مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد نہم

تصنیفات، شخصیات اور متفرق موضوعات سے متعلق مضامین

مرتبہ: ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

مجلسِ ترقیِ ادب، کلب روڈ لاہور

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد نہم

تصنیفات، شخصیات اور متفرق موضوعات سے متعلق مضامین

مرتبہ: ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

مجلسِ ترقیِ ادب، کلب روڈ لاہور

طبع اوّل : جون ۱۹۹۹ء

تعداد : ۶۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظم مجلسِ ترقیِ ادب لاہور

مطبع : سعادت آرٹ پریس، ۱۹ - اے، ایبٹ روڈ، لاہور

طابع : توفیق الرحمٰن

یہ کتاب محکمۂ اطلاعات حکومتِ پنجاب اور انفاق فاؤنڈیشن کے تعاون سے شائع ہوئی

فہرستِ مضامین

عرضِ مرتّب: ۷

حصّہ اوّل: تصنیفات

۱۔ قرآنِ پاک کی ایک قدیم تفسیر ۱۷
۲۔ قصّۂ چہار درویش ۱۱۳
۳۔ داستانِ پشاور ۱۴۰
۴۔ جنگ نامۂ موہن گڈھ ۱۵۴
۵۔ مخزن الغرائب و انیس العاشقین ۱۸۳
۶۔ حدِ جواب ۲۰۹

حصّہ دوم: شخصیات

۱۔ مخدوم شیخ بہاء الدین برناوی ۲۲۷
۲۔ مُلّا دو پیازہ اور جعفر زٹلی کی مروجہ سوانح عمریوں کا جائزہ اور تنقید ۲۸۰
(۱) مُلّا دو پیازہ ۲۸۱
(۲) جعفر زٹلی ۳۰۸
۳۔ فیض عثمانی: صحرائے راجپوتانہ کا ایک گم نام فارسی شاعر ۳۲۸

حصّہ سوم: متفرّقات

۱۔ گناہ (انشائیہ) ۳۴۵
۲۔ چند لمحے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں ۳۶۰

۳۔ پنجاب کے بعض غیر معروف اردو شاعر (قدیم اردو) ۳۷۳
۴۔ پنجاب میں اردو کی بعض قدیم تصنیفات ۳۹۶
۵۔ اردو کا دبستانِ دہلی ۴۲۰
۶۔ مسلمانوں میں ہندی موسیقی کا رواج ۴۳۸
۷۔ عباس صفوی کا شکار ۴۷۵
۸۔ آلاتِ آتش بازی ۴۸۱
۹۔ ولی کے سنِ وفات کی تحقیق ۵۲۶

حصۂ چہارم: تنقید و تبصرہ

۱۔ مطلع الانوار ۵۴۱
۲۔ ابنِ یمین ۵۴۶
۳۔ نیرنگ (رسالہ) ۵۴۶
۴۔ رہنمائے تعلیم (رسالہ) ۵۴۷
۵۔ اربابِ نثرِ اردو ۵۴۸
۶۔ انشائے جدید ۵۴۹
۷۔ مرقّعِ انشاء ۵۵۰
۸۔ ظلّ السلطان (رسالہ) ۵۵۰
۹۔ سروش (رسالہ) ۵۵۱
۱۰۔ تاریخ (رسالہ) ۵۵۲
۱۱۔ پروفیسر محفوظ الحق کا ایک مضمون ۵۵۳
۱۲۔ کردار افسانہ ۵۵۵
۱۳۔ قاعدۂ فارسی ۵۵۶
۱۴۔ چار یار ۵۵۷

۱۵۔ تاریخ الامت ۵۵۸

۱۶۔ ہمارے رسولؐ ۵۵۸

۱۷۔ سکھ سیلا ۵۵۹

۱۸۔ بانگِ درا (رسالہ) ۵۵۹

۱۹۔ حیاتِ فریاد ۵۶۰

۲۰۔ نورس (رسالہ) ۵۶۱

۲۱۔ مثنویاتِ میر ۵۶۲

۲۲۔ سوانحِ چاند بی بی ۵۶۳

۲۳۔ ہندوستانی فونیٹکس ۵۶۴

۲۴۔ دستکاری (رسالہ) ۵۶۶

۲۵۔ اتالیق (رسالہ) ۵۶۷

۲۶۔ انڈین لنگوسٹکس ۵۶۸

۲۷۔ منتخباتِ ہندی کلام ۵۶۹

۲۸۔ گلشنِ گفتار ۵۷۱

۲۹۔ محمود گاواں ۵۷۱

۳۰۔ باغبانی پراجیکٹ ۵۷۲

۳۱۔ اردو اکادمی، جامعۂ ملّیہ، دہلی (تعارف) ۵۷۳

۳۲۔ جدید اردو شاعری ۵۷۵

۳۳۔ تُرکوں کی اسلامی خدمات ۵۷۶

۳۴۔ داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی ۵۷۸

۳۵۔ مغل اور اردو ـــــ دو تاریک پہلو ۵۸۱

۳۶۔ فلسفۂ جمال ۶۰۳

۳۷۔ باپ کے خط بیٹی کے نام ۶۰۴

۳۸۔ مرقعِ دارا شکوہ اور اس کا مقدمہ ۶۰۶

۳۹۔ الموسیٰ (رسالہ) ۶۰۸

۴۰۔ فارسی ادب کی تلمیحات و اشارات ۶۱۱

۴۱۔ ترانۂ عشق ۶۱۳

۴۲۔ سلطان محمود غزنوی ۶۱۵

۴۳۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران ۶۱۶

۴۴۔ انجمنِ ترقیِ اردو کی کہانی ۶۱۸

۴۵۔ تذکرۂ بے نظیر ۶۲۰

۴۶۔ آسان اردو ۶۲۱

۴۷۔ ایثار ۶۲۳

۴۸۔ پنجاب میں اردو --- ایک تبصرے پر تبصرہ ۶۲۵

۴۹۔ اردو شہ پارے --- ایک ناتمام تبصرہ ۶۳۵

□□□

عرضِ مرتّب

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی کی نویں جلد میں شامل ہونے والے مضامین کا عرصۂ اشاعت رواں صدی کے آغاز سے اس کے آخری عشرے تک کوئی نوّے برس پر محیط ہے۔ اس اعتبار سے ان تمام تحریروں کو دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ مضامین جو خود فاضل مؤلف نے مکمل کر کے مختلف علمی و ادبی رسائل کو اشاعت کے لیے دیئے۔ دوسری قسم میں وہ تحریریں آتی ہیں جو مؤلف کی وفات کے بعد اشاعت پذیر ہو سکیں کیونکہ مرحوم نے ان کو نامکمل یا مطلوبہ معیار سے کم درجے کی ہونے کے باعث شائع نہیں کروایا تھا۔ ظاہر ہے کہ پہلی قسم کے مضامین مقابلتاً" زیادہ اہم ہیں۔ اس بنا پر میں یہاں ان کا الگ الگ مختصر تعارف کرا دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

"گناہ" نامی انشائیہ، جو آغا شاعر دہلوی کے تتبّع میں لکھا گیا تھا، دو لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہ شیرانی صاحب کا پہلا مضمون ہے جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔ دوسرے یہ ان کا واحد مضمون ہے جسے خالصتاً" ادبی کہا جاسکتا ہے اور جس کا علم و تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں۔ یوں تو وکٹوریہ البرٹ میوزیم والے مضمون کی بنیادی حیثیت بھی ادبی ہے تاہم اس میں مصنف ادبیت سے علمیت کی طرف رخ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

"چند لمحے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں" انہوں نے قیام لندن کے دوران میں لکھا تھا جب وہ وہاں بار کے طالب علم تھے۔ چنانچہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء کو اپنے والد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"میرا مضمون وکٹوریہ البرٹ میوزیم پورا ہوچکا ہے لیکن اس کا صاف کرنا باقی ہے۔"

اس مضمون کے آخری فقرے سے شیرانی صاحب کے مستقبل کے علمی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ : "ایک ایک چیز لامتناہی سلسلۂ خیالات چھیڑتی ہے اور ایک ایک خیال گھڑیوں بے چین رکھتا ہے۔ دل میں قوتِ احساس اور نگاہ میں شوقِ مشاہدہ درکار ہے۔"

اسلامیہ کالج لاہور کی ملازمت کے دوران میں شیرانی صاحب کو "کتاب چشتیہ" کا مخطوطہ بخطِ مولف دستیاب ہوا۔ چنانچہ "پنجاب میں اردو" میں ریختہ کے زیر عنوان اس کا تعارف ان الفاظ میں ملتا ہے :

"۔ ۔ ۔ ۔ میری اس اطلاع کا ماخذ کتاب چشتیہ ہے جو مخدوم حضرت علاء الدین ثانی برناوی نے ۱۰۶۵ھ میں تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا اصلی نسخہ بحالت تباہ راقم کو مل گیا ہے۔ مخدوم علاء الدین جانشین ہیں خاتم التارکین حضرت شیخ بہاء الدین برناوی متوفی ۱۰۳۰ھ کے، جو فن موسیقی میں امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں بے نظیر مانے جاتے ہیں حتیٰ کہ "راگ درپن" میں فقیر اللہ نے موسیقی دانوں میں سب سے پیش تر آپ ہی کا ذکر کیا ہے۔"

(پنجاب میں اردو، بار اول، صفحہ ۱۴ - ۱۵)

انہی دنوں انہوں نے مخدوم شیخ بہاء الدین برناوی پر مضمون سپرد قلم کیا جو اسی کتاب چشتیہ کے بیانات پر مشتمل ہے۔ مضمون کی تحریر کا ایک سبب یہ بھی ہوگا کہ مخطوطے کی سقیم حالت کے پیش نظر وہ اس کی فراہم کردہ اطلاعات کو محفوظ کرلینا چاہتے تھے۔

شیرانی صاحب کے ذخیرۂ کتب میں قرآن پاک کی ایک قدیم تفسیر کے باقی ماندہ چھیالیس اوراق موجود تھے۔ اس کے بارے میں وہ خود اپنے کتب خانے کے تعارفی تعلیقے (بزبانِ انگریزی) میں رقم طراز ہیں :

"نمبر ۱۷۴۴۳، قرآن پاک کی ایک قدیم تفسیر ہے جو غالباً" ابتدائی غزنوی دبستان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی فرسودہ زبان اور املا کسی قدیم تفسیر سے مماثلت نہیں رکھتی۔ اس میں کاف اور گاف نیز یائے مجہول و معروف میں امتیاز برتا گیا ہے۔ اس کی زبان شاہ نامہ سے ملتی جلتی ہے۔"

(اے بریف نوٹ آن مائی کولیکشن، صفحہ ۲،
عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جرنل، ٹونک، ۱۹۸۳ء)

مضمون "قرآن پاک کی ایک قدیم تفسیر" اسی مخطوطے کے مفصل تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون سے ہمیں کسی مجہول الاوّل و آخر مخطوطے کا مطالعہ کرنے کے آداب معلوم ہوتے ہیں۔ تفسیرہذا کی اہمیت کے پیش نظر، کتاب خانۂ جامعہ پنجاب لاہور سے اس کے عکس حاصل کرنے کے بعد، بنیاد فرہنگ ایران کے زیر اہتمام، اسے ۱۳۴۴ ہجری شمسی (م ۲۶ - ۱۹۶۵ء) میں تہران سے شائع کیا گیا۔ اس اشاعت میں ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری کا تحریر کردہ تعارف اور آقای بدیع الزمان فروز انفر کا مختصر مقدمہ بھی شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیرانی صاحب کے اس مضمون کے مقابلے میں یہ تحریریں آسمان و ریسمان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس فاضلانہ مضمون کا فارسی میں ترجمہ کرکے شامل اشاعت کردیا جاتا۔

قصہ چہار درویش کو عام طور پر خالق باری کی طرح حضرت امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ شیرانی صاحب نے اس غلط انتساب کی تردید کے موضوع پر ایک گراں قدر مضمون لکھا جو پہلی بار سالنامہ "کاروان" (لاہور) میں چھپا تھا۔

شیرانی صاحب کے خیال میں فارسی میں قصۂ چہار درویش کی ابتدائی کڑی حکیم محمد علی معصوم کا نسخہ تھا اور آخری اصلاح یافتہ کڑی میر احمد خلف شاہ محمد کا مرتبہ جس کو میر حسین عطا خان تحسین اور میر امن نے بالترتیب "نو طرز مرصّع" اور "باغ و بہار" لکھتے ہوئے اپنا رہبر بنایا۔ اب یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہوچکی ہیں یعنی محمد علی معصوم کے نسخے سے اقدم نسخے دریافت ہوچکے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ میر احمد نے

خود اپنی فارسی تالیف میں میر امن کی باغ و بہار سے امداد لی ہے جیسا کہ دیباچہ میں کہتا ہے:

"و از نسخۂ اردو ترجمہ میر امن دھلوی نیز مقابلہ کردہ"

شیرانی صاحب کو غلط فہمی اس لیے ہوئی کہ ان کے سامنے میر احمد کی "چہار درویش" کا جو مطبوعہ نسخہ تھا اس اشاعت میں مؤلف کا دیباچہ شامل نہیں تھا۔ بہرحال ان غلط فہمیوں کے باوجود شیرانی صاحب اپنے اصلی مقصد، یعنی قصۂ چہار درویش کی امیر خسرو سے انتساب کی تردید' میں پوری طرح کامیاب رہے۔ اس حقیقت کا اعتراف ڈاکٹر گیان چند جین نے بہ الفاظِ ذیل کیا ہے:

"چہار درویش کی تحقیق میں پروفیسر محمود شیرانی کا نام ہمیشہ درخشندہ رہے گا۔ انہوں نے حتمی طور پر ثابت کیا کہ امیر خسرو کو اس قصے سے دور کا تعلق نہیں۔"

(اردو کی نثری داستانیں، صفحہ ۱۶۶، کراچی، ۱۹۶۹ء)

"عباس صفوی کا شکار" ایک ہلکا پھلکا لیکن دلچسپ مضمون ہے جو کسی معیاری علمی رسالے کے لیے موزوں نہ تھا۔ یوں بھی مضمون نامکمل ہے اور اچانک ختم ہوجاتا ہے جس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ مرحوم اختر شیرانی نے "بابا" کی میز سے کھسکا کر اپنے پرچے "رومان" میں چھاپ دیا تھا۔

شیرانی صاحب کا بلند پایہ علمی کام گو زیادہ تر "تحقیقِ کامل" کے زمرے سے تعلق رکھتا ہے تاہم ان کے ہاں حقائق کی بازیافت اور ان کی ناقدانہ ترجمانی پر مبنی کام بھی، ضمنی یا مستقل حیثیت میں، بڑی حد تک موجود ہے۔ چنانچہ ان کا مُلّا دو پیازہ اور جعفر زٹلی والا مضمون حقائق کی جستجو کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کے آغاز میں وہ کہتے ہیں:

"تاریخ اور افسانہ میں صرف ایک قدم کا فرق ہے یعنی یہی کہ پہلا حقیقی واقعات سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا خیالی باتوں کو حقیقت کا رنگ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں تخلیط پیدا کردے تو یہ بڑا ظلم ہے اور ہر حال میں طشت از بام

کیے جانے کا مستحق ہے۔ یہ بڑی بے اصولی کی بات ہے کہ ایک مصنف قارئین کے ساتھ اپنے فرائض پس پشت ڈال کر ان کو ادبی دھوکے میں رکھے اور فرضی حالات کے قصر ان کے مطالعے کے واسطے کھڑے کردے۔ ایسی خدا عیاں ہر زبان و ادب میں ہوا کرتی ہیں اور اردو اس بارے میں استثنا پیش نہیں کرتی بلکہ قاعدہ۔ ہم اپنے وقت کو محدود سمجھتے ہوئے صرف دو شخصوں کے حالات سے تعلق رکھیں گے.....''

شیرانی صاحب اپنے کسی علمی کام کو حرفِ آخر کبھی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اس مضمون کے اختتام پر صریحاً" اعلان کرتے ہیں کہ :

''ان چند امور سے، جو تمثیلاً میں نے بیان کیے ہیں، یہ نہ سمجھا جائے کہ فارسی کے تمام ذرائع 'ملّا' کے سلسلے میں ختم ہوچکے ہیں۔ اگر تلاش جاری رکھی جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ اس کے باقی ماندہ حالات بھی دریافت ہوسکیں گے۔''

جہاں تک ان مضامین کا تعلق ہے جو شیرانی صاحب کی وفات تک غیر مطبوعہ تھے، کہا جاسکتا ہے کہ ان کے شائع نہ ہونے کا بڑا سبب ان کا نامکمل ہونا تھا۔ بعض کے معیار سے وہ مطمئن نہ تھے۔ دو مضمون ایسے بھی ہیں جو انہوں نے اپنے شاگردوں کے نام سے چھپوائے۔ ان مضامین میں سے کچھ ان کے دورِ طالب علمی کی یادگار ہیں اور چند وہ بھی جن پر مرحوم اپنی وفات سے پیش تر مصروف تھے۔ یوں کہنا درست ہوگا کہ ان میں سے ہر مضمون کی اپنی اپنی کہانی ہے۔ اس لیے میں نے ان سب کے ساتھ فرداً فرداً تعارفی سطور کا اضافہ کردیا ہے۔

غیر مطبوعہ مضامین میں اشاعت کی سبقت مضمون ''پنجاب کے بعض غیر معروف اردو شاعر'' کو حاصل ہے جو مرحوم خواجہ عبدالوحید کے توسّط سے ''قدیم اردو'' کے زیرِ عنوان سنہ ١٩٦١ء میں شائع ہوا۔ باقی تمام مضامین شیرانی صاحب کی صد سالہ تقریبِ ولادت کی مناسبت سے سنہ ١٩٨٠ء اور اس کے بعد کے برسوں میں منصّۂ شہود پر آئے۔ ''مخزن الغرائب و انیس العاشقین'' والا مضمون اگرچہ ١٩٢٤ء میں (ڈاکٹر) مولوی عبداللہ

(چغتائی) کے نام سے چھپ چکا تھا لیکن یہ اور اس سلسلۂ بحث کی آخری غیر مطبوعہ کڑی "حدِ جواب" کی اشاعت کی باری کہیں ۱۹۹۲ء میں آسکی۔ مضامین کی فہرست میں آخری اضافہ ایک تازہ انکشاف کے باعث ممکن ہوا۔ میری مراد مضمون "ولی کے سن وفات کی تحقیق" سے ہے جو اگست سنہ ۱۹۳۴ء کے "اورینٹل کالج میگزین" میں سردار عبدالحمید صاحب کے نام پر شائع ہوا تھا۔

ان تمام مضامین کی گزشتہ برسوں میں اشاعت سے میرا بنیادی مقصد ان کا تحفظ تھا جو اب کتابی شکل میں آنے کے بعد بدرجہ اولی حاصل ہو سکے گا۔

مقالات کی زیر نظر جلد کو موضوعات کے اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں مختلف تصنیفات (منثور و منظوم) سے متعلق چھ مضامین ہیں۔ دوسرا حصہ شخصیات کے بارے میں تین (یا چار) مضامین پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے میں متفرقات کے عنوان کے تحت نو مضامین شامل ہیں۔ ان تینوں حصوں کے مضامین کی ترتیب میں ان کی تاریخ اشاعت کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ زیر بحث موضوع کی نوعیت اور اہمیت ملحوظ خاطر رہی ہے۔ چوتھا اور آخری حصہ مختلف مطبوعات پر شیرانی صاحب کے تبصروں کا احاطہ کرتا ہے جسے "تنقید و تبصرہ" کا نام دیا گیا ہے۔ حصۂ چہارم کی بابت چند گزارشات کرنا یہاں نامناسب نہ ہوگا۔

شیرانی صاحب کے ہاں "تنقید" کا لفظ بڑی وسعت کا حامل ہے۔ اس کے دائرہ میں انتہائی معیاری تحقیق بھی شامل ہے۔ (جیسے تنقید شعر العجم، تنقید پر تھی راج راسا اور تنقید آب حیات) اور معمولی مطبوعات پر رسمی تبصرے بھی جو اورینٹل کالج میگزین میں تنقید و تبصرہ کے زیر عنوان شائع ہوتے تھے۔ یہی حال لفظ "تبصرہ" کا ہے۔ ان کے تحریر کردہ تبصروں کا یہ عالم ہے کہ جہاں شمس العلماء عبدالغنی اور ڈاکٹر اقبال حسین کی کتابوں پر ان کے تبصرے، بقول ڈاکٹر نذیر احمد (پروفیسر ایمریطس، علی گڑھ یونیورسٹی) "ایک کتاب پر بھاری ہیں" وہاں ایسی مطبوعات پر بھی تبصرے ہیں جو چند سطروں سے زیادہ کی متحمل نہیں ہوتیں۔ میں نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ طویل علمی اور تحقیقی

تبصروں کو باقاعدہ مقالات و مضامین کی صف میں داخل کرلیا اور انہیں ان کے موضوع سے متعلق جلد میں شامل کردیا ہے۔ اہم موضوعات کے بارے میں بعض مختصر تبصروں کا متعلقہ جلد کے آخر میں (دیکھئے جلد اول و چہارم) "تنقید و تبصرہ" کے زیر عنوان اضافہ کردیا گیا۔ پھر بھی کوئی پچاس کے قریب تبصرے ایسے ہیں جو، ماسوا چند ایک کے، اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوئے اور اب زیر نظر جلد میں بطور حصہ چہارم شامل کیے جارہے ہیں۔

شیرانی صاحب کی اورینٹل کالج کی ملازمت کا آغاز یکم اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء کو ہوا تھا لیکن جس طرح ان کے مضامین اورینٹل کالج میگزین میں فروری ۱۹۲۵ء کے شمارے سے نظر آنے لگے تھے اسی طرح ان کے تبصروں کی ابتداء فروری ۱۹۲۸ء کے پرچے سے ہوگئی تھی۔ ان کی شمولیت سے پہلے میگزین میں تبصروں کا شعبہ نامعلوم کمیت کی حیثیت رکھتا تھا۔ شیرانی صاحب کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے پہلے لیکچرار کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اس مناسبت سے زیادہ تر اردو کے کتب و رسائل پر تبصرہ ان کے فرائض میں شامل تھا۔ تاہم وہ فارسی زبان و ادب میں اپنی دلچسپی کے موضوعات و مطبوعات پر بھی تبصرہ کردیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تاحین ملازمت جاری رہا۔ یعنی نومبر ۱۹۴۰ء کے شمارے میں ان کے تحریر کردہ آخری تبصرے شائع ہوئے اور ۱۴ نومبر ۱۹۴۰ء کو وہ ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

شیرانی صاحب معمول کے تبصروں پر اکثر اوقات اپنا نام نہیں دیتے تھے اس لیے ان کی شناخت اور انتخاب میں خاصی محنت کرنا پڑی۔ اس بارے میں اخذ کردہ نتائج کی روداد میں نے متعلقہ تبصروں کے آغاز میں علیحدہ علیحدہ مختصراً بیان کردی ہے۔ ان تبصروں کی ترتیب میں، مضامین کے سلسلے میں اختیار کردہ اصول کے برخلاف، موضوع کی بجائے تاریخ اشاعت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مطبوعات پر ان تبصروں کی صف میں ایک علمی ادارے یعنی اردو اکادمی (جامعۂ ملیہ) دہلی کا تعارف بھی شامل تھا۔ میں نے اسے خارج کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس فہرست میں صرف تین تبصرے ایسے ہیں جو

اورینٹل کالج میگزین سے تعلق نہیں رکھتے۔ یعنی:

۱۔ "حیات فریاد" از شاد عظیم آبادی پر تبصرہ جو اختر شیرانی مرحوم کے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ "خیالستان" (لاہور) میں چھپا تھا۔

۲۔ "پنجاب میں اردو" پر مولوی عبدالحق کے مخالفانہ تبصرے کا جواب جس کا مسودہ مجھے شیرانی صاحب کے کاغذات میں ملا تھا۔ یہ مضمون بغیر کسی تعارف کے اچانک شروع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں "فنون" میں شائع کرتے وقت محترم احمد ندیم قاسمی صاحب نے اس کو "پنجاب میں اردو --- ایک تبصرے پر تبصرہ" کا عنوان دے دیا تھا۔

۳۔ ڈاکٹر محی الدین زور قادری کی تالیف "اردو شہ پارے" پر شیرانی صاحب کا جو تبصرہ اورینٹل کالج میگزین میں چھپا تھا وہ مقالات کی پہلی جلد میں شامل کیا جاچکا ہے۔ اس جلد کے حصہ چہارم کے آخر میں جو تاحال غیرمطبوعہ تحریر آپ دیکھیں گے وہ اسی کتاب پر شیرانی صاحب کے ایک اور تبصرے کا نقش اول ہے جو تکمیل پاکر رسالہ "مخزن" (لاہور) میں کسی اور کے نام سے شائع ہونا تھا۔ اس کا مسودہ میں نے "اردو شہ پارے --- ایک ناتمام تبصرہ" کے عنوان سے تبصروں کے آخر میں اضافہ کردیا ہے۔

"اورینٹل کالج میگزین" میں شائع ہونے والے تبصروں میں سب سے دلچسپ معاملہ اس مضمون نما تبصرے کا ہے جو نواب نصیر حسین خیال کی تالیف پر "مغل اور اردو --- دو تاریک پہلو" کے زیر عنوان د۔ ش کے نام پر چھپا تھا۔ اسے موضوع کی مناسبت سے مقالات کی پہلی یا دوسری جلد میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس وقت تک یہ انکشاف نہیں ہوا تھا کہ یہ خود شیرانی صاحب کی تصنیف ہے۔ (مرتب)

حصۂ اول

تصنیفات

قرآنِ پاک کی ایک قدیم تفسیر

یہ تفسیر اپنی قدیم طرزِ کتابت، مخصوص رسم الخط، صرفی و لسانی خصوصیات و دیگر گوناگوں دلچسپیوں کی بنا پر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔ ہم کو اس میں ایسا ذخیرہ ملتا ہے جو فارسی زبان کی قدیم حالت اور دوسری خصائص عصری پر جدید معلومات کا حامل ہے۔ سطورِ ذیل اسی معلومات کو منظرِ عام پر لانے کے لئے حوالۂ قلم کیجاتی ہیں۔

تفسیر ہذا جو کسی بڑی تفسیر کا ایک جزو ہے پارۂ الم کے ساتویں رکوع کے نصف اور آیۂ "ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت فقلنا لھم کونوا قردۃً خاسئین" سے شروع ہو کر پارۂ سیقول کے رکوع دوم کے ختم سے ایک آیت پہلے "کما ارسلنا فیکم رسولا منکم" پر ختم جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ حصہ دس ساڑھے دس رکوع کی تفسیر ہے اور چھیالیس اوراق پر شامل ہے اور سرسری اندازہ میں تمام قرآن کے ساتھ ایک اور تینتالیس کی نسبت رکھتا ہے۔ اس حساب سے پوری تفسیر کے اوراق کی تعداد دو ہزار سے کم تصور نہیں کی جا سکتی۔ بدقسمتی سے اس تمام ذخیرہ کی جو مقدار ہم تک پہنچی ہے بہت قلیل ہے تاہم اس قلیل مقدار میں بھی جدید معلومات کا کافی عنصر موجود ہے۔

اس نسخہ کے سلسلے میں ایک بڑی دقت یہ محسوس کی جاتی ہے کہ باوجودیکہ وہ تمام دیرینہ خصوصیات کا حامل ہے لیکن اس کے کاغذ سیاہی اور کتابت پر لحاظ کرتے .

بار دیگر هم نشدم تا سیم بار بر سر تنور شدم نگاه کردم بمانند سواری دیدم سپید جامه جامهٔ سپید اندر سر کشیده از تنور بر آمد و بسوی آسمان بر رفت باز آمدم گفتم این چونین دیدم گفتند آن ایمان تو بود برفت اکنون بیاموزی آن علمها ایشان برخوانند من یاد گرفتم و باز خانه آمدم از بهر آزمایش تخم اندر زمین افگندم و آن سخنها برخواندم در وقت بر رست و سبز شد و بر بالید و خوشه شد چون آن پدید آمد در حال پشیمان شدم پیش ازان هیچ جای آن را کار نبستم مرا چه گویی توبه هست عایشه رضوان الله علیها توبهٔ وی نپذیرفت و نزدیک صحابه آمد هیچ کس حکم نکردند بپذیرفتن توبهٔ اوی ایزد تعالی داند که حال وی بقیامت چگونه باشد ورق ۲۵ ب)

چون جهودان مر عَمّار یاسر را و حُذیفة بن الیَمان را گفتند از پس حرب اُحد کی مَی بینید کی این مرد را چه رسید و مر ورا چه پیش آمد اگر اوی بر حق بودی او را این پیش نیامدی باز گردید از دینِ اوی و اندر دین ما اندر آیید عمّار جواب داد کی عهد و پیمان شکستن را چگونه دارید شما کی جهودانید گفتند هَوْل و صَعْب است عهد شکستن عَمّار گفت پس من با خدای عز و جل عهد دارم و پیمان کی هرگز از دین او بر نگردم حُذَیفه را گفتند این عَمّار بی راه شده است و دین پدران را یله کرده است تو چه گویی باری یا حذیفه حذیفه جواب داد کی الله خداوند من است و محمد رسول منست و قرآن امام منست هم برین می باشم تا روز مرگ -

ابن عباس و قتاده گفت کی جهودان چون فرزندان را نام نهادندی بنام جهودی علامت کردندی و ترسا آن بنام ترسایی علامت کردندی و بعضی گفتند اصل این صِبْغَه آن بودی کی جهودان فرزندان را ختنه کردندی و گفتندی این نشان جهودی است و باز ترسا آن ختنه روا ندارندی بجای ختنه فرزند خود را بآب عَمُوریه بشستندی و بر روغن مبارک چرب کردندی و گفتندی کی این صِبْغه

ترسایان است ای کی علامت ترسایان است خداوند تعالی درمقابله بر آن مرین
مسلمانان را نیز صبغه خواند و این چنین روا باشد اندر لغت عرب و هم اندر لغت
عجم کی کسی از کسی چیزی یاد کند این کس مکافات آن را از خود یاد کند هم
نام آن چیز گوید چون جهودان ختنه را صبغه ی دین خویش خواندند و ترسا آن
آب عموذیه را و دهن مبارک را صبغه ی دین خویش داشتند درمقابله ی آن ایزد
تعالی مسلمانان را نیز صبغه خواند۔

ہوئے ہم اس کو دیرینہ کہنے کے لئے طیار نہیں اگرچہ اس کو ایک جعلی مخطوطہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی زبان ہر قسم کی بدگمانی کو دور کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ کافی ہے۔ جہاں وہ ایک طرف فردوسی کے شاہنامہ سے ہم آہنگ ہے دوسری طرف ابو علی بلعمی کے ترجمۂ تاریخ طبری سے ٹکر لیتی ہے اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس کے اصلی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

ایک اور شبہ میں ڈالنے والا پہلو یہ ہے کہ نسخۂ ہذا کا رسم الخط بعض امور میں بالکل زمانۂ حال کے مطابق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ب، ج، اور ک، سے ممیز کرنے کے لئے اس نسخے میں پ، چ اور گ، پر تین تین نقطے لگائے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان حروف کا یہ خصوصی ارتقا جیساکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کوئی جدید کارنامہ نہیں ہے بلکہ قدیم ہے۔ قاہرہ میں امام غزالی کی کیمیاے سعادت کے نسخہ نوشتۂ ۵۷۶ھ اور اسی کتاب کے دوسرے نسخے نوشتۂ ۶۷۲ھ مخزونۂ برٹش میوزیم میں انہی حروف پر تین تین نقاط لگانے کا دستور رائج ہے اگرچہ عام پابندی نہیں کی جا رہی یعنے یہ حروف دونوں طرح لکھے جا رہے ہیں۔ مثلاً پیر۔ بیش۔ پیدا۔ بیدا۔ اگرچہ۔ چہ۔ جیست جون۔ چہارم۔ جہارم۔ گاہے۔ کاہے۔ گردے۔ اگر۔ دیگر[1] وغیرہ ان مخطوطوں میں ملتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ عہد قدیم میں بھی مذکورہ حروف پر نقطوں کا رواج رہا ہے اگرچہ عالمگیر معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے بہت کم نسخے ہم تک پہنچے ہیں جن میں یہ خصوصیت موجود ہو۔

اس صورتِ حالات میں ہم اس رائے پر قائم ہو جاتے ہیں کہ یہ نسخہ کسی قدیم

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام صفحہ ۲۹۱ جلد اول

اصل پر مبنی ہے جس میں بطورِ لزوم مالا یلزم اصل کی شان خط و خصائص املا وغیرہ کو نہایت احتیاط کے ساتھ برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کتابت کے بعد اس نسخہ کی صحت بھی کرلی گئی ہے اور اسی لئے اس میں بہت کم غلطیاں نظر آتی ہیں۔

یہ نسخہ تلفظ و املا کے معاملہ میں ایرانی روایت کے برخلاف تورانی یا ماوراء النہری روایات کا پابند ہے۔ ہمارا یہ بیان کسی قدر تشریح طلب ہے اس سے یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہر فارسی زبان میں ابتداءً ادبی تحریکات کا بانی ہے۔ بخارا ان ایام میں بنو سامان کا پایۂ تخت تھا اور یہ آلِ سامان کا دور ہے جس میں فارسی زبان فروغ پاتی ہے۔ جب سیاسی واقعات بخارا سے ہٹ کر غزنین کو اپنا مرکزِ ثقل قرار دیتے ہیں تو غزنین بعہدِ آلِ ناصر سیاسات کے علاوہ ادب و شعر کا بھی مرکز بن جاتا ہے اور یہ غزنوی روایات ہیں جو ہندوستان میں جہاں تک کہ فارسی کا تعلق ہے سب سے پیشتر نفوذ کرتی ہیں گویا ہندوستان بواسطۂ غزنین ماوراء النہر کا مقلد بنجاتا ہے۔ خروجِ مغول کے بعد جب ماوراء النہر تباہی کے گرداب میں پھنس جاتا ہے، وہاں کے علما و فضلا غلاموں کے ابتدائی زمانہ میں ہندوستان میں پناہ گزین ہوتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان پر ماوراء النہر کا اثر نہایت گہرا بیٹھ جاتا ہے ہمارے اسلاف اکثر امور میں جن میں ادبی و مذہبی و فقہی تحریکات بہت نمایاں ہیں براہ راست دبستانِ توران کا اتباع کرتے ہیں۔ خود امیر خسرو تورانی و ہندوستانی فارسی کی موافقت و مطابقت کے قائل ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ توران و غزنین و ہندوستان ایک ہی سلسلۂ

لہ فرماتے ہیں :- اگر زبان پارسی است کہ از پارسیان رسیدہ است جز بعبارت ماوراء النہر کہ موافق است با پارسی ہندوستان دیگر ہیچ عبارتے را درستی لفظ نیست۔ دیباچہ دیوان غرۃ الکمال (صـ۳۲)

روایات کے پابند ہیں لیکن ایران اس معاملہ میں ان سے اختلاف رکھتا ہے

ہم یہاں اپنا مقصد کسی قدر واضح کرنے کے لئے مختصراً اس ایرانی و تورانی اختلاف روایات کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) یای مجہول و معروف کا فرق تورانی و غزنوی اور ہندوستانی تسلیم کرتے ہیں مگر ایرانی یائے مجہول کے قائل نہیں۔

(۲) ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو ایرانی بولتے اور طرح سے ہیں اور لکھتے اور طرح سے ہیں مثلاً آن ۔نان ۔ ہمیدان ۔ چنان ۔ وغیرہ کو رسم کتابت کے برخلاف اون ۔ نون ۔ ہمیدن ۔ اور چنون بولتے ہیں ۔اسی اختلاف تحریر و تقریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

"خراسانی 'چہ را' 'چی' میگویند و بعضے 'کجا' را 'کجو' میگویند و در کتاب 'چہ' نویسند نہ 'چی' و 'کجا' می نویسند نہ 'کجو' و لفظ درست آنست کہ در کتاب آید دانشان را مثل این کلمات کہ در لفظ چیزے گویند کہ در کتاب خطا باشد بسیار است" (دیباچہ غرۃ الکمال ص۳۳)

اہل توران جس طرح بولتے ہیں اس طرح لکھتے ہیں۔

(۳) دال و ذال :۔ اگر اس حرف کے ماقبل حرفِ صحیح ساکن ہو تو ایرانی دال مہملہ تلفظ کرتے تھے۔ اگر حرف ماقبل صحیح متحرک یا حرفِ علت ساکن ہو تو ذال بولتے تھے ۔ تورانی اس تفریق کو نہیں مانتے اور سب جگہ دال بولتے تھے حتیٰ کہ گذشتن اور

سلہ ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں اہل ہند ایران کو خراسان کے نام سے یاد کرتے ہیں دیلمے سند سے اس طرف کا تمام بالائی علاقہ مع ایران خراسان کے نام سے مشہور تھا اور دریائے جیحوں سے پار کا تمام مشرقی علاقہ توران کہلاتا تھا۔

پذیرفتن اور اُن کے مشتقات کو دال مہملہ سے بولتے اور لکھتے تھے بلکہ بعض عربی الفاظ مثلاً نفاذ اور تعویذ کو بھی دال مہملہ کے ساتھ لکھتے پڑھتے تھے۔ البتہ۔ الفاظ خدای خداوند۔ باذر۔ پذر اور خذمت کو ذال معجمہ سے بولتے اور لکھتے تھے۔

(۴) کاف وگاف:۔ ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن کو تورانی کاف سے بولتے ہیں مثلاً نوک۔ خیک۔ سرشک۔ کبک۔ پزشک۔ رشک۔ کرنک۔ کیل۔ کشن۔ کشادن۔ کشن۔ کشودن۔ کشنیز۔ کنیز۔ کنجشک۔ کنداور۔ کوردین۔ کیپا وغیرہ۔ لیکن ایرانی گاف کے ساتھ بولتے ہیں۔

اس مادۂ فارق پر نظر ڈالتے ہوئے نسخۂ ہٰذا کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ تورانی روایات کا مقلد ہے۔ اس میں اسی قسم کا اور مواد ہے جس کو یقیناً غیر ایرانی کہا جا سکتا ہے مگر اس کا ذکر آئندہ

تفسیر ہٰذا کے مصنف یا اس کے عہد تالیف سے ہم قطعاً ناواقف ہیں صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ مصنف چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں گذرا ہوگا۔ اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ چند الفاظ قدیم فارسی تفاسیر و مفسرین کے ذکر میں حوالۂ قلم کئے جائیں۔ اس غرض کے لئے ہم نے یورپ کے کتب خانوں کی فہرستوں بالخصوص مسٹر سی۔ اے۔ اسٹوری کی ایک تالیف سے جو بسلسلۂ ادبیات فارسی موسوم بہ ادبیاتِ قرآن (حصہ اول)[1] ہے پورا استفادہ کیا ہے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فارسی زبان میں شعر و شاعری کے ذوق نے اس زبان کی نثری تالیفات کو ہماری بے توجہی کا شکار بنا دیا ہے فردوسی کے غیر فانی شاہنامہ کے وجود میں آنے سے پیشتر نثر میں کئی شاہنامے لکھے گئے ہیں۔ جن

---

[1] طبع لیڈن ۱۹۲۷ء

کے نام جدید تحقیقات نے ہم تک پہنچائے ہیں مثلاً شاہنامۂ ابوالموید بلخی۔ شاہنامۂ منصوری اور شاہنامہ ابو علی مروزی۔ ان میں سے بعض اگر تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ چوتھی صدی میں بعہد آل سامان مذہبی تالیفات کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے اور یہ محض ایک اتفاق تھا جس کی بنا پر مذہب نے فارسی زبان میں کلام پاک کی تفسیر و تراجم کی اجازت دے دی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری متوفی ۳۱۰ھ کی عربی تفسیر جو چالیس جلدوں میں تھی امیر ابو صالح منصور بن نوح سامانی ۳۵۰ھ و ۳۶۶ھ کے دربار میں منگوائی گئی تو امیر منصور کو کافی عربی نہ جاننے کی بنا پر اس تفسیر کا مطالعہ دشوار معلوم ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر فارسی میں اس کا ترجمہ ہو جاتا تو عربی نہ جاننے والوں کے لئے بڑا مفید ثابت ہوتا۔ اس ضرورت کے لئے امیر نے علمائے ماوراء النہر سے فتوے مانگا کہ ان لوگوں کے لئے جو عربی زبان سے ناواقف ہیں کلام پاک کی تشریح فارسی میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ علما نے اس فتوے کا جواب اثبات میں دیا جو قرآن شریف کی اس آیت پر مبنی تھا۔

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ" (سورۂ ابراہیم۔ آیۂ چہارم)

یہ فتوے حاصل کر کے امیر نے بخارا۔ سمرقند۔ بلخ و فرغانہ کے جید جید علما کو جمع کیا جن میں سے ذیل کے بزرگوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔

(۱) ابوبکر محمد بن فضل الانام۔ متوفی بخارا ۳۸۱ھ

(۲) محمد بن اسمٰعیل الفقیہ۔

(۳) ابوبکر احمد بن حامد الفقیہ

(۴) خلیل بن احمد السجزی متوفی سمرقند ۳۶۸ھ

(۵) ابو جعفر محمد بن علی۔

(۶) ابو الجہم خالد بن ہانی المنفقہ وغیرہما۔

ترجمہ کے کام کے لئے اس جماعت نے اپنے میں سے چند فاضلوں کا انتخاب کر لیا اور ترجمہ شروع کر دیا گیا۔ مترجمین نے اسناد کو حذف کر دیا اور اپنی طرف سے ۳۴۵ھ تک کی بعض مفید تاریخی اطلاعات اضافہ کر دیں[1]۔ اس طرح فارسی زبان میں تفسیر نگاری کا راستہ کھل گیا۔ یہ تفسیر فارسی زبان میں یقیناً سب سے قدیم مانی جاسکتی ہے اس کے مکمل نسخے بہت کم ملتے ہیں صرف ایک نسخہ ہے جو ۸۵۳ھ میں جونپور میں نقل ہوا تھا اور اب برٹش میوزم میں ہے۔ ایک حصہ رام پور میں ہے۔ جو تقریباً ۶۰۰ھ کا نوشتہ ہے۔ ایک حصہ پیرس میں ہے جو ۷۲۲-۶۷۶ھ کا نوشتہ آذربائیجان ہے۔ ایک حصہ ایشاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔ جو ساتویں آٹھویں صدی کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ تفسیر ان ممالک میں جہاں فارسی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی بہت مقبول رہی ہے خصوصاً ہندوستان میں اس کو کافی شہرت تھی۔

ایک اور تفسیر جو غالباً منصوری تفسیر سے عمر میں کچھ ہی کم ہوگی کیمرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ پروفیسر براؤن آنجہانی نے اس پر ایک سیر حاصل مضمون رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ میں بابت ماہ جولائی ۱۸۹۴ء لکھا ہے۔ یہ نصف آخر قرآن کی تفسیر ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ محمد بن ابی الفتح الفقیہ الغریب ۶۲۸ھ

---

[1] یہ اطلاع میں نے مسٹر اسٹوری کی کتاب مذکورۂ بالا سے حاصل کی ہے۔ اس مضمون کے ختم ہونے پر مرزبان نامہ کا دیباچہ نظر سے گذرا۔ اس میں مرتب نے اصل تفسیر فارسی کا دیباچہ بھی نقل کر دیا ہے۔ جو ذیل میں حوالۂ قلم ہوتا ہے:-

"و این کتاب تفسیر بزرگست از روایت محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کردہ بزبان پارسی و دری راہ راست و این کتاب را بیاوردند از بغداد چہل مصحف

میں اس کی کتابت کرتے ہیں ۔ لیکن اس تفسیر کے مصنّف کے نام سے ہم ناواقف ہیں +

تفسیر توضیح - اس کا ایک کامل نسخہ دو جلدوں میں بخط تعلیق ہندوستان

(بقیہ حاشیہ صک) بوذ این کتاب نبشته بزبان تازی و باسنادهای دراز بوذ و بیاوردند سوی امیر سید مظفر ابوصالح منصور بن نوح بن نصر بن احمد بن اسمعیل رحمة الله علیهم اجمعین پس دشخوار آمذ بروی خواندن این کتاب و عمارت کردن آن بزبان تازی و چنان خواست کی مرین را ترجمه کنذ بزبان پارسی پس علماء ماوراء النهر را گرد کرد و این از ایشان فتوی کرد کی روا باشذ کما این کتاب را بزبان پارسی گردانیم گفتند روا باشذ خواندن و نبشتن تفسیر قرآن بپارسی مر آن کسی را که او تازی نداند از قول خدای عزوجل کی گفت وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ گفت من هیچ پیغامبری را نفرستادم مگر بزبان قوم او و آن زبانی کایشان دانستند و دیگر آن بود کاین زبان پارسی از قدیم باز دانستند از روزگار آدم تا روزگار اسمعیل علی همه پیغامبران و ملوکان زمین بپارسی سخن گفتندی و اوّل کس کی سخن گفت بزبان تازی اسمعیل پیغامبر بوذ علی و پیغامبر ما صلی الله علیه از عرب بیرون آمذ و این قرآن بزبان عرب براو فرستادند و اینجا بدین ناحیت زبان پارسی است و ملوکان این جانب ملوک عجم اند پس بفرمود ملک مظفر ابو صالح تا علمای ماوراء النهر را گرد آوردند از شهر بخارا چون ... ... و هم ازین گونه از شهر سمرقند و از شهر اسبیجاب و فرغانه و از هر شهری کبوذ بماوراء النهر اند همه را بیاوردند و همه خطها بداذند بر ترجمهٔ این کتاب کاین راه راستست پس بیرون آمذ فرمان امیر سید ملک مظفر بدست کسهای او و نزدیکان او و وزیران او بر زبان خاصّهٔ او و خادم او ابوالحسن فایق الخاصّه سوی این جماعت مردمان و این علما تا ایشان از میان خویش هر کدام دانا تر اختیار کردند تا این کتاب را ترجمه کنند و از جمله این مصحف اسنادهای دراز بیفگندند و اقتصار کردند بر متون اخبار الخ" (مقدمۂ مصحح ص ملک ڈیو، مرزبان نامہ طبع یورپ)،

نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتب خانہ واقع حبیب گنج میں محفوظ ہے۔ مصنف کے نام اور زمانہ سے ہم نا واقف ہیں +

تفسیر السور آبادی: از ابوبکر عتیق بن محمد السور آبادی الہروی جو الپ ارسلان سلجوقی (سنہ ۴۵۵ھ و سنہ ۴۶۵ھ) کے عہد کے بزرگ ہیں۔ حاجی خلیفہ اس تفسیر کا ذکر کرتا ہے اور اس کے مختلف حصے یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

تاج التراجم فی تفسیر القرآن للعجم المعروف بہ تفسیر طاہری: از عماد الدین ابو المظفر طاہر بن محمد الاسفراینی المخاطب بہ شاہفور متوفی سنہ ۴۷۱ھ۔ یہ مفسر نظام الملک کے منسوبین میں سے تھے۔

تفسیر زاہدی: از ابو نصر احمد بن الحسن بن احمد بن سلیمان درواجکی (کتاب معانی درواز قی) المعروف بہ زاہدی۔ مصنف کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔ یہ تفسیر سنہ ۵۱۹ھ میں بخارا میں تالیف ہوئی اس کا ہندوستان میں بہت رواج تھا۔ تفسیر بحر مواج[1] از مولانا شہاب الدین بن شمس الدین عمر دولت آبادی کے ماخذ میں شامل ہے۔ علی بن احمد غوری کرشتی کی تالیف کنز العباد فی شرح الاوراد تالیف سنہ ۷۴۷ھ میں اس کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔

تفسیر لبصائر یمینی یا البصائر فی التفسیر: از محمد بن محمود النیشاپوری۔ یہ بہرام شاہ غزنوی (سنہ ۵۱۱ھ و سنہ ۵۵۲ھ) کے عہد کے بزرگ ہیں۔ جب سنجر نے غزنین پر حملہ کا ارادہ کیا ہے بہرام شاہ نے انہی کو سنجر کے دربار میں سفارش دے کر بھیجا ہے اس تفسیر کا ایک قدیم نسخہ نوشتہ سنہ ۶۸۲ھ سید الخطاط علی بن محمد بن احمد الادیب البخاری کے قلم کا بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے ہمیں صرف اتنی تفسیروں کا علم ہے۔ ممکن ہے کہ ہماری تفسیر الہٰی میں سے

---

[1] بحر مواج ابراہیم شاہ شرقی سنہ ۸۰۴ھ و سنہ ۸۴۴ھ کے نام پر معنون ہے عہ یعنی کڑہ مانکپور۔

کسی ایک کا حصہ ہو۔ یہاں اسقدر اور اضافہ کیا جاتا ہے کہ یہ تفسیر پہلی دونوں تفسیروں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی نہ وہ طبری کی تفسیر کا ترجمہ ہے اور نہ پروفیسر براون کی بیان کردہ تفسیر کا ٹکڑا ہے۔ باقی تفسیریں ہماری نظر سے نہیں گذریں اسلئے بحالات موجودہ اس تفسیر یا اس کے مصنف کی شناخت ہمارے لئے دشوار ہے۔

اس نسخہ کی تقطیع ۱۳ × ۹ اور ۱۰ × ۷ ہے اوراق کی تعداد ۲۶۴ ہے۔ ورق ۴۳ و ۸۴ کے دو چھوٹے چھوٹے پرزے علیحدہ علیحدہ خالی کاغذ کے ساتھ چسپاں ہیں۔ فی صفحہ جلی قلم میں ۲۶ سطریں ہیں۔ متن کی آیات اس کوفی خط میں ہیں جو زیادہ تر پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ایران میں رائج تھا۔ جس میں ابتدائی کوفی کی سادگی مفقود ہے اور متاخرین کے تصرف نے حروف کو مبہم اور اُن کی شناخت کو مشکل کر دیا ہے۔ عربی تشریح و فارسی تفسیر کا خط اگرچہ پختہ نہیں ہے لیکن مالیقرا ہے اور تعلیق کی اس ابتدائی شاخ سے تعلق رکھتا ہے جو معاً کوفی سے ماخوذ ہے بالفاظ دیگر کوفی اور تعلیق کے بین بین ہے۔

اس تفسیر میں جن جن راویوں کے حوالے آئے ہیں ذیل میں اُن کے ناموں کی فہرست دیدی جاتی ہے۔

(۱) حسن بصری (۲) وہب بن منبہ (۳) کلبی (۴) ضحاک (۵) امام ابو حنیفہ (۶) یوسف (امام) (۷) محمد بن حسن (۸) امام شافعی (۹) مالک بن انس (۱۰) زفر (۱۱) مجاہد۔ (۱۲) سدی (۱۳) زجاج (۱۴) مقاتل بن سلیمان (۱۵) قتادہ (۱۶) عکرمہ (۱۷) عطائے خراسانی (۱۸) اسمٰعیل سدی (۱۹) واقدی (۲۰) بوصالح (۲۱) قاضی بوعاصم رحمۃ اللہ علیہ (۲۲) خواجہ ابو جعفر مفسر (۲۳) بامنصور ماتریدی (۲۴) خواجہ امام

اس فہرست میں اکثر نام قدیم ہیں۔ پچھلے چار نام ایسے ہیں جو چوتھی صدی یا اس کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی نام کم از کم مصنف کے زمانہ کی

یقین میں ایک حد تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ بامنصور ماتریدی کا مصنف نے ایک حوالہ دیا ہے۔

"وبامنصور ماتریدی رحمہ اللہ گوید" فائدہ اندران کت پسنگ مانند کرو نہ بروٗت ونہ باآھن ازیراک روٗت وآھن ھم باتش نرم گردد اما سنگ دراتش پارہ پارہ شود اما نرم نگردد"

ماتریدی کا پورا نام ابومنصور محمد بن محمود الحنفی المتکلم الماتریدی السمرقندی ہے یہ ماتریدی دبستان فقہا کے بانی اور کئی تصنیفات کے مالک ہیں اور ۳۳۳ھ میں انتقال کرتے ہیں۔ ماترید یا ماتریت سمرقند کا ایک موضع ہے [1]

ایک حوالہ قاضی بوعاصم کا دیا ہے۔ لکھتا ہے۔

"گفت خواجہ امام رضی اللہ عنہ از قاضی بوعاصم رحمۃ اللہ علیہ شنیدم (ل۲۳) تمام کتاب میں صرف اسی مقام پر ان کا نام آتا ہے۔ ایک قاضی بوعاصم سے ہم واقف ہیں۔ ان کا نام محمد بن احمد بن محمد ہے ہرات کے رہنے والے ہیں اور شافعی المذہب۔ فقہ ہرات میں قاضی ابومنصور ازدی سے اور نیشاپور میں قاضی ابوعمر بسطامی سے پڑھی۔ کئی مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ صاحب کتاب الاشراف ابوسعد ہروی نے ان سے حدیث سنی ہے اور روایت کی ہے۔ ۴۵۸ھ میں وفات پاتے ہیں[2]۔ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے مصنف کے قاضی ابوعاصم یہی ہیں یا کوئی اور۔ اگر انہی سے مراد ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ زیر تبصرہ تفسیر کے مالک غالباً امام زاہدی ہیں۔ مگر تفسیر زاہدی ۵۱۹ھ میں تالیف

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

[2] اتحاف النبلا ص۳۶۶ از نواب صدیق حسن خان

ہوتی ہے اور اس تفسیر کی زبان کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا اخیر زمانہ اس کے لئے قرار دینا بظاہر حالات یقیناً ناموزون ہے۔

خواجہ ابو جعفر مفسر کے ساتھ تو ہمارا مصنف ذاتی شناسائی رکھتا ہے۔ کہتا ہے "وز خواجہ ابو جعفر مفسر شنیدیم رحمہ اللہ کہ وی گفتی مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (لو ۲۳)۔

تلاش سے کئی ابو جعفر ہمیں ملتے ہیں مثلاً (۱) ابو جعفر محمد بن جریر الطبری صاحب تفسیر کبیر متوفی ۳۱۰ھ۔ لیکن ہمارے مصنف کو اتنا قدیم نہیں مانا جا سکتا

(۲) ابو جعفر محمد بن عبداللہ بن عمرو الہروی الفقیہ صاحب التفسیر متوفی ۳۸۱ھ[1] یہ ہمارے مصنف کے معاصر ہو سکتے ہیں۔ لیکن محض قیاس ہے۔

(۳) ابو جعفر محمد بن علی۔ یہ غالباً ان بزرگوں میں سے ہیں جو طبری کی تفسیر کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت مترجم کی ہے نہ مفسر کی۔ ان کے علاوہ کئی اور ابو جعفر موجود ہیں لیکن ان سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی اور قیاس آرائیاں بیکار ہیں۔

لیکن مصنف کا سب سے قریبی تعلق خواجۂ امام سے ہے اور ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر خواجۂ امام اُس کے اُستاد ثابت ہوں۔ ان کے حوالے اس تالیف میں متعدد موقعوں پر ملتے ہیں مثلاً ب‌ث ، لع‌۱۱ ، ب‌۱۴ ، لع‌۲۳ ، لع‌۱۳ ایک جگہ لکھا ہے۔ "خواجہ ی امام گفت رضی اللہ عنہ کہ از پیرے سماع دارم از اہل تفسیر رحمہ اللہ او چنیں گفت" (لع‌۱۱) دوسری جگہ ان کی رائے دی ہے "خواجہ ی امام گفت رضی اللہ عنہ شاید بود معنی آیت آن باشد" (ب‌۱۴) وغیرہ۔ یہ خواجۂ امام کون بزرگ ہیں۔

---

[1] طبقات المفسرین از علامہ سیوطی۔

اس سوال کا جواب دینا ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں بہت مشکل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خواجہ امام اور خواجہ ابو جعفر مفسر ایک ہی شخص ہوں۔

یہاں ایک اور امر قابل ذکر ہے۔ ہمارے مفسر ایک آیت "لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ" کی تفسیر میں کہتے ہیں۔

"خَرَاب مَدَائِنِهِمْ قُسْطَنْطِينِيَه وَعَمُّورِيَه وَرُومِيَه گفت ایشان را اندرین دنیا رسوایی‌ها باشد و یات وَ اھمائے بسیار بدان چه مسلمانان ظفر یابند بر بعضی شهرهاء ایشان چون قُسْطَنْطِينِيَه وَعَمُّورِيَه وَرُومِيَه (لعہ ۲۰)

قسطنطینیہ سے مراد یہی مشہور قُسْطُنْطُنِيَه ہے جسے سلطان محمد سنہ ۸۵۷ھ میں فتح کرتا ہے رومیہ سے مراد موجودہ روم دارالملک اطالیہ ہے جسے مسلمان اب تک فتح نہیں کر سکے ہیں۔ عموریہ پر عربوں نے کئی مرتبہ حملے کئے ہیں آخر خلیفہ المعتصم (سنہ ۲۱۸ھ–سنہ ۲۲۷ھ) سنہ ۲۲۳ھ میں اس شہر کو فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے لیکن سلجوقیوں کے عہد تک اس علاقہ پر مسلمانی قبضہ نہیں ہوتا سنہ ۴۷۰ھ میں سلیمان بن قتلمش سلجوقی ارض روم کا پہلا مسلمان پادشاہ بنایا جاتا ہے۔ اس سے ہمیں ایک یہ کمزور قرینہ ملتا ہے۔ کہ یہ تفسیر ایسے وقت میں لکھی گئی ہے جب ارض روم پر مسلمانی قبضہ نہیں ہوا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس کی تاریخ تالیف کو سنہ ۳۳۳ھ اور سنہ ۴۷۰ھ کے مابین حصر کر سکتے ہیں۔

اگر تفسیر کی زبان کو اس سلسلہ میں معیار مانا جائے تو ہمیں کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ چوتھی صدی کے منتصف دوم یا بنظر احتیاط پانچویں صدی کے ربع اول میں لکھی گئی ہوگی۔ اس کی زبان فردوسی کی زبان سے ملتی جلتی ہے اور شاہنامہ کے اکثر الفاظ اس میں نظر آتے ہیں مثلاً فردوسی کا شعر ہے

بہستیش باید کہ خستو شوی ‌‌‌‌‌‌ ‌ ز گفتار بیکار یکسو شوی

یہ شعر حمد میں ہے اور قافیہ میں الفاظ 'خستو' اور 'یکسو' آئے ہیں۔ اب ہمارا

مفسر انہی الفاظ کو با لون زائدہ 'خستون' اور 'سون' کی شکل میں لکھتا ہے ۔ اور یہ یقیناً شاہنامہ کے مقابلہ میں ان الفاظ کی قدیم شکل مانی جاسکتی ہے ۔ شاہنامہ میں حروف زائدہ ۔ اند ۔ بر ۔ مر وغیرہ بکثرت ملتے ہیں ۔ یہی حالت اس تفسیر کی ہے مثلاً 'بہ بیابان اندر رو مت[۲]' ۔ و اندر روی گا د اندر آمد ب[۲] ۔ دست اندر گردن وی اندر آر ب[۲] و اندر سایۂ ایشان اندر آمند ف[۹]'

مثال مر ۔ چہ بودہ است مر ترا الف[۲] ۔ 'خواست کہ مر ورا از راہ ببرد لف[۲]' ۔ مر ورا تلقین کردے لف[۲] ۔ یہ تینوں مثالیں صرف ایک صفحہ سے لی گئی ہیں ۔

لفظ 'سخن' شاہنامہ میں واو کے بغیر آتا ہے اس تفسیر میں واو کے ساتھ ملتا ہے یعنے "سخون" شاہنامہ کا 'رستخیز' و 'رستاخیز' اس تفسیر میں بشکل 'راست خیز' ملتا ہے جس سے ہمارے ان لغات کی بھی تردید ہوتی ہے جو اسے بضم اوّل لکھتے ہیں ۔ شاہنامہ میں 'دہش' واو کے ساتھ ملتا ہے یعنے ۔

بداود دہش یافت این نیکوئی ۔۔۔ تو داود دہش کن فریدون توئی

اس تفسیر میں تنہا 'دہش' ملتا ہے مثال :۔

فرمودیم بیچاست درویشان و بیچارگان نیکو کنند و مر ایشان را دہش دھند (ب) شاہنامہ کے الفاظ انگشتری ۔ گزیت ۔ دیوار ۔ شنبہ ۔ فرشتہ اور ناسپاس ۔ اس تفسیر میں انگشترہ ۔ سرگزید ۔ دیوال ۔ شنبد ۔ فریشتہ اور نوسپاس ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ اختلاف بربنائے قدامت نہ ہو بلکہ بوجہ اختلاف ملک یعنے فردوسی خراسانی لہجہ میں لکھ رہا ہے اور ہمارا مصنف تورانی لہجہ میں[۱]

---

[۱] اس کا ایک قرینہ ہمارے پاس یہ ہے کہ بو علی بلعمی اپنے ترجمۂ تاریخ طبری میں 'فریشتہ' بایائی زاید لاتا ہے نہ فرشتہ چنانچہ :۔ چون شب درآمد خدائے عزوجل یک فریشتہ را بفرستاد و پیش از ان پیغامبری بنام و بودش" مزید بر آن ہندوستانی مخطوطات میں بھی جو تورانی روایات پر قائم ہیں ہم کو "فریشتہ" ملتا ہے نہ فرشتہ ۔

شاہنامہ کے الفاظ۔ سدیگر۔ ونب۔ دانشومند۔ چنان چون۔ ہم چونین۔ ہر دوان۔ آن کجا۔ کیتی،۔ فسوس۔ زفنست نامی۔ دشخوار۔ شارستان۔ فنکفت۔ ایدر۔ نشرند۔ داوری۔ آمنجیدن۔ یکے۔ شان۔ تان۔ ازیرا۔ بجزو۔ پیغولہ۔ نشاختن۔ سردن۔ روز پسین۔ اور گوش بفرمان داشتن وغیرہ عیناً اس تفسیر میں موجود ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ شاہنامہ کا ویژہ۔ ابا۔ ابر۔ ابی رنجای۔ با۔ بر۔ بے۔ ایدون۔ اور اس کی دوسری صورتیں مثلاً ہمیدون۔ ارایدون۔ وایدون اس تفسیر میں مطلق نہیں ملتیں 'ابا' و 'ابر' وغیرہ کے الف زائد کے متعلق ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیئے اسلیئے کہ وہ اس عہد کی نثری تالیفات میں بھی کم ملتا ہے۔

تاریخ طبری پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بلعمی کا یہ ترجمہ اگرچہ ہماری تفسیر کے ساتھ اکثر خصوصیات میں شریک ہے لیکن اسلوب بیان و صفائی عبارت کے لحاظ سے ہماری تفسیر سے بہت بہتر ہے جملوں کا مفعولی ضمیر پر ختم ہونے کا طریقہ جو بلعمی کے ہاں رائج ہے۔ مثلاً "ملک بفرمود کہ اورا بزندان کنید و اورا بزندان کردندش" یا "پس یونس علیہا السلام بلب کشتی شد و خویشتن را بآب اندر افگند خدائے عزوجل آن ماہی را فرمود کہ فرو برش" ہماری تفسیر میں کم ملتا ہے۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ ہماری تفسیر میں ایسا عنصر جس کو قدیم کہا جا سکتا ہے کافی مقدار میں موجود ہے اور اس کو شاہنامہ و تاریخ طبری کے پہلو میں بآسانی جگہ مل سکتی ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس تفسیر کے املا و انشائی خصوصیات کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کریں۔ ہم املا سے شروع کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ زبان کی صرفی خصوصیات پر بھی نظر مارتے جائیں گے

املا و رسم الخط

حروف سے پیشتر ہم اعراب کو لیتے ہیں۔ کوفی خط کے لئے چار مختلف سیاہیوں سے کام لیا گیا ہے یعنے سیاہ۔ سُرخ۔ سبز اور زرد۔ الفاظ کو کالی سیاہی سے اعراب کو سُرخ سے۔ تشدید و جزم و ہمزہ کو سبز سے اور آیت کی علامت کو زرد سے لکھا ہے۔ اعراب کے لئے موجودہ طریقہ سے بالکل مختلف روش اختیار کی گئی ہے۔ یعنے سُرخ سیاہی سے مدوّر مگر جلی نقطے لگائے ہیں۔ مختلف حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کی شکل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ فرق حرف کی سطح سے معلوم ہوتا ہے۔ یعنے اگر نقطہ حرف سے اوپر ہے تو فتحہ مقصود ہے۔ اگر حرف سے نیچے ہے تو کسرہ ہے۔ اگر عین حرف پر ہے یعنے حرف کی سیاہی پر تو ضمہ مراد ہے اور تنوین کے لئے اوپر تلے دو نقطے دیئے ہیں۔ یہ طریقہ سریانی سے ماخوذ بتایا جاتا ہے۔ اور دوسری صدی تک رواج میں نہیں آیا تھا۔ حضرت مالک بن انس متوفی ۱۷۹ھ تلاوت قرآن میں اعراب دیئے جانے کے مخالف تھے۔

جزم کی صورت ایک دائرہ ہے اور تشدید وہی ہے جو آج کل ہے۔ علامت وقف یا آیت بڑے مدوّر نقطے کی شکل میں ہے۔ کوفی کے بعد جو عربی تشریح ہے اس کی حرکات کسی قدر ہماری خط سے مشابہ ہیں۔ فارسی خط میں بعض مشکل الفاظ پر حرکات دیئے گئے ہیں۔ ان میں پیش آج کل کا سا ہونے کے بجائے تقریباً کھڑا ہے اور اُس کی آنکھ بالکل بند ہے۔ مثلاً گُشادہ (ص ۱)، عُلما (ص ۱)، مُداہنت (ص ۱)، گُشتہ (ص ۲)، تُذْرُوْن (ص ۲)، فُرغُول (ص ۶)، موجودہ زیر و زبر کے علاوہ ترچھے زیر زبر بھی ملتے ہیں جو چپ سے راست کے طرف جاتے ہیں مثلاً زیر :- کہت (ص ۱)، دہ (ص ۲)

بستانِ (لعہ)، منکر (مہ)، آبت (مہ)، ترچھا زبر یای مجہول کی علامت کے لئے استعمال ہو رہا ہے مثلاً محت۔ اید۔ بارت۔ حکمت۔ توزیت۔ بودندت۔ آمدندت کروندت۔ دانستید۔ نداریذ۔ دیو۔ پذیرفتہ ایم۔ بگفتید (مت)، نقطہ کی علامت ایک دائرہ ہے جس میں ایک نقطہ موجود ہے۔

اب ہم حروف کا ذکر کرتے ہیں اور الف سے شروع کرتے ہیں۔

(الف)

(۱) الف ممدودہ پر ہمیشہ مد ڈالا جاتا ہے (خط کوفی اس سے مستثنیٰ ہے) مثلاً آنک۔ آن۔ آمد وغیرہ اکثر اوقات مد کے ساتھ الف کا مراطا ہوتا ہے۔

(۲) ایسے الفاظ مثلاً دعوےٰ۔ اسحٰق۔ سلیمان۔ ابراہیم۔ علیہ السلام۔ مصطفیٰ۔ موسیٰ عیسیٰ۔ ہارون۔ تعالیٰ۔ زکوٰۃ۔ لاکن وغیرہ میں الف مطلق نہیں لکھا جاتا اور اس طرح لکھا ہے:۔

دعوی۔ اسحق۔ سلیمن۔ ابرہیم۔ علیہ السلم۔ مصطفی۔ موسی۔ عیسی۔ ہرون۔ تعلی۔ زکوۃ۔ لکن۔

(۳) مرکب الف جس حالت میں کہ وسط یا درمیان میں ہو آجکل کی طرح اس کا حصۂ زیرین پہلے حرف کے جوڑ کے ساتھ مل کر بند نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی نوک سطح سے نیچے اتار دی جاتی ہے جس سے وہ دمدار بنجاتا ہے مثلاً جادوی۔ بینا۔ میان۔ مدیھا۔ بیابند۔ ما۔ جای۔ بمانند وغیرہ اس دمدار الف کا رواج کہا جاتا ہے کہ سریانی سے ماخوذ ہے اور دوسری صدی ہجری سے تحریروں اور کتابوں میں ملنے لگتا ہے اور ساتویں صدی تک برابر ملتا ہے۔ خراسان کا کتابت شدہ ایک مخطوطہ جو سنہ ۴۶۶ھ میں ختم ہوتا ہے اس الف سے خالی نہیں ہے۔ لیکن اسی صدی میں یہ الف متروک ہو جاتا ہے ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دمدار الف کا رواج

ہندوستان میں بھی رہا ہے اگرچہ عام نہیں ہے۔ ۶۵۴ھ کے ایک کتبہ میں جو راجپوتانہ سے تعلق رکھتا ہے یہ الف موجود ہے۔

(۴) الف کثرت وندبہ و دعائیہ کا استعمال متعدد موقعوں پر نظر آتا ہے۔ امثال:۔ گفت بدچیزا کت مر خویشتن را خریدند (ب ۱۳/۱۱)۔ بدا یماناکت ایمان شماست (ع ۱۵/۱)، بدچیزا این کت ایشان خویشتن بدان فروختند (ع ۲۴/۲)۔ گفت بگوی ت مریشان را ای کت جھودو ترسا ہا ای ت شکفتا شما با ما خصوصیت و داوری می ت کنید (ع ۲۱/۱)، برگست بادا ءآن روز مبادا (ب ۲/۱)۔ بشنو کی ت مشنویا (ب ۲/۲)

(۵) اضافت کے لئے الف کے پہلو میں ایک ہمزہ جس کے نیچے دو نقطے ہوتے ہیں لکھی جاتی ہے۔ مثلاً:۔ شہر ہاءِ ایشان (ل ۲/۲)، انبیاءِ خود را (ع ۳۲/۲)، آیتہاءِ دیگر (ع ۳۲/۲)، درہاءِ آں مسجد (ع ۲/۱)

(۶) گاف ایک لفظ میں الف کے ساتھ بدل گیا ہے یعنے گستاخی کو استاخی تحریر کیا ہے۔

(۷) ایشان کا الف از۔ بر۔ مر۔ اندر وغیرہ سے ملنے کی حالت میں گر جاتا ہے:۔

مرشیان:۔ (ع ۳)، (ع ۷)، (ع ۶)، (ع ۷)، (ع ۱۰)، (ع ۱۳)، (ع ۲۲) برشیان:۔ (ع ۷)، (ع ۱۴)، (ع ۱۹)، ب ۷، ب ۸

ازشان:۔ (ع ۱۰)، (ع ۱۲)، (ع ۱۴)، (ع ۱۵)، (ل ۱۶) اندریشان (ب ۲/۱)

ب، پ اور ت

(۱) قدیم زمانہ میں ب اور پ کی تمیز کے لئے عام مخطوطات میں باستثنائے بعض کوئی علامت نہیں ہوتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ علامت اس نسخہ میں موجود ہے [۱]

---

[۱] کتاب الابنیہ میں بھی جس کا ذکر آگے آتا ہے (پ) کے تین نقطے بعض موقعوں پر ملتے ہیں۔

کاتب ب کے نیچے ایک نقطہ اور پ کے نیچے ہمارے عہد کی طرح سے تین نقطے
لگا رہا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ پہلے ایک نقطہ لگاتا ہے اور اس کے نیچے دو نقطے دیتا
ہے جیسے ہم شین کے لگاتے ہیں یعنے :-

پاک - پیدا - پس - پدید - پاداش وغیرہ - مگر حتی الامکان یہ نقطے حرف
کے پہلو میں لگائے جاتے ہیں -

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بجائے تین نقطوں کے ایک شوشہ جو ہای ہوز کے شوشہ
سے ملتا جلتا ہے لگاتا ہے جیسے :-

پرستند - پارسا - پس - پدر - پادشاہی

۲) بای بسیط جو اسم و فعل سے پہلے لائی جاتی ہے اسماء الفاظ کے ساتھ
بالعموم بای فارسی کی شکل میں لکھی گئی ہے مثلاً :-

پدرو - پماند - پزیارت - پگرفتن - پمیان - پتوحید - پخدمت - پمکہ -
پجزیت - پوقت - پخدا ات - پنزد وغیرہ -

افعال کے ساتھ بای موحدہ کی صورت میں ملتی ہے مثلاً :-

بدانید - بدھید - بیابید - بیامد - بنشانم - بماند - بنشستند - بشد - بستد -
بکروند - بنهاد - بشکوند - بگویید - ببندید - بگذاشتند - ببرید وغیرہ - یہ یاد رہے کہ
پہلوی زبان میں بای وصلی کا تلفظ بای فارسی کے ساتھ ہے اگرچہ فارسی میں
بای عربی کے ساتھ بدل گیا ہے تاہم بعض الفاظ میں قدیم تلفظ اب بھی باقی ہے -
مثلاً 'پدید' میں - یعنے پدید مرکب لفظ ہے اور پ اس میں وصلی ہے نہ اصلی -

۳) بای زائدہ نون نفی سے مقدم آتی ہے :-

گفت تا یوسف او ببر زر ندهید بند هم (ب)

۴) ہمارے ہاں قاعدہ ہے کہ بای بسیط اسم و حرف کے ساتھ ہمیشہ

مفتوح ہوتی ہے۔ فعل کے ساتھ اگر مضموم الاول ہے مضموم ورنہ مکسور بولی جاتی ہے۔ ایرانی اسم و فعل میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہمیشہ مکسور بولتے ہیں۔ اس نسخہ میں بعض افعال کے ساتھ مضموم ملتی ہے مثلاً :۔

بُبِرَد (۲۸ب)، بُرَنجشَدی (۵۲ت)، بُباش۔ بُباش (۵۳ب)۔

۵) نوشتن کو ہمیشہ نبشتن لکھا ہے۔

۶) 'ت' ایک لفظ میں 'ط' سے بدلی ہے یعنے تلخ کو طلخ لکھا ہے اور

۷) بعض لفظوں میں حذف ہو گئی ہے یعنے سخت تر کو سختر لکھا ہے :۔

کفت دلهای شما جون سنکهاست یسختی نی چه از سنکها سختر وی آب تراود (۲ د)

ج اور چ

۱) ج اور چ میں بھی ب اور پ کی طرح وہی علامت فرق بعینہ موجود ہے

۲) الفاظ آنچه۔ ازانچه۔ اینچه۔ ازیراچه۔ هرچه۔ هرانچه۔ بدانچه۔ بدینچه کو آنج ازانج۔ اینج۔ ازیراج۔ هرج۔ هرانج۔ بدانج۔ بدینج لکھا گیا ہے۔

۳) تنہا 'چه' کو 'جت' یا 'چه' لکھا ہے۔

د اور ذ

د اور ذ کے متعلق اہل توران و ایران کا اختلاف اس سے قبل مذکور ہوچکا ہے محقق طوسی لکھتے ہیں :۔

آنانکه بپارسی سخن میرانند | در معرض دال ذال ننشانند
ماقبل وی ار ساکن و جز وای بود | دال است وگرنہ ذال معجم خوانند

اس لحاظ سے یہ نسخہ تورانی روایات کا مقلد ہے۔ مگر بعض افعال میں ذال معجمہ

ملتی ہے لیکن ایسے افعال کی تعداد بہت کم ہے مثلاً :-

رسذ (م ب ۲۱)، باشذ (م ب ۲۲)، شذم (م ب ۲۳)، بوذ (ل ع ۲۶)، آیذ (ل ع ۲۷)، نشوذ (ل ع ۲۸)، پوشیذه (م ت ۳۰)، برخیزذ (ل ع ۳۱)

لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے اور ایسے موقعے بہت ہیں جہاں یہی افعال دال مہملہ سے تحریر ہوئے ہیں۔ اس نسخہ میں تورانی روایات کی شدید پابندی اس امر سے ظاہر ہے کہ مصادر پذیرفتن و گذشتن اور اُن کے تمام مشتقات کو بلا استثنا دال مہملہ کے ساتھ لکھا گیا ہے چنانچہ

پذیرفتن :- بپذیرفت (ل ع ۲۴)، بپذیرفتن (ل ع ۲۴)، بپذیر۔ پذیرنده - بپذیرفت - بپذیرفتن (ل ع ۳۸) بپذیرد (ل ع ۴۳) پذیرد - نپذیرد (م ت ۴۳) ۔

گذاردن :- بگذاریم - گذارد (ل ع ۲۵) گذارد - بگذاریم (م ت ۲۵) بگذارید (ل ع ۲۷) گذاشت (ل ع ۲۹) بگذارد (م ت ۲۹) بگذارم (م ت ۳۴) اندر گذشت - مت بگذاری (ل ع ۳۷) درگذاشت (ل ع ۳۸) گذشتند (م ت ۳۹) فرو گذارد - گذشتند (ل ع ۴۲)

ر۔ ز اور ژ

جب یہ حرف کوئی کاف و گاف کے ساتھ ملتے ہیں تو ان کو واو کی شکل میں لکھا جاتا ہے اور فرق یہی رکھا جاتا ہے کہ واو کی گھنڈی کھلی رکھی جاتی ہے اور ان کی گھنڈی بند ہوتی ہے :-

گروه (گروه) دیگر (دیگر) گوارنده (گوارنده) گویند (گویند) وغیرہ

(۹) زمانۂ حال کی طرح سے ان میں علامت شناخت موجود ہے۔

(ب) دوزخ کی 'ز' کو 'ژ' کے ساتھ بدل کر ہمیشہ دوژخ لکھا ہے۔ یہ خصوصیت غالباً غزنین و ماوراءالنہر کے ساتھ وابستہ ہے اور ان کی تقلید میں ہندوستان

میں بھی رائج رہی ہے اور آٹھویں اور نویں صدی کے مخطوطات میں بکثرت ملتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ جب مغلوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا ہے اس وقت متروک ہوئی ہے

س اور ش

(۱) خاقانی کا ایک شعر ہے :-

بہ بستم حرص را چشم و شکستم آز را دنداں   چو میم اندر خط کاتب چو سین در حرف دیوانی

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی کے وسط میں بند میم اور لمبے سش کا رواج موجود تھا۔ اس نسخہ میں دونوں سین دندانہ دار ہیں اور لمبا سین کہیں نظر نہیں آتا۔

(ب) لفظ "کاشکے" ایک سے زیادہ مقام پر سین مہملہ سے لکھا گیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ چھوٹے سین سے بھی بولا جاتا تھا۔

ف اور ق

(۱) ف اور ق کی گھنڈی کی آنکھ ہمیشہ کھلی رہتی ہے خواہ لفظ کے شروع میں ہوں یا وسط اور آخر میں۔

(ب) ف پر یوں تو ایک ہی نقطہ ہوا کرتا ہے لیکن ایسے موقعے بھی ہیں جن میں اس پر تین نقطے لگائے گئے ہیں مثلاً لفظ فام بمعنی دام میں :- چھارم بی ثامت (ل ۹) - اور افزودن میں :- کت آن مرد را غم افزاید (ل ۳) علیٰ ہذا افگندن اور اس کے مشتقات میں :-

بر ... از درہای آن مسجد برو و بیفگند (ل ۲) ھنوزش یکا اندر نیفگنده اند (ب ۳) و بمیان راه خویشتن بیفگند و نالیدن گرفت (ل ۴) شبی مرد را بکشت و او را بجای بُرد و میان قوم بیفگند و روز دیگر دست بگریستن برد (ل ۵)

ایزد تبارک وتعلق شبہ عیسیٰ علیہ السلم برای مہتر جہودان برافگنند
(ب ۱) ایزد تعلق شبہ عیسیٰ بردی افگنند (ل ۱۲) گفت ہیچ کس از پیغامبران
راصلوت اللہ علیہم از یک و دیگر جدا نیفگنیم چنانکہ جہودان افگنند و ترسائن (ب ۲۲)

ہمارے لئے یہ ایک معما ہے کہ افزودن۔ افگندن اور فام میں فے پر تین تین نقطے کیوں لگائے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے اس کی صوتی خصوصیت کا اعلان مقصود ہو۔ ایک بات ہمیں معلوم ہے وہ یہ ہے کہ ان تینوں لفظوں میں فے واو کے ساتھ بدل جاتی ہے اور وہ وام۔ اوزودن اور اوگندن بن جاتے ہیں۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ 'ف' پر اختلاف نقاط کوئی رسم الخط کی بنا پر ہے یہی اصول غالباً 'گ' اور 'ی' میں بھی کام کر رہا ہے۔

ک اور گ

(۱) کاف بیانیہ وکامیہ وغیرہ ہمیشہ 'کت' لکھا جاتا ہے اسی طرح 'ہرکہ' کو 'ہرکت' لکھا ہے لیکن جب دوسرے الفاظ کے ساتھ ملتا ہے مثلاً آنکہ۔ بدانکہ۔ ازانکہ۔ ازیراکہ وغیرہ تو آنک۔ بدانک۔ ازانک اور ازیراک لکھا جاتا ہے۔ متعدد موقعوں پر ازیراکت بھی ملتا ہے۔

(ب) 'ک' اور 'گ' میں توران و ایران کا اختلاف اس سے پیشتر بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اور ایسے الفاظ دیئے جاتے ہیں جنہیں تورانی تلفظ کے ماتحت لکھا گیا ہے۔

برکست (ب ۲) بجای برگست۔ جادوانکی (ف ۲۸) بجائے جادوانگی۔ خاصکی (ل ۱۵) بجای خاصگی۔ خوردکی (ل ۸) بجائے خوردگی۔ شکفت (ف ۲) بجای شگفت کیسو (ل ۳۵) بجائے گیسو۔ نکوسار (ف ۲۳) بجائے نگونسار۔ مژدکان (ف ۱۲) بجائے مژگان

کیسو بمعنی موی جعد اگرچہ لغات میں نہیں ملتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ مستعمل ضرور رہا ہے اس لئے کہ فرہنگوں میں کیسو ایک دوائی کا نام بتایا گیا ہے جس کو عربی میں جعدہ کہتے ہیں۔ پس اگر کیسو استعمال میں نہیں آرہا تھا تو جعدہ کا ترجمہ گیسو کیا جاتا نہ کیسو اور جب اس کو کیسو کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کیسو بمعنی گیسو ضرور مستعمل رہا ہے۔ ہندی زبانوں میں بھی 'کیس' ہی آتا ہے۔

(ج) گاف پر معمولاً دو نقطے لگائے گئے ہیں۔ یہ نقطے اس کے مرکز پر دیے جاتے ہیں مثلاً:-

گفت۔ گردن۔ گیرد۔ دیگر۔ بگرفت۔ گاو۔ نگوند۔ سنگ۔ بزرگ۔

جب کوئی کاف جس کا مرکز سمٹا ہوتا ہے لایا جاتا ہے اس وقت اس پر تین نقطے لگائے جاتے ہیں امثال:-

اڭر (اگر)، دیڭر (دیگر)، ڭوید (گوید)، مرڭ (مرگ)، ساڭی (ساگی)، بڭیرند (بگیرند)، ڭفته (گفتہ)، ڭو دانید (گروانید)، افڭند (افگند)، ڭرویم (گرویم)، آنڭه (آنگہ)،

کوفی اور غیر کوفی گاف میں یہ فرق ناقابل تشریح رہتا ہے سوائے اس کے کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ موجودہ مخطوطہ میں دو مختلف روایات کا اجتماع ہو گیا ہے اور کاتب نے دونوں کو برقرار رکھا ہے۔

نویں صدی کے بعض مخطوطوں میں جو ہندوستان میں لکھے گئے ہیں گاف کے نیچے خال خال موقعوں پر تین نقطے دینے کی رسم تھی خصوصاً غیر مانوس الفاظ پر جو ہندی زبان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابو منصور موفق ہروی کی کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ میں بھی جس کا ایک نسخہ نوشتہ سنہ ۴۴۷ھ بخط اسدی طوسی شاعر مشہور ویانا میں موجود ہے بعض وقت گاف کے نیچے تین نقطے ملتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ گاف کے ساتھ نقطوں کا رواج قدیم سے ہے۔

ل

ایک لفظ میں رے کو لام سے بدلا ہے یعنے دیوار کو دیوال لکھا ہے مثال :-

چون دیوال بلند شد اسمعیل بر مقام بیستاد ی ت (ال ۳۶)

م

(۱) خاقانی کے شعر مذکورۂ بالا سے یہ قرینہ ملتا ہے کہ ان ایّام میں میم کی آنکھ بند کرنے کا بھی دستور تھا لیکن اس مخطوطہ میں یہ آنکھ ابتداء، وسط اور آخر میں ہمیشہ کھلی رہتی ہے اور کبھی بند نہیں ہوتی -

(ب) ایک لفظ میں "میم" "بے" کے ساتھ بدلا ہے یعنے فریبانیدن کو فریمانیدن (ال ۱۹۱) لکھا ہے -

ن

(۱) بعض الفاظ میں ایک نون زائد آخر میں ملتا ہے یعنے "خستو" اور "سو" کو "خستون" اور "سون" لکھا ہے -

خستون :- ناخستون شدند مگر کتابی کت جز از توریت بود (ب ۱۳)

سون :- بعضے گویند تا بمکہ بود ہم بران سون نمازش فرمودہ بودند تا فرق بودی ت میان او و میان کافران مکہ (ت ۴۲)

(ب) لفظ "جوان مرد" کو نون کے ساتھ بھی لکھا ہے اور نون کے حذف کے ساتھ بھی :-

این جوامرد رفت بیابان کوہ شد و خداوند را تعلق بخواند (ب ۲)

و

(۱) اول آخر اور وسط میں 'واو' کی گھنڈی ہمیشہ کھلی ہوتی ہے بلکہ مرکب ہونے کی حالت میں 'واو' اور 'رے' کی شناخت میں یہی فرق ہے کہ 'واو' کی گھنڈی کھلی ہوتی ہے اور 'رے' کی بند ہوتی ہے۔

(ب) ایک لفظ میں 'ف' سے بدلی ہے یعنے وام بمعنی قرض کو فام لکھا ہے۔

(ج) 'سخن' کو اکثر اوقات 'سخون' کی شکل میں لکھا گیا ہے :-

: ایشان مت دانستند کت آن سخون خداوند است عزوجل ایشاں آنرا بدل مت کنند (۶ ب) وگویند کت این ویل سخوفت است کت کست را گویند کت اوت اندر هلاکت افتاده باشد (۶ ب)

(د) یہی حال امید کا ہے جسے اومید بھی لکھا گیا ہے۔

(ہ) ذیل کے الفاظ میں 'واو' کی تخفیف واقع ہوئی ہے۔

خشندی (۲۰ ب)، (۳ ب)، (۳۳ ب)؛ خرسند (۳۲ الف)، (۳۶ الف)، خرود خورد (۲ ب)، خرو کی (۵ ب)

ہ

(۱) لفظ کی ابتدا اور وسط میں ہای دوچشمی کے سوا کوئی اور ہے شوشہ دار یا بے شوشہ نظر نہیں آتی۔ آخر میں حسب معمول ہای مدور 'ہ و ہ' ملتی ہے۔

(ب) ایک لفظ میں دال سے بدل گئی ہے یعنے شنبہ کو شنبد اور یک شنبہ کو یک شنبد لکھا ہے۔

(ج) ایک لفظ میں حذف ہوگئی ہے یعنے گواہ کو گوا لکھا ہے۔

(د) ایک جگہ 'ی' کے ساتھ بدل گئی ہے یعنے ماہ کی جمع 'مایگان' بنائی گئی ہے۔

(ہ) اضافت کی صورت میں 'ہ' کے بعد ایک ہمزہ یا یوں کہو کہ ایک کٹی 'ی' جس سے دائرہ کا اکثر حصہ خارج ہے لکھی جاتی ہے اور نیچے دو نقطے لگا دیئے جاتے ہیں۔ نقطوں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرف ترجیحاً بہ نسبت ہمزہ کے 'ی' کہلانے کی زیادہ اہلیت رکھتا ہے۔ بہرحال اس کی یہ صورت ہے "ۓ" امثال :-

خانہ ۓ تو (ص[illegible]) پرورندہ ۓ ما (ص[illegible]) نمونہ ۓ (ص[illegible]) صیغہ ۓ مجہودی (ص[illegible]) قبلہ ۓ خود (ص[illegible]) خواجہ ۓ امام (ص[illegible]) ھدیہ ۓ خدای ت (ص[illegible])

اسدی کے نسخہ میں یہ صورتیں ہیں :- اورندہ ۓ - راندہ ۂ - واندہ ۓ

۶

(و) ہمزہ کو فی خط کے دائرہ سے تقریباً خارج ہے۔ بعض جگہ ہے تو کبھی اس کو سبز دائرہ کی شکل میں دکھایا ہے اور کبھی معمولی ہمزہ کی صورت میں۔ عربی حصہ میں البتہ ملتی ہے لیکن اعراب کی طرح ہے بعد میں لگی ہے۔ فارسی حصہ میں اکثر نہیں ملتی لیکن ایک ہمزۂ معکوس ہے جو یای ایمائی وغیرہ پر بعض جگہ ملتی ہے میں اس کو ہمزۂ معکوس اس لیئے کہتا ہوں کہ درحقیقت وہ معکوس ہے - اس کی بعض مثالیں یہاں دیجاتی ہیں

بیحصان کردند آن گوایت کت خداوند را اندلت. بوذ (ص[illegible]) میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ 'گوائ ای' بولا جاتا ہوگا۔

اہت کت یکت گویانیم و بیکی پرستندگانیم (ص[illegible]) اگر جدا نست کت تو بر من نشستی (ص[illegible]) یکت گویانیم و یکی پرستندگانیم (ص[illegible])

امّا این زشت نامی(۲) باشد کت برمانشیند۔ (ف۳)، واندران دریا ماهی(۲) بود است (ف۱)، ماهی(۲) برکنارهٔ آب پدید آمد (ف۲)، حسد جوششی بود اندر دل کت پدید آید بسبب نیکوئی(۲) کت، یاری از آن کست را پدید آید (ف۲)، عرابی(۲) یکی ما برسد (ف۲۹)،

(ب) ذیل کے الفاظ سے ہمزہ قطعاً ترک کر دی گئی ہے۔

جبریل۔ میکایل۔ (ف۱۹)، اسرایل (ف۲)، داود (ف۱)، مسلہ (ف۲)،

ی

(۱) وسط اور ابتدا میں آنیوالی "ی" نیز لمبی "ے" کے نیچے حسب معمول دو نقطے ملتے ہیں۔ ادھر آخر میں آنیوالی دائرہ دار "ی" کے پیٹ میں نقطے لگائے جاتے ہیں۔ اس خصوص میں کاتب کوئی رسم الخط کی پابندی کر رہا ہے۔ چوتھی اور پانچویں صدی کے قرآنوں میں یہی قاعدہ دیکھا جاتا ہے اور فارسی رسم الخط میں یہ قاعدہ دیر تک باقی رہا ہے۔

(ب) یائے معروف کی شناخت کے لئے کوئی خاص علامت نہیں۔ یای مجہول پر البتہ کھڑا زبر ملتا ہے جس کا پیشتر ذکر ہو چکا ہے۔ بعض امثال:۔

نصابی۔ گردانیده ایذ۔ یافته ایم۔ رسولی۔ دارنی۔ باری۔ شکیبایذ گیروی۔ ایستیذ۔ مونیم۔ وعونی۔ بدانمی۔

(ج) فارسی میں قاعدہ ہے کہ جن الفاظ کے آخر میں الف یا واو ہو یای الحاق لانے سے پیشتر ایک ہمزۂ مکسور زائدہ اضافہ کر دی جاتی ہے شلاً دانائی اور بیناسئے وغیرہ۔ نسخۂ ہذا میں اس ہمزہ کی جگہ دی ملتی ہے۔ مثالیں:۔

یائے مجہول:۔ جایی (م۲۳ب)، کارهایی (۲۵ب)، چیزهایی (۲۶ب)، معجزاتهایی (ف۱۴)، بنایی (م۲۶ب)، شارستانهایی۔

یائے معروف:۔ نیکویی (م۲۴ب)، کویی (ف۲۵)، پادشایی (م۲۶ب)،

نمایت (د ۲۶)، ترسایت (ر ۲۱)، توایت (ر ۲۳)، بخدایت (ل ۱۴)

(د) ایک لفظ میں (ہ) کے ساتھ بدلی ہے یعنے انگشتری سے انگشتیرو (ب ۱۷)، (ب ۱۹)؛

(ہ) کتب صرف میں ایک یای استمرار کا ذکر آتا ہے جو کسی فعل کی مداومت کے اظہار کے لئے ماضی پر اضافہ کردی جاتی ہے۔ مثلاً ؎

گرفتے کمر بند زور آزمائے   وگر کوہ بودے بلندی زجائے

اس کا نام اہل صرف نے ماضی شرطیہ یا تمنائی رکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ استمرار کا افادہ بھی کرتی ہے اور اس کے صرف تین صیغے بتائے ہیں یعنے واحد و جمع غائب اور واحد متکلم۔ لیکن یہ ایک نہایت ناتمام بیان ہے۔ اس تفسیر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یای استمرار کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہے وہ نہ صرف ماضی شرطیہ کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ اکثر افعال کے ساتھ آتی ہے مثلاً

ماضی بعید و ماضی استمراری اور مضارع۔ میں ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتا ہوں۔

ماضی شرطیہ:۔ اس کے ہیں دو نئے صیغے ملتے ہیں یعنے واحد حاضر اور جمع متکلم۔ امثال:۔

اگر بجاءت جبریل بنزد تو میکایل آمدےت ما تو گرویدیمےت (ل ۱۹)

تو بندگےت نوح ہیچ پیغام بما نرسانید اگر رسانیدےت بگرویدیمےت (ل ۲۳)

گادبسخون آمد گفت اگر چنانست کےت تو برمن نشستےت ہرگز مرا ندیدےت (ب ۴)

گفتند اگر تو پیغامبر بودیےت راستی سخونہاےت تو در دل ما جاگیردےت (ب ۱۴)

ماضی بعید:۔ و آنچ از دانشومندان خویش شنیدہ بودندےت بعضی با مومنان بے گفتندےت (د ۔۔)

ماضی استمراری :- سرش بآسمان می‌سودی و آواز تسبیح فرشتگان می‌شنیدی (ب ۳۶)

چون سلیمان علیه السلم ازوی غایب شدی او آنرا می‌پرستیدی بجای بتی (ص ۱)

مضارع :- و آرزو برد هریکی ازیشان کی بزیدی هزار سال (ص ۱۵) اگر شما مومنیدی این چنین نکنیدی (ب ۱۵)

گفت اگر ایشان راستی بدانندی کی ایشان را ازین جادوی چه زیان خواهد داشت نگرویندی بجادوی را و بنا مرزندی (ص ۲۴)

گفت اگر ایشان کی جهودانند بگروندی بمحمد صلی الله علیه وسلم و بکتاب او و بکتابهای دیگر و بپرهیزندی از شرک ایشان را از خدای عزوجل پاداش به ازین جادوی باشدی و آنچ بر جادوی می‌یابند اگر بدانندی کی چنین است بگروندی (ص ۲۴)

روزی عمر خطاب گفت رضی الله عنه این مقام پدر ماست چه باشدی کی ما این را چون قبله سازیمی و امام پیش او ایستدی (ص ۳۵)

گفت مرا می‌کراهیت آید با جهودان موافقت کردن اندر قبلهٔ بیت المقدس خوامی کی خداوند تعلی مرا فرمان دهدی تا بسوی قبلهٔ پدر خویش ابراهیم علیه السلم نماز کنمی (ب ۴۲)

ایک مثال تاریخ طبری سے دی جاتی ہے۔

گفت کاشکی قوم بدانندی که خدای تعالے مرا باین آمرزید که آن پیغامبران را متابع شدم تا ایشان نیز متابع شوندی (از ذکر حبیب نجار)

فردوسی ؎ اگر مرگ کس را نیوباردی ز پیر و جوان خاک بسپاردی

نظم میں تو اب بھی مستعمل ہے میرزا غالب ؎

دل چو بجوش آیدی عذر بلا خواستن ‌ ‌ ‌ جان چو بیاسایدی شکوہ ز غم داشتن

حال :- ورنگ آن گاو زرد ست نگادیت سخت؛ زرد چنانگ گویی از رنگ موت وت آفتاب مت برخشدیت (الف۲)

اب ہم اور امور کا ذکر کرتے ہیں جو زیادہ تر صرف سے تعلق رکھتے ہیں -

جمع

(۱) موجودہ طریقہ میں جن الفاظ کے لئے بغرض جمع 'یان' آتا ہے اس تفسیر میں 'آن' لایا جاتا ہے - مثلاً دانا کی جمع 'دانایان' کے بجائے 'دانا آن' ہے - مثالیں :-

.چون این نادانان ہنرد دانا آن خود باز آمدندیت آن دانا آن مر ایشان ملامت کروندیت وگفتندیت (ب۶)

دعا کرویت ایزد تعلی بیمار آن را درست گردانیدیت ونابینا آن را بینا گردانیدیت و مردگان را زندہ گردانیدیت (ب۱)

.جھودان با ترسا آن خصومت کردند گفتند ترسا آن کس نیند و دین ایشان نہ دین حق ست و اندر بہشت نشود کس جز ما کت جھودانیم و ترسا آن ہم چونین گفتند مر جھودان را (۱۲۸) ای کت بیدادگران فرزندان ترا امام پارسا آن نکنم (۱۲۴)

(ب) 'گان' کے ساتھ یعنے :- گزیدگان - گرویدگان - فریشتگان - سفلگان - بندگان - دایگان - بچگان - یاد کنندگان - نبیرگان - پیشینگان - بیچارگان - مردگان - مژدگان - مادرگان - پدرگان - پیش روندگان - پایگان -

(ج) 'ان' کے ساتھ :- نماز کنان - جھودان - دیوان - خلقان - گناھان - فاسقان - بت فرمانان - دوستان - امتان - مومنان - مخلوقان - فرزندان -

انجیل خوانان ـ بتان ـ کافران ـ بدان ـ مغان ـ مشرکان ـ خاربنان ـ پیغامبران ـ درویشان ـ سوگندیان ـ زیانکاران ـ

(د) 'ها' کے ساتھ :- درها ـ کسها ـ آسمانها ـ تباهیها ـ نیکوییها ـ نمازها خواستها ـ مسجدها ـ پارساییها ـ رکنها ـ نیزکها ـ جادویها ـ بنشتها ـ نعلینها بیهدها ـ اور جمع الجمع عجایبها ـ معجزاتها ـ

(ہ) بعض اوقات صفت بھی اپنے موصوف کے ساتھ جمع میں آتی ہے یعنے :-

ناپاکان بت پاکان (لعـ) ، بیهدهای ترفندها (لعـ)

فاسقان بی فرمانان (ر) ، زبان زدگان شکوفان (لعـ ۲۳)

ضمائر

هر بدی بجنبیدش (لعـ ۳۷) بهتر الیشان هر سیرش مریشان را (ب) ، چنان کش بایست خورد (ر ۳۷) ، مرورا از مملکتش (لعـ ۱۷) ، اگر آیند بگیرندش و کشند (لعـ ۳) ، آنچ فرمودش خداوند تعالی (مـ ۳۲) هر فرزندش برخاست (مـ ۳۲) پرسیدش (لعـ ۱۴) ، حرامست بروی کت اوی امام مسلمانان گرود (لعـ ۳۴) ، و بدو ت بگروید (ر ۱۴) ، دل من در وی بسته است و بت وی بمت تسکیبم (لعـ ۱۱) واوی از آسمان جز عذاب نیارد (لعـ ۱۹) ، باز گرویداز دین اوی واندر دین ما اندر آیید (لعـ ۲) ، فرمان بردار توند (ر ۴۳) ، نه من دوست توم (مـ ۲۸) ، حُذَیفه جواب داد کت الله خداوند من است و محمد رسول منست و قرآن امام منست (لعـ ۲۰)

شان اور تان لفظ ماقبل کے ساتھ ملا کر لکھے جاتے ہیں :-

اگر دشمنیشان با جبریل ازین جهت است (لعـ ۱۶) این همه کت کروند ازان کروند کت حسدشان آمد و رشکشان آمد (لعـ ۱۳) ، و این هم بدرا نشان کرده بودند (مـ ۱۴)

ومذالبشان مت کنند (ف ۲۲) بدین جهد ویشان اندر نکرد یا دین حنیفی (ت ۳۹) هر بادی کت بامشرکا نشان کارزار بودی (ل ۱۳) واندکیشان برخورداری وهم اندرین ونیا (ل ۳۶) ورمغانشان نیز بر زندگانی حریص تر یابی (ت ۱۵)

شکفتشان نیاید از خود (ل ۱) این بنان که پدرانشان مت پرستند (ت ۳۹) معیشتشان چگونه است (م ۳۲) حال معیشتشان چگونه است (ل ۳۵) واز جای ... برکنیدم کوهی بر مقدار شکر گاهشان (ب ۴) اندر دلشان این مقدار خرد نیست (ب ۶) بی ازانک شمارا مکافات بدیهاتان بدعد (ل ۴۲) بداسچتان فرموده شد (ل ۳)

ستان' واحد و جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

حروف

مر:- بکثرت لایا جاتا ہے اور اکثر زاید آتا ہے ذیل کی مثالیں صرف ایک ورق سے لی گئی ہیں:-

دو عمزاده بود مرورا درویش (ل ۵) وجزدی مرورا میراث خواری بنود شبی مرورا بکشت (۵ ل)

ایزد تعلی بفرمود مرایشاں را (ل ۵) خبرده مارا کی مر ترا کی کشته است (ب ۵) ومرورا ازان میراث او هیچ نه ده (ف ۵)

ای کی پنهان کشتید مر عامیل را (ب ۵) گفتیم بر زبان موسی علیه السلم مرشمارا کی مران کشته را بیک اندام گاو بزنید (ف ۵)

اندر:- بی آنک اندر وین او خلل اندر آید (ل ۱۹) وآن زن آن را بخانه اندر بنهاد و جامهای بدر خویش اندر وی پوشانید (ل ۱۸)

تا اندر کودکی اندر خانهٔ توبت پرستید ندی (ف ۱۸) وهرباری کی

سلیمن علیہ السلم بآب خانہ اندر شدی ت (ب ۱۹) این گفت گوی ت اندر میان مردمان افتاد (ب ۹)۔
این، مهتر اندر خانہ؛ عیسی ت اندر آمد (ب ۱۱) و دستی ت را کت زیر بغل اندر آوردی ت ازان
نوری ت ساطع شدی ت (ب ۱۱)

بر ۔ حسبتی کی ت و مرا برین گاو برنشانی ت (ع ۴۲) اندر ها برآمد (م ۴) برنشین
برمن (ب ۴۲) ایزد تبارک و تعلی شبہ عیسی ت علیہ السلم بر ان مهتر جهودان برافگنند (ب ۱۹)،
بر بمعنی با :۔ وکس را بر و نشانی ت و بی ت فرمان من آنرا برکس نفروشی (م ۳۰) مارا
بروی ت دشمنی ت ازین جهت افتاده است (ع ۱۶)

بر برای تقابل :۔ فردا بنزد من آی ت تا ترا یاری ت دهم بر شوی ت تو (ع ۲۲)
را :۔ وای ت دیل بریشان مرین جهودان را بدان سبب کی ت نام پیغامبر را
صلی اللہ علیہ وسلم ونشان او را اندر توریت برگردانیدند (ب ۴)، خداوند را تعلی بخواند
(ب ۳) بخواند خداوند را تعلی (ع ۴) پاکی مر خدای ت را تعلی (م ۳۰)،

را :۔ برای اضافت :۔ وخواست او راست جل جلالہ (ع ۵) عیسی ت را
دل از بهر وی ت بسوخت (ب ۱) عیسی ت را دل بروی ت تنگ شد (ع ۱۱)
را بمعنی از :۔ و مرکت ازیشان این زن را جدا بجدا پنهان ازیار خویش وعده
نهاوند (ع ۲۲) آن زن را دست باز دارد (م ۲۲؟) دعا کرد خداوند را تعلی (ع ۱۱)

جب بدل و مبدل منہ کسی جملہ میں آتے ہیں را دونوں کے ساتھ لایا جاتا ہے۔ امثال :۔
گفت بداویم مرعیسی ت را پسر مریم را علیهما السلم نشانیها ی ت. براستی پیغامبری ت
(ب ۱) عیسی ت مرحواریان را گفت یاران خویش را (ب ۱۱)، هم چنان کی ت ایزد تعلی
مرین کشتہ را عامیل را پس از کشتن زنده گردانید (ب ۵)، اندرز کرد مر فرزندان خویش را
اسمعیل و اسحق و مدین و مدیان را (ع ۳۹)

حذف را :۔ نخواستند کی ت آن بخرند (ع ۵)؛ چون این نادانان بنزد دانا آن خود

باز آمدندی آن دانا آن مریشان ملامت کردندی (ب۶) اور خویشتن کے ساتھ اکثر محذوف ہوا ہے۔

بمیان راہ خویشتن بفگنند و نالیدن گرفت (لع۲) ابلیس چون بشنید خویشتن ازمیش دی ناپدید کرد و برفت (لع۴) ابلیس خویشتن بمانند مرغی برساخت (ب۴) من خویشتن بشناسندھم (لع۲۲) بد چیزا این کی ایشان خویشتن بدان فروختند (لع۲۴) جبریل علیہ السلم خویشتن آشکارا کرد و بدو نمود (ب۳۷)

از اور اس کے مرکبات :- بی از انک از کسی آموختہ باشد (ب۳۱) بی ازانک ایشان را آزمودند (ب۲۶) بے ازانک بریشان کشتن واجب آمد (لع۱۴) نیست مر شمارا یا بندگان جز از خدای عزوجل کسی کی شغلہای شمار است آرد (ب۲۶) تا جز از بنی اسرائیل زنی بزنی نکند (لع۱) ناخستون شدند ہر کتابی کی جز از توریت بود (ب۱۳) و آدرد از خداوند تعلی بسوی شما معجزاتہائی کی آن جز از آمارات پیغامبری نباشد (لع۱۴) ازپس آن کی موسی علیہ السلم از شما غایب شد (ب۱۴) ازپس ازان پیروزگاری این مرد بسوی عیسی روان آمد (لع۱) گفت ازپس مرگ موسی علیہ السلم یک ازپس دیگر پیغامبران فرستیدیم۔

باز :- آن بہاد جمال باز بدو باز آمد و لشکر ہنرواد گرد آمدند و باز بمملکت خویش باز رسید (لع۲۱)

کی تا :- این کس ماخواست کی تا او را بکشد جبریل او را برہانید (لع۱۶) با این جھودان و ترسا آن عہدی و پیمانی بستہ آید کی تا بگروند بدین پیغامبر (ب۱۹) ایزد تعلی مرسلین را علیہ السلم فرمان چنان دادہ بود کی تا جز از بنی اسرائیل زنی بزنی نخواہد (لع۱)

اُو :- استفہامیہ ہے اور سوال کے وقت جملہ کے شروع میں لایا جاتا ہے :-

گفت او هر بارت ک یا این جهودان و ترساآن عهدت و پیمانت بسته آید کت تاگروند بدین پیغامبر آخر الزمان همت گروشت از یشان آن فرمان را بجاکت مانند وآن پیمان را شکنند (ت۲) گفت یا جهودان او هر بارت کت بسوی شما از من رسولت فرستیده آید و پیغامبرت آید کت آن شریعت او با شریعت شما موافق بنیاید و با شما بمراد شما کار نکند ایشان را کشتن گیرید و دروغ زن کردن گیرید (ط ۱۲)

یہ 'او' قدیم تفسیروں اور کلام پاک کے ترجموں میں بکثرت ملتا ہے اور عربی کے استفہامیہ 'أ' اور 'ہل' کا ترجمہ ہے۔ ابتدا میں 'او' کی شکل میں ملتا ہے بعد میں 'آ' یا 'ا' رہ گیا ہے۔ چونکہ کتب لغات میں اس کا ذکر نہیں آتا میں چند مثالیں ایک قدیم ترجمۂ قرآن سے لے کر یہاں نقل کئے دیتا ہوں:-

أَتُرِيدُونَ:- اُمی خواهید ای مومنان کہ بر راہ راست آرید آن را کی گمراہ گرواند خدای عز وجل۔

أَتُرِيدُونَ - اُمی خواهید ای مومنان کہ باشد مر خدای را تعالی بر عقوبت کردن شما حجتی پیدایی (ص ۶۷)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ:- آمگاہ نکنی کہ آنانک می پندارند کہ ایشان بگرویدہ اند بدانچ فرو فرستادہ شدہ است و بدانچ فرو فرستادہ شد پیش از تو۔

أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ الْعِزَّةَ:- اُمی جویند از نزدیک جهودان عزت و نصرت۔

هَلْ أَتَّبِعُكَ:- ا دستوری دهی پس روی کنم ترا۔ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللهَ الَّذِي:- امی بنیند کی خدای تعالی آن خدایست کہ بیافرید آسمانها و زمین۔ أَفَأَصْفَاكُمْ:- ایس برگزیند برای شما پروردگار شما پسران و بگیرد از فرشتگان دختران (ص ۱۹۲)

همی:- و چنان نمود کت از آب خانه همی بیرون آید (ت ۱۴)۔ اما اندر کوی اندر خانه یی توبت نهر ستایند (ت) و اکنون همت بت پرستند (ص ۸۱) آوازی بگوش او آمد

ندا الست از کجا همی آید (ب۳۴)، آواز دهنده گفت بر اثر من همی آی بر آن اثر همی شد (ب۳۴)،
پس همی شنیت از شبها ایزد تعالی آن قوم را کی ماهی گرفته بودند کپیان گردانید (لع۱) ـ
و دیو هم چنان بر سر منبر خلق را علم همی گفت (ب۱۹)، گفت با ما بچه چیز اندر مناظره همی کنید (ب۲۱)،
هر باری کی با این جهودان و ترسا آن عهدی و میثاقی بسته آید کی تا بگروند بدین پیغامبر
آخر الزمان همی گروهی از ایشان آن فرمان را بجای ماندند و آن پیمان را شکنندند (ب۱۶)،

می ماضی کے ساتھ:- در ساعت سلیمن در خود نگریست چنان شد کی خود را می
نشناخت (ب۱۹) کسی را دید همانند او کی بر منبر آمده بود و خلق را می خطبه کرد (ب۱۹)،

می مضارع کے ساتھ:- گفتند کی تا وبده دینار می کم ندهد (ب۲)۔ تو مُردگان
تازه را می زنده کنی (لع۱)، یا گدای خود را سلیمن مانند می کنی و بنام سلیمان می
گدایی کنی (ب۱۹)، بیست اهل دین خود را می باز خرید (لع۱)۔ بدان کی شفاعت تو
از ما می روا نشود (ب۲۲)۔ هیچ گونه سخنهای تو اندر دل ما می جای نگیرد (ب۱۲)،
گفت جز آنک گروهی از ایشان می بپوشانند مر راستی را پیش نادانان خود می نگویند
از حدیث پیغامبر ما صلی الله علیه وسلم (ب۲۳)،

می مستقبل کے ساتھ:- خداوند تعالی اندر توریت با شما گفته بود کی اندر
آخر الزمان این پیغامبر می پدید خواهد آمد (ب۶)،

می امر کے ساتھ:- ایزد تعالی ایشان را بزمین فرستاد و فرمان داد کی روز بزمین
می شوید میان فرزندان آدم حکم می کنید و عدل نگاه می دارید و سوی جنت وجود میل
مکنید (لع۲۲) این عهد با فرزندان خود ببندید و بگویید تا با فرزندان خویش و فرزند فرزندان هم چونین
خبر می دهید تا بدان پیغامبر بگروند (لع۱)۔ بگوی آن را کی دشمن جبریل است کو می
باشی دشمن کی دشمنی تو او را زیان ندارد (لع۱۶)

حذف۔ یای اضافت:- ابتدا دشمنی شما با جبریل از کجا افتاده است (لع۱۶)۔

از حسد مت کنند کت دلهاشان پُر غم است (۲۵ٹ)۔ ہمیشہ دلھاشان باسلیمن علیہ السلم خصومت مت بود (۲۱ٹ) بت از انک شمارا مکافات بدیھاتان بدھند (۴۲ٹ) ھر باری کی ترا آرزو عرش گیرد (۲۶ب)

عربی کا اثر

تفسیر کی زبان پر عربیت غالب ہے۔ جس سے یہی گمان گذرتا ہے کہ وہ کسی عربی تفسیر کا ترجمہ ہوگی مگر بعض ایسے اشارے موجود ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ اصل تالیف ہے مثلاً ایک مقام پر آتا ہے۔

"دحسد رایتازی عبارۃ کردہ ایم الحسد غم یظھر فیك بما انعم اللّٰہ علی اخیك حسد غمت بود کت ہدیہ آید ودل تو بہ نیکوئی کت ہدیدآید بر برادر تو ہ وعبارتی دیگر بپارسی الحسد جوشش والحرص کوشش والغش پوشش (۱۳ب)،

عربی کا اثر ایک تفسیر قرآن میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کیونکہ اول تو یہ مضمون ہی عربی ہے دوسرے خود مصنف کو عربی کے ساتھ فارسی سے کم مزاولت نہیں ہے حتیٰ کہ وہ عربی میں سوچتا اور فکر کرتا معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی فارسی پر عربی رنگ چڑھ گیا ہے اس سے میرا یہ مقصد ہے کہ فارسی میں معمولاً ایک جملہ فعل پر ختم ہوتا ہے اور جملہ کے دیگر اجزا اور متعلقات فعل سے پہلے لائے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارا مصنف اکثر اوقات فعل کو فاعل کے ساتھ ابتدا میں لے آتا ہے اور باقی اجزا یعنے مفعول ودیگر متعلقات فعل کے بعد میں لاتا ہے بعض مثالیں یہاں درج ہوتی ہیں:۔

ومالت بسیار بود مر ورا (۲ٹ) معمولاً یہ جملہ فارسی میں یوں آتا۔ واو مالے بسیار داشت شکفت آمد ایشان را از وی (ب۶) گفتند یاموسی بپرس از بھرما مر خداوند خود را تعلی (ب۲) اکنون نشانی ملاستی وادی تومارا بشدند بجستند یافتند این تنا و برین نشان بزرد

جوانی نیکوکار بجای مادر (ب۳) کم رغبت کنندہ مردمان ببرادن دختر مرگ (ب۳)۔
کی تکبر ورزند و بگردند بعصیت خدای عزوجل و پیغمبرشان و یکتا بما و پیغامبران (لف ۸)۔
گفت کی مریم رضوان اللہ علیہا زیر دار آمد شبی و بسیار می گریست" (لف) وعید
حرم حرام ست گرفتن و درختان آن حرام است بریدن وگیاہ آن حرام ست ..... (ب ۲۳)۔

اس تفسیر میں عربی الفاظ کی تعداد شاہنامہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے اور بلعمی کے ترجمۂ تاریخ طبری کے برابر ہے البتہ کشف المحجوب کے مقابلہ میں کم ہے۔ میں یہاں ابتدائی چند اوراق کے الفاظ درج کرتا ہوں۔

عقوبت۔نکال۔عبرت۔مسخ۔امر۔نہی۔شریعت۔سبط۔مسجد۔حق۔رضی اللہ عنہ رحمہ اللہ۔علیہ السلام۔عزوجل۔صلی اللہ علیہ وسلم۔علیہ السلام۔انشاء اللہ۔نعلین۔مصلح۔حرفت وضیعت۔رغبت۔استحلال۔تسبیح وتہلیل۔تلقین۔میراث۔ابلیس۔سلام۔امام۔بیعت۔مطیع۔محنت۔ابن عم۔منکر۔بعث۔قصہ۔شرح۔علم۔منافق۔توریت۔انجیل۔معنی۔تفسیر۔ہلاک۔رحم۔یتیم۔خیر۔مسلمانی۔عاقلی۔تجارۃ۔شرط۔عہد۔ہجرت۔عرعات۔قیامت۔تعزیت۔دعا۔ساعت۔کافر۔ہول۔کافر۔شبہہ۔صورۃ۔بدل۔قرین۔روایت۔رسول۔غلاف۔قرآن۔مشرک۔نصرت۔آخر الزمان۔نعمت۔نسل۔حقیقت۔بغی۔باطل۔نور۔ساطع۔غلبہ۔معجزات۔طوفان۔معبود۔مومن۔ایمان۔خصومت۔دعوی۔حریص۔عذاب وغیرہ

ان الفاظ میں تقریباً نصف ایسے ہیں جنکا صحیح مرادف فارسی میں یا تو موجود ہی نہیں ہے یا اگر موجود ہے تو اتنا چسپاں نہیں ہے جتنا کہ اصل عربی لفظ۔ باقی نصف کے لئے البتہ موزوں اور مناسب الفاظ موجود ہیں۔

بعض وقت دیکھا جاتا ہے کہ مصنف بعض آسان آسان عربی الفاظ کی تشریح میں مصروف ہے۔ کچھ مثالیں یہاں دیجاتی ہیں:۔ معنی حق بپارسی چیزی شایستہ باشد و بپارسی باطل ناشایستہ (لف ۱۳) بپارسی حرص گوازہ کردن باشد و معنی حرص سیرناشدن

باشذ (ب۱۵) نام این زن بتازی زهره بود و بپارسی بیذخت و بزبان عبری ناهید (الف۲۲)
ویل سخونی است کی کسی را گویند کی اوی اندر هلاکی افتاده باشد معنیش بپارسی
چنان باشد کی وای بر ایشان (الف۲۸) معنی اختلاف میان دو تن ناسزاواری بود کی هر
یکی از ایشان مر یار خود را دروغ گوید و کید موافقت نکند (ب۲۹) و مبدع نوسازنده ی بود کی
نه از چیز چیز آرد (ب۳۰) بپارسی ملت کیش باشد (الف۳۰) بپارسی مخلص یک روی باشد (ب۳۱)
بپارسی حجت بهانه ی بود کی خصم را بیرده گرداند و دعوی دعوی کننده را روشن گرداند (ب۳۲) معنی حذر
بپارسی هیش بیتی (ب۴۷) ◆ یہ نسخہ کسی قدیم اصل پر مبنی ہے۔ اسمیں کسی احتمال کی گنجایش نہیں
اسمیں ہای دوچشمی اور دندانہ دار سین کا رواج۔ ف۔ ق۔ م اور 'و' کی گھنڈیوں کا کھلا ہونا 'ی' کے پیٹ
میں نقطوں کا دیا جانا اور کوفی کاف وگاف کے ساتھ 'ر' کو 'و' کی شکل میں لکھا جانا دلالت کرتے ہیں
کہ موجودہ نسخہ ایک ایسے نسخہ کی نقل ہے۔ جسکی کتابت پانچویں یا چھٹی صدی ہجری میں عمل میں آئی
ہے اور جس پر شدید کوفی اثر غالب ہے۔ ہمیں معلوم رہے کہ پانچویں صدی ہجری میں کوفی خط میں
مصحف کی کتابت کی رسم متروک ہونے لگی ہے۔ اس انقلاب کی کوئی تاریخ تو معین نہیں کی جاسکتی کیونکہ
ہمارے پاس کافی شہادت موجود نہیں ہے۔ مگر برٹش میوزیم (جلد دوم ص۵۳ فہرست) میں ایک نسخہ ۴۲۷ھ
کا اور قاہرہ میں ایک نسخہ ۴۹۹ھ کا ہے۔ یہ دونوں نسخے غیر کوفی یا مدور خط میں نوشتہ ہیں چھٹی صدی
کے مصحفوں پر بھی یہی حکم لگایا جاسکتا ہے۔ چند دیگر تاریخ والے مصحف جو ملتے ہیں مثلاً مکہ والا ۵۲۶ھ
کا۔ دوسرا ۵۵۵ھ کا۔ اور ایک نوشتۂ ایران ۵۹۹ھ کا۔ یہ سب کے سب غیر کوفی خط میں مرقوم ہیں۔ ادھر
موفق ہروی کی کتاب الابنیہ نوشتۂ ۴۴۷ھ ایرانی کوفی میں مرقوم ہے۔ ہمارے نسخہ میں چونکہ کوفی کا پرتو بہت
نمایاں ہے اسلئے ہم اسے پانچویں یا چھٹی صدی کی طرف منسوب کرتے ہیں ◆ اس تفسیر کے اگرچہ کل ۴۶
اوراق ہاتھ آئے ہیں لیکن ان سے قدیم الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ حاصل ہوتا ہے اور اسی بنا پر اس تفسیر کی اہمیت
ہماری نگاہ میں بڑھ جاتی ہے۔ انمیں بڑی تعداد ایسے الفاظ کی ہے جو ہمیں اور ذرائع سے بھی ملتے ہیں یا ہماری
کتب لغات میں محفوظ ہیں۔ لیکن ایک قلیل تعداد ایسے الفاظ کی بھی ہے جو ہمیں اور ذرائع سے معلوم نہیں ہوسکتے
اور صرف یہی تفسیر انکے لئے حوالہ مانی جاسکتی ہے۔ اسطرح یہ ذخیرہ مستقبل کے فرہنگ نگار کیلئے ایک قیمتی ماخذ کا

کام دے سکتا ہے۔ ذیل میں ان الفاظ کی فہرست حوالۂ قلم کی جاتی ہے اور فہرست کے بعد تفسیر کی عبارت کے چند اقتباسات بطور نمونہ دے دیے جاتے ہیں :۔

فہرستِ الفاظِ تفسیرِ ہٰذا

آب خانہ = بیت الخلا :۔ وھر باذی کی سلیمن علیہ السلم بآب خانہ اندر شذی
از حرمت مران انگشتیرہ را با خود نداشتی ہزنی از زنان خویش کی ہنزد
او امینہ تر بود نام وی ضینۂ انگشتیرہ بدو داذی وپس در اب خانہ شذی
روزی ہم برین عادت انگشتیرہ بدو داوہ بود وخود بآب خانہ ورشدہ بود
وچون وقت معروپیش آمدہ بُود دیوی کی نام او صخر بود خویشتن را بر
صورت سلیمن علیہ السلم بساخت وچنان نمود کی از آب خانہ ہمی بیرون
آید پنزد آن زن آمد و انگشتیرہ از وی بستد آن شکوہ کی مر سلیمن را
علیہ السلم بود برین دیو پدید آمد (۱۷ ب)

آب رسیدن = پانی ختم ہو جانا :۔ ھاجرؑ از خاشاک کوہ وز خار بنان وادی خویشتن
را کوچکی ساخت وپارہ ئی آب داشت اندر مشکی کھن وآن آب برسید
(۳۷ لف)

اندودن = لیپنا :۔ کافران مکہ بآبادان داشتن خانہ ئی کعبہ ورُفتن و اندودن بر
مومنان فخر کردند خداوند تعلی رد کرد قول ایشان گفت نہ آبادانی مسجد اندر
رُفتن است جہ آبادانی مسجد اندر مومنانست کی اندر وی نماز کنند (۲۹ ب)

آزادی = شکر وسپاس :۔ ابرھیم علیہ السلم پرسید کی حال عیشتان جگونہ است
از خدای عزوجل بسیار آزادی وشکر نمود وگفت ابرھیم را کی ساعتی
فرود آی (۳۵ لف)

زبہر چیزی وکسی را = از بہر آمدن جبریل را علیہ السلم (۳۹ لف) وبپیروزی

نخوردند از بهر نماز را ۴۶ (لف)۔

جملهٔ تان بیکجا آرد خداوند تعلی از بهر کردن حساب را و دادن مکافات را ۴۶ (لف)

از جهت چیزی و کسی را :۔ پس گفت مرد را کہ ابتدا دشمنی شما با جبریل از کجا افتاده است جواب داد از آن جهت را کہ ایزد تعلی در کتابهای خویش ما را آگاه کرده بود کہ مردی خواهد بود او را بُختِ نَصّر گویند (لف ۱۹)

از یراج = زیرا چه :۔ رشکشان آمد کہ این پیغامبر از فرزندان اسمعیل آمد از یراج جهودان اندر توریت نشان پیغامبر اخر الزمان یافته بودند (لف ۱۳)

خدای عز و جل بی عیب است و مستغنی از گرفتن فرزند از یراج هر کرا فرزند باشد او محدث باشد نه قدیم (ب ۳۰)

ازین جهت است کہ مُبتَدِعْ را مُبتَدِعْ خوانند از یراج در اسلام چیزی نو پدید آورده باشد بی از آنک مر ورا از قرآن یا از حدیث رسول صلی الله علیه وسلم اصلی باشد (ب ۳۱)

از یراک } زیرا کہ :۔ فایده اندران کہ سنگ مانند کرد نه بروی و نه با آهن
از یراکہ } از یراک روی و آهن هم با آتش نرم گردد اما سنگ در آتش پاره پاره شود اما نرم نگردد (لف ۶)

از یراکہ تا پیغامبر صلی الله علیه وسلم بمکه بود (ب ۲۵)،

اُستاخی = گستاخی :۔ پیش از آن هیچ دیوی را زهره نبوده کہ پنزد سلیمن آمدی یا با وی اُستاخی کردی (ب ۱۹)

استوار داشتن = یقین داشتن :۔ اگر شما استوار دارند کانبیه مرا استوار دارید (ب ۴۵)

اَشکَرْد = واجب :۔ تمام گزارید نمازهایی را کہ بر شما اَشکَرْد کرده اند است کہ واجب کرده اند (لف ۹)،

و بدہید زکوۃ ای کی وسختی کی بر خواستهای شما اشکرہ و کردہ اند ای کی
واجب کردہ اند بر شما (لف۹)
یہ لفظ فرہنگوں میں نہیں ملتا ۔

افسوس = استہزا اور تمسخر:- من از جملہ یہ جاھلان باشم کی بر مومنان افسوس کنم کی
ھرکی بر مومنان افسوس کند او از جملہ یہ جاھلان باشد (ب۲)

الفغدن : حاصل کرنا، جمع کرنا:- بدان سبب کی دانند کی ایشان چہ الفغدہ اند
مرخویشتن را، (لف۱۵)
گفت مرایشان راست ھرج کردند و الفغدند مکافات آن خود بیابند (ب۳۹)

الفنجیدن = مرادف الفغدن و اندوختن:- گفت ھرکی بدی الفنجد ای کی
بخدای عزوجل شرک آرد بی ستون گردد (لف۸)
وشما را نیز ھرج کنید و الفنجید مکافات آن بیابید (ب۳۹)

۱ **اندر حصار کردن** = محصور کرنا:- ایزد تعالی پیغامبر را صلی اللہ علیہ وسلم فرمان داد
تا ایشان را اندر حصار کردند و چند روز اندر حصار ببودند پس صلح بران افتاد (ب۲۷)
وایشان را اندر حصار کرد چند روز (ب۲۷)

اندر خواستن = درخواست کرنا:- مجاھد گوید قریشیان از پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم
اندر خواستند گفتند کوہ صفا از بھر ما زر گردان (ب۲۶)

اَندَرز = پند:- گفت یعقوب نیز ھم بدین سخن مر فرزندان خویش را اَندَرز کرد و آن
دوازدہ فرزند بودند (لف۳۹)
یا جھودان شما آن روز حاضر بودید کی یعقوب فرزندان را اَندَرز کرد بدین جھودستان
اندرز کرد یا دین حنیفی (ب۳۹)

اندر زیر = ذیل میں۔ تحت میں:- و آنگاہ فایدھای سنگ پدید کرد تا اندر زیر آن

عیب دلہاے ایشان پدید آورد (۶ لف)

آن کجا = کہ، یا جو کہ - گفت ہیچ آرزو نبرند و نخواہند این کافران کہ خستون نیند مر پیامبری ترا از توریت خوانان و انجیل خوانان و نہ نیز این کافران مکہ وجز ازیشان آن کجا بتان را با خداوند عزوجل انباز گویند (ب ۲۴)،

شاہنامہ میں کثرت سے ملتا ہے،

انگشتیرہ = انگشتری :- عصا معجزت موسیٰ گشت و انگشتیرہ معجزت سلیمن علیہ السلم (ب ۱۷)،

سلیمن اندر خواندن زبور بود کہ انگشتیرہ در انگشت او کرد جبریل، (لف ۱۸)

و اندر روایت بو صالح است کہ آن دیو بود کہ انگشتیرہ ی وی را در انگشت داشت و خلق ہمہ بنداشتند کہ این سلیمن است علیہ السلم (ب ۱۹)

و چون روزگار عتاب سلیمن باآخر رسید برکنارہ ی آبی نشستہ بود اندوہگین ماہی برکنارہ پیدا آب ہدید آمد و برطپیدن گرفت سلیمن آنرا بگرفت و خواست کہ شکم او بازکند آن انگشتیرہ ی خویش اندر وی بیافت انگشتیرہ بانگشت اندر آورد آن بہا و جمال بازپدو باز آمد و لشکر ہنرد او گرد آمدند و باز بمملکت خویش باز رسید (لف ۲۱)،

اُو = استفہامیہ ہے بمعنی "آیا" یا "کیا" :- گفت یا جہودان اُو ہر بار کہ کی بسوی شما از من رسولی فرستیدہ آید و پیغامبری آید کہ آن شریعت او با شریعت شما موافق نیاید و با شما بمراد شما کار نکند ایشان را کشتن گیرید و دروغ زن کردن گیرید (لف ۱۲)،

واو کے بغیر بھی آتا ہے اور پرانے ترجموں اور تفسیروں میں بکثرت ملتا ہے۔
میں درج نہیں،

اومید = امید :- دلهای شما سیاه وسخت گشت وخشک گشت کی اندرانجاهیم وَ اُومید و نورِ یقین نماند (ب۵)

ای کی اومید دارید کی جهودان بشما بخواهند گروید (لف۔)

اوی = او :- اگر اوی برحق بوَی اورا این پیش نیامدی بازگردید از دین اوی و اندر دین ما اندر آئید (لف۲۷)

حرامست بروی کی اوی امام مسلمانان شکر وو (لف۳۴)

آهنجیدن : بمعنی کشیدن :- یارب توی عزیز ای کی کینه آهنجی ازان کس کی نشکر وو بدین پیامبر وحکیمی کی حکم کنی بفرستادن این پیغامبر (ب۳۵)

ایدر : یہاں :- گفت فرمان اینست کی مرین هاجر راو پسر را ایدر بگذاری (لف۳۷)

شاہنامہ میں بکثرت ملتاہے'

ایستانیدن = کھڑا کرنا : رفتیم تا بجائی رسیدیم کی دو شخص دیدایم نکوسار آویخته مرا هیش ایشان بزد و بیستانید ایشان آواز کردند کی میاموز آنچ ما شکوییم کی کافر شوی (ب۲۳)'

بازز دکردن = منع کرنا :- آن بیرون کردن شما مریشان از خانها شان حرام بود بر شما یعنی باز زد کرده بود شمارا (لف۔)

اما ناسخ آنست کی پیش ازان آیتی آمده باشد و بدان کار فرموده پس آن آیتی دیگر آید و کاری دیگر فرماید و زان کار پیشین باز زد کند این آیت کی بستر آمد آنرا ناسخ خوانند و آن پیشین را منسوخ خوانند (لف۲۵)

پادشاهی هفت آسمان و زمین مر خدای راست عزوجل بملک و ملک مر ورا است اندر پادشاهی خویش تصرف کند آنچ خواهد فرماید و آنچ خواهد باز زد کند چنانک خواهد آنکه کی خواهد و جنون کی کس را بروی چرای نیاید (لف۲۶)

باژوان = محصّل - تحصیل وصول کرنے والا :- سدیگر کلبی گوید دختر باژوانی را زنده کرد (لطا)'

شاید بود کہ این زن دختر آن باژبان بوده است کہ کلبی یاد کرده است (لطا)'

بایست و نابایست - واجب و ناواجب امر و نہی :- بہراستی کہ ما بسوی تو فرو فرستاده ایم آیتہای قرآن پدید کرده اندرو بہ بایست و نابایست و شایست و ناشایست و فرمان و نہی مرورا منکر نشوند مگر فاسقان بی فرمانان از کافران و جہودان و ترسا آن (ثب)

بایستی - چاہیئے :- حکم اول این بود کہ زنان را یک سال بایستی داشت و نفقات از ترکات بایستی خورد (لطا)

بجای آوردن : تاڑ لینا - سمجھ جانا - تاڑ جانا :- تو دانی کہ من امروز اندر عبادة بیش از آنم کہ در کودکی بودم آصف زبان برکشاد و گفت بلی اما اندر کودکی اندر خانہ ی تو بت ہرستیدندی و اکنون ہمی بت ہرستند سلیمن بجای آورد کہ حق می گوید بخانہ اندر آمد و آن بت را فرمود تا بسوختند و آن زن را طلاق داد و از در بیرون کرد و بعذر بدرگاه خداوند تعلی باز گشت (ثب)

مردمان عامہ آن در نیافتند و پنداشتند کہ مر سلیمن را ہمی چنانک سزا بود بستوده است اما سلیمن علیہ السلم آن بجای آورد چون خالی شد و ز منبر فرود آمد او را ہنزد خود خواند (ثب)

بجای ماندن = ترک کر دینا - چھوڑ بیٹھنا - جہودان بیشتر علم توریت بجای ماندند و بجادوی و نیرنجات مشغول گشتند (لطا)

اگر تو عہد و فرمان من بجای مانی من این از تو باز ستانم (ثب)

ہر باری کہ با این جہودان و ترسا آن عہدی و پیمانی بستہ آید کہ تا بکروند

بدین پیغامبر آخر الزمان همی گروهی از ایشان آن زمان را بجای مانند و آن
پیمان را شکنند" (لف ۱۶)

بخاصه = خصوصاً - بالخصوص :- هرکه او دشمن خدای تعلی باشد او دشمن همه فریشتگان
باشد بخاصه ازان جبریل و میکایل (ب ۱۶)

بخرَد = دانا - سمجھ دار :- امّا بدرت را گوساله یی بود بخرد که آنرا اندر کوهی برده است
بامانت بخداوند ابرهیم و اسحق سپرده است (ب ۳)

بخش = حصه :- هر که این جادویی اختیار کرد اورا در بهشت هیچ بخش نماند (لف ۲۴)

بُرده و بُرده = غالباً بردن سے مشتق ہے - شطرنج کی اصطلاح میں 'برد' اب بھی
بولا جاتا ہے - بردیافتن بمعنی بازی ربودن آتا ہے - اس تفسیر میں وہ غالباً
ملزم - لاجواب - قایل و معقول کے معنی دیتا ہے :- ایشان بدین بر شما
بقیامت بخدای تعلی بهانه گیرند و مر شمارا بدین بُرده گردانند و گویند
که شما دانستید که این پیغامبر سزاوار است جز انکه وی دید (ب ۶)
گفت این مقدار بارای هوش ندارید و اندرونتان این مقدار خرد نیست که
بدانید که ایشان را حجت و بهانه باشد و شما اندرین بُرده شوید (لف ۷)
پارسی حجة بهانه یی بود که خصم را بُرده گرداند و دعوی دعوای کننده را
روشن گرداند (ب ۲۶)

برسون = طرف بالا :- تو همی بینیم آن روی گردانیدن تو بسوی آسمان و برسون
نگریستن تو اندر نماز و جز آن از بهر آمدن جبریل را علیه السلم (لف ۲۲)

بر شما باد! = یعنے بر شما لازم باد :- در خبر آمده است از پیغامبر صلی الله علیه وسلم
که بر شما باد که نعلین از پوست گاو نرد دارید (لف ۳)

بَرگشت = معاذ الله یعنے خدا نکرے - لغات میں کاف فارسی کے ساتھ ملتا ہے :-

صاحب انجمن آرای ناصری کا خیال ہے کہ اس لفظ میں تصحیف ہوئی ہے کہتے ہیں "معلوم می شود کہ برگست تبدیل ہرگز بودہ ہای ہوز را با گمان کردہ اند و تبدیل سین وزا در پارسی معمول و متداول است مانند ایاز و ایاس و برگست باضافہ تانیز منافی ہرگز نیست چون بالش و بالشت"۔

موسیٰ گفت علیہ السلم بزگشت بادا و آن روز مبادا کی من از جملہ یہ جاہلان باشم (ب۲)

بُزنُش = یونس سپطی دوازدہ ہزار مرد از علما و حکما و اہل دزنس و کتب و مردمانی بزنش دار و عکازہ گیر از زہاد و عباد و دیگر بندگان (لعہ۱۸)

بزرگ منشی = دور کھینچنا :۔ گفت ہر باری کی بشما آمد از من رسولی براخ کی موافق شریعت شما نباشد و بر مراد شما نباشد اُستَکبَرتُم بزرگ منشی کردید و گردن کشی کردید آن پیغامبر را (لعہ۱۲)

بزہ مندی = گناہ گاری :۔ دوستان خویش را یاری می دہید بر قہر کردن اہل دین خویش وَ الاِثمِ وَالعُدوَانِ یہ بزہ مندی وستمگاری (ب۹)

بسمل کردن = چونکہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہی جاتی ہے اس سے بسمل کردن بمعنی ذبح کردن نکل آیا ہے :۔ موسیٰ علیہ السلم ایشان را بفرمود بفرمان خدای عزّ و جل تا گاوی را بگیرند و بسمل کنند و اندامی ازان او بر کشتہ نہند تا ایزد تعلیٰ او را بسخون آرد (ب۲)

بی آگاہی = بے اطلاع = گفت نہ چنانک خداوند تعلیٰ از کردہای شما بی آگاہی است و یا خبر ندارد کی شما چہ می کنید (ب۲۴)

بَیذُخت = زہرہ = وقتی زنی را باشوی خصومت افتاد نام این زن بتازیی زُہرَہ بود و بپارسی بَیذُخت و بزبان عبری اناصید (لعہ۲۲)

انجمن آرای ناصری میں لکھا ہے :۔ ظن مولف آنست کہ آن نیز ہیدخت بودہ مانند ہیدخ تصحیف خوانی شدہ چہ دخت بمعنی دختر است وہی بمعنی خوب است وناہید بمعنی دختر نارپستان نیز موید این قول است پس اصل درین لغت ہید دخت بودہ چنانکہ رسم است یکدال را حذف کردہ اند ہیدخت شدہ وتصحیف بیدخت گردیدہ بیدخت یعنی بیدختر و دربنجا این معنی مناسب نیست ۔

بی گمانی = رفع تشکیک ۔ یقین :۔ ایشان آنچ می کنند وی گویند جز بگمانی نمی کنند نہ ایشان را اندر انچ می کنند ویا می گویند یقینی وبی گمانی است (لعـ)

ما آیت ومعجزت می نماییم ولکن این آیت ومعجزت مران کس را سود دارد کہ او بہستی ما و بہ پیغامبری تو بی گمان باشد (لعـ ۳۲)،

پارہ = پارہ :۔ پس آوردند این گاو را وکشتند یوشع بن نون از ران او یی پارہ گوشت را ببرید وبران کشتہ نہاد (ب)

پاشنا = ایڑی :۔ جبریل علیہ السلم خویشتن آشکارا کرد وبدو نمود وپس او را پیجای زمزم برد پاشنا بزد آب زمزم پدید آمد ہاجر اندر دوید وگرد بر گرد آن خاک افگند از بیم آنک مگر آن آب برود نیز نماند (لعـ ۳۲)

پایگاہ دار = ذی رتبہ ۔ عالی مرتبہ :۔ ومر او را وزیری بود آصف بن برخیا ابن شمعیا کی از بزرگان بنی اسرائیل بود اندر علم وحکمت وعبادۃ وزہادت مردی پایگاہ دار بود (لعـ ۱۸)

پادافراہ = عذاب :۔ گفت ایشان را اندرین دنیا رسوایی باشد ویادافراہ بسیار بدان چہ مسلمانان ظفر یابند بر بعضی شہرہای ایشان چون قسطنطنیہ و عموریہ ورومیہ (لعـ ۳۰)،

"کافران را و مومنان را روزی دهم ولکن کافر را و ایشان را نم اندران جهان بپایت واحت دردناک (الف ۳۶)

و مریشان را خواهد بود برونست ہیں است کہ بدان جهان پایت و اعصای بزرک [کذا] در آتش دوزخ (الف ۳۰)

یہ لفظ فرہنگوں میں درج نہیں۔

پایت وه = مخفف پایت واه بمعنے عذاب :- گفت آنکسها کہ چنین کروند حقا کہ برنگیرند ازیشان آن پایت وہ دوزخ و سبک نکنند ازیشان آن دردها و رنجها کہ در دوزخ بیند چندانی کہ چشمی برچشمی زنی (ب ۱)

گفت چنان نیست اگر او خود هزار سال بزید کہ این زندگانی مرو را از عذاب دپایت وہ خداوند تعلیٰ بخواهد رهانید یا از دوزخ ایشان را دور خواهد کرد (ب ۱۵)

د مرجهودان راست کہ ترا بر اعناد شنام دهند پای . وهی اندر دوزخ دردناک (ب ۲۴)

پدرگان = باپ والے ۔ ددھیالیے :- گفت چیست کہ فرزند گروهی بہ پدرگان ماند و گروهی بمادرگان پیغامبر گفت صلی اللہ علیہ وسلم هر کرا آب غلبہ کند فرزند بکسهای او ماند (ب ۱)

پردہ :- دیکھو 'بردہ' مذکورۂ بالا

پلسودن = چھونا :- گفتند جهودان کہ نپساید ما را آتش دوزخ جز کہ روزی چند شمردہ بدان مقداری کہ پدران ما اندران روزگار گوسالہ پرستیدند و آن چهل روز بود (ب ۱)

پشتگان = پشتیبان ۔ ممد و معاون :- گفت آنکہ (کذا) مر ترا جز از خدای عزوجل کہ باشد دست گیری و کارسازی کہ ترا منفعت نماید و از وی نیکوی

باشند و یا پشتگانی کی مرترا یاری دهد وز عذاب خداوند تعلی برهاند (لف ۳۳)

یہہ لفظ 'نصیر' کا ترجمہ ہے۔

پشتواره = پشتاره :- رفت خویش را با ملاحان و متیاً دان بمزدوری داد از میان آب کی پایاب بودی ماهی را به پشت واره بکناره ی دریا آوردی و هر شبی دو ماهیش مزد دادندی یکی را بفروختی نان خریدی و یکی را نان خورش کردی (ب ۱۹)

و چون روز شدی پشت واره ی هیزم آوردی و آن را بفروختی (لف ۲)

پنداشت = خیال - تصور - گمان :- جهودان اندر توریت نشان پیغامبر آخرالزمان یافته بودند و بشکر دیده بودند بران پنداشت بودند کی این پیغامبر آخرالزمان از فرزندان اسحق باشد ازیراک جهودان از نسل اسحق اند علیه السلم (لف ۱۳)

پی بردن = پیروی کرنا - اقتدا کرنا :- حقیقت امامی آن بود کی بنده بر طریقتی بود کی هرچ خود کند اندر انش رستگاری بود هرکی پی وی اندران پی برد آنکس را نیز اندران رستگاری بود (لف ۳۴)

پی افتادن = پے گرفتن - یہاں سمجھ لینا مراد ہے :- یک دیگر را گفتند تا کنون ما این مرد را پنهان می دشنام دادیم اکنون بآشکارا دشنام می دهیم و می گوییم را عنا او خود پی نیفتد سعد معاذ رضی الله عنه لغت جهودان پی افتادی با تیغ بر ایشان زد -

پیر پیر = یعنی پیر :- گفت موسی علیه السلم خداوند من چنین گفت این گاو یست نه پیر پیر است و نه جوان جوان میانه گاو یست (لف ۳)

اردو میں اس قسم کا روزمرہ کثرت سے ملتا ہے - اور یقیناً فارسی سے ماخوذ ہے -

پیسان = مبروص - کوڑھی :- گفت بدادیم مر عیسی را پسر مریم را علیهما السلم نشانیهای

بہ راستی پیغامبری وزان نشانیہا یکی آن بود کی دعا کردی ایزد تعلی پیسان را درست گردانیدی و نابینا آن را بینا گردانیدی و مردگان را زندہ گردانیدی (سب)

پیشین = اگلا۔ پہلے کا:۔ خداوند تعلی بندگان خود را فرمان دھد بچیزی ودانذکی صلاح ایشان اندرانست تا بوقتی وزپس آن وقت وانذکی صلاح ایشان اندر چیزی دیگر است آن پیشین را منسوخ کند و فرمان دیگر بفرماید (لف ۲۶)

خورسند باش یا محمد ہد ہیچ ترا متی شی یذکی پیغامبران پیشین را ہمین گفتند (لف ۳۲)

این آیت اندر نبشتن وخواندن پس ازان آیت پیشین است (لف ۸)

پیغولہ = گوشہ:۔ اینست مقام ابرھیم واین سنگ در پیغولہ یہ مسجد بود پروزگار تا روزی عمر خطاب گفت رضی اللہ عنہ (لف ۳۵)

تا = بمعنی ہرگز:۔ اگر ایزد تعلی آن گوسالہ ہتو باز رساند تا بروی ننشینی وکس را برو ننشانی وبی فرمان من آنرا برکس نفروشی (ب ۳)

ایزد تعلی مرسلیمن را علیہ السلم فرمان چنان دادہ بود کی تا جز از بنی اسرایل زن ہزنی نخواھد (لف ۱)

تارہ = تاریک:۔ یاران پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم وقتی در بیابانی بودند تارۂ میغی برآمد آسمان بپوشید وجھت قبلہ بریشان پوشیدہ شد (ب ۳)

ترفند = دروغ وبیہودہ:۔ این دروغھاست کی ایشان میگویند وسخنہایی بی اصل است و ترفندِ جاھلانہ این چہ ایشان ہمی گویند (لف ۲۵)

تعزیت = ڈھارس دلانا۔ تسلی وسکون دلانا۔ خورسند کرنا۔ گفت ہم چنین کہ این کافران مرترا می گویند کافرانی کہ پیش ازیشان بودند مر انبیاء خود را ہمین گفتند اندرین تعزیت است مر پیغامبر مارا صلی اللہ علیہ وسلم وتعزیت خرسندی دلان

باشد ای کی خرسند باش یا محمد بدینج ترا می گویند (لعہ۳۲)

و اندر زیر این تعزیتی[۱] است مر مومنان را چنانستی کی گفتی ای مومنان اشیحر شمارا جهود و ترسا عیب می کنند دین شمارا بچیزی می نشمرند صبر کنید کی ایشان یک دیگر را نیز هم چنین گویند (لعہ۲۹)

تُنک = نرم و رقت زده:- عازور دوستی بود از دوستان عیسی علیه السلم بہ یکی[۱] نشستی و او کی مرده شد تابوتی ساختند او را از سنگ و اندران تابوتش بنهادند چون خبر بعیسی رسید بتعزیت آنجا شد اهل او تنک ولی بسیار می کردند دل عیسی تُنک شد بر سر گور او آمد و دعا کرد (ب۱)

این عیال من بوده است و دل من در وی بسته است و بتی وی می[۱] شکیم عیسی را دل بروی تُنک شد دعا کرد خداوند را تعلی گور باز شکافت و زن سر از انجا بر آورد دست شوی گرفت و بخانه باز شد (لعہ۱۱)

جادوی = جادو - سحر = از قاضی بوعاصم رحمة الله شنیدم کی او گفتی[۱] اندر زمانه یی جادوی چنان فاش گشت کی گروهی مردمان معجزات پیغامبران خویش را صلوات علیه بجادوی بر گرفتندی و فرق ندانستندی کرد میان جادوی و میان معجزات ایزد تعلی دو فریشته بفرستاد تا مریشان را باز نمود چگونگی جادو و چگونگی معجزات (لعہ۲۳)

و گروهی گویند این خود فریشتگان نیند دو مرد گبر بوده اند ببابل مردمان را جادوی آموختندی و بدین قول میل کرده است حسن بصری رحمة الله علیه (لعہ۲۳)

جادوان = جادوگر، تو یا آدمی بخدای کافر شو و جادوی میاموز و کار مبند این جهودان و دیوان و جادوان از ایشان یاد گیرند بی[۱] از آنک ایشان را آموزند (ب۲۱)

جاودانگی = همیشگی - دائمی:- این کس کی چنین باشد پاداش باشد او را از خدای

عزوجل نه بیم جاودانگی باشد اورا و نه اندوه جاودانگی (رب۲۸)
فرہنگوں میں کاف فارسی سے ملتا ہے

جاوید جاوید = ہمیشہ ہمیش۔ سدا:- این جنین کسها باشند سزاوار دوزخ و اندر دوزخ مانده جاوید جاویدکی۔ نه از آتش بیرون آمدن باشد و نه اندر آتش مرایشان را مرگی و راحت باشد (لف۵)

این آنکسها اند سزاوار بهشت و شایسته ی بهشت ایشان اند اندران بهشت جاوید جاوید مگی باشند بی ازانک بیرحدیا از نجاشان بیرون باید آمد ہمیشه (رث) -

جایگاه مردان = بلوغ:- اندر بنی اسرائیل جنان عادت بودی کی کسی را کم دختر ہزنی دادندی تا ہنروا و ازسه چیز کی نبودی یا جز فتی دانستی یا ضیعتی داشتی یا دست مایه ی بودی اورا جون این جوان بجایگاه مردان رسید رغبت افتاد ویرا بتزویج (رب)

جدا بجدا = الگ الگ ۔ جدا جدا:- جشم ایشان بران زن افتاد دل ایشان بدو مشغول گشت هر کسی ازیشان تنها بدل اندیشید اکهر این زن مرا بودی شایستی اما با یار خویش نگفت و هر یکی ازیشان این زن را جدا بجدا پنهان از یار خویش وعده نهادند (لف۲۲)

جوامرد = جوان مرد:- بی فرمان من آزا بر کس نفرستی این جوامرد رفت بپایان کوه شد و خداوندرا تعلی بخواند (رب)

ابلیس جواب داد کی ما درجه خبر دارد مرو آنجا تا من ترا دوگانه قوت بدهم جوامرد جواب داد کناه و مردمان مرا جگونه دهی و من بدستدن کناه مردمان استحلال نکنم (لف۲)

جوامرد بخروشید بخاند خداوند را تعلی (الف ۴)

خدای عزوجل این گاو را بسخون آورد و گفت ای جوامرد نیکو کار بجای مادر
بر نشین بر من تا مانده نشوی (ب ۴)

جوشش = جذبہ۔ غم۔ حسد :- و حسد را بتازی عبارة کرده ایم اَلْحَسَدُ غَمٌّ
يَظْهَرُ فِيكَ بِمَا اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلٰى اَخِيكَ حسد غمی بود کی پدید آید در دل تو به
نیکوی کی پدید آید بر برادر تو و عبارتی دیگر بپارسی اَلْحَسَدُ جوشش وَالْحِرْصُ
کوشش وَالْغِشُّ پوشش (ب ۱۳)

حَسَدُ جوششی بود اندر دل کی پدید آید بسبب نیکویی کی ازان کسی پدید آید
(الف ۲۷)

این جوششی است کی در دلهای ایشان افتاده است ازانچ می دانند کی
شما را آن جهان چه نیکوییها خواهد بود (الف ۲۷)

چنان چون = جسطرح۔ جیسے :- گفت دلهای شما سخت ولی آبی چنان چون
سنگهای خاره گشته است (ب ۵)

و گروهی را بکشتید چنان چون زکریا و یحیی را علیهما السلم (الف ۱۲)

بعضی آنست کی آنرا دو فصل است چنان چون سورهٔ تبت (الف ۲۶)

بعضی آنست کی خواندنش منسوخ است و حکمش بر جای مانده است چنان
چون سنگ سار کردن مرزانیان را (ب ۲۵)

چونین = ایسا۔ ایسی :- گفتم این چونین دیدم گفتند آن ایمان تو بود (ب ۲۳)

هیچ = نفف چیز :- وحی آمد بدو کی یا ابرهیم این بتان کی پدرانتان می پرستند
هیچ نیند خالص گردان دل خویش را بشناخت خدای عزوجل (الف ۳۹)

این آرزوهاست کی ایشان می برند به آرزو هیچ نیابند (الف ۲۸)

حِسْبَت = نیکی۔ کرم :- اگر بینی حِسْبَتی کنی و مرا بدین نگاہ و خود بر نشانی تا بنزد
زمہ رسم (لف۲)

خاست نشست = اٹھنا بیٹھنا۔ نشست و برخاست :- یک گروہ خاموش بودند و با
این ماحی گیران بساختند مهمان ایشان می شدند و با ایشان خاست نشست
می داشتند (لف۱)

خاصکی = خاصہ۔ خاص :- اگر بهشت جاودان در حکم خدای عزوجل چنانست کی
آن مر شماراست خاصکی مِن دُونِ النّاس بی از دیگر مردمان (لف۱۵)
گفتند کی بهشت خاصکی مر ماراست و اندر بهشت نیاید کسی جز جهود و ترسا آن
گفتند کی نی بهشت خاصکی مر ماراست و اندر بهشت جز ترسا کس
نیاید (لف۱۵)

خردکی = چھٹپنا - بچپن :- پس منادی آید هر کی ختنہ وار داز فرزندان اسرایل
همہ را از دوزخ بیرون آرید ما ازین جهت است کی بخردکی بچگان
را ختنہ کنیم (لف)
لغات میں کاف فارسی سے ملتا ہے

خرسند = خوش :- اگر خواهی کی من خرسند شوم بفرمای دیوان را تا بمانند پدرم
صورتی کنند تا هر وقتی کی مرا غم پدر بگیرد اندران نگرم خرسندی باشد
مرا (لف۱۸)

خسپانیدن (اشتر) : اونٹ کا بٹھانا :- گفت لابد اشکر فرو نیایی باری اشتر
بخسپان تا روی ترا و موی ترا بآب خانہ بخویش بشویم (لف۳۵)

خستون = معترف :- هیچ آرزو نبرند و نخواهند این کافران کی خستون نیند مر پیامبری
ترا از توریت خوانان و انجیل خوانان (ب ۲۴)

شکفتہا! ‌شما بید از خود کی بجہری از توریت بگروید و کار بندید بباز خریدن اسیران
و بجھتے بی ستون و ناخستون شوید یکشتن یک دیگر (نف ۱۰)

منکر شدند و ناخستون شدند بھر کتابی کی جز از توریت بود (ب ۱۳)

گفت شما خستون شدید کی بر شما عہد ہم بران گونہ بودہ است کی یاد کردیم
(ب ۹) -

لغات میں 'خستو' نون کے بغیر ملتا ہے -

خوابنیدن (شتر) بٹھانا :- ابرھیم علیہ السلم اشتر بخوابنید این زن نگی بیاورد
ہزیر پای وی نہاد (لف ۳۵)

خوارداشتن = بیقدری کرنا - بیحرمتی کرنا = اندران پنداست مر مومنان را
تا بدانند کی با خداوند تعلی دلیری نباید کرد و فرمان وی را خوار نباید
داشت (لع ۲)

خواستہ = مال :- و ایشان را اندر حصار کرد چند روز تا بر حکم سعد معاذ رضی اللہ
عنہ فرود آمدند ھمہ را بکشت و زن و فرزند و خواستہ ی ایشان بغنیمت گرفت
(ب ۲۷)

ھر چیزی کی شما بدھید و پیش فرستید از خواستھای خویش و کردارھای
نیک و گفتارھای خوب این ھمہ از بھر خود فرستادہ باشید (لع ۲۸)

اھل مکہ را ایمن گردانیدیم از غارت کردن خواستہ و نہ تاراج بردن و زبچگان
ایشان اسیر و بردہ بردن (لع ۳۴)

خوش خوشنک = خوش خوش :- گاو را دید از سر کوہ فرود آمدن گرفت و ھنزد این
جوان آمد و بیستاد و این جوان دست در گردن وی آورد و او را خوش خوشک
ھمی آورد (ب ۳)۔

خیاره = منتخب :- گفت آری این چنین آفریدیم مر شمارا کی مسلمانانید امتی گردانیدیم
شمارا خیاره ترین اُمّتان (لعہ ۴۳)

دانستن = بمعنی توانستن :- اندر زمانہ ی جادوی چنان فاش گشت کی گروهی
مردمان معجزات پیغامبران خویش را صلوات اللہ علیہ جادوی برگرفتندی و
وفرق ندانستندی کرد میان جادوی و میان معجزت (لعہ ۴۳)

دانشومند = دانش مند :- گروهی از جهودان کی کم علم تر بودند و گروهی منافقان با
مومنان هم نشینی کردندی و آنچ از دانشومندان خویش شنیده بودندی بعضی با
مومنان می گفتندی و زان جملہ آن بود کی گفتندی کی مارا دانشومندان ما
خبر داده اند کی این پیغامبر بخواهد بود نشان او در توریت یافتہ ایم و نیز بگفتندی
کی دانشومندان ما مارا خبر داده اند کی از پیشینگان ما بعضی را خدای عزوجل کبتی
بحر دانید (بہ)

داوری = جھگڑا :- ایی شگفتا شما با ما خصومت و داوری می کنید اندر صفت
خداوند ما تعلی (بہ ۴۱)

درحال - فوراً - جھٹ :- چون آن پدید آمد درحال پشیمان شدم پیش ازان خ هیچ جای
آنرا کار نبستم (بہ ۲۳)

دروقت = جھٹ پٹ :- از بهر آزمایش تخم اندر زمین افگندم و آن سخن‌ها برخواندم
دروقت برُست و سبز شد و برُبالید و خوشہ شد چون آن پدید آمد درحال پشیمان شدم
(بہ ۲۳)

دست مایہ = سرمایہ - مایا :- رغبت افتاد وی را بتزویج مادرش گفت یا فرزند دست مایہ
نداری و ضیعتی نداری و حرفتی ندانی کم رغبت کنند مردمان بدادن دخترم
ترا (بہ ۴)

دشخوار = دشوار :- اگر ایشان بدین صفت گاوی بخریدندی مراد ایشان بدان
حاصل آمدی ولکن برخود دشخوار گرفتند و باز پرسیدند موسی را علیه السلم (الف ۳۰)
ایشان را از عرصات قیامت باز گردانند بسوی آتش دوزخ کی آن عذاب
صعب تر و دشخوار تر و دردمند تر از عذاب دنیا باشد (الف ۱)

این روی گردانیدن تو از قبله ی بیت المقدس بسوی بیت الحرام سخت دشخوار
آمد بر دل گروهی از جهودان مگر آنکسها کی ایزد تعلی ایشان را بمسلمانی راه
نموده است کی ایشان را دشخوار نیامد (ب ۲۳)

دشمن وار = دشمن رکھنے والا :- و خدای عز و جل دشمن دار کافرانست (ب ۱۶)

ذنب = دم :- کلبی گفت از استخوان ذنب اویے بر کشته نهادند و بعضی گفتند یکپاره
گوشت کی درمیان دو کتف او باشد بر کشته نهادند کشته زنده شد (ب ۵)

دوژخ = دوزخ :- مرین بی خستونان را ہای و ہی بوداند دوژخ خوار کننده نه
کفارت کننده (ب ۱۳)

هرگز آرزو نکنند ایشان مرمرگ را هرگز هرگز تا اندرین جهان باشند اما اندر دوژخ
بسیار مرگ آرزو کنند اما نمیرند (الف ۱۵)

دوکان = چبوترا۔ مکان کی کرسی :- آدم علیه السلم آنجا دوکانی بنا کرد و فریشته از
پنج کوه سنگ آورد از کوه جودی و لبنان و حرا و طور سینا و طور زیتا چون دوکانی
بر آمد ایزد تعلی خانه ی زرین از زیر عرش بسوی آدم فرستاد با هفتاد هزار فریشته تا
آن خانه را بر میان دوکانی (دکان) بنهادند . . . . اکنون چون آدم علیه السلم
این دوکانی بنا کرد و این خانه بران نهاده آمد (ب ۳۹)

دهش = بخشش۔ عطا : فرمودیم بجای درویشان و بیچارگان نیکوی کنند و مریشان
را دهش دهند (ب ۵) ۔

و بدھید زکوۃ اسے کے دھشنے کے برخواستہای شما اَسکرکردہ اند (لعٰ)

دیوال = دیوار :- واین مردمان کے ماحے نگرفتند و بگرفتن رضانداداند بمیان شہر

دیوالے برکشیدند و ازیشان جدا شدند (لعٰ)

آدم علیہ السلام آن انگشتیرہ اندر انگشت آورد و نورہے ازان بتافتے چون نور

آفتاب چنانک ہمہ درختان بہشت ازان نورانی گشتے و دیوالہاے بہشت

پنداشتے کے ازان نورمے بخندند (بٰ)

چون دیوال بلند شد اسمعیل بر مقام بیستادے (لعٰ۳۶)

دیو مردم = زشت مردم :- چون باز گردند این فرومایگان پسوے آن دیو مردمان ہمتران

خویش (بٰ)

راستاے = مقابل :- فرمودیم تا بہ راستاے خویش و پیوندان نیکو بیہا کنند و رحم پیوستہ

دارند (بٰ)

گفت پایندہ گردانم نیکوبیہاے خویش بر شما این جہانے و آن جہانے و دیگر تا

نیکوبیہاے خویش بہ راستاے شما تمام گردانم (بٰ)

راستیے = یعنی "راستی اینست" :- گفتند اگر تو پیغامبر بودیے راستیے سخنہاے تو در

دلہاے ما جاگیردے (بٰ۱۲)

اگر ایشان راستیے بدانندے کے ایشان را ازین جادوے چہ زیانہا خواہد داشت

نگزیندے جادوے را (لعٰ۲۴)

راستخیز = قیامت ، گفت بروز راستخیز سزاے ایشان آنست کے ایشان را از

عرصات قیامت باز گردانند بسوے آتش دوزخ (لعٰ)

امداد و براف میں "ریست آخیز" (ریست بمعنی مردہ) اور لغات میں رستاخیز و رستخیز

بضم اوّل ' ملتا ہے '

رخشیدن = چمکنا۔ بالضم اوّل لکھا ہے :۔ گویی از رنگ موی وی آفتاب می
برخشیدی (ب ۲)
لغات میں بفتح اوّل آتا ہے

رسیدگی = بلوغ :۔ واجب شدن نماز را سه شرط است یکی مسلمانی دیگر رسیدگی
سدیگر عاقلی (الف ۹)
واجب شدن زکوة را هفت شرط است یکی مسلمانی دیگر رسیدگی سدیگر عاقلی
(الف ۹)

رش = ہاتھ۔ گز :۔ بالای خانه نه رش کرد و پهنای آن سی رش پس ایزد تعالی
زکان را بسوی او فرستاد (الف ۲۶)
لغات میں بفتح اوّل ہے

رشک = جلاپا۔ سوتیا ڈاہ :۔ زنی بنزدیک عایشه آمد رضی الله عنها و گفت که
شوی وی زنی دیگر کرده بود و مرا رشک وی می رنجه داشت (ب ۲۳)
و ابرهیم را علیه السلم از هاجر اسمعیل بیامد ساره را ازان رشک آمد ابرهیم را
گفت این کنیزک را با پسر از پیش من غایب کن (ب ۳۴)

روفتن = جھاڑنا :۔ کافران مکه بآبادان داشتن خانه ی کعبه و روفتن واندودن بر
مومنان فخر کردند خداوند تعالی رد کرد قول ایشان گفت نه آبادی مسجد اندر
روفتن است جه آبادانی مسجد اندر مومنانست که اندر وی نماز کنند (ب ۲۹)

زبان بند = جادو سے زبان باندھ دینا :۔ آن زنکان که ریسمانها گره کنند واندران
می دمند و آن را زبان بند نام می کنند (ب ۲۳)

زشت نامی = بدنامی :۔ گفتند یا موسی ما این دیت بدهیم و سوگند بخوریم اما
این زشت نامی باشد که بر ما نشیند دعا کن خداوند را تا بما باز نماید که او

راکہ (کذا) کشتہ است (ب)

زلیفن = بروزن طپیدن بمعنی ترسانیدن و تہدید کردن :- گفت مژدکان دھندہ فرستیدیم ترا مر گرویدگان را بہشت و بزلیفن کردن فرستیدیم مرترا مر ناگرویدگان را بدوزخ (ب ۳۲)

زناشویی = میاں بیوی :- این جهودان و دیوان و جادوان از ایشان یاد گیرند بدانک ایشان را آموزند سخنهایی کہ بدان سبب میان زناشویی جدایی افکنند (ب ۲)

زہی = لغات میں ملتا نہیں - زہیدن کا حاصل مصدر ہے - اس سے مراد ایسے مویشی ہیں جو نسل کشی کے لئے رکھے جاتے ہیں :- واجب شدن زکوة را صفت شرط است اول مسلمانی دیگر رسیدگی سدیگر عاقلی چهارم بی قامتی پنجم نصابی تمام ششم تمام شدن سال هفتم اگر چهارپایی بود چنان باید کہ زہی باشد یا از بهر تجارت این صفت شرط کی نبود زکوة واجب نیاید در قول بو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (لع ۹)

چہار مقالہ سے فقرۂ ذیل :- چون بحضرت چغانیان رسید بهارگاه بود و امیر بداغگاه و شنیدم کہ هجده هزار مادیان زہی داشت هر یکی را کرہ در دنبال و هر سال برفتی و کرگان داغ فرمودی (مقالۂ دوم - ذکر فرخی)

ستدن = لینا :- جوامرد جواب داد کہ و مردمان مرا چگونہ ذمت و من بستدن گاو مردمان استحلال نکنم (لع ۲)

ایزد تعالی فریشتہ ای را بفرستاد تا ابلیس را هزیمت کرد و آن گاو از وی بستد و بجوان باز آورد (ب ۲)

سخت = سخت تر :- دلهات شما چون سنگهاست بسختی نی چہ از سنگها سخت تر آب تر (لع ۶)

سخون = سخن :- پرسیدندت ایشان راکت فلان، تو‌ت و فلان کدامست سرمی جنبانیدت
وبزبان سخون نتوانستندت گفت (ب ۱)

معنت این سخون آنست کت آن گاو بهزروت چنان باشدکت حرکت درووت نکرد
پشکفتی بماندو دلش شادمانه گرد (لعـ ۳۱)

وهم ازین گونه میان ایشان سخون رفت تا جوان چنین گفت کت من بی فرمان مادر
کاری بکنم (لعـ ۴۲)

لغات میں یہ شکل نہیں ملتی - قدیم مخطوطوں میں بکثرت موجود ہے - اور غالباً رسم الخط
کی بنا پر ہے

سدیگر = تیسرا :- دوشب و دو روز مت رفت چون روز سدیگر بود بدید این گاو را
بدین نشان اندر چراگاه مت (ب ۴)

واین را سدیگر معنت هست (ب ۳۴)

ومعنت سدیگر تا مریشان را بدادن زکوة پاکیزه گرداند از گناهان (ب ۳۸)

سرگزید = سربها - زرفدیہ :- چه باشد سزات آنکس کت این چنین کند جزهات وة
ورسوایت ونکوهش اندین جهان بستدن سرگزید ازیشان وکشتن بنت قریظیان
وزشهر راندن بنت نضیریان (لعـ ۱)

سُروُن = سینگ :- آن گاوت استکت همه پوست او زرد است زردِ زرد تا شُخُلها
وسُرونش نیز زرد است چنانک شادمان گرداند مرنگرندگان را (لعـ ۳۱)

لغات میں بفتح اوّل بروزن زبون ملتا ہے

سرپاکان :- لغت میں ملتا نہیں بظاہر دانا پیشوا کے معنوں میں معلوم ہوتا ہے :- از
جهودان گروهت نادانانند توریت خوندانند جز آن بیهدهات ترفندهاکت
از سرپاکان ودانشمندان خویش مت شنوند و بندارندکت آن علم است (لث)

لغت فرس میں ایک لفظ سرچیک بمعنی سرہنگ ملتا ہے۔ جسکی مثال میں مولف نے عنصری کا شعر ذیل دیا ہے :-

اے بر سر خوبان جہان بر سرچیک   پیش دہنت ذرّہ نماید خرچیک

ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی لفظ کی مختلف صورتیں ہوں

ستون = لغات میں نہیں ملتا مگر خستون کا مرادف ہے 'بے' کے الحاق سے منکر کے معنی دیتا ہے :- حرکتِ بدت الفنجداے کت بخدای عزوجل شرک آرد بے ستون کرد و بحق رسول او ناخستون کردد (لف۸)

بہ پیامبرت او بے ستون گشتند (لف۱۳)

و نفرین خدای باد برین چنین بی ستونان (لف۱۳)

آنکسها کت بہستے خداوند تعلی بی ستون گشتند (لف۲۳)

سزاوارے = سازواری - سازگاری و موافقت :- اختلاف میان دوتن ناسزاواری بود کت حرکت ازیشان مر یار خورا دانج شکوید و کند موافقت نکند (ب۲۹)

سوگندیان = حلیف و ہم سوگند :- سوگندیان خویش را و دوستان خویش را یاری مے دھید بر قہر کردن اھل دین خویش (ب۹)

سون - سوی - طرف :- بر یک سون انگشتیرہ نبشتہ بود اَنَا اللّٰہُ لَمْ اَزَلْ و بدیگر سون اَنَا اللّٰہ الحَقُّ القَیُّوم و بر سدیگر سون اَنَا اللّٰہُ العَزِیزُ لَا عَزِیزَ غَیْرِی و بر چھارسون آیۃ الکرسی (لف۱۸)

و چون بمدینہ آمد ھم بران سون نماز مے کرد (ب۴۲)

مے بینیم آن روے گردانیدن تو بسوے آسمان و برسون نکریستن تو اندر نماز وجز آن از بھر آمدن جبریل را علیہ السلم (ب۴۲)

بدان قبلہ کت فرمودم روے بدان سون کنے (ب۴۲)

سیکی = تھائی :- ہشت وارہ یہ ہیزم آوردی و آن را بفروختی بھای آن سہ قسمت
کردی سیکی بدرویشان دادی و سیکی خود خوردی و سیکی بمادر دادی (لف۲)

شادمانہ = خوش :- در خبر آمدہ است از پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بر شما باد کی نعلین
از پوست گاو زرد دارید دل شادمانہ گردید و دور باشید ازین نعلینھا کی از پوست
گاو سیاہ کنند کی آن مر دل را غم افزاید (لف۳)

شارستان = شہر :- قومی بودند اندر شارستان اَیلہ اندر ایام داود علیہ السلام و این
اَیلہ جاییست بر کنارہ یہ دریای طبریہ (لف۱)

و چون روز شد این مردمان مصلح در شارستان خود بگشادند و بیرون آمدند و آن درِ
شارستان دیگر گشادہ نشد (ب۱)

جبریل دشمن ماست و اوی از آسمان جز عذاب نیارد و شارستانھا را او ھلاک
کردہ است (لف۱۶)

شایست و ناشایست = حق و باطل - نیک و بد :- فرو فرستادہ ایم آیتھای قرآن
پدید کردہ اندر وی بایست و نابایست و شایست و ناشایست و فرمان و نھی و را
منکر نشوند مگر فاسقان بی فرمانان (ب۱۶)

اس سلسلہ میں یہ جملہ بھی یاد رہے :- معنی حق بپارسی چیزی شایستہ باشد
و بپارسی باطل ناشایستہ (لف۲۲)

شُکرُوفان = مفسرین کے ترجمہ 'زبان زدگان' کی صفت ہے :- گفت آنکسھا کی
ھستی خداوند تعالی بی ستون گشتند و بہ پیغامبری و قرآن ناخستون گشتند
ایشانند زبان زدگان شُکرُوفان (لف۳۳)

لغات میں یہ لفظ ملتا نہیں ممکن ہے کہ 'شکرف' کی پرانی شکل ہو یا زبان زدگان کے
ہم معنی ہو -

شکفت = تعجب :- او مى گفت بده دينار كم ندهم شكفت آمد ايشان را از وى گفتند
كاوى را ده دينار باز آمدند هنوز موسى (ب۲)

چنانك شادمانه گرداند مرنكرندگان را كه در وى نگرند و بشگفت آرد ايشان را (الف۳)

اى شگفت كارا هين مسلمانان بگفتيد كى خداوند تعلى با شما و با پدرانتان چه كرده
است (ب۲)

شكفتتان نبايد از خود كى بيهرى از توريت بگرويد و كار بنديد بباز خريدن اسيران
(الف۱)

شگفتا = اى تعجب :- گويند اين پيش روان مرين پس روان خود را اى شگفتا شما
هين ياران محمد صلى الله عليه وسلم بگفتيه آنچ خداوند تعلى اندر توريت با شما گفته
بود (ب۱)

بگوى مر ايشان را اى كى جهود و ترسا آن را اى شگفتا شما با ما خصومت و داورى
مى كنيد اندر صفت خداوندما تعلى (الف۲)

شكفتى = تعجب :- معنى اين سخون آنست كى آن گاو هنر وى چنان باشد كى
هر كى در وى نگرد بشكفتى بماند و دلش شادمانه گردد (الف۳)

شنبد = شنبه :- و روز شنبد از هر جايى از درياها ماهيان بزيارت وى آمدندى
(الف۱)

قوم خود را بگوى تا روز شنبد ماهى نگيرند (الف۱)

چون روز شنبد ماهى بسيار بيامدى بر اثر آب اندرين حوضها گرد آمدندى و ايشان
بشدندى و بند آب را ببستندى (الف۱)

شُنشُكُل :- گفت موسى كى خداوند تعلى چنين گفت كى آن گاوى است
كى همه پوست او زرد است زَرْدِ زَرْد تا شنشكلها و سُرُونش نيز زرد است

چنانک شادمانہ گرداند مرنگرندگان را کی دروی نگرند (الف۳)
لغات میں ایک لفظ شنگلہ بروزن زنگلہ بمعنی جھالر و طرّہ ملتا ہے۔

شوی = شوہر:- فردا ہنزدِ من آیے تا ترا یاری دھم برشوی تو (الف۲۲)
کسی ہنزدیک زنی آید مردرا گوید من ترا جادوی آموزم یا از بھر تو جادوی
کنم تا شوی تو مر ترا دوست گیرد واین زن ہدان رضا دھد دیا آن بیاموزد بدین اعتقاد
جادوی مرتدہ گردد و از شوی خویش باین گردد (ب۱۲)
زنی ہنزدیک عایشہ آمد رضی اللہ عنھا و گفت کی شوی وی زنی دیگر کردہ
بود و مرا رشک وی می رنجہ داشت زنی مرا گفت من ترا بجایی برم کی ترا
چیزی آموزند کی برشوی خوانی آن زن را دست باز دارد (ب۲۳)

طور زیتا = کوہ زیتون بیت المقدس کے ایک پہاڑ کا نام:- و فریشتہ از پنج کوہ
سنگ آورد از کوہ جودی و لبنان و حرا و طور سینا و طور زیتا (ب۲۶)

عکازہ گیر = صاحب عصا:- و سلیمن اندر نماز بود با دوازدہ سبط بنی اسرایل ہر سبطی
دوازدہ ھزار مرد از علما و حکما و اھل درس و کتب و مرومانی برنس دار و عکازہ
گیر از زھاد و عباد و دیگر نیکان (الف۱۵)

ثام = بدل وام۔ قرض:- واجب شدن زکوۃ راھفت شرط است اول مسلمانی دیگر
رسیدگی سدیگر عاقلی چھارم بی ثامی پنجم نصابی تمام (الف۹)

فرستیدن = بھیجنا:- اندر وقت ایزد تعلی جبریل را علیہ السلم بعتاب بفرستید کی
یا سلیمن اگر این قربان از بھر من کردی سبک داشتی مرا چہ بھر من قربان اُشتر
باید یا گاو باید یا گوسپند (الف۱۹)
ایزد تعلی پیغامبر ما را صلی اللہ علیہ وسلم بخلق فرستید و سوی او آیت فرستید و
و بیان کرد کی آن کتب دیوان نبشتند نہ سلیمن (الف۲۱)

گفت یا محمد ما مر ترا کی بفرستیدیم براستی فرستیدیم نه بدروغ و بسزا فرستیدیم
نه بناسزا ای کی بدین حق فرستیدیم و پیغامبری بحق فرستیدیم تو بدین دعوت
راست گویی نه دروغ زن (لف ۳۴)

فُرغُول کار = فراموش کار :- نیست خداوند تعلی از کردهایه شما بی خبر، گفت کی
خداوند تعلی از کردهای شما فُرغُول کار نیست (لف ۶)

فرود آوردن = گرا دینا :- ویران کردن مسجد نه آن بود کی مسجد فرود آرند اما از جماعت و
نماز خالی ماند ویرانی مسجد آمد (لب ۲۹)

فرود گذاشتن = معافی دینا :- و یا جنانست کی شمارا فرود گذارد بی از انک شمارا
مکافات بدیها تان بدهد (لف ۴۲)

فرویش کار = گفت نیست خداوند تعلی از کردهایه شما بی خبر و گفت کی خداوند تعلی
از کردهای شما فُرغُول کار نیست گفت است کی فَرویش کار نیست (لف ۶)
گفت خدای عزوجل از پای وی ایشان فرویش کار نیست و از کردهای ایشان
بی خبر نیست (لف ۱)

فروشدن = اترنا :- در شارستان دیگر گشاده نشد عجب داشتند و جون روز بلند
بر آمد از سوی دیوال کسی را بر فرستادند تا بیاهمهای ایشان فروشد (لب ۱)

فریشته = فرشته :- ایزد تعلی فریشته یی را بفرستاد تا ابلیس را هزیمت کرد و آن کاد
از وی بستد و مجان باز آمد (لب ۴)
مادر گفت یا پسر پندارم کی آن فریشته یی است مر ترا بیا باز ماید کی تو حق مادر
چگونه نگاه داری باز گرد و مران فریشته را بگوی کی چه فرمایی تا این کار را بکنم
فروشم جوان پسر و فریشته باز آمد و زوی بپرسید فریشته گفت بدانک مرا خدای
عزوجل فرستاده است (لف ۵)

فریمانیدن = فریب دینا:- آخر چون فتنہ مستحکم گشت خواست کہ مردرا بفریماند
بنی آہنگ اندر دین او خلل اندر آید بفرمود تا ملخی را بیاوردند وگفت این ملخ
را از بھر بُت تو قربان کنم کارد برنھاد و سرِ ملخ ببرید (لعہ ۱۹)

فسوس = تمسخر- مذاق- کھلّی اڑانا:- گفت خداوند تعلی فرمودہ است تا گاوی بسمل
کنید گفتند یا موسی برما فسوس می کنی (لعہ ۲)
برخود دشوار گرفتند اول گفتند یا موسی تو بر ما فسوس می کنی (ب ۲)
جھودان چنین گفتندی: چرا ابن محمد را چندین رای است وبریاران خویش فسوسھا
کنندگاہ شان فرماید تا روی بدین جانب کنند وگاہ فرماید تا روی بدان جانب کنند
(ب ۴۲)

قیمت روز:- روزمرہ کی قیمت:- گفت این گاو بیافتند بنزدیک کسی وآن بقیمت
روز ازوی بخواستند او می گفت ہدہ دینار کم ندھم شگفت آمد ایشان را از
وی (ب ۲)

کارکوفتہ = جتا- چلتا- کام دیتا:- آن گاو یست کہ ھنوزش بکار اندر نیفگندہ اند
وکارکوفتہ نگشتہ است بکشت کردن و بدلو آب گردانیدن (ب ۳)

کارناکن = ان جتا- اچل- بن جتا:- گفتند از بھر ما یکی بخوان مر خداوند خود
را تا بدید کند کہ این گاو چہ گاو است کارکن است یا کارناکن کہ صفت این
گاو پوشیدہ گشت بر ما ما درنیابیم (لعہ ۳)

کاسکی = کاشکے:- ابن عباس رحمۃ اللہ علیہ گوید کاسکی بدانمی کہ با آن سوم چہ کردہ
بود کردند (پ۱)
روزی پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم مر جبریل را گفت علیہ السلام ای کاسکی
بدانمی کہ کار و بار مادر و پدرم چگونہ شدہ است (ب ۳۲)

کپیّ = بوزینہ - بندر :- یافتند مریشان را ہمہ کپیان گشتہ خروش برداشتند و
درہای شارستان بکشادند و اندر آمدند یافتند اندر خانہا دہ کان و بچگان و کم
و بیش مرد و زن کپی گشتہ (بّ)
گروہی گویند کی ایشان برستند و گروہی گویند کی ایشان نیز کپی گشتند
(بّ)
و نیز بگفتندی کی دانشومندان ما مارا خبر دادہ اند کی از پیشینگان ما بعضی را
خدای عزوجل کپی شکر دانید اندر زمانہ ی داود علیہ السلم و بعضی را خوک
شکر دانید اندر وقت عیسی علیہ السلم (بّ)

کرباس = گزی :- این نہ آن مرداست کی ما اندر توریت نعت و نشان او یافتہ ایم
کعب مریشان را لختی چوُ بخشید و شکزاپے چند کرباس (بّ)

کریچک = ٹپری - جھونپڑی :- ھاجرُ از خاشاک کوہ وز خار بنان وادی خویشتن
را کریچکی ساخت و پارہ ی آب داشت اندر مشکی کھن (لعہ)

اکشن = لغات میں یہہ لفظ نہیں ملتا :- بندگان خداوند تعلی از اطراف زمین اینجا
آیند لبیک گویند سرہا اکشن شدہ و گرد آلود گشتہ و گرد آن خانہ طواف کنند و
این آب شراب آن مہمانان خداوند تعلی باشد (بّ)

کیسوی = گیسو :- و این روز کی زن پسرش کیسوی وی بشست اوی بر براق
بود (لعہ)

گردن برد = گردن کش ؟ :- کیست بر تن و جان خود بی دادگرتر و بر خداوند تعلی
دلیرتر وز خداوند گردن بردتر ازین کسہا کی پنہان کردند آن گواہی کی خداوند
را تعلی بود ہنزد ایشان درباب پیغامبر ما صلی اللہ علیہ وسلم (لعہ)
گفت کیست از مردمان برخویشتن بیداد شکرتر وز خداوند تعلی شکوہ دن بردتر و

بر خداوند خود دلیر تر از آنکس کہ او باز دارد نماز کنان را از مسجدھا یِ خداوند تعلی و نگذارد یاد کنندگان را کہ در مسجدھا خداوند را تعلی یاد کنند (ب ۲۹)

گرویدن = ایمان لانا :- گفت آنکسھا کہ بگرویدند و بگروند بھستی خدای عز و جل و بفریشتگان و بکتابھا و پیغامبران و کار نیکی کنند و فرمان بردار باشند (الف ۹) می نگروند بسخنھای تو مگر گرویدنی اندک و نیز گویند بگروند مگر اندکی از ایشان (ب ۱۲) گفتند نگرویم تا ما را از میان این کوھھا چشمھا یِ آب پدید نیاری (ب ۲۶)

گویند کہ نوح ہیچ پیغام تو بما نرسانید اگر رسانیدی ما بگرویدیمی (الف ۴۳)

گم بوده = گم شده :- ھر کسی کہ او ایمان را بکفر عوض کند کفر را بر ایمان برگزید گم بوده کرده باشد مر راه راست را و رھا کرده دین مسلمانی را (ب ۳۶)

گوا = گواه :- ایزد تعلی از بھر اظھار عدل را از نوح علیہ السلم گوا خواھد (الف ۴۳) گفت تا رسول مر شما را گوا باشد ای کہ مُعَدّل و مزکّی باشد (الف ۴۳)

گوایی = گواھی :- نوح علیہ السلام این امت را بگوایی خواند تا از بھر او ی گوایی دھند و گویند کہ نوح علیہ السلم پیغام بدیشان رسانید (الف ۴۳) نوح مر آمت را چہ گفت و امت مر و را چہ جواب دادند ایزد تعلی گوایی این امت بپذیرد (الف ۴۳)

گواژگی = حریص :- گفت ایشان را ھر آینہ از ھمہ مردمان دیگر بر زندگانی حریص تر یابی ای کہ گُوَاژگی تر یابی ھا رسی حرص گواژه کردن باشد و معنی حرص سیر ناشدنی باشد از یافتن چیزی اگر چہ بسیار یابد (ب ۱۵)

گواژه کے معنے لغات میں ' طعن و تشنیع دیے ہیں -

مادرگان = ننھیالیے :- گفت چیست کہ فرزند گروھی بہ پدگان ماند و گروھی

ناگرویدگان پیغامبر گفت صلے اللہ علیہ وسلم هرکرا آب غلبه کند فرزند بکسهات او ماند (ب ۱۵)

مژدگان دهنده = بشیر - خوش خبری دینے والا :- گفت مژدگان دهنده فرستیدیم ترا مر همه مردمان را ببهشت و بیم کنندهٔ فرستیدیم مر ترا مر ناگرویدگان را بدوزخ (الف ۳۲)

مژدگان دهنده بهشت جاودان مر مومنان را (ب ۱۶)

مژدگانی = مژده - خوش خبری :- گفت صلے اللہ علیہ وسلم اَنَا دَعْوَةُ اَبِی ابرهیم وبُشْرَیٰ اَخِی عیسیٰ منم دعات پدر خویش ابرهیم ومژدگانی برادر خویش عیسیٰ (ب ۳۵)

مسله = مسٔله :- و اندرین مسله اختلافست هنزدیک ابوحنیفه رحمة اللہ علیہ (الف ۲)

مندیش = میندیش :- گفت مندیش ازیشان و مترس روی ازین قبله بدان قبله گردان و ازمن ترس (ب ۴۶)

ناخواهانی = بے پروائی - ناخواستگاری - بے رغبتی :- کیست کی ناخواهانی کند مردین ابرهیم [را] مگر آن کس کی خودرا و قدر خودرا نشناسد معنی این سخن بجمله آن باشد تا جاهلی نباشد وبی خردی و بی قیمتی مردین ابرهیم را ناخواهانی نکند (ب ۳۸)

کیست کی مردین این چنین کس را ناخواهانی بکند نباشد مگر جاهلی ونادانی (الف ۳۹)

نبخت = قرآن پاک :- چون هنزد ایشان نامه یی آمد از خدای عزوجل وآن قرآنست وقرآن را بپارسی نبخت گویند برابر آمد با آن نامه کی ایشان دانند وآن توریت است (ب ۱۲)

این بعث وحسد ورشک بدان ظاهر کردند کہ ایزد تعالے پیغامبری بدان
کس داد و بعث بدان کس فرستاد از بندگان خویش و آن محمد است صلے اللہ
علیہ وسلم (۱۳ب)

اگر چنانک شمار است گویید بدینچ مے شکویید کہ ما مومنانیم واین بعث
کہ حق است با توریت برابر بتوحید ایزد تعالے و بعث محمد صلے اللہ علیہ
وسلم چرا این را باطل مے شمرید (۱۴الف)

بضم اول و کسر ثانی در برہان و رشیدی و در کشف بکسرتین نیز آمدہ

نشاختن = مرادف نشاندن :- شب اندر آمد دوسک یا دو گربہ بیاورد واللہ اعلم
یکے خود برنشست و یکے مرا نشاخت رفتیم تا بجایئے رسیدیم کہ دو شخص
دیدیم نگوسار (۲۳ب)

نشانی = نشانی :- گفت بدادیم مرعیسے را پسر مریم را علیہما السلام نشانیہائے
بر راستے پیغامبری وزان نشانیہا یکے آن بود (۱۱ب)

نفرین = لعنت - دعائے بد :- نہ چنانست کہ ایشان مے گویند جز آنک دلہای
ایشان را و ایشان را خدائے عزوجل بنفرین (کذا) کردہ است وزخود دور
کردہ است (۱۲ب)

گفت سزاوار گشتند مر نفرین خدائے را تعالے و خشم او را نفرینت بس نفرینت
تا جاویدی اند موجب آن نفرین و آن خشم بمانند (۱۳ب)

نژند = فرہنگوں میں بمعنے غمناک و اندوہگین - یہاں بمعنی زبون و ذلیل :- سرانجام
خداوند تعالے این غم و شغل جہودان از پیش دل تو برگیرد و ایشان را نژند
و ذلیل شما گرداند (۴۰ب)

نفی کردن = نکالنا - خداوند تعالے بر قتل بعضے برکشتن دشمنان خویش و نفی

کردن از شهرها مر دشمنان خویش را قادرست و توانا (۲۷ ب)

نگوسار = اوندھا :- رفتیم تا بجایے رسیدیم کے دو شخص دیدیم نگوسار آویختہ مرا پیش ایشان برد و بیستانید ایشان آواز کردند کے میاموز آنچ ما گوییم کہ کافر شوی (۲۳ ب)

لغت میں کاف فارسی سے ملتا ہے

نوسپاسے = ناسپاسی - ناشکری :- و نوسپاسے کروند نعمتے را کے خداوند تعلی مریشان را دادہ است

نیک آمد = بہبود و بہروزی :- خدای عز و جل مر شمارا دینے گزیدای کے بھر نیک بختے شما را و نیک آمد شما را دین اسلام - نہ میرید مگر بر مسلمانی (۳۹ الف)

نیکوی = نیکی :- آنکے مرترا جز از خدای عز و جل کے باشد دست گیرے و کارسازی کے ترا منفعت نماید و از وے نیکوی باشد (۳۳ الف)

کعب اَشرف گفت بنی نَضیب شدید از خیر بسیار مرانیت آن بود تا بجای شما نیکوی کنم اکنون شما مرورا راست گویے داشتید از خیر من بنی نضیب گشتید (۳ ب)

و بفرمودیم تا بجای مادران و پدران نیکوی و کردار کنند و بحق مریشان را فرمان بردار باشند (۴ ب)

وَابِشَا وَانَمُ = بے بس و عاجز کردو نگا :- گفت یا ابرهیم کافران را و مومنان را روزے دهم ولکن کافر را وَابِشَا وانمُ اندران جهان پیامے واسے دردناک است بدجای کے آنست (۳۶ الف)

فرہنگوں میں نہیں ملتا - ثُمَّ اَضْطَرَّهٗ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ کے ترجمہ میں آیا ہے -

وعدہ نہادن = وعدہ کرنا :- وھریکے از ایشان این زن راجدا جدا پنہان از یار خویش وعدہ نہادند کے فردا بنزد من آیے تا ترا پارےٗ سیم بر نشوتہ تو (لہ ۲۲)

ھرووان = آن یا اسم اشارہ ہے یعنے آن ھردو یا مزید علیہ :- ایشان عذاب دنیارا بر عذاب آخرت اختیار کردند اکنون ھرووان را از بابل آویختہ اند و عذابشان مے کنند از وقت نماز بامداد تا وقت آفتاب بر آمدن و از وقت نماز دیگر تا وقت آفتاب فرو شدن (ب ۲۲)

ھفدہ مایگان = سترہ ماہ - ماہ کی 'ہ' 'ی' کے ساتھ بدل گئی ہے :-
جون پیغامبر صلے اللہ علیہ وسلم ھجرت کرد از مکہ بمدینہ آمد و نماز سوے بیت المقدس کرد ھفدہ مایگان و ھژدہ نیز گفتہ اند وشانزدہ نیز گفتہ اند بعضے گویند تا بمکہ بود ھم بران سون نمازش فرمودہ بودند تا فرق بودے میان او و میان کافران مکہ (ب ۲۲)
گفت کے ایشان را چہ بر گردانید ازان قبلہ کے نماز کردندے بران جانب ھفدہ مایگان (ب ۲۲)
گفت نفرمودہ بودیم ما ترا بدان قبلہ کے ھفدہ مایگان بسوے آن نماز کردے (ب ۲۳)
معلوم ہوتا ہے کہ ماہ کی 'ہ' اس لفظ میں 'ی' کے ساتھ بدل گئی ہے - جس طرح راہگان ورایگان اور شاہگان وشایگان وغیرہ میں

ھم چونین = اسی طرح :- بنگرید تا اندر آسمانہا از شما فریشتگان کیست خویشتن دارتر و پارساتر صد فریشتہ بگزینید و پس گفت نو فریشتہ بگزینید و پس گفت ھشتاد ھم چونین تا گفت از جملہ ےٗ ایشان سہ تن را اختیار کنید (ب ۲۱)
آب انگور بجہ جاے رسد مست گردد و خوردن آن حرام گردد و بجہ جایگاہ باشد کے

خوردن آن حلال باشد بدین آن خواهد تا او را حلال از حرام باز نماید این فریشتگان نیز همچنین بودند (الف ۲۳)

بگویید تا با فرزندان خویش و فرزند فرزندهم چونین خبر کنید و منید تا بدان پیغامبر بگروند (الف ۱۷)

همیشگی = ہمیشہ ۔ سزاوار گشتند مرنفرین خدای را تعلی و خشم او را نفرینت بس نفرینت تا همیشگی اندر موجب آن نفرین و آن خشم بمانند (۳ب)

هوازی = لغت میں بمعنی یکبار و یکایک ملتا ہے ۔ اور فرخی کا یہ شعر سند دیا ہے ؎

هوازی مرا گوید آن شکرین لب که ای شاعر اندر سخن ژرف بنگر

اور قطران ؎

آن مرا شیرین چو جان است و گرامی چون جهان از جهان و جان هوازی کس ندارد دست باز

ان شعروں میں یکایک اور ناگہاں کے معنی بالکل چسپاں ہوتے ہیں ۔ پروفیسر برون کے ہاں انہی معنی میں مثال ذیل دی گئی ہے :-

" داود علیہ السلم بس آن مرغ بر بام شد تا مرو را بگیرد ان مرغ زاستر (بزاں سوتر) برید داود از پس او زاستر شد هوازی نگاه کرد زن اور یا را بدید برهنه بر سر حوض ایستاده اندر سرای خویش و خویشتن را همی بشست " (ص۲۹۳ جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی بابت ۱۸۹۴ء)

یہ معنی ہماری تفسیر میں مناسب نہیں معلوم ہوتے ۔ میں پورا فقرہ درج کئے دیتا ہوں ۔

" وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ گفت اگر تو بقبلهٔ ایشان نماز کنی و یا بدین ایشان اندر آیی از پس آن کی ترا آگاهی داده باشد کی دین خدای مسلمانی است و قبلهٔ حق کعبه است اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ تو هوازی آن کی از جملهٔ بی داد گران باشی بر خویشتن ۔

شاید کی این خطاب مر ورا بود و مراد دیگران را بود و شاید کی این خطاب او
را بود و مراد هم مراو را بود از یراج اشکی بنده معصوم است از پند و زامر
و نهی خالی نباشد (لف۲۵)

ہم سمجھتے ہیں کہ مفسر نے یہاں 'ہوازی' کو 'درالحال' کے معنوں میں استعمال کیا ہے

یادوار کردن = یاد میں لانا :- گفت یاد کن و یاد دار کن ما پیمان بستیم وسوگند دادیم
مر فرزندان یعقوب را علیه السلم اندر توریت بر زبان موسی علیه السلم تا نپرستند
جز مر یک خدای را عزوجل

یک شنبد :- ماهی اندران حوضها بماندی و باز نتوانستی گشت چون روز یک
شنبد بودی برفتندی و آن ماهیان را بگرفتندی و گفتندی ما روز یک شنبد
می گیریم نه روز شنبد مردمان آن شهر بر سه قسمت شدند یک گروه با ایشان
یار شدند بگرفتن ماهی و گفتند راست گویند این روز یک شنبد گرفته مے
شود نه روز شنبد (لف۱)

یکی = بایای مجهول مزید علیه یک :- از عکرمه روایت آرند کی بنی اسرائیل را
یکی مسجد بود آن را دوازده در بود از آنج ایشان دوازده سبط بودند (لف۲)

بار دیگر معاودت کردند و گفتند از بهر ما یکی بخوان مر خداوند خود را تا پدید کند
کی این گاو چه گاو است (لف۳)

کافران گفتند مر عیسی را علیه السلم کی تو مر مردگان تازه را می زنده کنی وشاید
بود کی هنوز جان از یشان بر نیامده است تمام خواهیم کی ما را یکی مرده ی کهن
زنده کنی (لف۱۱)

یکی = بایای مصدری، ایک ہونا - واحدیت - احدیت یکتائی :- گفت ابرهیم علیه
السلم خالص گردانیدم دل خویش را و یگانه گشتم از بهر خداوند خویش را و بیکی(۲۱)

او اقرار داوم (للف ۳۹)

یگانه = خالص مخلص۔ یا ابرھیم این بتان کی ھدرانتان مت پرستند جز نیند خالص کردان دل خویش را بشناخت خدای عز وجل و عبادت یگانه کن مر ورا و مر ورا بیگانگی اقرار ده گفت ابرھیم علیه السلم خالص گردانیدیم دل خویش را و بیگانه گشتم از بھر خداوند خویش را (للف ۳۹)

گفتند یارب ماھر دو را یگانه ی خو گردان ای کی ما را چنان گردان بیگانگی ترا بشناختیم چنان پرستیم و اندر پرستش تو ریا و نفاق و شرک اندر نیاریم (للف ۳۸)

یله کردن = ترک کرنا - چھوڑ دینا :- حذیفه را گفتند این عمار بی راه شده است و دین ھدران یله کرده است تو چه گویی بار ای (للف ۲۷)

فرمان داد تا ایشان را اندر حصار کردند و چند روز اندر حصار بودند پس صلح بران افتاد کی خانمان و ضیاع و مال یله کنند خود با عیال از ناحیت حجاز بیرون روند بسوی شام (تب ۲۷)

کافران گفتند چه شد این محمد را و یاران او را کی قبله ی خود یله کردند و روی سوی قبله ی ما کردند ھم چنانک بقبله ی ما باز آمدند امید ھست کی بدین ما باز آیند (تب ۴۲)

یوبان = آرزومند - شایق - امیدوار :- دلھای مومنان سوی آن یوبان گردانیم چه اگر کسی بسیار دیده باشد ھم یوبان آن باشد و اگر چه رفته باشد باز دیگر باره آرز و برد (للف ۲۴)

یوبه گاه = امیدگاه :- گفت یاد کن یا محمد کی چون ما مر خانه ی کعبه را مثابه گردانیدیم و یوبه گاه دلھای مومنان گردانیدیم ای کی دلھای مومنان سوی آن یوبان گردانیدیم (للف ۲۴)

صاحب فرہنگ انجمن آرای ناصری کہتے ہیں کہ یوبہ در اصل بوبہ یعنی آرزو ہے یوبہ پڑھنا غلط ہے'

اقتباسات تفسیر ہذا

قومی بودند اندر شارستان اَیْلَہ اندر ایام داود علیہ السلم و این اَیْلَہ جاییست برکنارہ ی دریای طَبَرِیَہ و اندران دریا ماهی بودہ است کی آن را زاهِدَہْ خواندندی و روز شنبد از هر جایی ازدریاها ماهیان بزیارت وی آمدندی چنانک روی آب از ماهی پوشیدہ گشتی ایزد تعالی بداود علیہ السلم وَحْی کرد کی قوم خودرا بگوی تا روز شنبد ماهی نگیرند و گرفتن آن حلال ندارند و ایشان یکچندی برین جملہ فرمان نگاہ می داشتند پس مردی چند ازین ناپاکان بی باکان شیطان مریشان را بران داشت کی روز آدینہ حوضها ساختند و ز دریا آب را بدین حوضها راہ دادند چون روز شنبد بودی ماهی بسیار بیامدی بر اثر آب اندرین حوضها گرد آمدندی و ایشان بشدندی و بند آب را ببستندی تا ماهی اندران حوضها بماندی و باز نتوانستی گشت چون روز یک شنبد بودی برفتندی و آن ماهیان را بگرفتندی و گفتندی ما روز یک شنبد می گیریم نہ روز شنبد مردمان آن شهر برسہ قسمت شدند یک گروہ با ایشان یار شدند بگرفتن ماهی و گفتند راست می گویید این روز یک شنبد گرفتہ می شود نہ روز شنبد و یک گروہ با ایشان بدین موافقت نکردند و با ایشان نساختند و گرفتن ماهی روا نداشتند و یک گروہ دیگر خاموش بودند و با این ماهی گیران بساختند مهمان ایشان می شدند و با ایشان

غاست نشست محت داشتند] واین مردمان کی ماهی نگرفتند و هرگز فتی رضا نداد ندی
بمیان شهر دیوالی بر کشیدند و از ایشان جدا شدند پس همی شبی از شبها ایزد تعالی
آن قوم را کی ماهی گرفته بودند کپیان شکوواشید دگر وانید و چون روز شد این
مردمان مصلح دَرِ شارستان خود بگشادند و بیرون آمدند و آن دَرِ شارستان دیگر گشاده نشد
عجب داشتند و چون روز بلند بر آمد از سوی دیوال کسی را بر فرستادند تا بیا مهای
ایشان فرو شد یافتند مریشان را همه کپیان گشته خروش برداشتند و درهای شارستان
بگشادند و اندر آمدند یافتند اندر خانها دهگان و بچگان و کم و بیش مرد و زن کپی
گشته پرسیدندی ایشان را کی فلان توی و فلان کدامست سر می جنبانیدندی
و بزبان سخن نتوانستندی گفت این همه سه روز بزیستند و از پس آن هلاک
شدند و آنک نگرفته بودند ماهی همه برستند اندرین سه دیگر دیگر گروه کی
با ایشان نان خوردند و مداهنت کرده بودند و ایشان را ازان فعل بد باز نداشته بودند
علما اختلاف کردند گروهی گویند کی ایشان برستند و گروهی گویند کی ایشان نیز
کپی گشتند ابن عباس رحمة الله علیه گوید کاسکی بدانمی کی، با آن سوم
گروه (گروه) چه کردند (ورق ۱۷)

مردی از بنی اسرائیل مرده شد از وی فرزندی ماند و زنی و این فرزند
مصلح آمد و پارسا و نجات ماده نیکوکار و اندر بنی اسرائیل چنان عادت بودی کی
کسی را کم دختر بزنی دادندی تا هنر داو از سه چیز یکی نبودی یا حرفتی
دانستی یا ضیعتی داشتی یا دست مایه بودی او را چون این جوان بجایگاه مردان
رسید رغبت افتاد و برا بزن تیم مادرش گفت یا فرزند دست مایه نداری و ضیعتی
نداری و حرفتی ندانی کم رغبت کنند مردمان بدادن دختر مر ترا اما پدرت را گوساله
بود بخردگی آنرا اندر کوهی برده است با مانت بخداوند ابرهیم و اسحق سپرده است برو آنجا

شو بپایان کوه دعا کن بگوی یَا اِلٰهَ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ امانت پدرم بمن باز ده اگر ایزد تعالی آن گوساله
بتو باز رساند تا بروی بنشینی و کس را بر و منشانی و بدان فرمان من آنرا بر کس نفروشی این جوانمرد
رفت بپایان کوه شد و خداوند را تعالی بخواند آن گاو را دید که از سر کوه فرود آمدن گرفت و هنوز این جوان
آمد و بیستاد و این جوان دست در گردن وی آورد و او را خوش خوش همی آورد ابلیس لعنه الله
خواست که مر او را از راه ببرد آمد و خویشتن را مانند شبانی بر ساخت و بمیان راه خویشتن بیفگند
و نالیدن گرفت و خویشتن را اندر خاک همی غلطانید و این جوان پارسا آنجا رسید بر سر او بیستاد گفت
یا عبد الله چه بوده است مر ترا ابلیس جوان را گفت من یکی مردی شبانم چهار پایان مردمان
داشتم اندرین کوه با امانت بسوی خانه رفتم که تا توشه بیارم بمیان راه اندر شکم بگرفت اینجا افتاده ام
و ترسم که آن امانت مردمان ضایع شود اشکو داگر نیکویی کنی و مرا برین گاو خود
بر نشانی تا بشهر در رسم این جوان گفت مادرم نفرموده است ابلیس جواب داد که مادر چه خبر دارد
مرو آنجا تا من ترا دو گاو قوی تر بدهم جوانمرد جواب داد که گاو مردمان مرا چگونه دهی و من پرستم گاو
مهمان را استحلال نکنم ابلیس گفت مرا اندران چهار پایان خود هست نیز و هم ازین گونه میان ایشان
سخن رفت تا جوان چنین گفت که من بی فرمان مادر کار نکنم اشکو داگر ترا غم امانت
سلطانست و خداوند تعالی از نیت تو بداند ترا آنجا رساند و اشکو داگر تو دیوی لعنت بر تو باد
ابلیس چون بشنید خویشتن از پیش وی ناپدید کرد و برفت خویشتن را یکی عقابی ساخت
و اندر هوا بر آمد و زآنجا بزد و از دار و این گاو را بگرفت و ببود از پیش جوان در هوا ببرد جوانمرد بسجده شد
بخواند خداوند را تعالی یا اله ابراهیم و اسحق اُرْدُدْ اِلَیَّ اَمَانَتِیْ گفت یَا اِلٰهَ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ
وَیَعْقُوْبَ آن گاو را بمن باز رسان [بامر خدای تعالی آن گاو بیامد] این روایت ابو صالح بود ۞

اما اندر روایت وَهْبِ بن مُنَبِّهْ و حسن بصری از ابو هریره رحمة الله علیهم روایت کنند از پیغامبر
صلی الله علیه وسلم که او گفت اندر بنی اسرائیل جوانی بود بحاجت مادر خویش نیکو کار و شب
را سه قسمت کردی و یک قسمت بخفتی و یک قسمت نماز کردی و اندر یک قسمت بربالین

مادر بنشستی و مرو را تلقین کردی بتسبیح و تهلیل و تکبیر گفتی ای مادر اگر از قیام شب ضعیف گشته ای تسبیح و تهلیل همی کن و چون روز شدی پشت واره ای هیزم آوردی و آن را بفروختی بهای آن سه قسمت کردی یکی بدرویشان دادی و یکی خود خوردی و یکی بمادر دادی و مادر وی بعضی بازان بخوردی و بعضی صدقه دادی چون روزگار برآمد این مادر مر ورا گفت یا فرزند من از پدر تو گاوی میراث یافته ام نشانی بر گردن وی نهاده ام و اورا بخدای عز و جل سپردم و بصحرا بیرون راندم و رنگ آن گاو زرد است گاوی سخت زرد چنانک گویی از رنگ موی وی آفتاب همی برنخشندی بی عیب گاوی ای بیابان اندر رو و بخوان خدای ابراهیم و اسحق را چون خداوند تعالی آن گاو بتو باز دهد دست اندر گردن وی اندر آر و آن را بنزد من آر این جوان از پیش مادر برفت دو شب و دو روز همی رفت چون روز سدیگر بود بدید این گاو را بدین نشان اندر چراگاهی بخواند خدای را عز و جل و گفت یا اِلٰهَ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ آن گاو را بمن رسان بامر خدای عز و جل آن گاو بیامد پیش آن جوان بیستاد خدای عز و جل این گاو را بسخن آورد و گفت ای جوانمرد نیکوکار بیجای مادر برنشین برمن تا مانده نشوی جوان گفت مادرم نفرموده است گاو بسخن آمد گفت اگر چنانست کی تو برمن نشستی هرگز نیز مرا ندیدی اکنون کی امر مادر نگاه داشتی بذلک اشکر داگر تو این کوه را فرمان دهی کی از جای برخیزید همه از جای برخیزند به برکت آن فرمانی کی تو مادر خود را داشتی رفتند هر دو تا ابلیس لعنه الله اندر راه پیش آمد چنانک یاد کردیم ٥ بقیت قصه کلبی ٥

ایزد تعالی فریشته ای را بفرستاد تا ابلیس را هزیمت کرد و آن گاو از وی بستد و بجوان باز آورد ٥

و اندر روایت وهب و حسن بصری کی از بو هریره روایت کردند گفت ابلیس خویشتن را مانند مرغی ساخت و اندر روی گاو اندر آمد و آن گاو از پیش وی برمید جوان خداوند را تعالی بخواند گاو بنزد وی باز آمد و گفت آن مرغ نبود چه آن ابلیس بود مرا از پیش تو ببرد

خداوند تعالی فرشته‌ای را بفرستاد تا مرا از دست وی بستد و بتو باز آورد بحرمت آن طاعتی
کی تو مادر خود را داشتی و منت واری پس آمد این جوان با آن گاو به نزد مادر مادرش
گفت رو ای پسر این گاو را ببر و به سه دینار بفروش در رضای من اندران شرط کن این جوان
بیازار شد ایزد تعالی فرشته‌ای را بمانند آدمی به نزد وی فرستاد و گفت ای جوان
این گاو را بچند فروشی گفت به سه دینار و شرط رضای مادرم فرشته گفت شش دینار بستان
بی رضای مادر گفت اگر هم سنگ او زر دهی بی رضای مادر نفروشم جوان بمادر باز آمد
مادر گفت رو شش دینار بفروش بر شرط رضای من جوان باز آمد بیازار فرشته گفت دوازده
دینار بستان بی رضای مادر جوان بمادر باز گشت و زوی دستوری خواست مادر گفت
ای پسر پندارم کی آن فرشته است مر ترا بیازماید کی تو حق مادر چگونه نگاه داری
بازگرد و مران فرشته را بگوی کی چه فرمایی تا این گاو را بچند فروشم جوان به نزد فرشته باز آمد
وی را بپرسید فرشته گفت بدانک مرا خدای عز و جل فرستاده است تا بنگرم کی مادر خود
را چون مطیع باشی بازگرد و به نزد مادر شو و او را از من سلام کن و بگوی کی این گاو را موسی
بن عمران علیه السلم خریدار خواهد گرد مفروش تا پوست او را پر زر بتو ندهد (ورق ۳ - ۵)

ایزد تعالی بموسی وحی کرده بود و گفته کی هر جای کی کشته‌ای یابید و ندانید کی
کی کشته است قیاس گیرید تا بکدام ده و محلت نزدیکتر است پس از آن ده و محلت پنجاه پیر را
بگیرید و گاوی یک ساله را با خود ببرید بوادیی کی آن را وادی تُدُوْن
گویند آن گاو را آنجا بسمل کنند پس این پنجاه پیر دست بران نهند بخدای
عز و جل سوگند خورند و گویند کی ما این مرد را نکشتیم و کشنده او را نشناسیم چون این سوگند خورده
باشند از قصاص برهند اما ایشان را بگیرند و خون بها بستانند شریعت موسی علیه السلم برین جمله
بود چون روزگاری برین برآمد مردی بود اندر بنی اسرایل او را عامیل گفتندی و مالی
بسیار بود مر او را دو عم زاده بود مر او را هر دو بهم جای بسگالیدند تا مر او را بکشند بر امید تا مال وی میراث

بگیرند و از عکرمه روایت آرند که او گوید که بنی اسرائیل را یکی مسجد بود آن را دوازده در بود ازانچ ایشان دوازده
سبط بودند هر سبطی را دری بود این مرد چون عامیل را بکشت برون از در های آن مسجد
برد و بیفگند چون روز شد مردمان آن ره را بشکوفتند دیگر گفتند) و بریشان خون دعوی کردند
دکردند؛ ایشان بنزد موسی آمدند گفتند یا موسی ما این دیت بدهیم و سوگند نخوریم اما این زشت
نامی باشد که برما نشینید دعا کن خداوند خود را تعالی تا بما باز نماید که او را که کشته است انگه
موسی علیه السلم ایشان را بفرمود بفرمان خدای عز و جل تا گاوی را بگیرند و بسمل کنند و اندامی
ازان او بر کشته زنند تا ایزد تعالی او را بسخن آرد و بگوید که او را که کشته است گفت این گاو بیافتند
بنزدیک کسی و آن بقیمت روز ازوی بخواستند اوی گفت بده دینار کم ندهم شگفت آمد ایشان را
از وی گفتند گاوی را ده دینار باز آمدند بنزد موسی و گفتند که شما بده دیناری
کم ندهد موسی گفت حق اوست اشکو داگر) نفروشد بازگشتند [وگفتند ده دینار بدهیم خداوند گاو
گفت گاو به بیست دینار کم ندهم باز آمدند بنزد موسی گفت حق اوست بدانچ خواهد فروشد]
بازگشتند بیست دینار بدهیم گفت پنجاه دینار کم ندهم باز آمدند بنزد موسی و موسی همان
جواب داد بازگشتند بخداوند گاو گفتند پنجاه دینار بدهیم گفت صد دینار کم ندهم باز همچنین باز می
آمدند و باز می رفتند تا بدانجا رسید گفت تا پوست او پر زر ندهید بندهم چاره ندیدند و پوست او
پر زر بدادند و بخریدند ازین جهت اندر خبر آمده است که رسول الله صلی الله علیه و سلم آن
بَنِی اِسْرَائِیلَ لَمَّا شَدَّدُوا عَلَی اَنْفُسِهِمْ شَدَّدَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ
[گفت بنی اسرائیل بر خویشتن سختی گرفتند ایزد تعالی بریشان سختی نهاد] و بعضی
گویند این تشدید بر خود نهادن ازان بود که چون موسی علیه السلم ایشان را گفت گاوی
بکشید اگر ایشان برفتندی و گاوی بکشتندی مراد ایشان خود بحاصل آمدی اما
بر خود دشوار گرفتند اول گفتند یا موسی تو بر ما فسوس می کنی موسی گفت علیه السلم
پناه گرفتم باد او آن روز مباد اکی من از جمله ی جاهلان باشم کی بر مومنان افسوس کنم کی
هر که بر مومنان افسوس کند او از جمله ی جاهلان باشد آن وقت گفتند یا موسی بپرس از

بهر ما مر خداوند خود را تعالی تا پدید کند ما را که چه گاو است این خرد است یا بزرگ گفت موسی
علیه السلم خداوند من چنین گفت این گاویست نه پیر پیر است و نه جوان جوان میانه گاوی
است گفت اشکوه اگر ایشان بدین صفت گاوی بخریدندی مراد ایشان بدان حاصل
آمدی ولکن بر خود دشخوار گرفتند و باز پرسیدند موسی را علیه السلم [ایزد تعالی بر ایشان دشوار
گردانید] گفت فرمان بجای آرید بدانچه تان فرموده شد و پس ازین مپرسید از چگونگی گاو
فرمانی کردند و باز بسوال معاودت کردند گفتند بخوان از بهر ما خداوند خود را تا پدید کند ما را که
این گاو بر چه رنگ است گفت موسی که خداوند تعالی چنین گفت که آن گاوی
است که همه پوست او زرد است زَرْدِ زَرْد تا شُنْشُکُلُهَا و سُرُونش نیز زرد است
چنانک شادمانه گرداند مر نگرندگان را که دروی نگرند و شگفت آرد ایشان را معنی این
سخن آنست که آن گاو بزردی چنان باشد که هر که دروی نگرد شگفتی بماند
و دلش شادمانه گردد چنانک در خبر آمده است از پیغامبر صلی الله علیه وسلم که بر شما باد که
نعلین از پوست گاو زرد دارید دل شادمانه گردد و دور باشید ازین نعلینها که از پوست
گاو سیاه کنند که آن مر دل را غم افزاید بار دیگر معاودت کردند و گفتند از بهر ما که بخوان مر
خداوند خود را تا پدید کند که این گاو چه گاو است کارکن است یا کارناکن که صفت این گاو
پوشیده گشت بر ما که در نیابیم گفتند اگر خدای عزوجل بخواهد ما راه بریم بسوی
گشنده یا این گشته و باز یابیم نشان این گاو و در تفسیر آورده اند که اگر ایشان این انشاء الله نگفتندی
هرگز این گاو را در نیافتندی گفت [موسی] آن گاویست که هنوز بکار اندر نکشیده اند و کار
کوفته نگشته است بکشت کردن و بدلو آب گردانیدن گاوی باشد بسلامت که در وی عیب
نباشد و نیز گویند گاوی است یک رنگ که بر همه اندام وی هیچ جای رنگی دیگر
نیست جز از یک رنگ زردی گفتند اکنون نشان راست دادی تو ما را بشدند بجستند
یافتند این گاو برین نشان هنر و جوانی نیکوکار بجای مادر خویش و بخریدند آن گاو از وی

ـه پوست او هر زر (ورق ۲-۴)

ایزد تعالی مر سلیمن را علیه السلم فرمان چنان داده بود کی تا جز از جفت اسرایل زن بزنی نخواهد وقتی از وقتها بغزاتی رفت دختری از ان ملک کافران هبردکی گرفت ولیس اورا آزاد کرد و بزنی خواست غفلتی بروی برفت ایزد تعلی آن ازوی نپسندید و بعتاب آن مرورا از مملکتش معزول گردانید تا چهل روز و سبب آن بود کی ایزد تعلی شکوه مملکت او اندر زیر آن نگین انگشتری وی نهاده داشت و گفته اند کی آدم علیه السلم از بهشت آن را بیرون آورده بود و عصای موسی را علیه السلم عصا معجزت موسی گشت و انگشتیره معجزت سلیمن علیه السلم و هر باری کی سلیمن علیه السلم پآب خانه اندر شدی از حرمت مران انگشتیره را با خود نداشتی بزنی از زنان خویش که هنزد او امینه تر بود نام وی ... انگشتیره بدو دادی ولیس در آب خانه شدای روزی هم برین عادت انگشتیره بدو داده بود و خود بآب خانه در شده بود و چون وقت معزولیش آمده بود دیوی کی نام او صخر بود خویشتن را بر صورت سلیمن علیه السلم بساخت و چنان نمود کی از آب خانه همی بیرون آید بنزد آن زن آمد و انگشتیره از وی بستد آن شکوه کی مر سلیمن را علیه السلم بود برین دیو پدید آمد

قصه ی انگشتیره ی سلیمن علیه السلم

وهب بن منبه گوید کی ایزد سبحانه و تعلی چون آدم را علیه السلم اندر بهشت آورد خاتم جز از بهروحت بیافرید و گفت یا آدم این نگینه ی جز است از بهر تو آفریده ام و این خلعت من تراست تا آن وقت کی عهد من فراموش نکنی اشکروا گر تو عهد و فرمان من بجای ماتی من این از تو باز ستانم بکسی دهم از فرزندان تو گفت یا رب آن کدام فرزند باشد از ان من گفت بنده ی من سلیمن کی از جبر سلامت یافته باشد یعنی متکبر نباشد آدم علیه السلم آن انگشتیره اندر انگشت آورد و نوری ازان بتافتی چون نور آفتاب چنانک همه درختان بهشت ازان نورانی گشتی و در بوالماء بهشت پیدا شتی کی ازان نور همی بجنبند تا آن وقت کی از آدم

آن زلت موجود آمد آن انگشتیره از انگشت او بپرید تا خویشتن را اندر زیر کنگرهای عرش افگند و گفت یا رب آدم مرا نگه‌داشت ندا آمد که اینجا قرار گیر که ترا بپیغامبری خواهم داد که او را ملکت خواهم داد چنانک از پس او نیز کس را ندهم چون ایزد تعالی سلیمن را برگزید عز او را اندران انگشتیره نهاد جبریل را علیه السلم بفرستاد بروز عاشورا روز آدینه با انگشتیره و سلیمن اندر نماز بود با دوازده سبط بنی اسرائیل هر سبطی دوازده هزار مرد از علما و حکما و اهل درس و کتب و مردان پرنَس‌دار و عکازه گیر از زهاد و عباد و دیگر نیکان و سلیمن اندر خواندن زبور بود که انگشتیره در انگشت او کرد جبریل و گفت یا سلیمن بگیر این هدیهٔ خدای عز و جل مر ترا سلیمن با همه قوم سر بسجده نهادند تا آخر روز در یک سجده بودند بر یک سون انگشتیره نبشته بود أَنَا اللّٰهُ لَمْ أَزَلْ ○ و بدیگر سون أَنَا اللّٰهُ الْحَقُّ الْقِيَامِ الْقَيُّومَ ○ و بر سدیگر سون أَنَا اللّٰهُ الْعَزِيزُ لَا عَزِيزَ غَيْرِي وَعَزِيزٌ مَنِ الْبَسْتَهُ خَاتَمَ عِزِّي و بر چهارم سون آیة الکرسی و گرد بر گرد نبشته بود محمد رسول الله خَاتَمُ الْأَنْبِيَاء فَبِذِكْرِهِ وَالْإِيمَانِ بِهِ تَتِمَّ عِزُّكَ يَا سُلَيْمَٰنَ فَصَلِّ عَلَيْهِ لَيْلَكَ وَنَهَارَكَ یعنی عز تو یا سلیمن آن وقت تمام شود که محمد را علیه السلم یاد کنی و بدو بگروی یا سلیمن شب و روز بر محمد درود ده ○ و اندر روایت بو صالح که اندر تفسیر یاد کرده است گوید سبب این معزولت سلیمن علیه السلم آن بود که بر ملکی از ملک کافران که در جزیره بودی غزو کرد با وی او را بکشت و دختر او را بزنی کرد و این دختر منافقه بود و مسلمانیش پاک نبود و سلیمن علیه السلم او را بغایت دوست داشتی هر بار که در آمدی او را اشکویان و گریان یافتی چون پرسیدی مر او را که چرا اشکوی گفتی غم پدرم گرفته است مرا اشکو خواهی که من خرسند شوم بفرمای دیوان را تا بمانند پدرم صورتی کنند تا مر وقتی که مرا غم پدر نکیرد اندران نگرم خرسندی باشد مرا سلیمن علیه السلم از بهر کب دلی خویش بفرمود تا آن چنان صورتی بکردند و آن زن آنرا بخانه اندر نهاد و جامهای پدر خویش اندر وی

بپوشانید چون سلیمن علیه السلم از وی غایب شدی او آن را نهفت پرستیدی بجای
بت تا بدان جای رسید کی کنیزکان خویش را نیز بر پرستش آن بت خواندن گرفت آن خبر
بیرون افتاد و گفت گوی پدید آمد کی اندر خانهٔ سلیمن همی بت پرستند و سلیمن را ازین آگاهی
[نی] و مرو را وزیری بود آصف بن برخیاء ابن شمعیا کی از بندگان بنی اسرایل بود و اندر
علم و حکمت و عبادة و زهادت و ریاضت تمام دار بود این خبر بدو رسید از حشمت سلیمن علیه السلم
این سخن با وی بمشافهه نتوانست گفت و گفت حیلتی بسازید و آمد بنزد سلیمن گفت بدان
کی من پیر گشتم و عمر من بآخر رسید خواهم کی یکی مجلس کنم و خدای را عز و جل و انبیا را علیهم
السلم ثنا گویم و سیرتهاء ایشان پیش بنی اسرایل یاد کنم تا از من یادگاری ماند سلیمن علیه السلم اورا
بدان دستوری داد و روزی وعده نهادند و بنی اسرایل جمله شدند و سلیمن علیه السلم حاضر آمد پس
منبری بنهادند و آصف بر آنجا بر آمد خداوند را تعالی چنانک سزا بود ثنا و حمد گفت پس از آدم
گرفت علیه السلم هر پیامبری را یکان یکان همی ستود و شمایل ایشان از روزگار کودکی تا بوقت
پیری یاد همی کرد چون بسلیمن علیه السلم برسید و آن پارسائیها و اوراد و عبادتهای
او را کی اندر ایام کودکی کرده بود یاد کرد و اندر درازی ایام بزرگیش هیچ یاد نکرد و مردمان عامه آن
در نیافتند و پنداشتند کی مر سلیمن را بتمامت چنانک سزا بود بستوده است اما سلیمن علیه السلم
آن بجای آورد چون خالی شد و ز منبر فرود آمد او را بنزد خود خواند و گفت هر پیامبری را صلوات
الله علیه از کودکی تا بزرگی ثنا گفتی و شمایل ایشان یاد کردی و چون بمن رسیدی ایام
کودکی مرا یاد کردی و ز روزگار بزرگی یاد نکردی و تو دانی کی من امروز اندر عبادة
بیش از آنم کی در کودکی بودم آصف زبان برگشاد و گفت بلی اما اندر کودکی اندر خانهٔ تو بت
نپرستیدندی و اکنون همی بت پرستند سلیمن بجای آمد کی چه همی گوید بخانه اندر
آمد و آن بت را فرمود تا بسوختند و آن زن را طلاق داد و از در بیرون کرد و بنشست بدرگاه خداوند تعالی
بازگشت و زاری کرد بسیار و چون خداوند تعالی خواست کی توبهٔ وی بپذیرد و آتش

مبتلا کرد بذل و معزولی و غریبی و گرسنگی و مزدورکاری آن دقتش بتخت و مملکت
باز آورد ۞

اما وهب بن منبه گوید که این ملک را که سلیمن علیه السلم قهر کرد ملکی جبار بود
و از آنجا که سلیمن بود تا بدین جزیره که این ملک بود مسافتی دور بود باد را فرمان
داد تا بشد و جاسوسی کرد و خبر آن ملک بنزد سلیمن آورد و گفت از اینجا تا بدانجا که
اوست مسافتی دورست بر دریا گذشت باید و ز جزیره او را هیچ گونه ندانستم که سوار
را و پیاده را آنجا راه بود یا پرودی آنجا رسند سلیمن علیه السلم باد را سوگند داد که
لشکر مرا باید که برگیری و بپرودی آنجا بری لشکر را برنشاند و سلاح اندر
بپوشانید و با و ایشان را همه برگرفت به مقدار یک نیم روز آنجا برد و بر ایشان کارزار
کردند و قهر کردند باد اندر آمد ایشان را و ملک شان را و مال ایشان را و دختران و زنان
ایشان را همه برگرفت و بنزد سلیمن علیه السلم آورد سلیمن آن غنیمت بر ایشان قسمت کرد
و آنچ نصیب قربان بود اندر مذبح نهاد پس دعا کرد بسیار ایزد تعالی آتشی بفرستاد
و آن قربانی بپذیرفت سلیمن چون آن دختر ملک را بدید دلش اندر وی بسته شد
هر چند مسلمانی بر وی عرضه کرد نپذیرفت گفت اگر مسلمانی نپذیری
پدرت را بکشم این دختر گفت اگر پدرم را بکشی من خویشتن را بکشم و اگر مرا
بمسلمانی خوانی من خویشتن را بکشم و اگر مرا بگذاری که بت خویش را
پرستم خود را بکشم سلیمن از دوستی که وی را گرفته بود هیچ روی نمی
خواست که او خود را بکشد و نیز روا نداشت که مشرکه را بزنی کند همچنین
مر ورا محبت فزونیست و دل گرمی می بود و این زن بشب و روز می گریست
تا آخر بدانجا رسید که سلیمن را علیه السلم گفت خواهی تا من بمراد تو اندر آیم از بهر بت
مرا قربانی بکن سلیمن گفت این نشاید اندر دین ما آخر چون فتنه مستحکم گشت خواست

کی مرورا بفرمایند بت آنک اندر دین او خلل اندر آید بفرمود تا ملخی را بیاوردند
وگفت این ملخ را از بهر بت تو قربان کنم کارد بر نهاد و سر ملخ ببرید اندر وقت ایزد تعالی
جبرئیل را علیه السلم بشتاب بفرستید گفت یا سلیمن اگر این قربان از بهر من کردی سبک
داشتی مرا چه بهر من قربان اشتر باید یا گاو باید یا گوسپند واکنون این قربان بهر بت
کردی روا داشتی کی بهر زنی جز بهر من قربان کنی لاجرم خادمی
را از ان تو بر تخت تو نشانم و هیئات تو بر وی پدید آرم و ترا اندر غربت افکنم
و پیش ازان هیچ دیوی را زهره نبودی کی بنزد سلیمن آمدی یا با وی
استاخی کردی چون این محنت اندر رسید دیوی بیامد و این انگشتری از
انگشت وی بکشید و در ساعت سلیمن در خود نگریست چنان شد کی خود را می
نشناخت گفت نه من آنم کی بودم و چون بیرون آمد کسی را دید بمانند او کی
بر منبر برآمده بود و خلق را می خطبه کرد و اندر روایت بوصالح است کی آن دیو بود
کی انگشتری وی را در انگشت داشت و خلق همه پنداشتند کی این سلیمن
است علیه السلم و سلیمن روی از شهر بیرون نهاد چون ماندگی و گرسنگی پدید رسید
بنزد زالی آمد و گفت من سلیمانم مرا نانی ده زال سنگی برداشت و بر سر او زد
وگفت یا گدای خود را سلیمن مانند می کنی و بنام سلیمن می گدایی
کنی سلیمن پیامبری است ملکی برجای ملک نشسته سلیمن دانست
کی روزگار محنت آمده است رفت خویشتن را با ملاحان و صیادان بمزدوری
داد از میان آب کی پایاب بودی ماهی را به پشت واره بکناره دریا آوردی
و هر شبی دو ماهیش مزد دادندی یکی را بفروختی نان خریدی و یکی را
نان خورش کردی تا چهل روز اندرین بماند و دیو هم چنان بر سر منبر خلق را علم همی گفت
و آن علم او در دل کسی جای نگرفتی مردمان دانا و اهل فراست

بشک اندر افتادند و بایک دیگر گفتن گرفتند کی اگر این سلیمن است این راز خدای عز و جل خشمی پدید آمده است و دور افتاده است از خداوند عز و جل وگر نه این سلیمن نیست ما را بباید جستن تا سلیمن کجا افتاده است چون این گفت گوی اندر میان مردمان افتاد دیوان دانستند کی این حال بریشان دیر نماند کتابها ساختند از جادوی و نیرنجات و اندران نبشتند [دبه پشت کتابها نبشتند] کی این علمها است کی آصف بن برخیا مر سلیمن ملک را آموخته است و سلیمن بدین علمها بود کی خویش را بتوانست داشت و پس بیاوردند آنرا زیر کرسیها و مصلاهای سلیمن فرو بردند و بنهفتند آن انگشتری او را اندر دریا انداخت و چون روزگار عتاب سلیمن بآخر رسید بر کناره ی آبی نشسته بود اندوهگین ماهی بر کناره ی آب پدید آمد و بر طبیعت گرفت سلیمن آن را بگرفت و خواست کی شکم او باز کند آن انگشتری خویش اندر وی بیافت انگشتری بانگشت اندر آورد و آن بها و جمال باز بدو باز آمد و لشکر بنزد او گرد آمدند و باز بمملکت خویش باز رسید (ورق ۱۷، ۱۸، ۱۹ و ۲۰)

کلمه یاد کرد اندر کتاب خود کی وقتی فریشتگان آسمان به زمین نگرستند از اهل زمین معصیت و فسادها بدیدند گفتند یا رب نه ما گفته بودیم أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا گفته بودیم کی در زمین باز خلقانی آفرینی کی ایشان گناهان کنند و تباهیها کنند اینک همی کنند خداوند تعالی بفریشتگان وحی کرد و گفت بگزینید تا اندر آسمانها از شما فریشتگان کیست خویشتن دارتر و پارساتر صد فریشته بگزینید و پس گفت نود فریشته بگزینید و پس گفت هشتاد هم چنین تا گفت از جمله ی ایشان سه تن را اختیار کنید تا من همان شهوت کی اندر فرزندان آدم نهاده ام اندرین فریشتگان نهم و پس ایشان را بزمین فرستم اگر ایشان خود را از گناهان نگاه دارند و نگاه توانند داشتن آنگاه شما را رسد کی بر فرزندان

آدم دراز زبانی کنید ایشان اندر آسمان سه فریشته اختیار کردند یکی عزا و دیگر عزایا
و سدیگر عزازیل ایزد تعالی شهوت اندریشان مرکب کرد این کی عزازیل بود چون
اندر خویشتن آن شهوت بدید و طمع او خواهان گشت مر شهوتها را اشرم گرفت از خدای
عز و جل بحاجت اندر خواست تا آن شهوت از وی برگیرد و او را بحال اول
باز برد ایزد تعالی دعای وی مستجاب کرد و آن حال از وی دفع کرد اکنون
آن فریشته از شرم خداوند تعالی سر اندر پیش افکنده است گویند کی تا قیامت
سر بر نیارد اما آن دو فریشته عزا و عزایا و عزا آن کی هاروت است و عزایا کی آن ماروت
است ایزد تعالی ایشان را بزمین فرستاد و فرمان داد کی روز بزمین می شوید
میان فرزندان آدم حکم می کنید و عدل نگاه می دارید و سوی جنت و جود میل
مکنید و شبانگاه باز باسمان باز آیید ایشان همبرین حال روزگاری می
آمدند و می شدند تا وقتی زنی را با شوی خصومت افتاد و نام این زن بتازی
زهره بود و بپارسی بیدخت و بزبان عبری اناهید پیش ایشان آمد با شوی
خویش چون چشم ایشان بران زن افتاد دل ایشان بدو مشغول گشت مر کسی
از ایشان تنها بدل اندیشید اگر این زن مرا بودی شایستی اما با یار خویش نگفت
و هر یکی از ایشان این زن را جدا بجدا پنهان از یار خویش وعده نهادند کی فردا
بنزد من آی تا ترا یاری دهم بر شوی تو دیگر روز هر یکی از ایشان بر وعده
بنزد آن زن آمدند هر دو را اتفاق بیکجای افتاد و بس راز خویش با یک دیگر بگفتند
چون ایشان با آن زن بنشستند زن آغاز کرد کی من خویشتن بشما ندهم تا آنگه
کی شما آن نام بزرگ کی بدان نام باسمان روید و ز آسمان فرود آیید مرا بیاموزید
شهوت مر ایشان را اسیر خود کرده بود آن نام بزرگ او را بیاموختند چیز حیاتی دیگر
از ایشان درخواست کی من روا ندارم یاد کردن آن اندران ساعت کی این دو فریشته

بنزد آن زن نبشستند ایزد تعالی فرمان داد تا درهای آسمانها بگشاوند و فرشتگان
آسمانها را گفت فرو نگرید تا گزیدگان خود را ببینید که کجا نشسته اند از آن روز
باز فرشتگان آسمانها شفیع مومنان گشته اند و مومنان را از خداوند تعالی آمرزش می
خواهند از انج بدانستند که در دنیا آدمی با این شهوت کم بود که بسلامت
رهد از انج گزیدگان اهل آسمان در دنیا سلامت نرستند پس این زن آن دعا
برخواند و سوی آسمان برفت ایزد تعالی مر ورا مسخ گردانید و آتش گشت
ابن عمر گوید رحمة الله علیه این ستاره ی زهره اوست که در آسمان پدید آید و این
فرشتگان آن نام برخواندند هر چند کوشیدند تا بآسمان بر آیند نتوانستند برآمدن تا یکه
از ایشان بشد بر روی زمین بماندند از شرق تا غرب می دویدند و می گریستند
و زاری می کردند تا یاد آمد مر ایشان را که در روی زمین خدای را
عزوجل بنده ی است که هر روز فرشتگان از وی چندان طاعت بآسمان آورندی
که از همه اهل روی زمین آوردندی و آن ادریس پیغامبر بود صلوة الله علیه
هر دو آمدند بنزدیک اوی و گفتند از ما گناهی موجود آمده است ما را شفاعت کن
تا خداوند عزوجل مگر ما را عفو کند ادریس علیه السلم جواب داد که هرگز دیده اید که
اهل زمین مر اهل آسمان را شفاعت کنند گفتند آری ما منزلت تو دیده ایم
اندر آسمان ادریس گفت اگر من نیز شفاعت کنم چه دانم که شفاعت من روا
کردند یا نی فرشتگان گفتند تو سر بسجده نه و شفاعت کن آنگه که سر برآری
اگر ما را بنزد خود بینی امید آن باشد که شفاعت تو می روا کنند
و اگر ما را از پیش تو برده باشند بدان که شفاعت تو از ما می روا نشود
ادریس علیه السلم سر بسجده آورد و دعا کرد تا او سر از سجده برآورد ایشان را برده بودند
و ندید مر ایشان را و اندر خبر چنانست که ایشان را ببردند پس فرمان آمد که اختیا.

کنند عذاب دنیا خواهید یا عذاب آخرة واندر آخرة مشیت مراست اندر کار شما جبریل علیه السلم گفت عذاب دنیا اختیار کنید و ایشان عذاب دنیا را بر عذاب آخرت اختیار کردند اکنون هردوان را از بابل آویخته اند و عذاب ایشان مے کنند از وقت نماز بامداد تا وقت آفتاب برآمدن و از وقت نماز دیگر تا وقت آفتاب فروشدن و کلماتی است کی ایشان آن را بر زبان محی رانند کی ایشان بدان مبتلا اند بعضی از علما گویند کی آن از بهر آن خوانند تا عذاب ایشان زیادت شود و بعضی گویند کی بدان خوانند تا عذاب ایشان سبک شود جهودان و دیوان و آنکسها کی اعتقاد جادوی دارند آنجا روند و گوش دارند مر آن کلمات را ایشان نخست مر ایشان را پند دهند و گویند این از ما میاموزید و یاد نگیرید کی ما بدین مبتلا ایم و هر کی این بیاموزد و اعتقاد جادوی کند او کافر گردد و مر ورا اندر بهشت هیچ نصیب نماند (ورق ۱۲-۲۳)

گفت خواجه امام رضی الله عنه کی اندر بعضی از تفسیرها چنان سماع کردیم کی زنی نزدیک عایشه آمد رضی الله عنها و گفت کی شوی وی زنی دیگر کرده بود و مرا رشک وی همی رنجه داشت زنی مرا گفت من ترا بجایی برم کی ترا چیزی آموزند کی بر شوی خوانی آن زن را دوست باز دار و شب اندر آمد دو سگ یا دو گوبه بیاورد والله اعلم یکی خود برنشست و یکی مرا نشاخت رفتیم تا بجایی رسیدیم کی دو شخص دیدیم نگوسار آویخته مرا پیش ایشان برد و بنشانید ایشان آواز کردند کی میاموز آنچ ما گوییم کی کافر شوی گفتم لابد مراست بباید کی بیاموزم مرا گفتند اگر لابدست شو نزدیک آن تنور شو مانند تنور جایی دیدم چون فراز رفتم بترسیدم باز گشتم گفتم شدم بنزدیک تنور گفتند چه دیدی گفتم هیچ چیز ندیدم گفتند نشده ای پس باز گرد میاموز کی کافر شوی فرمان نکردم پس گفتند زود بر سر تنور شو تا چه بینی

قصۂ چہار درویش

(از سالنامہ ''کاروان'' بابت سنہ ۱۹۳۳ء)

کچھ عرصہ ہوا حیدر آباد سے ایک استفسار، قصہ چہار درویش کے سلسلے میں، ہمارے نام موصول ہوا تھا، جس میں لکھا گیا تھا کہ اس قصے کو عام طور پر حضرت امیر خسرو دہلوی کی تصنیف مانا جاتا ہے، اس عقیدے کی تائید میں کیا کوئی تاریخی بیان مل سکتا ہے؟ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

مجھ کو افسوس ہے کہ میں اپنے مشاغل ضروریہ سے عدم فرصت کی بناء پر اس وقت اس استفسار کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ جناب مستفسر سے میں اس تاخیر کی معافی مانگتا ہوں اور التماس کرتا ہوں کہ سطور ذیل اسی استفسار کا جواب تصور کی جائیں۔

چہار درویش ہمارے ملک کے مشہور افسانوں میں سے ہے، جس میں آزاد بخت پادشاہ روم اور چار درویشوں کا قصہ مع دیگر ذیلی کہانیوں کے ملتا ہے۔ موجودہ افسانوں میں اس کا پایہ نہایت بلند ہے اور الف لیلیٰ کے بعد قصۂ حاتم طائی کے ساتھ بہترین افسانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ قصہ ہمارے ہاں فارسی سے آیا ہے۔ سب سے پہلے محمد حسین عطا خاں تحسین اس کو مکلّف اردو میں لکھ کر نواب آصف الدولہ والی اودھ کے نام پر معنون کرتے ہیں۔ ان کی تالیف کا نام نو طرز مرصع ہے۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے ایک انعامی

اشتہار کی بنا پر میر امن نے اس کو ٹھیٹ اردو محاورے میں لکھ کر بقائے دوام کا خلعت حاصل کیا۔ میر امن کی یہ تالیف، جس کا تاریخی نام "باغ و بہار" ہے، اردو زبان کی زندہ جاوید مصنفات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

یہ امر موجب دلچسپی ہے کہ میر امن نے اس تالیف کے قبول کئے جانے کے بعد کالج کمیٹی کی خدمت میں ایک درخواست بغرض وصولی انعام بالفاظ ذیل دی تھی:

"عرضی میر امن دلی والے کی جو مدرسی کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی:

صاحبان والا شان نجیبوں کے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے۔

اس بے وطن نے حکم اشتہار کا سن کر چار درویش کے قصے کو ہزار جدوکد سے اردوئے معلّٰی کی زبان میں "باغ و بہار" بنایا۔ فضل الٰہی سے سب صاحبوں کی سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب امیدوار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غنچہ دل مانند گل کے کھلے۔ بقول فردوسی کے شاہنامے میں کہا ہے:

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم زندہ کردم بہ این پارسی
سو اردو کی آراستہ کر زباں
کیا میں نے بنگالا ہندوستاں

خاوند آپ قدردان ہیں۔ حاجت عرض کرنے کی نہیں۔ الٰہی تارا اقبال کا چمکتا رہے۔"

مولانا عبدالحق صاحب، ایڈیٹر رسالہ "اردو" اورنگ آباد نے "باغ و بہار" پر جو محققانہ مضمون اپنے رسالے میں سپرد قلم کیا ہے اس کے ضمن میں فاضل مضمون نگار نے اس تالیف کے ماخذ کے ذکر میں ایسی بحث چھیڑی ہے جس سے میر امن کی دیانت اور راست بازی پر یقیناً حرف آتا ہے۔ یہ بیان چونکہ اردو کے ممتاز اور مسلم الثبوت

محقق کے قلم سے نکلا ہے اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ اس لئے ذیل میں اس معاملے پر کسی قدر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :

"فارسی اور نوطرز مرصع کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "باغ و بہار" فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نوطرز مرصع ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ میر امن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمے کا تو ذکر کیا مگر نوطرز مرصع کا ذکر صاف اڑا گئے۔"

(رسالہ اردو، جلد دہم، جولائی سن ۱۹۳۱ء صفحہ ۳۹۵)

اور اس دعوے کی تائید میں کہ "باغ و بہار" کسی فارسی ماخذ پر مبنی نہیں ہے بلکہ نوطرز مرصع پر، صفحہ ۳۹۵ سے لے کر صفحہ ۴۰۴ تک دونوں تالیفات کے مختلف مقامات سے اقتباسات نقل کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک اصل ہے اور ایک نقل۔

مولانا کے استدلال کو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن حقیقت میں میر امن پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میر (امن) نے اپنے دیباچے میں "نوطرز مرصع" کا بحیثیت ماخذ کوئی ذکر نہیں کیا مگر اپنی تالیف کے سرورق پر صاف الفاظ میں اظہار کیا ہے۔ چنانچہ عبارت سرورق ملاحظہ ہو :

"باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قصہ چہار درویش سے۔"

یہ عبارت "باغ و بہار" کی اشاعت اول پر درج تھی جو کلکتے میں چھاپی گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ خود ڈاکٹر گل کرائسٹ، جنہوں نے "باغ و بہار" کے واسطے فرمائش کی تھی، اسی اشاعت کے ساتھ اپنے انگریزی دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں :

"عطا حسین خاں نے ابتدا اصل فارسی سے اس کا ترجمہ شائع کیا مگر چونکہ اس کی زبان، بہ وجہ کثرت تراکیب و محاورۂ فارسی و عربی، مغلق اور قابل اعتراض مانی گئی تھی اس لیے اس نقص کو رفع کرنے کی غرض سے کالج کے ملازمین میں

سے میر امن دہلوی نے مذکورۂ بالا ترجمے سے موجودہ متن تیار کیا ہے۔"

یہ بیانات میر امن کو ہر قسم کے الزام سے بری کر دیتے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر امن کے بعد ہندوستانی اہل مطابع نے سرورق کی عبارت کو حذف کر کے صرف کتاب کے نام پر قناعت کر لی ہے۔

فارسی میں چہار درویش کے قصے پر مختلف شخصوں نے قلم اٹھایا ہے۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی اس پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کے مولفین میں سے صرف دو شخصوں کے نام ہم تک پہنچتے ہیں:

(۱) حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں۔

(۲) انجب جس کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ چہار درویش اب تک کم از کم تین منازل ارتقا ختم کر چکی ہے۔ یعنی ابتدائی' درمیانی اور آخری۔ یہ قصہ اپنی ابتدائی حالت میں نہایت سیدھی سادی اور روکھی پھیکی عبارت میں ملتا ہے جس میں زبان آرائی اور رنگینی کی چاشنی قریب قریب مفقود ہے اور واقعات کی ترتیب بھی چنداں دلآویز نہیں ہے لیکن اپنے ارتقا کے آخری دور میں پہنچ کر حک و اصلاح و ترمیم و تنسیخ کے بعد گوناگوں دلچسپیوں کا مرکز بن جاتا ہے اور زبان و بیان کے اعتبار سے شگفتہ اور خوش آئند معلوم ہوتا ہے۔ ہم اپنا تبصرہ اس آخری اصلاح یافتہ چہار درویش سے شروع کرتے ہیں' جو ہمارے ملک میں بے حد مقبول ہے اور اردو ترجموں کا ماخذ ہونے کے علاوہ امیر خسرو سے بھی منسوب ہے اور متعدد بار طبع میں آچکا ہے۔

میر احمد خلف شاہ محمد نے اس کی ترتیب دی ہے اور قاضی محمد ابراہیم بن قاضی نور محمد نے چھاپا ہے۔ اس کی ایک اور اشاعت کے ذمہ دار شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین تاجر کتب کشمیری بازار لاہور ہیں۔ یہی نسخہ باختلاف قلیل مطبع محمدی بمبئی نے سنہ ۱۳۱۸ھ میں طبع کیا ہے۔ اس میں تکملہ بختیار نامہ بھی شامل ہے اور میر احمد کا دیباچہ نکال دیا گیا ہے۔[۱] اس کے دو سو چوہتر صفحات اور اکیس سطریں فی صفحہ ہیں۔ اصل

قصہ صفحہ ۲۲۷ پر ختم ہوتا ہے۔ باقی ماندہ صفحات میں "بختیار نامہ" ہے۔

اس نسخے میں قصے کی تالیف امیر خسرو کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ میر امن نے بھی اس روایت کو قبول کیا ہے۔[۲] اگرچہ میر محمد حسین عطا خاں "نو طرز مرصع" میں اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے جس سے ظاہر ہے کہ یہ روایت ان ایام میں اس قدر عالمگیر نہیں تھی۔ بہرحال روایت مذکور عبارت ذیل پر تعمیر پاتی ہے:

"باعث تصنیف این داستان از راز پژوهان اخبار پیشینان باین نوع مفهوم گردید که باری طبع مقدس جناب سالک مسالک طریقت و ناسک مناسک شریعت، قدوة العارفین و زبدة الصالحین، حامی دین متین چراغ ہدایت شمع یقین حضرت شیخ نظام الدین قدس سرہ العزیز بعارضہ علیل بودند۔ حضرت امیر خسرو دہلوی مدام این قصہ را زیب رقم فرمودہ بحضور پیر و مرشد خود می خواندی تا آنکہ حضرت موصوف غسل صحت فرمودند و این دعا می نمودند کہ یارب ہر کس این قصہ را بخواند یا بشنود از علت امراض نجات یابد"

(صفحہ ۳ ۔ ۴)

اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ اصل قصہ امیر خسرو کی تالیف ہے اور یہ مختصر دیباچہ مع حمد و نعت کسی نے بعد میں اضافہ کردیا ہے۔ باوجودیکہ اس قصے کے ایک سے زیادہ متن ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کی زبان بھی ایسی نہیں جسے امیر خسرو یا ان کے عہد کی زبان کہا جاسکے۔ امیر خسرو کی نثر کے نمونے کافی سے زیادہ ہمارے پاس موجود ہیں، جن کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امیر صنائع و بدائع، دقت پسندی اور پیرایہ کلام کو پیچ دے کر دشوار فہم بنانے کے عادی تھے لیکن یہ نسخہ نہایت سادہ و سلیس اور خوش مذاقی کی حد تک مقفی اور رنگین عبارت میں مرقوم ہے۔ اس کی املا و انشا و پیرایہ بیان بالکل اسی اسلوب میں ہے جو ہمارے ہاں گذشتہ اور اس سے قبل کی صدی میں رائج تھا۔

چہار درویش کے جو قلمی نسخے ہم تک پہنچے ہیں ان میں قدیم ترین وہی ہیں جو

بارھویں صدی ہجری کے منتصف تک ہمیں لے جاتے ہیں۔ اس سے آگے ان کی سراغ رسی نہیں کی جاسکتی۔ نہ اس عہد سے پیشتر کوئی اہل قلم اس تالیف سے آشنا معلوم ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں جہاں اپنے عہد کے مروجہ افسانوں کا ذکر کیا ہے مثلاً کلیلہ و دمنہ' نل دمن' رامائن' رزم نامہ اور قصہ امیر حمزہ' ان میں چہار درویش کا نام نظر نہیں آتا۔

ادھر شیخ نظام الدین اولیا کے حالات و مقالات و ملفوظات پر متعدد کتب و رسائل موجود ہیں جو خود اسی عہد کے مشاہیر نے مرتب کیے ہیں۔ بعض کے نام یہاں درج کرتا ہوں:

(۱) "فوائد الفواد" مرتبہ حسن دہلوی ہجری۔
(۲) "افضل الفوائد" مرتبہ امیر خسرو دہلوی۔
(۳) "انوار المجالس" از خواجہ محمد بن بدرالدین اسحاق۔
(۴) "تحفۃ الابرار" از خواجہ عزیزالدین صوفی۔
(۵) "سیر الاولیا" از سید محمد بن سید مبارک کرمانی۔

ان ملفوظات و مولفات کے ذریعے سے' تقریباً' شیخ کی زندگی کے روزانہ حالات و واقعات پر اطلاع بہم پہنچ سکتی ہے لیکن ان کتابوں میں چہار درویش اور اس کے سبب تالیف کا کوئی مذکور نہیں۔

اسی طرح امیر خسرو کے حالات و تصنیفات بالتفصیل معلوم ہیں لیکن نہ مورخین نہ تذکرہ نگار اس نام کی کوئی تالیف ان کی تصنیفات میں شمار کرتے ہیں۔

جب ہم اصل قصہ چہار درویش کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں متعدد ایسے وجوہ اور قرائن موجود پاتے ہیں جو ایک طرف امیر خسرو سے اس کے تعلق کی تردید اور دوسری طرف اس کے جدید الاصل ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

اس نسخے کو مختلف شعراء کے کلام سے موقع و محل کے مناسب ابیات لاکر آراستہ کیا گیا ہے جس میں باستثناء بعض اکثر ایسے شعراء داخل ہیں جو امیر خسرو کے بعد کے

زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً خواجہ حافظ جن کو کثرت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ صفحات ۹، ۲۷، ۵۳، ۵۹، ۷۲، ۷۵، ۹۲، ۱۳۱، ۱۳۵، ۱۹۵ و ۲۰۶ پر ان کے اشعار اور غزلیں ملتی ہیں۔ حافظ کے علاوہ فغانی کا یہ شعر منقول ہے:

سرو قدش که از چمن جان برآمده
شاخ گلی بصورت انسان برآمده

(صفحہ ۶۱)

اور نظیری کا شعر:

محبت با دل غم دیده الفت بیشتر گیرد
چراغی را که دودی هست آتش زود تر گیرد

(صفحہ ۶۸)

غیرتی کی غزل کے تین بیت:

زدیده قطرهٔ اشکی روان نمی آید
که یک دو لخت جگر درمیان نمی آید

(صفحہ ۴۳)

عرفی کی غزل سے دو شعر:

دو عالم سوختن نیرنگ عشق است
شهادت ابتدای جنگ عشق است

(صفحہ ۹۴)

شاپور کی غزل کے چار شعر:

می نماید تپش دل ره پرواز بمن
می روم تا چه کند ناله ناساز بمن

(صفحہ ۷۳)

اور عزتی کی غزل سے دو شعر:

کو بکو آن را کہ می جستم بدامان یافتم
ھم چو صبح این دولت از چاک گریبان یافتم

(صفحہ ۷۷)

حافظ کے بعد سب سے زیادہ شیخ سعدی کے اشعار و اقوال ملتے ہیں۔

صفحہ ۱۲:

ابلہی کہ روز روشن شمع کافوی نہد
زود باشد کش بہ شب روغن نہ بینی در چراغ

صفحہ ۱۳۱:

مر او را رسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

صفحہ ۱۴۹:

در بیابان خشک و ریگ روان
شلغم پختہ بہ کہ نقرۂ خام

صفحہ ۱۴۹: مصرع

تو خواھی از سخنم پند گیر و خواہ ملال

صفحہ ۱۵۸:

درویش و غنی بندۂ این خاک در اند
آنان کہ غنی تر ند محتاج تر ند

صفحہ ۲۰۶:

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔"

اب ہم بعض الفاظ کی شہادت پیش کرتے ہیں جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ امیر خسرو کے عہد میں ان کا وجود نہ تھا۔

صفحہ ۲۴: "بہزار تومان خریدم۔"

صفحہ ۲۵: دوسہ اشرفی بہ غلامان تواضع کردم۔"

ہم نے صرف ان دو مثالوں پر قناعت کی ہے ورنہ تومان اور اشرفی کا ذکر اس تالیف میں بکثرت موجود ہے۔ اول الذکر ایرانی اور آخرالذکر ہندوستانی سکہ ہے۔ تومان اور اشرفی بحیثیت اصطلاح زرمروجہ بالکل جدید الاستعمال ہیں۔ ساتھ ہی الفاظ آئندہ پر بھی غور ہو۔

صفحہ ۶۱ و ۱۰۰: تورچیان

صفحہ ۱۴۴: کشکچیان

صفحہ ۱۴۸: کشک خانہ

صفحہ ۱۴۸: اشک آقایان ؟

صفحہ ۱۵۵: وکیل السلطنہ

صفحہ ۲۳۵: خزانہ دار

صفحہ ۲۳۴: امیر آخور

اب یہ تمام اصطلاحات ہندوستان میں مغلوں کی آمد کے بعد رواج پاتی ہیں۔

اس تالیف میں دوربین کا بھی ذکر آتا ہے۔ خواجہ سگ پرست اپنے اونچے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا زیردامن صحرا و دریا کے نظارے میں مصروف ہے۔ دور میدان میں اسے دو صورتیں نظر آتی ہیں جنہیں وہ پہچان نہیں سکتا۔ دوربین منگوا کر دیکھتا ہے:

"ناگاہ سیاھی دو نفر دیدم کہ در بیابان می آمدند۔ دوربین را طلبیدم و نیک ملاحظہ کردم"

(صفحہ ۱۴۵)

اب دوربین یورپ میں بھی، جو اس کا وطن ہے، سترھویں صدی عیسوی میں رائج ہوتی ہے۔

مولف کئی موقعوں پر حضرت علیؓ کا ذکر کر رہا ہے مگر ذیل کے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فرقہ اثنا عشری کا ایک رکن ہے۔

صفحہ ۱۰۲: "کیشم محبت دوازدہ امام است واداى صلواۃ و صیام"

صفحہ ۱۵۱: "و تو باید کہ بہ مصلحت وقت تقیہ کنی و بی مضائقہ بت را سجدہ کنی۔"

اب وہی نسخہ، جو امیر خسرو کو اپنی تالیف کا ذمہ دار قرار دیتا ہے، یہ شہادت بھی پیش کر رہا ہے کہ اس کا مولف شیعہ جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس صغریٰ و کبریٰ سے یہ نتیجہ نکلا کہ امیر خسرو شیعہ تھے۔ لیکن امیر ایسے پکے سنی ہیں کہ قاضی نوراللہ جیسے شیعہ تراش بھی ان کو مجالس المومنین میں داخل کرنے کی جرات نہیں کرسکے حالانکہ وہ سنائی، عطار، مولانا روم، سعدی و حافظ جیسے سنیوں کی شیعیت کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ چونکہ امیر خسرو کا تسنن یقینی ہے اور یہ کتاب شیعی جذبات و احساسات کی حامل ہے اس لیے امیر کی تالیف نہیں مانی جاسکتی۔

یہ عقیدہ کہ یہ افسانے اصلاً" ایران میں لکھے گئے ہیں یا ہندوستان میں؟ کتاب میں اس کے متعلق متضاد شہادت موجود ہے۔ مولف کا اکثر اوقات اپنے افراد کو "مرد عجمی" بیان کرنا، ان کے فارسی نام، تومان کا استعمال اور ایرانی شہروں کا زیادہ ذکر دلالت کرتے ہیں کہ مولف ایرانی ہوگا مگر ذیل کے امور سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے:

صفحہ ۱۲۹: "حال ہم در ھند قاعدہ چنان است کہ ھرکس یک لک روپیہ دارد یک بیرق بر سر دیوار خانہ می بندد۔"

صفحہ ۱۸۳: "در بلاد ہندوستان جزیرہ ایست خوش آب و ھوا بہ کیفیت و صفا مشہور بہ جزیرہ حکیم بدان اعتبار کہ جوگی در آن جزیرہ باغی ساختہ۔"

جنوں کے متعلق اس کا عقیدہ ہے کہ ان کے پاؤں بکری کے سم کی طرح چرے ہوتے ہیں۔

صفحہ ۲۰۰: "اما پایہای ایشان مانند گوسفند سم شگافتہ۔"

الفاظ "رومال" اور "اشرفی" کئی مقام پر اس تصنیف میں لائے گئے ہیں جو استعمال ہند کے ذیل میں مشمول ہیں۔

چہار درویش میں روم، قسطنطنیہ، یمن، شام، بیت المقدس، بصرہ، بغداد،

آذربائیجان، فارس، عجم، نیمروز، نیشاپور، ترکستان، بخارا، ہندوستان، زیرباد اور بلاد فرنگ کا ذکر آتا ہے۔ مصنف کی جغرافیائی معلومات، جیسا کہ افسانوں کا دستور ہے، ناقص ہے۔ زیرباد جس سے اس کی مراد ملک برما ہے، اس کے بیان کے مطابق فرنگستان کے قریب واقع ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

"بہ شہری رسیدیم کہ درمیانہ فرنگ و زیرباد بود۔" (صفحہ ۱۲۰)

اسی طرح ایک آذربائیجانی نوجوان کے قصے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا۔ یہاں سے باپ بیٹے زیرباد پہنچے۔ وہاں سے فارغ ہوکر فرنگ کے ارادے سے جہاز میں سوار ہوگئے۔ (صفحہ ۱۳۶)

ہم سوچتے ہیں کہ یہ کیسا برما ہے جہاں سے انسان براہ راست فرنگ پہنچ جاتا ہے۔ اس فرنگ سے مصنف کی مراد کہیں پرتگالیوں اور دیگر مغربی اقوام کے وہ مقبوضات تو نہیں جو گیارھویں، بارھویں صدی ہجری میں جزائر شرق الہند اور ہند کی دیگر بندرگاہوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

درویش اول یمن کا رہنے والا ہے۔ اس کی بہن روپیہ دے کر تجارت کے لیے اسے ملک شام بھیجتی ہے۔ جب شام کے دارالخلافے میں پہنچ جاتا ہے، شام کی شہزادی کو ایک صندوق میں زخمی اور بے ہوش پاتا ہے۔ علاج کے لیے جراح کو بلا کر لاتا ہے۔ جراح خیال کرتا ہے کہ خود درویش نے اس کو زخمی کیا ہے۔ کہتا ہے "ظالم کہیں یوں گھائل کرتے ہیں" درویش معذرت میں کہتا ہے "یہ عورت میری بہن ہے۔ ہمارا سارا کنبہ یمن سے، جو ہمارا وطن ہے، بیت المقدس کی زیارت کو نکلا۔ کل رات جنگل میں ہمارے قافلے پر قزاق آگرے۔ میرے خاندان کے تمام لوگ مارے گئے۔ صرف بہن بچی، اسے بھی بری طرح گھائل کرگئے۔ میں اٹھا لایا ہوں۔" (صفحہ ۱۹)

اب سوچنے کا مقام ہے کہ ایک شخص یمن سے بیت المقدس کے ارادے سے چلتا ہے۔ اس کو شام کا دارالخلافہ (دمشق)، جو بیت المقدس سے بھی شمال میں واقع ہے، کیسے مل سکتا ہے۔

چہار درویش کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرنگیوں کے ساتھ کثرت سے ارتباط و اختلاط کے تعلقات دکھائے گئے ہیں۔ دو قصوں میں وہ حصہ لیتے ہیں۔ دربار روم میں ان کا سفیر وزیر روم کی جان بچاتا ہے۔

فرنگیوں کے متعلق مصنف کی اطلاعات بعض صحیح اور بعض غلط ہیں۔ وہ نعمان سیاح کو راہبوں کے سیاہ لباس میں ملبوس بیان کرتا ہے۔ (صفحہ ۵۴)

اس کو معلوم ہے کہ فرنگیوں کے ہاں برہنہ سر ہو کر سلام کرنے کا دستور ہے۔

صفحہ ۵۴: "سر برہنہ کردہ پیش رفتم و سلام گفتم:

برہنہ پیش تو آیم برسم و راہ فرنگی

کہ من گدای فرنگم تو بادشاہ فرنگی"

وہ جانتا ہے کہ کتے ان کے ہاں نجس نہیں مانے جاتے۔

صفحہ ۹۶: "سگ در ہمہ مذہب نجس است مگر بہ مذہب کفار فرنگ۔"

اسے علم ہے کہ شاہ روم کے ہاں فرنگی سفیر متعین ہے۔ وہ فرنگیوں میں کرسی کے رواج سے باخبر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کتاب میں اکثر جگہ کرسی اور صندلی کا مذکور آتا ہے۔ پادشاہ، ملکہ، شہزادے اور شہزادیاں، افسر اور تاجر سب کے سب کرسیوں پر بیٹھے دکھائے گئے ہیں۔

امیر خسرو کے عہد میں فرنگیوں کے متعلق یہ اطلاع مشکل سے بہم پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ امور اس کتاب کے جدید العہد ہونے کی دلیل ہیں۔

فرنگی ملکہ اور دیگر لوگ مسلمانوں کو "مسلمی" کے عجیب خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحہ ۵۷، ۵۹، ۶۱ و ۱۳۴۔

جہاں تک ان کی پرستش کا تعلق ہے، مولف کتاب ان میں اور ہندوؤں میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ ان کے عبادتی تذکرے میں اس نے بھول کر بھی حضرت عیسیٰ کا نام نہیں لیا ہے چہ جائیکہ دیگر بزرگان دین سے واقف ہو۔ نہ وہ انہیں عیسائی اور نصاریٰ کے نام سے یاد کرتا۔ اس کے بیان کے مطابق ان کے عبادت خانے، بت خانے کہلاتے

ہیں۔

(صفحہ ۱۴۲ '۱۴۳ و ۱۵۱)

وہ بت بزرگ کو پوجتے ہیں۔ صفحہ ۱۲۶ '۱۳۰ '۱۳۱ '۱۳۲ '۱۳۹ و ۱۴۰۔

لات و منات بھی ان کی پرستش میں داخل ہیں۔ صفحہ ۱۳۹

ان کے پجاری کشیش اور برہمن کہلاتے ہیں۔ صفحہ ۱۳۹ و ۱۵۲۔

ایک مادر موموناں کا ذکر آتا ہے جس کی عمر ۱۱۸ سال ہے۔ دیار فرنگ میں یہ عورت نہایت مقبول و محبوب ہے۔ فرنگیوں کے ہاں ناقوس کا بھی رواج ہے۔ صفحہ ۱۴۱ و صفحہ ۱۵۳۔

یہ بعض امور ہیں جو اس کتاب کے سرسری مطالعے کے وقت ہماری نظر سے گزرتے ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر ایسا مواد ہے جو کتاب کو امیر خسرو کے ساتھ وابستہ کرنے کی بجائے اس کے جدید العہد ہونے کی شہادت پیش کر رہا ہے۔

اب تک ہم نے چہار درویش کے ایسے نسخے کا مطالعہ کیا ہے جو اس افسانے کی تعمیر کی سب سے آخری اور ارتقا یافتہ کڑی ہے۔ اب ہم اس کی ابتدائی کڑی کا معائنہ شروع کرتے ہیں۔ جس چیز کو ہم ابتدائی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں' ایسی تالیف ہے جو دیگر مولفات کے مقابلے میں بلحاظ سادگی عبارت و ادائے مضمون و اختصار پسندی یقیناً قدیم ہے۔ اس میں امیر خسرو کے ساتھ انتساب کا قصہ مذکور نہیں ہے بلکہ مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اس کو زبان ہندی سے فارسی میں منتقل کر رہا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم اس کتاب کے مصنف اور اس کے زمانہ تالیف سے واقف ہیں۔

مصنف کا نام حکیم محمد علی الخاطب بہ معصوم علی خاں ہے۔ وہ محمد شاہ پادشاہ (سنہ ۱۱۳۱ھ و ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں گزرا ہے۔ آوزلی اپنی فہرست میں اس کا نام محمد علی معصوم لکھتا ہے۔[۳] (صفحہ ۴۱۷)۔ محمد علی کا بیان ہے کہ ایک روز میں نے محمد شاہ پادشاہ کی خدمت میں کسی تقریب پر درویشوں کی ایک کہانی بہ زبان ہندی سنائی جسے اعلیٰ حضرت نے بے حد پسند کیا اور حکم دیا کہ اسے ہندی عبارت سے فارسی زبان میں ترجمہ کردو۔

تعمیل ارشاد عالی میں میں نے اسے فارسی زبان میں منتقل کردیا۔ یہاں مصنف کی اصل عبارت درج کی جاتی ہے:

"درین ایام کہ جہان و جہانیان از ریزش سحاب عدل و کرم شاہنشاھی چون روضہ جنت و ساکنان فردوس خورم و مسرور می باشند و بندگان درگاہ عرش اشتباہ ملائک پناھش غبار آستان کیوان نشانش کحل الجواھر دیدۂ پرنور می سازند یعنی حضرت خدیو جہان کشای عالمگیر، اقلیم ستان جہانگیر، ملائک سپاہ، خلافت پناہ، نور پیشانی صبح سعادت، دعای جوشن بازوی شجاعت، ماحی اطوار جور و اعتساف، بانی آثار عدل و انصاف، فرازندۂ تخت و تاج، معالج روزگار علیل مزاج سمی حضرت ختمی پناہ، ظل اللہ، طرا زندۂ اورنگ جہانبانی، حضرت صاحبقران (ثانی)، محمد شاہ دام دولتہ و قام لقایہ الی یوم القیام، اما بعد روزی این غلام مستہام در محفل اقدس و مجلس مقدس خسرو گردون (پناہ) حاضر و پروانہ آسا بران شمع خورشید نظر ناظر بود بہ تقریبی حکایتی از دل ریشان درویشان و سرگزشتی از سرگزشتگان قلندران بہ زبان ھندی بعز عرض ھمایون رسانید و آن حکایت مرغوب طبع و پسند خاطر مشکل پسند پادشاہ فیروز مند آمد باین کمینہ یعنی حکیم محمد علی مخاطب بہ معصوم علی خان فرمان فرمای دل و جان صادر شد کہ آن را از عبارت ھندی بہ زبان فارسی ترجمہ نماید بناء علی ہذا اطاعت فرمان واجب الاذعان نمودہ آن حکایت را بالسطر بہ زبان عجمی نقل نمودہ و ھی ھذا۔"

تعجب ہے کہ حکیم محمد علی نے اس تالیف کا کوئی نام نہیں رکھا ہے لیکن اس کا جو مخطوطہ ہمارے زیر نظر ہے، خاتمے میں عبدالکریم کاتب اس کو "حکایات عجیب و غریب" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر ابتدا میں "چہار درویش" کا یہی نام ہو۔ خاتمے کی عبارت ہے:

"تمت حکایات عجیب و غریب بتاریخ ۱۳ شہر شوال سنہ ۱۵ محمد شاھی الراقمہ عبدالکریم۔"

نوشتہ بماند سیہ بر سفید

نویسندہ را نیست فردا امید"

یہ نسخہ حجم میں مطبوعہ نسخے سے تقریباً" نصف ہے۔ اس کے ایک سو تہتر صفحات اور فی صفحہ ۱۴ سطریں ہیں۔ اگرچہ محمد علی کا یہ متن اس داستان کے اکثر مطالب و دیگر خط و خال تمام و کمال پیش کر رہا ہے ،تاہم طبع شدہ متن کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔ نہ اس کی زبان میں وہ شگفتگی و برجستگی ہے جو مطبوعہ متن میں ملاحظہ کی جاتی ہے۔ عبارت اکثر مختصر' سادہ و عاری ہے۔ حسن بیان کی بجائے بیان واقعات پر توجہ مصروف ہے۔ داستانی واقعات کے سلسلے میں بعض موقعوں پر اس میں اور دوسری تالیفوں میں کسی قدر فرق ہے لیکن قصہ خواجہ سگ پرست میں یہ فرق بہت نمایاں ہوجاتا ہے۔ میں جزئی اختلاف کو ترک کرکے بعض صریح اختلافات کی چند مثالیں یہاں دیتا ہوں :

(۱) ایک فرق تو یہ ہے کہ مطبوعہ نسخے میں دوسرے درویش کی کہانی کے بعد بادشاہ آزاد بخت خواجہ سگ پرست کی کہانی شروع کرتا ہے' محمد علی یہ کہانی تیسرے درویش کی کہانی کے بعد لاتا ہے۔

(۲) خواجہ سگ پرست روم کی وزیرزادی کے ساتھ جو مردانہ بھیس میں تھی قسطنطنیہ کے قریب پہنچ جاتا ہے اور شہر کے باہر خیمے لگاکر ٹھہر جاتا ہے۔ آزاد بخت کے دربار میں اس کی طلبی کے متعلق دونوں نسخوں میں فرق ہے۔ مطبوعہ نسخے کا بیان ہے کہ قراول شاہی کی معرفت اس کی آمد کی اطلاع دربار میں پہنچتی ہے۔ محمد علی کا بیان ہے کہ خود دختر وزیر اپنی ماں کو ترغیب دیتی ہے کہ خواجہ کو دربار میں بلایا جائے۔ میں دونوں نسخوں کی اصل عبارت یہاں نقل کرتا ہوں :

نسخۂ محمد علی :

"آن جوان عملی از خواجہ بیچارہ رخصت شدہ بہ شہر آمد و در وقت شب داخل

حرم خود شد۔ بخدمت مادر احوال خود و خواجہ سگ پرست مفصل ظاہر کرد و گفت دو روز دیگر مرا معاف دار تا پدرم را خلاص نمایم و ای مادر مہربان بخدمت فرمان فرمای معروض (دار) کہ بر صدق مقال پیر غلام حق تعالیٰ کرم فرمودہ این پیر کنیز امیدوار است کہ آن سوداگر سگ پرست را بامدادان طلب داشتہ جواہر آویزان گلوی سگ ملاحظہ فرمایند و سرگذشت آن را تفحص نمایند واگر تاجر در اظہار آن مضائقہ نماید آن جوان خوش ظاہر کہ ہمراہ اوست او را سزاوار قتل فرمایند تا آن تاجر از خوف قتل آن سرگزشت سگ پرستی واضح سازد و پیر غلام را از زندان برآرند چون این پیغام ترجمان وزیر رسید در طلب سوداگر حکم فرستادیم۔" (ب ۴۸)

نسخۂ مطبوعہ:

"از قضا یکی از میرشکاران بادشاہ کہ از شکار برگردیدہ بود وقت عصر گزرش بر آن مکان افتاد۔ خواجہ زادہ و سائر تجار از خواب چاشت بیدار شدہ و بر در سراپردۂ خواجہ برلب جوئی بر فراز صندلی ھا نشستہ صحبت می داشتند۔ او را تعجب می آید کہ آیا ایشان کیانند۔ بادشاہ کسی را امر بہ سفرنہ فرمودہ و ایلچی نیز بتازگی از طرفی نیامدہ۔ پس شاطر خود را بہ خبرگرفتن امر می کند۔ شاطر چون یک بار بہ اردوی تجار می رسد خواجہ او را پیش می طلبد و از احوال مخدومش می پرسد و چون بر جاہ و منزلت او مطلع می گردد پیغام می فرستد اگر شما را از صحبت درویشان ملالی نباشد غریب نوازی فرمودہ منزل ما را منور نمایند و لمحہ بیاسایند۔ او نیز بجہت اطلاع برکماھی احوال ایشان بدان صوب روانہ می شود و بعد از تکریم و تعظیم از جانبین برفراز صندلی می نشیند و آن ھمہ اسباب و اثاثہ و خیل و خدم و خواص با آن مکنت و ثروت و خواجہ زادۂ آفتاب طلعت را می بیند و برابر صندلی سگ و قفس ھای مذکورہ را بہ نظر می آورد ھوش از سرش بدر می رود و خواجہ بعد از

ادای وظائف میزبانی چند جامه و از متاع نفیس باو تکلیف می کند و بعد از تفتیش احوال خواجه و نام و مقام او .شهر می آید. روز دیگر بدرگاه ما حاضر می شود. بجهت امرا حکایت می کند. همگی از شنیدن او (کذا) متعجب شدند. چون داخل بارگاه گردیدند .بعرض مارسانیدند و خبث اطوار خواجه بحدی گفتند که نائره غضب من شعله ور گردید و جزم کردم که آن مرد از مشرکان است و سیاست او موجب حفظ ایمان است و به تنبیه سائر بی ادبان چند از قورچیان پر غضب را بحاضر ساختن سراو و ضبط اموال او امر فرمودم. درویشان از قضا همان ایلچی فرنگ که دران روز شفاعت وزیر نموده بود چون این حکم از من شنید بی اختیار فرو خندید و قهر برمن مستولی گردید بلی شعر:

خنده که از دل نگشاید گره
گریه ازان خندهٔ بی وقت به

گفتم ای مردک نادان به چه سبب خندیدی. گفت شهریارا خندهٔ بنده چند سبب دارد. اول آن که صدق قول وزیر صائب تدبیر در خدمت امیر کبیر ظاهر شد و آن مرد فقیر بی تقصیر از زندان خلاص خواهد یافت. الحمد لله که به شفاعت این بی بضاعت دران روز حضرت اعلیٰ به خون بی گناهی آلوده نه گردیدند.
دیگر آن که شهریار جهان بدون آن که مرد تاجر را .بطلبند و از احوال او پرسند .بمجرد شنیدن حرفی از شخصی که بخواهش هرچه گوید حکم قتل فرمودن. نظم:

گوش بر قول آن و این کردن
رخنه باشد .بملک و دین کردن

سخن .مفسدان اگر شنوی
جانب خلد بی گمان نه روی

درویشان چون آن مرد نیک خواه بدین نکته مرا آگاه ساخت و بیاد وزیر انداخت فرمودم بروند خواجه را باپسرش و آن دو نفر محبوس و آن سگ بیارند. حسب

الامر قورچیان ہمہ را حاضر ساختند۔ (سخہ ۱۰۰ تا ۱۰۲)

(۳) ایک اختلاف اس موقع پر نظر آتا ہے جب خواجہ سگ پرست شہزادی فرنگ سے شادی کرکے ممالک فرنگ میں آباد اور شاہ بندر کے عہدے پر ممتاز ہے اور بھائیوں کو پنجروں میں قید کرچکا ہے۔ مطبوعہ نسخے میں ذیلی کہانی کے طور پر ایک آذربائیجانی نوجوان کا قصہ درج ہے جو حسب ذیل ہے:

یہ نوجوان اپنے والد کے ساتھ تجارت کی غرض سے ہندوستان آتا ہے۔ وہاں سے زیرباد اور زیرباد سے بہ ارادۂ دیار فرنگ سفردریا اختیار کرتا ہے۔ راستے میں طوفان آتا ہے اور جہاز ڈوب جاتا ہے۔ ہمارا نوجوان ایک تختے کے سہارے ساحل دریا تک پہنچ جاتا ہے۔ کنارے پر اسے چنے کے کھیت نظر آتے ہیں۔ جن میں سیاہ فام انسان آگ جلا کر ہولے کر رہے تھے۔ نوجوان نے بھی تھوڑے سے چنوں کے ہولے کیے۔ کچھ کھائے اور کچھ ساتھ لیے اور چل دیا۔ کئی دن کے سفر کے بعد ایک شہر میں پہنچا۔ وہاں کا دربان کوئی ایرانی تھا۔ اس نے اسے شہر میں جانے سے روکا اور سمجھایا کہ یہ شہر بڑا منحوس ہے' آدمی یہاں ہر وقت خطرے میں رہتا ہے' تم کسی اور شہر کو چلے جاؤ اور یہاں نہ رہو۔ نوجوان اس کی نصیحت نہیں سنتا۔ مجبور ہوکر وہ اسے اپنے بھائی کے پاس بھیج دیتا ہے۔ وہ بھی سمجھاتا ہے مگر نوجوان شہر چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ آخر دختر وزیر سے اس کی شادی ہوجاتی ہے۔ ایک ہی سال کے اندر لڑکی کا انتقال ہوجاتا ہے۔ اس شہر کا دستور ہے کہ اگر خاوند مرجائے تو بیوی کو اور اگر بیوی مرجائے تو خاوند کو چالیس روز کی خوراک دے کر ایک مقفل قلعہ نما چاردیواری میں' جو درحقیقت مردہ خانہ ہے' مردے سمیت بند کردیتے ہیں۔ نوجوان اس عمارت میں بیوی کی لاش کے ساتھ لایا جاتا ہے اور بند کردیا جاتا ہے۔ جب اس کی خوراک ختم ہونے کے قریب پہنچتی ہے عین اس وقت کسی اور شخص کا مردہ مع اس کے زندہ زوج کے مردہ خانے میں داخل ہوتا ہے۔ نوجوان اس زندہ کو قتل کرکے اس کی خوراک پر گزران کرتا ہے اس طرح عرصے تک زندہ رہتا ہے حتیٰ کہ شہر کے وکیل السلطنت کا داماد انتقال کرتا ہے۔

اس کی لاش کے ساتھ وکیل السلطنت کی لڑکی گورستان میں لائی جاتی ہے۔ نوجوان اسے قتل نہیں کرتا اور اپنی بیوی بنالیتا ہے۔ اس سے اولاد ہوتی ہے۔ آخر مردوں میں زندگی سے تنگ آکر پانی کی موہری کے راستے سے میاں بیوی باہر نکل جاتے ہیں اور عام راستوں سے بچتے اور بناسپتی پر گزر اوقات کرتے مہینے بھر کے سفر کے بعد اس جنگل میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے خواجہ سگ پرست کا محل قریب رہ جاتا ہے۔ خواجہ محل کی چھت سے انہیں دیکھتا ہے اور چونکہ پہچانے نہیں جاتے' دوربین سے دیکھتا ہے۔ دونوں کو عجیب وضع کا پاکر اپنے پاس بلوالیتا ہے۔ عورت کو اپنی بیوی کے پاس بھیج دیتا ہے اور مرد کو اپنے پاس بلالیتا ہے۔ نوجوان اپنی رام کہانی سناتا ہے۔ خواجہ بڑی مہربانی سے پیش آتا ہے اور اسے اپنی سرکار کا ناظر مقرر کرتا ہے۔ جب وطن کا شوق گدگداتا ہے' خواجہ شاہ بندر کا منصب پادشاہ سے نوجوان کو دلا کر مع اپنے بھائیوں کے جو پنجروں میں مقید ہیں' ایران پہنچ کر نیشاپور میں آباد ہوجاتا ہے۔

محمد علی کے ہاں آذربائیجانی نوجوان کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس کا قصہ دراصل خواجہ سگ پرست کی اپنی سرگزشت کا ایک جزو ہے۔ یعنی جب خواجہ ممالک فرنگ میں عہدۂ شاہ بندر پر فائز ہوکر شہزادی فرنگ کو اپنی بیوی بنالیتا ہے' میاں بیوی ایک عرصے تک شادمانی کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر خواجہ کو اپنے بھائیوں کی فکر پریشان رکھتی ہے۔ تین سال کے بعد سوداگروں کا ایک قافلہ براہ دریا بندرگاہ میں آیا۔ اہل قافلہ نے خواجہ کی ضیافت کی۔ دعوت کے وقت اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں بھائی قافلے میں موجود ہیں اور خدمت گاری کے کام پر متعین ہیں۔ خواجہ کو بڑا صدمہ ہوا۔ انہیں پھر گھر لے آیا اور ہر طرح سے ان کی دل جوئی اور نازبرداری میں مشغول رہا۔ شاہ فرنگ سے ان کو اپنے ہی دفتر میں عہدے دلوا دیئے اور ان کی ترقی میں ساعی رہا لیکن بہ مصداق جبل گردد جبلی برنگردد' یہ بدذات اپنی خباثت سے باز نہ آئے۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ خواجہ کی بیوی باغ میں سیر دریا میں مصروف تھی۔ منجھلا بھائی اتفاقیہ دیکھ کر اس پر عاشق ہوگیا۔ دونوں بھائیوں میں صلاح ٹھہری کہ خواجہ کے خون سے ہاتھ رنگین کیے

جائیں۔

ایک رات خواجہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دونوں موذی پہنچے۔ ایک خواجہ کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ دوسرے نے پھندا گلے میں ڈال کر اسے فشار دیا۔ خواجہ سگ پرست بے ہوش ہوگیا۔ کتا بھونکا اور ان ظالموں نے خواجہ کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ جب خواجہ کو ہوش آیا' دیکھا کہ دھوبی دریا کے کنارے اس کے منہ میں چاولوں کا پانی ٹپکا رہے ہیں۔ شام کو اسے گھاس پر لٹا دیا گیا۔ صبح جب اٹھنے کے قابل ہوا تو اسے سامنے چنوں کے کھیت نظر آئے۔ جہاں سیاہ رنگ کے انسان کام کر رہے تھے۔ وہ اسے چنے دیتے ہیں۔ یہ ان چنوں کو پتھر پر پیس کر روٹی تیار کرتا ہے۔ جب وہ سیاہ فام یہ روٹی چکھتے ہیں بڑے خوش ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہی واقعات دہرائے جاتے ہیں جو ہم آذربائیجانی نوجوان کے قصے میں اوپر دیکھ آئے ہیں۔ ان کو دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں' البتہ اتنا فرق ہے کہ ان مصائب میں کتا خواجہ کا شریک رہتا ہے۔

بالآخر ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ بیوی بچوں اور کتے سمیت پانی کی راہ سے مردوں کے قلعے سے نکل کر جنگلوں میں چھپتا اور فاقے کرتا ایک شہر میں پہنچ جاتا ہے۔ کچھ دیر کرایہ کے مکان میں رہ کر اپنی حالت درست کرتا ہے اور جواہرات بیچ کر ایک حویلی خرید لیتا ہے۔ دریا کے کنارے دکان کھولتا ہے۔ اور امیرانہ ٹھاٹ کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ ایک روز صبح کے وقت وہ دریا کا نظارہ کر رہا تھا۔ دور سے دو صورتیں نظر پڑیں۔ خیال ہوا کہ انہیں جانتا ہے۔ دوربین منگوائی اور پہچان لیا کہ یہ وہی دونوں بھائی ہیں۔ سپاہی بھیج کر انہیں پکڑ بلوایا۔ جب پاس آئے بہت لعنت ملامت کی۔ دونوں اپنی حرکات پر نادم ہوئے۔ رونے لگے۔ آخر خون نے جوش مارا۔ خواجہ نے انہیں معاف کر دیا۔ حمام میں بھیجا۔ کپڑوں کے نئے جوڑے بھیجے۔ اپنے گھر کے پاس انہیں گھر لے دیا اور خانہ داری کی ضرورت کا ہر قسم کا سامان ان کے ہاں بھجوا دیا۔ تین سال تک وہ خاموش رہے۔ آخر ان کی جرم و گناہ کی رگ جنبش میں آئی۔

خواجہ سگ پرست ایک دن کسی دوست کے ہاں مہمان گیا تھا۔ موقع تاڑ کر دونوں

بھائی زنانے میں درانہ گھس آئے۔ خواجہ کی بیوی انہیں آتا دیکھ کر کوٹھڑی میں چھپ گئی۔ اور اندر سے زنجیر لگالی۔ ان خبیثوں نے بچوں کو پکڑلیا اور بچوں کی ماں سے کہنے لگے کہ اگر تو باہر نہیں آئی اور ہمارا کہنا نہیں مانا تو ہم ان بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ عورت نے نہ مانا۔ ان پاپیوں نے بچوں کو قتل کردیا۔ ماں نے جب بچوں کی یہ حالت دیکھی، آپ سر پتھر پر دے مارا اور مر گئی۔ اس اثنا میں خواجہ سگ پرست اپنے مکان پر پہنچا۔ اس نے غلاموں کو حکم دیا کہ انہیں گھیر کر گرفتار کرلو۔ ان کی سفاکی اور غداری سے خواجہ کا پیمانہ صبر لبریز ہوچکا تھا تاہم وہ ان کی خوں ریزی پر راضی نہ ہوا۔ آخر یہ تدبیر کی کہ دو پنجرے منگوائے اور ان پنجروں میں ان کو بند کردیا۔

(۴) اسی قسم کا ایک فرق خواجہ سگ پرست کی کہانی میں اس موقع پر ملتا ہے جب خواجہ کے بھائی خواجہ کو اپنا غلام ظاہر کرکے اس پر اپنے بھائی کے قتل کی تہمت لگاتے ہیں اور سو تومان حاکم کو رشوت میں دے کر پھانسی کا حکم حاصل کرلیتے ہیں۔

مطبوعہ نسخے میں آتا ہے کہ: جب خواجہ کو پھانسی پر لٹکانے لگے، خدا کے حکم سے عین اسی گھڑی بادشاہ شہر کے قولنج کا درد شدت کے ساتھ اٹھا۔ ایک وزیر نے صلاح دی کہ درد کا یہی علاج ہے کہ صدقہ اور قربانی دی جائے اور قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ شاہی ندیم بندیوں کو قید سے آزادی دلانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ راستے میں خواجہ کو پھانسی دی جارہی تھی۔ ندیم گھوڑا دوڑاتا بے تحاشا ہجوم میں گھس گیا اور تلوار سے پھانسی کی رسی کاٹ دی۔ خواجہ سگ پرست کی جان بچ گئی لیکن اس کے بھائی دوبارہ حاکم کے پاس پہنچے اور اپنے مفروضہ بھائی کے خون کے طالب ہوئے۔ حاکم چونکہ رشوت کھا چکا تھا، بولا اب تو کھلم کھلا اس کا قتل مشکل ہے مگر تمہاری خاطر سے یہ ہوسکتا ہے کہ اس کو زندان سلیمان میں ڈلوادوں جہاں وہ خود بھوک پیاس سے ہلاک ہوجائے گا چنانچہ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا جنہوں نے خواجہ کو پوشیدہ طور پر لے جا کر ایک کنویں میں، جو زندان سلیمان کے نام سے موسوم تھا، ڈال دیا۔

محمد علی اس موقع پر ایک فقیر کے ذکر اور خواجہ کے بھائیوں کی گرفتاری و رہائی

کے بیان سے قصے میں جدید عنصر داخل کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

جب خواجہ کے گلے میں پھانسی ڈال دی گئی' قدرت الٰہی سے اسی وقت حاکم کے پیٹ میں قولنج کا درد اٹھا۔ ایک ندیم نے مشورہ دیا کہ اس درد سے نجات کی یہی صورت ہے کہ قیدیوں کو آزاد کیاجائے۔ حاکم نے یہ مشورہ مان کر ایک مصاحب کو اس کام پر مقرر کردیا۔ جس طرف خواجہ کو پھانسی دی جارہی تھی' مصاحب اسی طرف سے نکلا اور پھانسی کی رسی تلوار سے کاٹ دی۔ خواجہ خدا کا شکر بجالایا اور شہر سے باہر نکل گیا۔ ایک گاؤں میں پہنچا۔ وہاں ایک فقیر سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کھانا دیا۔ خواجہ نے پیٹ بھر کر کھایا اور کتے کو بھی کھلایا۔ فقیر نے اس کی سرگزشت پوچھی۔ جو کچھ بیتی تھی کہہ سنائی۔ درویش افسوس کرتا رہا۔ اس اثنا میں ایک مرید نے دس تومان فقیر کے نذر کیے۔ یہ رقم لے کر اس نے خواجہ کو دے دی اور بولا اس رقم کو تجارت میں لگاؤ۔ اگر خدا توفیق دے میری رقم مجھے دے دینا ورنہ خیر' میرا تم سے کوئی دعویٰ نہیں۔ خواجہ فقیر کو دعائیں دے کر رخصت ہوا۔ خدا کے فضل سے تجارت میں اس قدر برکت ہوئی کہ جب سال بھر کے بعد خواجہ اسی گاؤں میں آیا اس وقت چالیس زریں کمر غلام اس کی خدمت میں حاضر باش تھے۔ خواجہ آکر فقیر سے ملا اور بولا کہ میں فلاں شخص ہوں اور تمہاری دعا سے اس رتبے کو پہنچ گیا ہوں۔ یہ کہہ کر بہت سا روپیہ فقیر کی نذر کیا مگر درویش نے کچھ نہیں لیا۔ چند روز فقیر کی خدمت میں رہا۔ پھر رخصت لے کر شہر میں گیا۔ لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ دو چور حاکم شہر کے ہاں چوری کرنے گئے تھے۔ پکڑے گئے ہیں۔ ان کو سزا دی جانے والی ہے۔ خواجہ نے چوروں کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا کہ اس کے اپنے بھائی ہیں۔ بھائیوں کے درد سے بے تاب ہوگیا اور رقم کثیر حاکم کے ہاں بھر کر دونوں کو چھڑا لیا۔ گھر لے گیا۔ تین ماہ تک تینوں بھائی اس شہر میں مقیم رہے۔ اس کے بعد وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ایک اور شہر کے قریب پہنچے۔ قافلے نے پڑاؤ کیا۔ عصر کا وقت تھا' خواجہ کے بھائیوں نے تجویز کی' پیدل سیر کو نکلیں اور جنگل کی ہوا کھائیں۔ یہاں سے قریب

ایک عمدہ شکار گاہ ہے جسے حاکم وقت نے تیار کیا ہے۔ ان کی خواہش کے مطابق خواجہ پیدل چل نکلا۔ کوس بھر زمین طے کی ہوگی۔ خواجہ نے سوال کیا کہ شکار گاہ کہاں ہے۔ بھائیوں نے جواب دیا' ابھی اور آگے ہے۔ چلتے چلتے ایک کنویں پر پہنچے۔ منجھلا بھائی کنویں پر کھڑا ہوگیا اور جھانک کر بولا' بھئی واہ! یہاں تو عجیب ہی تماشہ نظر آتا ہے' اس پر بڑے بھائی نے کنویں میں جھانکا اور اچنبھے کے ساتھ کہنے لگا' میں نے عمر بھر ایسا تماشہ نہیں دیکھا۔ خواجہ سگ پرست بھی بڑھا اور کنویں میں جھانکنے لگا لیکن اندھیرے کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا۔ چاہتا تھا کہ منہ کھولے۔ اتنے میں منجھلے بھائی نے کمر پکڑ کر کنویں میں دھکا دے دیا۔ خواجہ کنویں میں گرا اور سخت چوٹ آئی۔ یہ وہ کنواں تھا جس میں ان لوگوں کو جھونک دیا جاتا تھا جن سے حاکم وقت ناخوش ہوتا تھا۔

(ورق ۵۲ و ۵۳)

میں بخوف طوالت ان ہی مثالوں پر قناعت کرتا ہوں اور یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت مجھ کو تفصیل میں جانا منظور نہیں ہے تاہم اکثر ایسے موقعے ملتے ہیں جن میں مطبوعہ نسخہ محمد علی کے نسخے سے مختلف ہے لیکن یہ اختلاف اس قسم کا ہے کہ یا پیرایہ بیان کو پھیلا دیا گیا ہے یا عبارت میں اصلاح دے دی گئی ہے۔ چست فقرے بڑھا دیئے گئے ہیں یا مختصر عبارت کو بعض حشویات کے ادخال سے' جو نفس قصہ پر اثر انداز نہیں' طول دے دیا گیا ہے یا بیان واقعہ میں بہ نظر تہذیب و تزئین ضروری تبدیلی داخل کردی گئی ہے۔ بیان غائبانہ کو بصیغہ متکلم تبدیل کردیا ہے۔ بعض موقعوں پر شخصوں اور شہروں کے نام اضافہ ہوئے ہیں اور مناسب موقع و محل اشعار داخل کیے گئے ہیں۔ باوجود اس قدر تبدیلیوں کے' جن سے مطبوعہ نسخہ تقریباً" المضاعف ہوگیا ہے' دیکھا جاتا ہے کہ محمد علی کے اصل متن کے آثار طبع شدہ نسخے میں جگہ جگہ' کہیں کم اور کہیں زیادہ' بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں مقابلے کے لیے تمثیلاً" کچھ عبارت دونوں نسخوں سے نقل کی جاتی ہے:

نسخۂ محمد علی:

"علی الصباح مرا بحمام فرستاده و لباس فاخر پوشانیده بر مرکبی همراه خود سوار کرده روبه بت خانہ کردیم۔ خلق آن شہر از ہفت سالہ تا ہفتاد سالہ اعلیٰ و ادنیٰ دران جا حاضر شدند و دختران خورشید سیما و پسران خوش لقا صف زدہ سیر کنان رسیم تا بجای کہ فرمان فرمای و امرا بخدمت بت سرکورنش و تسلیمات نہادہ من نیز بظاہر زمین بوسیدم و دست برہمن و فرمان فرمای را ہم بوسیدم و دامن وی را (کذا) گرفتہ طلب دختر کردم۔ فرمان فرمای ازان مرد پرسید کہ این کیست و از کجا آمدہ است۔ گفت از خویشان منست بامید زیارت بت بزرگ آمدہ و الحال بر دختر وزیر مائل شدہ التماس دارد کہ بامر فرمان فرمای در غلامی او را قبول کند۔ فرمان فرمای فرمودہ حکم بت نافذ است۔ فی الحال برہمن رشتہ سیاہی در گردن من کرد و مرا بپای بت بزرگ آورد و سجدہ فرمود۔ حرفی چند گفت۔ آوازی از جوف بت برآمد کہ خواجہ زادہ خوش آمدی۔ از مرحمت امیدوار باش۔ یک مرتبہ خلائق ہمہ برخاک افتادند و بہ ترانہ صدقنا مترنم گشتند۔ فرمان فرمای خلعت فاخر بمن پوشانید و حکم بنواختن نقارخانہ فرمود و در افواہ عوام افتاد کہ عجمی را بت بزرگ نظر کردہ دختر وزیر را باو داد۔"

نسخۂ مطبوعہ:

چون صبح نزدیک شد مرا بحمام فرستاد و لباس فاخرہ داد۔ چون بخانہ آمدم آن مرد سوارشدہ و مرا نیز بر مرکبی نشانیدہ روانہ بت خانہ شدیم و آن بت خانہ درکنار دریا واقع بود و بہ ترتیب و زینتی کہ زبان از شرح آن عاجز و قاصر است و خلق آن شہر از ہفت سالہ تا ہفتاد سالہ اعلیٰ و ادنیٰ دران جا حاضر۔ ہمہ مستان و پای کوبان دختران خورشید سیما و پسران یوسف لقا در ہر طرف صف زدہ در سیر و صفا۔ بیت:

گل رخان جملہ در صفا و حضور
چشم بد از جمال نیکان دور

سیر کنان رفتم تا بجای کہ پادشاہ و امرا بخدمت برہمن بدو زانوی ادب نشستہ بودند۔ سرھا برھنہ کردہ گوش ھا بر آواز بت داشتند۔ من بموجب تعلیم کورنش و تسلیم نمودہ بت را بظاہر زمین بوسیدم و دست برہمن و پادشاہ راھم بوسیدم و بعدہ دامن وزیر راگرفتم و طلب دختر کردم۔ پادشاہ ازان مرد پرسید کہ این کیست و از کجا آمدہ است۔ گفت از خویشان من است۔ بامید زیارت بت بزرگ آمدہ است و الحال دختر وزیر را دیدہ و مائل او گردیدہ۔ چون بدین در آمدہ التماس دارد کہ وزیر بامر بادشاہ بہ غلامی خود قبول کند۔ بادشاہ فرمود امر بت بزرگ نافذ است۔ فی الحال برہمن رشتہ سیاھی در گردن من کردہ بپای تخت بت بزرگ آوردہ سجدہ فرمودہ و حرفی چند گفت۔ آوازی از جوف بت بزرگ بر آمد کہ خواجہ زادہ خوش آمدی۔ از مرحمت ما امیدوار باش۔ ترنگ از خلائق بر آمد۔ تمامی برخاک افتادہ صدق صدق گفتند۔ باری بادشاہ مرا خلعت دادہ نقارخانہ را بنواختند و آواز بلند شد کہ عجمی را بت بزرگ نظر کردہ دختر وزیر را باو دادہ۔"

(صفحہ ۱۵۱ ۔ ۱۵۲)

ان اقتباسات میں اس قدر مماثلت و مشابہت کوئی توارد تو ہے نہیں۔ یہی کہنا پڑتا ہے کہ مطبوعہ متن کا مالک محمد علی کے متن سے نہ صرف واقف ہے بلکہ اسی کی عمارت پر اس نے اپنی تعمیر کھڑی کی ہے۔ اس کے باوجود یہ بیان کہ جب نظام الدین اولیا کسی بیماری میں مبتلا ہوئے' امیر خسرو ان قصوں کو رقم کرکے اپنے پیر و مرشد کو سناتے رہے' جب آنحضرت نے غسل صحت فرمالیا اس وقت دعا کی کہ الٰہی جو شخص بھی ان قصوں کو پڑھے یا سنے وہ ہمیشہ بیماریوں سے مامون و مصئون رہے' محمد علی کے بیان کے سامنے کہ اس نے محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے اس کتاب کا ہندی سے ترجمہ کیا ہے' کسی وقعت کا مستحق نہیں۔ اس روایت سے نہ صرف محمد علی ناواقف ہے بلکہ محمد

حسین عطا خان تحسین بھی اس سے بے خبر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت سب سے پہلے طبع شدہ فارسی نسخے سے شروع ہوئی اور میر امن نے اس سے نقل کی۔ باغ و بہار کے بیان نے اس کو شہرت دے دی بحالیکہ اس کی صحت کے حق میں کسی کی دلیل بھی باوجود تلاش نہیں ملتی۔ مسلمانوں میں قصوں اور افسانوں کے متعلق ہر زمانے میں تعصب رہا ہے۔ فسانہ وامق و عذرا اور ویس و رامین اسی بنا پر ممنوع تھے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر امیر خسرو کو اس کا مصنف بنا کر اور نظام الدین اولیاء سے تبریک دلوا کر مرتب قصہ نے اس کو مقبول عام بنانے کی غرض سے دروغ مصلحت آمیز والا حیلہ تراشا ہو۔ نیم مذہبی قصوں میں مصنفین قاری و سامع کو ثواب دارین کی بشارت اکثر دیا کرتے ہیں۔

❑❑❑

حواشی

(۱) یہاں فاضل مولف کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ مضمون لکھتے وقت غالباً" شیرانی صاحب کے پیش نظر یہی مطبع محمدی، بمبئی والا نسخہ تھا جس میں میر احمد کا دیباچہ شامل نہ تھا۔ اب یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ میر احمد کا مرتبہ "چہار درویش" پہلی بار سنہ ۱۲۹۵ھ (مطابق ۱۸۱۵ء) میں مطبع حیدری سے شائع ہوا تھا۔ اس اشاعت میں مولف کا جو دیباچہ شامل تھا اس میں یہ اعتراف موجود ہے کہ میر احمد نے چند فارسی مخطوطات کے علاوہ میر امن کی "باغ و بہار" کی مدد سے یہ نسخہ ترتیب دیا تھا۔ ملاحظہ ہو "اردو کی نثری داستانیں" از ڈاکٹر گیان چند جین، صفحہ ۶۹، اشاعت ثانی، کراچی، ۱۹۶۹ء (مرتب)

(۲) مندرجہ بالا حاشیہ کی روشنی میں میر امن اس روایت کے محض ناقل نہیں باقی ٹھہرتے ہیں۔ اور میر احمد نے قصے کا امیر خسرو سے انتساب میر امن کی تقلید میں کیا ہے۔ اس ضمن میں رشید حسن خاں کا کہنا ہے: "میر امن کے اس بیان کے سوا، ان سے پہلے یا ان کے زمانے میں اور کہیں اب تک یہ روایت دیکھنے میں نہیں آئی اور اسی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ انہی کی بنائی ہوئی ہے۔" دیکھئے "باغ و بہار" مرتبہ رشید حسن خاں، مقدمہ، صفحہ ٦٦، دہلی، ۱۹۹۲ء (مرتب)

(۳) شیرانی صاحب کے مضمون کے بعد چہار درویش کے بعض ایسے نسخوں کا انکشاف ہوچکا ہے جو محمد علی معصوم کے نسخے سے اقدم ہیں۔ ان میں سب سے قدیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذخیرہ حبیب گنج میں ہے جو بقول ڈاکٹر گیان چند جین جہاندار شاہ کے جلوس کے پہلے سال یعنی سنہ ۱۱۲۴ھ (مطابق ۱۷۱۲ء) کا تحریر کردہ ہے۔ ڈاکٹر جین ایک اور نسخہ نوشتہ ۱۱۴۱ھ (مطابق ۱۷۲۸ء) کا ذکر بھی کرتے ہیں جو بوڈلین لائبریری (آکسفورڈ) میں محفوظ ہے (بحوالہ نمبر ۴۴۳، فہرست حصہ اول)۔ ملاحظہ ہو کتاب "اردو کی نثری داستانیں" محولہ بالا (صفحہ ۱٦۷)

ڈاکٹر نفیس جہاں کا بیان ("میر امن دہلوی --- حیات و تالیفات" دہلی، ۱۹۸٦ء) جس کی تصدیق رشید حسن خاں بھی کرتے ہیں، یہ ہے کہ ذخیرہ حبیب گنج والا نسخہ غائب ہوچکا ہے اور باوجود تلاش کے دست یاب نہیں ہوا۔ دیکھئے مقدمہ باغ و بہار از رشید حسن خاں، صفحہ ۹۸ (مرتب)

❑❑❑

داستانِ پشاور

(از سہ ماہی "صحیفہ" اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۶ء)

اس نظم کے مخطوطے پر مبنی چند خستہ اوراق اور اس کے تعارف میں لکھا ہوا شیرانی صاحب کا یہ مختصر سا مضمون مجھے مرحوم کے کاغذات میں دستیاب ہوا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مضمون سنہ ۱۹۲۰ء یا اس سے ذرا پہلے لکھا گیا ہوگا۔ مضمون کسی خصوصی اہمیت کا حامل نہیں۔ شاید اسی بنا پر شیرانی صاحب نے اس کی اشاعت پر توجہ نہیں کی البتہ زیر نظر نظم یقیناً اہم ہے۔ اس کی اہمیت کا ذکر شیرانی صاحب نے بدیں الفاظ کیا ہے :

"داستان پشاور کے ایراد سے ہمارا مقصد رنگین کی رنگین بیانی کا اظہار نہیں ہے بلکہ ڈیڑھ صدی (اب دو صدی سے اوپر) قبل پشاور شہر میں، جو ہندوستان کا سرحدی شہر ہے، اردو کی مقبولیت کا بیان کرنا ہے کہ پٹھانوں کے اس شہر خاص میں، تیمور شاہ کے عہد میں لوگ اردو میں بھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔"

اردو شاعری کی طرح صنف شہر آشوب کا آغاز بھی دکن میں ہوا۔[۱] شمالی ہند میں ابتدائی شہر آشوب میر جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۳ء) سے منسوب کیے جاتے ہیں۔[۲] اگرچہ اس کی ان نظموں یعنی "قطعہ در بیان نوکری" اور "دستور العمل در اختلاف زمانہ ناہنجار" پر شہر آشوب کا پوری طرح اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ : "محض گردش آسمانی یا زمانے کی ناقدردانی کا ذکر کسی نظم کو شہر آشوب بنادینے کے لیے کافی نہیں۔"[۳] بعد میں محمد شاکر ناجی (م : ۱۷۴۳ء)، اشرف

علی خان فغاں (م : ۱۷۷۲ء)' مرزا محمد رفیع سودا (م : ۱۷۸۰ء)' شیخ ظہور الدین حاتم (م : ۱۷۸۱ء)' قیام الدین قائم (م : ۱۷۹۵ء)' میر تقی میر (م : ۱۸۱۰ء) اور نظیر اکبر آبادی (م : ۱۸۳۰ء) شہر آشوب کو ایک باقاعدہ صنف کی صورت دیتے ہیں۔ داستان پشاور کے مصنف رنگین کا تعلق بھی اٹھارھویں صدی عیسوی کے منتصف دوم سے ہے۔

اس دور میں شہر آشوب کے مضامین : حاکموں پر نکتہ چینی' سیاسی ابتری و بدامنی' رشوت کی گرم بازاری' امرا کی خستہ حالی' فوج کی تباہی' فوجیوں کی پریشانی' قرض خواہوں کے ہاتھوں بے عزتی' پیشہ وروں کی بدحالی' ارباب علم و ہنر کی خواری اور نودولتیوں کی مذمت پر مشتمل ہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد شہر آشوب میں جو مرثیے کا رنگ پیدا ہوا وہ ابھی ناپید تھا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اہل حرفہ اور دکانداروں کی بدحالی کا رونا اکثر شہر آشوبوں میں رویا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بھرپور نظم نظیر اکبر آبادی کی "جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند" کہی جاسکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دکانداروں اور پیشہ وروں کی بددیانتی' ملاوٹ اور منافع خوری کے ہاتھوں عوام الناس کی جو درگت بنتی ہے' اس کا تذکرہ شہر آشوبوں میں الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے شیرانی صاحب کے زیر نظر مضمون کا یہ فقرہ محل نظر ہے کہ "شہر آشوب . . . . . شہر کے پیشہ وروں دھنئے' بقالوں' حجاموں وغیرہ کی مذمت میں لکھا جاتا ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ دور جدید کے اس اہم مسئلے پر اٹھارھویں صدی کے شہر آشوب نویس توجہ دیتے نظر نہیں آتے۔ بہت بعد میں اکا دکا شاعروں نے اس طرف دھیان دیا ہے۔ مثال کے طور پر میریار علی عرف جان صاحب (متوفی : ۱۸۷۹ء) کے شہر آشوب کا ایک بند یہاں درج کیا جاتا ہے :

گدھ ہیں گویا اے بوا اس شہر کے دوکاندار

نوچیں مردہ جان کر دیکھیں جو گاہک جاندار
ایک ڈھونڈھے سو میں تو نکلے نہیں ایماندار
بھاری بھرکم دیکھنے کو ہیں یہ بھڑوے شاندار
کھوکھلے تربوز سے دے ان کو نسبت آج کل

لیکن جان صاحب کے ہاں بھی یہ مضمون اتفاقاً" در آیا ہے اور اس شہر آشوب میں اس موضوع پر یہ واحد بند ہے۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے "داستان پشاور" کے مصنف کی انفرادیت عیاں ہوتی ہے۔ اگرچہ نظم کا مرکزی خیال "طوق زریں ہمہ در گردن خرمی بینم" ہے لیکن اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کسی بھی اور چیز کے مقابلے میں اہل حرفہ اور دکانداروں کی عیاری' بے ایمانی' ملاوٹ اور لوٹ کھسوٹ کے ہاتھوں زیادہ نالاں ہے۔ اس اعتبار سے بھی رنگین کا یہ شہر آشوب خصوصی اہمیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔

(مرتب)

"داستان پشاور" ایک شہر آشوب ہے۔ شہر آشوب' جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے' شہر کے پیشہ وروں' دھنئے' بقالوں' حجاموں وغیرہ کی مذمت میں لکھا جاتا ہے۔ یہ نظم پشاور میں لکھی جاتی ہے اور غالباً" کسی مقامی شاعر کے قلم کی یادگار ہے۔ شاعر کا تخلص "رنگین" ہے جیساکہ داستان پشاور کے مقطع کے شعر سے واضح ہوتا ہے۔ "رنگین" کی اور نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو اور فارسی زبانوں میں شعر گوئی کرتا ہے اور تیمور شاہ ابن احمد شاہ ابدالی (متوفی ۱۲۰۵ھ) کے عہد میں موجود تھا۔

رنگین کی ایک اور اہم تاریخی نظم وہ ہے جو اس نے تیمور شاہ کے خلاف ایک سازش بلکہ بغاوت کے فرو ہوجانے کے موقع پر فارسی میں تحریر کی ہے۔ بغاوت کا سرغنہ فیض اللہ خان[۴] افغان تھا۔ اس بنا پر نظم کا نام "داستان فیض اللہ خاں" ہے۔ جس کا پہلا بند یہ ہے:

شکر کن ای دل کہ برق غم بہ بدخواہان رسید
تیغ تیز شاہ بر حلقوم افغانان رسید
روز محشر بر خلیل و خیبری یکسان رسید
بر افاغن ہمچو قوم نوح یک طوفان رسید
بخت و اقبال و ظفر با خسرو دوران رسید

ان پٹھانوں نے شہر میں، جب تیمور شاہ قلعہ میں مقیم تھا، فساد برپا کیا اور مسلح ہو کر چڑھ دوڑے اور عین دوپہر کے وقت قلعہ والا میں داخل ہو گئے۔ آغا جلال ان کو بارگاہ شاہی میں داخلے سے روکتا ہے۔ فیض اللہ خاں اپنی پوری فوج کے ساتھ آیا تھا۔ بادشاہ خواب میں تھا۔ بیدار ہوا اور بالائے بام جا کر وہ اپنی آنکھوں سے باغیوں کی فوج کو بڑھتا دیکھتا ہے:

ع: گفت اکنون بر سلیمان لشکر موران رسید

بادشاہ نے اپنے خانگی ملازمین کو مدافعت کے لیے حکم دیا۔ خواجہ سرا اور پیش خدمت، شاہی حکم سے آگے بڑھے۔ ادھر سے آبدار آگئے اور لڑائی شروع ہو گئی۔ اتنے میں نائب خان کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی۔ وہ ننگے پاؤں بھاگا آیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ پہلے ان کم بختوں کو بالا حصار سے نکالو۔ شاہی خدام اور امیر آخور وغیرہ دوڑے۔ کسی کے ہاتھ میں پتھر، کسی کے ہاتھ میں لکڑی آئی اور افغانوں پر ہلہ کر دیا۔ اتنے میں زنگی اور غلماق آگئے۔ شاطران شاہی اور قاپچی بھی پہنچ گئے اور افغانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دیوان بیگی خان عبداللہ، جس کے ساتھ فوفل زئی تھے، آگیا۔ اودھر پائندہ خاں بھی مع بارک زئیوں کے آپہنچا۔ بازار اردو میں منادی ہوئی اور تمام دکاندار دشمنوں پر اٹھ دوڑے۔ سنچی باشی بھی آگیا۔ نشان خان مع اپنے دستے کے آگیا۔ بنیاد خاں، احمد خاں اور بارو خاں بھی آن پہنچے۔ یہ لوگ سرداران شاہی میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ تین دن برابر ملاعین پر تلوار چلتی رہی اور بے حساب قتل ہوئے۔ خان گل نے آکر مفسدوں کے لیے امان طلب کی اور بادشاہ نے ان کو معاف کر دیا۔ دربار لگا اور خان گل

برہنہ سر، گردن میں رسمان ڈالے اور منہ میں تنکا لیے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے بھی معاف کردیا۔ قیدیوں کو رہائی کا حکم مل گیا اور فیض اللہ خاں کو ہاتھی کے پاؤں میں ڈلوا دیا گیا۔

"داستان پشاور" میں شاعر نے پشاور کے پیشہ وروں کے عجب و غرور اور بے جا فخر و تبختر کا خاکہ اڑایا ہے۔ اس کی زبان سادہ مگر شکستہ و بستہ ہے جس سے روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی بالکل مفقود ہے۔ شاعر ایک سیدھے سادے انداز میں اہل پیشہ کی برائی کر رہا ہے۔ جن میں ان اہل حرفہ کا مذکور ہے:

ڈوم، نائی، خرچران، چوہڑ یعنی خاک روب، معلی، بافندہ، گل کش و گل کار، نعل بند، شمشیر گر، (باکی ساز)، گنداخ ساز، بندوق ساز، خوردہ فروش، آٹا فروش، موچی، سرتراش، خیمہ دوز، نمدمال، پنجی پراچے، ماشکی، جوتی فروش، باسن فروش، زرگر، کلال، سبزی فروش، نجار، لوہار، عطار، کبابی، قیمہ گر، نان با، آش پز، ارائیں، درزی، رنگ رز، (گازر)، علاقہ بند، پچہ ساز، بقال، پاپڑ فروش، شالی کوب، تارکوب، تلہ تاب، تارکش، قصائی، صابون گر، (غلیلی)، شیرنی فروش، موزہ دوز، چھاپہ گر، جوہری، صراف۔

"داستان پشاور" کے ایراد سے ہمارا مقصد رنگین کی رنگین بیانی کا اظہار نہیں ہے بلکہ ڈیڑھ صدی قبل پشاور شہر میں، جو ہندوستان کا سرحدی شہر ہے، اردو کی مقبولیت کا بیان کرنا ہے کہ پٹھانوں کے اس شہر خاص میں، تیمور شاہ کے عہد میں لوگ اردو میں بھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔

شاعر کی زبان کے استقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقامی شاعر ہے۔ اس کی بے محاورہ زبان صاف ظاہر کرتی ہے کہ وہ کوئی ہندوستانی نہیں ہے اور نہ زبان پر اس کو عبور ہے۔ جن نمونوں سے اس نے اردو سیکھی ہے وہ دہلی کی ٹکسال کے نہیں ہیں بلکہ دکنی جن میں موں، سوں، سیں، تیں وغیرہ کا استعمال بجائے ظرفیہ "میں" اور جارہ "سے" بہت عام ہے۔

نظم میں مقامی زبان کی خصوصیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی۔ البتہ "راستی"

بجائے "راست" آرہا ہے مثلاً ع:

راستی جانے گا گر دیکھے کوئی انصاف وار

اور ع:

راستی ہے یہ بیاں ہر ایک جانوں یادگار

فارسیت اور فارسی محاورے زیادہ غالب ہیں۔ مثلاً ع:

میں بتادیتا ہوں ہر یک قوم کوں کر کر شمار

یا ع:

جس کوں آتا ہے مغل سوں اور افغاں سوں بی عار

یا ع:

فقر کا جبہ انھوں کے تن سوں ہے گا ساز وار

یا ع:

اب امیروں کے مصاحب ہیں کہاتے آپ کوں

"ہنکال" (ہانک) کی جگہ "ہنکار" لایا گیا ہے۔ ع:

بلبلاں کوں گل سوں دیکھیں جس جگہ (کذا) دیویں ہنکار

"تیکار کرنا" مجھ پر غیر منکشف ہے یعنی ع:

اب وہ دہ باشی کہاویں آپ کوں کر کر تیکار

دیکھا جاتا ہے کہ ناظم کئی موقعوں پر اپنے مقصد کے اظہار سے قاصر رہا ہے اور شعر "المعنی فی البطن شاعر" کا مصداق رہ جاتا ہے۔ رنگین کی ایک غزل بھی دستیاب ہوئی ہے۔ جو ذیل میں درج ہے:

ریختہ

مشرف گر کبھو تجھ حسن سیں مہتاب ہو جاتا

قیامت لگ پھر آنا رات کوں نایاب ہو جاتا

تعجب کیا ترے جلوے سے کوہ طور گر لرزا
وہاں فولاد بی ہوتا تو گل کر آب ہو جاتا
برہ کی آگ جیسی سخت تھی گر اب تلک رہتی
مرا ہر لخت دل غم سوں پگل خوں ناب ہو جاتا
نہ ہوتا شعر بازی کا بی استعداد گر تجکوں
خدا کی سوں بتاں کے غم سوں دل بے تاب ہو جاتا
اٹھاتا مکھ سے گر وہ سیم تن رنگیں نقاب اپنا
جہاں موں جس کے گھر روپا تھا سب سیماب ہو جاتا

اکثر اوقات جمع "وں" کے ساتھ آتی ہے۔ بعض اوقات "ان" بھی دیکھا جاتا ہے مثلاً:

ع: بلبلاں کوں گل سوں دیکھیں جس جگہ دیویں ہنکار

یا ع:

بات کرتا ہوں میں شیرینی فروشاں کی عیاں

"اے پر" آج شاید نہ سمجھا جاوے مگر یہ فارسی لفظ "بارے" کا ترجمہ ہے۔ مثال ع:

اے پر ان ساروں کو مت یکساں تصور کیجیو

متن داستان پشاور

۱۔ شہر نا پرساں جو کہتے ہیں فہیم روزگار
سو پشاور ہے یہی دل سوں کرو گے اعتبار
۲۔ دوم(۵) اور نائی کہاویں جس جگا(۶) موں خاں بیگ
آبرو داروں کو پھر واں کون دیتا ہے وقار
۳۔ باپ اور دادے سوں تھا اشراف سو اب ہے خراب
میرزا صاحب کہاویں خرچراں احمق گوار(۷)

۴ـ سید اور ملا کو کوئی نئیں جانتا اس شہر موں
گرچہ ہوجاویں ولی و متقی پرہیزگار

۵ـ کیا قریشی کیا عرب کیا شیخ کیا زاہد سبھی
واسطے روٹی[٨] کے سرگرداں پھریں حیران زار

۶ـ وقت ہے اجلاف کا تم کوں نہ آوے گر یقیں
میں بتا دیتا ہوں ہر یک قوم کوں کر کر شمار

۷ـ اولا اول تو نخوت کھرموں جا چھور[٩] کی دیکھ
جس کوں آتا ہے مغل سوں اور افغاں سوں بی عار[١٠]

۸ـ بعد اس کے ہے مغلی کا بی جامہ زرفشاں
جس کے زانو پر کبھی ثابت نہ دیکھی تھی ازار

۹ـ دوم جس کی محتسب ہر روز کرتا تھا علاج
اب وہ دہ باشی کہاوے آپ کوں کر کر نیکدار

۱۰ـ عمر جن کی گزر گئی باقندگی کرتے ہوئے
فقر کا جبہ انھوں کے تن سوں ہیگا سازوار

۱۱ـ گل کش و گل کار ایسے ہوگئے مغرور سب
گر کسی کا گھر گرا ہو کس سوں کرواوے طیار

۱۲ـ نعل بندوں کی رعونت انھوں سوں ہیگی زیاد
گرچہ رکھتے نیں وہاں سوں نعل تیغ یک سوار

۱۳ـ ہیں دگر بانکے پشاور کے بھی شمشیر کر
کام کر دمڑی[١١] کا پیسہ چھین لیویں نابکار

۱۴ـ سخت کوبی کے سبب یارو یہ پاکی ساز شہر
نرم کر ڈالے ہیں لوہے کوں ہتھورا[١٢] مار مار

۱۵ـ بسکہ ہے گنداخ سازوں کا بہت لکری سوں کام
نیں کسی گلشن میں چھوڑا[١٣] سرو و شمشاد و چنار

۱۶۔ ہیں امیر وقت بازاروں سے بندوق ساز
یا خوانیں پاس بیٹھے یا پھریں کرتے شکار

۱۷۔ کلہ[۱۴] شخ ہیں کیا کہوں اس شہر(کے) خوردہ فروش
کیا کرے ان سے کوئی بیوپار از روی شعار

۱۸۔ کیوں نہ ہو زردار ھر یک شہر کا تتا[۱۵] فروش
بیس کر بیچے کنک موں تیسرا حصہ جوار

۱۹۔ موچیوں کا کیا کہو (ں) پایا نہیں جاتا دماغ
بسکہ ہیں اس وقت موں ہر یک عراقی پر سوار

۲۰۔ اب امیروں کے مصاحب ہیں کہاتے آپ کوں
جن کو مسند پر غلاموں کے نہیں ملتا تھا بار

۲۱۔ سر تراش و خیمہ دوز اور نمدمال اس شہر موں
حاکموں کے گھر موں بن بیٹھے ہیں صاحب اختیار

۲۲۔ کیا کہوں جنجی پراچے ماشکی جتی فروش
عاشق اور معشوق ہیں کیا سادہ رو کیا ریش دار

۲۳۔ پہلواں بن گئے ہیں سارے شہر کے پان فروش
کیوں نہ ہو یخنی کشی یا ورجشوں[۱۶] کی مار مار

۲۴۔ یا خوانیں شہر کے زرگر ہیں یا ہیں گے کلال
کیوں نہ بھاندے[۱۷] سر پہ اپنے چن کے پگڑی نو دار

۲۵۔ قصہ خوانی موں جو رہتا ہے کوئی سبزی فروش
شاہ کہلاوے اپس[۱۸] کوں از کمال افتخار

۲۶۔ اس نگر موں گر کوئی نجار ہے یا ہے لوہار
دیودھی[۱۹] پر دیکھ اوس کی بیٹھے ہیں چوبدار

٢٧۔ مارتے ہیں دے دوائی غیر تشخیص مرض
ہیں فلاطون زمانہ شہر کے یہ سب عطار

٢٨۔ کیا کبابی، قیمہ گر کیا نان، باکیا آش پز
خوچیوں کے گھر موں بن بیٹھے ہیں صاحب اختیار

٢٩۔ اس نگر موں جو آرائی[21] ہیں سو ہیں شیطان وقت
بلبلاں کو گل سوں دیکھیں جس جگا دیویں ہنکار

٣٠۔ درزیوں کی ہوگئی دیکھو ہوا کیسی بلند
اس زمانہ موں کہ ہے ہر یک نواب تلدار

٣١۔ رنگ ریز و گازر و علاقہ بند و نیچہ ساز
کودتے ہیں زر کی خوش وقتی (سوں) مانند تمار

٣٢۔ دیکھ یہ بقال اور پاپڑ[22] فروش و شالی کوب
ایک دمڑی[23] کاسو کے ساتھ نہیں کرتے اودھار

٣٣۔ تارکوب و تلہ تاب و تارکش مستی ستی
کارخانہ سوں نہ نکلیں گر بیود سو سو پکار

٣٤۔ بندے ٹھگ[24] ہر سیں مشہور ہیں کہتے ہیں لوگ
... سو ہمارے شہر کے ہیں ٹھگے قصائی نابکار

٣٥۔ ہیں ٹھگوں کے ٹھگ برے[25] اس شہر کے صابون گر
لے کے چربی دنبیوں کی درمیاں والیں[26] ہیں مار

٣٦۔ جو بنبلی ہیں پشاور کے نگرموں نامور
ان کی مت پوچھو حقیقت بسکہ ہیں کے زاو نار

٣٧۔ بات کرتا ہوں میں شیرینی فروشاں کی عیاں
نیم شب گذر (ے) ہوئے چوروں کو دیتے ہیں اودھار

٣٨۔ ایک جیسے ہیں یہ دونو(ں) موزہ دوز اور چھاپہ گر
آشناؤں کی بھی پگڑی سر سے لیتے ہیں اوتار

۳۹۔ تجر کی نیت سبھوں کی کیا جوہری یا صراف[۲۰]
دس کو لیویں ایک اوپر سو کو بیچیں یہ ہزار

۴۰۔ رہزنی کے کسب موں کامل ہو تو ہیں بجا
کیا ہنود اور کیا مسلماں جو کہ ہے دوکان دار

۴۱۔ میں جو یہ صفتوں کتیں چن چن کے کاغذ پر لکھا
راستی جانے گا گر دیکھے کوئی انصاف وار

۴۲۔ اے پر ان ساروں کو مت یکساں تصور کیجیو
پست (و) بالا سب کی انگشتوں نیں ہوتی ہے قطار

۴۳۔ اکثر ان لوگوں میں ہوتے ہیں ہویدا اولیا
صاحب علم و سخن ور نکتہ دان و ہوشیار

۴۴۔ اس زمانہ کو شرف ہے ورنہ کئی اہل ہنر
ان ہیں[۲۸] قوموں سیتی ہوتے تھے جہاں موں آشکار

۴۵۔ چار دن جس کی بری[۲۹] ہے عمر باموی سفید
شرم میں ہوگا وہ پتھا[۳۰] جا کہیں گوشے کنار

۴۶۔ جو جواں ہے اوس کی آنکھوں میں بھی کچھ[۳۱] ہوئے حیا
سخت آفت ہے عزیزاں خورد سال ایں دیار

۴۷۔ بے حجاباں اس طرح جاتے ہیں فاسق کی طرف
دور سیں جس طور دوڑے[۳۲] باز پھوکھ[۳۳] برشکار

۴۸۔ ڈال سرمہ چشم موں ہو تھو[۳۴] کتیں[۳۵] سرخی لگا
وسمہ کر ابرو کو اور عاشق کو کر ڈالیں فگار

۴۹۔ عالم عورات کو لایق نہیں زیور سبھی
پہر[۳۶] کر نکلیں ہیں کرکے گھر سوں اپنے کو سنوار

۵۰۔ حلقہ گیسو میں کئی دل کوں کریں اپنا اسیر
جس گھری[۳۷] پہنچیں کسی مجلس میں کر ہار اور سنگار

۵۱۔ تیغ ابرو کھینچ کر مار(ے) ہیں جب عاشق کتیں
نیم بسمل ہو گرے اپنے لہو میں بے قرار

۵۲۔ راہ جاتے کو جو پھینکیں دور سیں پلکوں کے تیر
زخم کھا چھاتی ستی فریاد کر بولے پکار

۵۳۔ کنچنی اور بھگتنی کو کون کرتا ہے پسند
ہاتھ آویں جس جگا اس طور کے گلگوں عذار

۵۴۔ تمہ[۳۸] ہیں کہ انصاف سب[۳۹] یارو کہاں تک ہے کہ جھوٹھ[۴۰]
حسن خلق ان لرکیوں کا جو ہوا نقش و نگار

۵۵۔ تبن[۴۲] والے کو کہیں خدمت موں کمل[۴۳] پہنچوں گا آپ
ساتھ جاویں اوس کے جو پیسے دلاویں نقد چار

۵۶۔ جاتے جاتے راہ موں پھر گھر کے تا آنے تلک
ہر گلی ہر چوک موں دو تین کو آویں پچھار[۴۴]

۵۷۔ مثل قمری کے اسیر حلقہ دام جنوں
عرض رکھتا ہوں کہ ہر واحد کے ہوں گے پانچ چار[۴۵]

۵۸۔ شک نہ لانا دل میں یارو کیجئے گا تک[۴۶] یقیں
راستی ہے یہ بیاں ہر ایک جانوں یادگار

۵۹۔ بس ہے رنگیں اس کے آگے فکر کوں جولاں ند(د)
وہ سخن ہی خوش نما ہوتا ہے جس موں اختصار

حواشی

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر قمقام حسین جعفری کا مضمون "اردو شہر آشوبوں کا تاریخی پس منظر" مطبوعہ رسالہ "اردو" کراچی۔ شمارہ نمبر ۳، ۴، ۱۹۷۶ء اور شمارہ نمبر ۱، ۱۹۷۷ء۔

(۲) برائے تفصیل ملاحظہ کیجئے ڈاکٹر نعیم احمد کی کتاب "شہر آشوب" دہلی، اشاعت ۱۹۶۸ء۔

(۳) ڈاکٹر سید عبداللہ: "شہر آشوب کی تاریخ" مشمولہ "مباحث" صفحہ ۲۱۰، لاہور، ۱۹۶۵ء۔

(۴) یہ سنہ [illegible] کا واقعہ ہے۔ فیض اللہ خاں کا تعلق قبیلہ خلیل سے تھا اور اس نے شہزادہ تیمور سے ایک بغاوت کی تھی جس سے تخت کا بڑا شہرہ تھا۔ بغاوت کا مقصد سکندر شاہ کو تخت نشین کرانا تھا۔ (ملاحظہ ہو پروفیسر احمد حسن دانی کی انگریزی کتاب "پشاور ... ہسٹارک سٹی آف دی فرنٹیئر" صفحہ ۹۹) مرتب۔

(۵) ڈومنے

(۶) جائے

(۷) گنوار

(۸) روٹی

(۹) بیوہ

(۱۰) بھی

(۱۱) بھائی

(۱۲) تھوڑا

(۱۳) پچھوڑا

(۱۴) تخت سے پڑی ہے الخ

(۱۵) آتا

(۱۶) ورزشوں

(۱۷) باندھتے

(۱۸) خود لو

(۱۹) تیوڑھی

(۲۰) بیچتے

(۲۱) آزمائیں

(۲۲) پیڑ

(۲۳) دمڑی

(۲۴) ٹھمک

(۲۵) بڑے

(۲۶) ڈالیں

(۲۷) پھرتی نیت سبھوں کی' جوہری کیا' کیا صراف؟

(۲۸) ہی

(۲۹) بڑی

(۳۰) بیٹھا

(۳۱) کچھ

(۳۲) دوڑے

(۳۳) بھوکا

(۳۴) ہونٹوں

(۳۵) کے تئیں' کا مخفف

(۳۶) پر' بجائے' پہن' قدیم اردو پہ راجستھانی اثر ہے۔

(۳۷) گھڑی

(۳۸) تم ہی

(۳۹) "ہے" کی جگہ "ہے" مناسب ہوتا۔

(۴۰) جھوٹ

(۴۱) لڑکیوں

(۴۲) بھوسہ فروش

(۴۳) کل

(۴۴) پچھاڑ

(۴۵) پانچ

(۴۶) تک

□□□

جنگ نامۂ موہن گڈھ

۱۲٦۷ھ مطابق ۱۸۵۰ء

(از عربیک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جرنل' ٹونک۔ جلد ا شمارہ ا۔ محمود شیرانی نمبر' ۸۲ ـ ۱۹۸۱ء)

زیر نظر مضمون بھی ان مضامین میں سے ایک ہے جنہیں نسبتاً" کم اہم ہونے یا نامکمل ہونے کی وجہ سے فاضل مولف نے شائع نہیں کروایا تھا۔ مضمون لکھتے وقت مولف کے پیش نظر جنگ نامہ موہن گڈھ کا جو نسخہ تھا وہ ناقص الآخر تھا۔ مجموعہ شیرانی میں' جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا حصہ ہے' یہ نسخہ موجود ہے اور اس کا داخلہ نمبر ۴۳۷۲ ہے۔ بعد میں کسی وقت ایک اور مکمل اور خوش خط نسخے کا شیرانی صاحب کے کتب خانے میں اضافہ ہوا۔ یہ نسخہ بھی اب یونیورسٹی لائبریری میں بذیل داخلہ نمبر ۴۳٦۹ محفوظ ہے۔ یہ دوسرا نسخہ جب مولف کو ملا ہوگا تو اس کی روشنی میں وہ اپنا مضمون مکمل کرسکتے تھے لیکن عدیم الفرصت ہونے یا کسی اور سبب سے وہ ایسا نہ کرسکے۔ اس دوسرے نسخے پر نظم کا نام "مجمع اللسان" درج ہے۔ یہ اس لیے کہ اس جنگ نامے میں اردو' فارسی' ڈھونڈھاری' میواتی' پوربی' پنجابی اور پشتو زبانوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ اردو کے بعد سب سے زیادہ ابیات ڈھونڈھاری بولی کے ہیں جو راجستھان کے وسطی علاقے میں رائج ہے۔

چنانچہ ۱۹۸۰ء میں شیرانی صاحب کی صد سالہ تقریب ولادت کے موقع پر میں نے اس مضمون کا مسودہ، عجلت میں صاف کر کے عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک کے ڈائریکٹر صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب کو بھجوا دیا۔ انہوں نے یہ مضمون مرحوم فاضل مولانا قاضی محمد عمران خاں کے حوالے کیا۔ اتفاق سے ٹونک میں جنگ نامہ موہن گڈھ کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوا پھر بھی مولانا نے اس کے ناظم کا سراغ لگالیا چنانچہ مضمون کے تعارف میں فرماتے ہیں:

"آپ حضرات کو یہ معلوم ہو کر مسرت ہوگی کہ اس نظم کے ناظم محمد اسمٰعیل خاں ٹونکی ہیں جو اسلام نگر کے رہنے والے تھے اور نواب وزیرالدولہ سے متعلق تھے۔ محکم تخلص فرماتے تھے..... ۱۲۶۷ھ م ۱۸۵۰ء میں جنگ موہنی کا یہ سانحہ ہوا ہے اس وقت حیات تھے اور خود اس جنگ میں شریک تھے۔ انہوں نے اس جنگ کو سات زبانوں میں نظم کیا ہے اور یہ وہی جنگ نامہ موہن گڈھ ہے۔"

آگے چل کر مولانا عمران خاں رقم طراز ہیں:

"مولانا احمد علی سیماب جد امجد حضرت بسمل سعیدی، ٹونک کے مشہور علما میں گزرے ہیں۔ انہوں نے نواب محمد علی خاں کے دور حکومت (۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۸ء) میں فارسی زبان میں ٹونک کی ایک تاریخ لکھی ہے۔ نواب محمد علی خاں کے نام کی مناسبت سے اس کا نام "محامد علیہ" رکھا ہے۔ اس کتاب میں آپ نے ۱۲۶۷ھ کے واقعات میں جنگ موہنی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس مختصر ذکر کو ختم کرتے ہوئے آپ اس کتاب اور اس کے مرتب کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

محمد اسمٰعیل خاں نامی ساکن اسلام نگر کہ محکم تخلص می کرد و جوانے آزاد وضع، نغز گوی، خندہ روئی، وفا منش بود و بایں خاکسار ربط

اتحاد داشت۔ سرگزشت جنگ موھنی را بہ صفت زبان در نظم آوردہ و
گفتگوئے ھر قومے را بہ زبان او مودے ساختہ۔ الحق کہ داد سخن دادہ و
قطع نظر از دیگر زبان گفتار پوربیہ و زبان باشندگان راجواڑہ را بہ وضع
مہین و طرز دل نشین منظوم ساختہ است۔ اگر کسی را مطالعہ آں میسر
شود خواھد دانست کہ چقدر عرق ریزی کردہ و خون جگر خوردہ"۔

("محامد علیہ" مخطوطہ صفحہ ۲۲۰ - ۲۱۹)

مولانا عمران خاں مرحوم نے زیر نظر مضمون پر جا بجا مفید حواشی
دیئے تھے۔ ان میں سے اہم اور ضروری حواشی میں نے پاورقی میں درج
کردیئے ہیں اور ان کے آخر میں قوسین کے اندر ع۔خ لکھ دیا ہے۔
خود میں نے بھی بعض حاشیے لکھے ہیں بالخصوص ڈھونڈھاری زبان کے
اجنبی الفاظ کے بارے میں۔ مولانا نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی
کیونکہ اہل ٹونک کے لیے یہ الفاظ و محاورات جانے پہچانے تھے۔
(مظہر محمود شیرانی)

ٹونک، راجپوتانہ میں یوسف زئی پٹھانوں کی ایک تنہا ریاست ہے جو گزشتہ صدی
کے پہلے ربع میں قائم ہوئی ہے۔ اس کے بانی نواب امیرالدولہ امیر خان[۱] ہیں
جو ہلکر[۲] کے دوست اور بڑے سردار تھے۔ اور انگریزوں سے معاہدے کے بعد ہوس
ملک گیری ترک کر کے اپنے مقبوضات پر قانع ہوگئے۔ نواب امیرالدولہ کے جانشین
نواب وزیرالدولہ[۳] بہادر ہیں جو اس عہد کے روسا میں سب سے زیادہ متقی اور دین
دار تھے۔ ان کے عہد میں ٹھاکر ہنونت سنگھ نے بغاوت کی جو موہن گڈھ کا بھومیا تھا۔
قصبہ موہن گڈھ تحصیل بگڑی پرگنہ ٹونک میں جانب مغرب واقع ہے۔ اس وقت
سلطان ناوتوں میں ہنونت سنگھ بھومیہ اس گڈھی[۴] پر قابض تھا۔ ہنونت سنگھ کی لادہ[۵]

کے ٹھاکر کرن سنگھ نروکے[۶] سے عداوت تھی۔ ایک روز وہ نواب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی؛ جسے شاعر خود ہنونت سنگھ کی زبان[۷] میں جو ٹونک کے علاقے[۸] میں ہندوؤں میں رائج ہے، یوں ادا کرتا ہے:

کرن سنگھ سوں بڑی جچھے لاگ مھانگی
کمرمیں لاگی جچھے اوں نے آگ مھانگی
کمتراں ہوتا جچھے ان داتا نرو کا
جچھے سلطاں ناوتں کا بی کا بھوہ
پھرے جچھے وے کمتراں مھاں پر رسایا
رکت[۹] کا مانس[۱۰] کا بھوکا تسایا[۱۱]
کرے جچھے راڑ[۱۲] دن میں اوٹھ کے ہووار
کمتراں کایا[۱۳] ہویا مھے اوں سوں دربار
حکم ہو تو بنا لیاں روکتی بیست[۱۴]
وے نیزہ[۱۵] مار جیالا ایک دن میںنت[۱۶]
مھے بی جانوالا تھاں کو ناؤں ہولو
وے ڈوپے لا سکھی سب گاؤں ہولو
جو ماتھا پہ رہے لو ہاتھ تھاں کو
تو راکھے لا نروکا ساتھ مھاں کو
بھگا دیشاں مھے وا نے مار بھاٹا[۱۷]
جدیاں ہوویلا واں کا دانت کھاٹا
تھے پرتھی ناتھ چھو راجہ چھو مھاں کا
مھے تھاں کی ریت[۱۸] چھاں چاکر چھاں تھاں کا

نواب نے اس کی خواہش منظور کرلی۔ ہنونت سنگھ واپس لوٹا اور اپنی گڈھی کو جنگ کے واسطے اس نے تیار کرنا شروع کیا۔

ایک روز نواب صاحب کا فرمان تمام بھومیوں کے پاس پہنچا کہ سب کے سب اپنے اپنے نذرانے لے کر حاضر ہوں' مال واجب الادا میں کیوں توقف کیا جارہا ہے۔ تمام بھومیوں نے اپنا نذرانہ ادا کردیا لیکن ہنونت سنگھ نے انکار کردیا۔ اس کا جواب ناظم نے خود ہنونت سنگھ کی زبان میں یوں ادا کیا ہے :

کذھا سوں آئی مماں کا گھر میں مایا
جو مے دیو کراں نت بھیٹ بھایا
کمنڑاں کایا ہویا ایں راج سوں مے
یو چھوڑیو گاؤں ہی جو آج سوں مے
کہ مے ایں گاؤں کا رہیا سوں دھایا
کہ مماں کا جیونے سو روگ بیایا[19]

کرن سنگھ کو جب معلوم ہوا تو اس نے اپنے طعنوں سے ہنونت کو بغاوت میں بالکل مضبوط کردیا۔ موہنی میں عالم خاں[20] تعلق دار تھا۔ وہ اس کی حرکات سے پہلے ہی تنگ تھا۔ اس نے بذریعہ عرضی ہنونت سنگھ کی سرکشی کی خبر نواب کی خدمت میں پہنچادی۔ نواب نے احمد خاں[21] کمیدان کو بہ غرض فہمائش بھیجا مگر بگڑے راجپوت پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کا بیباکانہ جواب یہ تھا:

کذھا سوں لیاواں مے دیانے توڑا
بڈا آیا چھو تھے مماں پر کروڑا
نزا دیکھا چھے تھاں سر کا میاں مے
پدھارو ٹونک نے جاؤ پراں تھے

الغرض احمد خاں کمیدان لوٹا اور نواب کی خدمت میں تمام حال عرض کردیا۔ اس پر نواب نے حکم دیا کہ فیض اللہ خاں[22] جا کر قلعہ اس سے خالی کرائے۔ فیض اللہ خاں قوم کا آفریدی' قوی ہیکل جوان اور بہادری میں رستم ثانی تھا۔ وہ فوج لے کر روانہ ہوا۔ گولود[23] پر ڈیرے لگے۔

ادھر ہنونت سنگھ نے چٹھیاں بھیج کر اطراف کے راجپوتوں کو جن میں ساکے[۲۴] جتاوت' نروکے' رجاوت' سناوت' راٹھوڑ اور سلطان ناوتے تھے' بلوا لیا۔ یہ معاملہ سلطان ناوتوں کا گویا قومی معاملہ بن گیا۔ ٹھاکر تیج سنگھ[۲۵] کا کنور' بلدیو سنگھ بیس بندوقوں کے ساتھ آیا۔ چپرانے اور اجمیرے کے ٹھاکر آئے۔ ہنونت سنگھ لشکر کی آمد کی خبر سن کر موہنی سے رتیا کو آیا۔ جو اس کا جاگیری گاؤں تھا۔ وہاں سے خفیہ اجمیر روانہ ہوا اور لوس[۲۶] صاحب کے بنگلے پر پہنچا اور بہت غل مچایا۔ صاحب نے بلایا' اس کا حرف مدعا سنا اور خفا ہو کر اپنے بنگلے سے نکلوا دیا۔ ناچار وہ واپس رتیا گیا اور اپنے چچا اوگم جی کو یہ چٹھی لکھی:

کہ ہوں اجمیر کاکا[۲۷] جی گیو چھو
پھرنگی کے کنے[۲۸] دو دن ریو چھو
ملیا سائب[۲۹] جی کرسی ناکھ دینی[۳۰]
بٹھایا مھاں نے مھاں کی بھیٹ لینی[۳۱]
کری مھاں کی توجہ اوں گھنی مان
لگائی باشا[۳۲] پاچھے دیو پان
گنتراں آچھی طرح وانسوں ملیا مجھے
کشاں آیا چھو بولیا ٹھاکراں تھے
جدیاں صائب جی بوجی بات مھاں سوں
تو مے نکلی کی یا بات واں سوں
جدیاں یہ بات مھاں سوں سن چکاوے
تو من آیا جوں صائب جی بکاوے
پھرنگی کا کھیلتا[۳۳] آیا جچھے
وے تھاں نے جھو نیس[۳۴] ڈرپا ریا چھے
ڈرپ جو تھے متی وے لاکھ ڈر پائے

تھے رکھ جو گاڈ[۳۵] جتری تھاں سوں بن آنے

کائیں مونڈو جتھے واں کو بائے گولا

جو باوے لا تو کروے شاں مے دولا

ہنونت سنگھ نے یہ پیغام بھیج کر قلعہ میں جمع ہونے والے راجپوتوں کو لڑائی پر آمادہ کر دیا۔ ادھر نواب کی فوج موہنی پہنچ گئی۔ جب ہیر پور کے ٹھاکر تیج سنگھ کو معلوم ہوا کہ موہن گڈھ پر سرکاری فوج آگئی ہے اور کوئی دم میں لڑائی شروع ہوا چاہتی ہے اور اس کا فرزند بلدیو سنگھ اور اس کے بھائی بند باغیوں کے شریک ہوگئے ہیں تو وہ بہ غرض فہمائش روانہ ہوا۔ محمد امان[۳۶] اور رنئے ٹیلہ سے حمزہ خاں[۳۷] کو ساتھ لیا اور سالار فوج سے ملاقات کی اور بولا کہ اگر آپ مہلت دیں تو میں جاکر ان کو سمجھاؤں۔ اگر گڑھی کو گرادیں اور نذر دینے پر آمادہ ہوجائیں تو لڑائی کیا ضرور ہے۔ خان صاحب نے جواب دیا تم درست کہتے ہو۔ نواب صاحب یہی چاہتے ہیں۔ اگر یہ دونوں شرطیں مان لیں تو لڑائی کی ضرورت نہیں۔ آپ جائیے اور سمجھا دیکھیے۔

تیج سنگھ جی گئے۔ ان کے ساتھ نواب کا شقہ اور بہادر خاں کو بھی ساتھ کردیا گیا۔ تیج سنگھ جی نے اوگم جی کو بلوایا۔ ان کو تمام نشیب و فراز سمجھائے۔ بولے کہ قلعہ کو کسی قدر مسمار کردو اور اپنے آپ کو حوالے کردو تاکہ تمہارے حقوق اور تمہاری جانیں محفوظ رہیں۔ تم نواب کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ تمہاری یہ حالت ہوگی کہ کتے تک تمہاری لاشیں نہیں سونگھیں گے اور کنوئیں ان سے پاٹ دیئے جائیں گے۔ دربار دربار ہے اور بھومیا پھر بھومیا ہے' دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں۔ تیج سنگھ کے الفاظ یہ ہیں:

اورا آو کیو مانو تھے محاں کو

گنڈھ اوپر سوں چنی سو پاڑ ناکھو[۳۸]

بری ہو تھے سنا چھاں راج کی ہٹ

کہ ایں پر جائے لا ماتھا گھنٹراں کٹ

بڑا ساونت چھو رابار[۳۹] چھوتھے

گھنٹراں لڑبا بی موٹیار[۴۰] چھوتھے

اشا تو مے زا چھے کھیل کھیلیا
پڑا جو بوجھ مھاں پر مے ہی جھیلیا
کرم آگے زا مے بھی کریا چھے
مریا بھایاں نے دیکھیا دکھ بھریا چھے
گڑھی نے پاڑ ناکھو ٹونک جاؤ
وہ مانے جان واں کو منتر مناؤ
ستر(۴۱) کے آئی چھے دربار کی پھوج
گڑھی نے پاڑ تھاں کو کھوئے لی کھوج
کہ تھاں سوں کائیں بی بن نے پڑے لی
گڑھی میں لوتھ سگلاں کی سڑے لی
پگاں میں پاگ جن جن کے دھرولا
تکلیا لیر مونڈا میں پھرولا
گڑھی کے بار تھاں نے روک لیشی
وے سگلا بار تھاں نے ٹھوک لیشی
مے اب جانڑیا کہ تھاں کا بھاگ پھوٹیا
گیا جیسا سوں گھر کونڈا ہی چھوٹیا
سپاہی یا بندوکاں جھوک دیلا
نہ چھوڑے لا گھرڑاں تھے ڈھوک(۴۲) دیلا
نہ سونگیلا گنڈکڑا(۴۳) ماس تھاں کو
گنے لا کاگ(۴۴) بیٹھا سانس تھاں کو
کنواں لوتھاں سوں سگلا بور دے لا
پچھے ماٹی سوں اون نے پور دیلا
بڑا لوگاں یہ کمناوت کہی چھے
ندیکو سانتو(۴۵) پنتر بھیلی دئی چھے

کہ گدی پاچھے ہوچھے گنوار کی بدھ
پڑے چھڑیاں جد آوے آگلی سدھ
اٹی باتاں میں کائیں کاڈ شو سار
کہ تھے چھو بھومیاں وے انت دربار
چھے وے دربار واں کا بھاگ موٹا
کروتھے راڑ تھاں کا دن چھے کھوٹا
کدیاں چھے راڑ کرو جوگ تھاں نے
دھرے لا ناؤں سگلا لوگ تھاں نے
کہ وے تو راج کا پہلا دھنی چھے
نری چھے پلٹناں توپاں گھری چھے
مے کائیں کال چھاں تھے کائیں کرو چھو
بن آئی ٹھاکراں سگلا مرو چھو
یا سگلی اوستا(۴۶) بیتی چھے مھاں کی
کرولا راڑ تھے، سردا(۴۷) چھے تھاں کی
کڈیے بھی نہ ملشی بھیک تھاں نے
کڑی لاگی جو مھاں کی سیک(۴۸) تھاں نے
کنور بلدیو نے بارے کھندا دو(۴۹)
مے پاچھے دیکھ شاں تھاں کو ارادو

اوگم جی کا جواب زیادہ تر کنور اور ان کی بہو کے متعلق طنزیہ اشاروں پر شامل تھا۔ چنانچہ:

تھے مت سمجھاؤ مھل نے اب پرا جاؤ
گھنو چوکھو چھے تھاں کو ٹھاکراں نیاؤ

کنور کا تھے جو لے جابا نے آیا
کہ مھاں نے آپ سمجھابا نے آیا
گھراں بوجی نے آئی تاپ ہوشی
سراپے لا تو مھاں نے پاپ ہوشی
کہ کن دیکھے لو کنورانی کو مونڈو
کنور بن راؤلو(۵۰) لاگے لو بھونڈو
پڑیا ہووے لا ڈھولیا(۵۱) پر اوموتا(۵۲)
کرو مت میل کنورانی کا سونا
محل میں ہوئے لو سگلاں نے سانسو(۵۳)
بشن جی ایکلا جیسے لا کانسو(۵۴)
اشی تھے بات بودی(۵۵) کیوں بچارو
کنور نے لار(۵٦) لے بیگا(۵۷) پدھارو
کدیاں ہووے لی مھاں سوں ریس تھاں کی
کہ لیراں چھے بندوکاں بیس تھاں کی

تیج سنگھ تو اپنے کنور کو لے کر چل دیئے۔ لیکن حمزہ خاں' بہادر خاں اور شیخ محمد امان' فرمان حضور باغیوں کو سنانے ٹھہر گئے۔ ان لوگوں نے پھران کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان پر تو بھوت سوار تھا۔ کوئی بات نہ مانی۔ اوگم جی نے جواب میں کہا:

اشاں تھے مھاں نے کائیں ڈرپوک سمجھیا
ڈرپ جانوالا ڈر پایا سوں تھاں کا
کرولا راڑ تو مھے راڑ کرشاں
کہ مھے رجپوت چھاں اپنت(۵۸) مرشاں
کراں لا ایک کا مھے ٹوک دو دو
جو مھاں پر ہاتھ چھے رگھناتھ(۵۹) جی کو

بندوکاں تھاں کی لاہوری چھے کائیں
بندوکاں چھے جشی ایں گڈھ کے مائیں
سبل گڈھ کی کھرم پر کی چھے ٹیری(٦٠)
چلے جوں پھول جاں کی گونج گیری
بندوک، آمیر، بوندی، راج گڈھ کی
کہ جد چالے تو جانے بیج کڑکی
وہ مانچھرنے کی نرور کی بندوکاں
کہ جانکی آن مانے چھے نروکاں
بندوکاں گڈھ کے مائیں دو بلاں چھے
بندوکاں تھاں کی کائیں بھوگلیاں(٦١) چھے
بندوکاں کا بھڑاکا دیکھ جو تھے
سرویاں(٦٢) کا جھڑاکا دیکھ جوتھے
سروئی چھے سرویاں جودھ پر(٦٣) کی
چھری لاوہ، نوائی اور نگر کی
کراں اونچی تو یو آکاس دہلے
پڑے نیچی تو یا دھرتی نہ جھیلے
کہ تھاں کے ساتھ کائیں بھیڑ چھے یا
پڑیا جد مے اٹھے سوں جیڑ چھے یا
دھماکا کھوس لیاں لا پلٹناں کا
مے آود پاتی (کذا) کھونشا چھے گھنٹاں کا
مے کتراں کی بندوکاں چھے نکھالی
کہ مے تو سنگھ چھاں تھے ترک چھالی(٦٥)

کائیں ماریلا مماں نے باپڑا[٦٦] تھے
پچھے مماں کا ڈیل دبلا پاتلا تھے
کہ یا تو آپ ہی سوں مریا چھے
کہ یاں پر مماں نے بھی آوے دیا چھے

اوگم جی کی اس فخریہ بنکار پر پوربی سپاہیوں کو بڑا طیش آیا۔ انہوں نے کہا:

سسرین ہن کے مرہئی دیکھیئے تم
سکارے تمری مرہیا کر ہیں گم سم
کہا تم ہمکا دھمکاوت رہو سارے
کھوپریا توڑ دیں موندن[٦٧] کے مارے
کہ ہمکا رام دئی ہم تو نڈر ہیں
گڈھیا کا ڈھوا کر ساپ کر ہیں
نہ کرہیں ساپ ہم تو کون کرہئیں
لوگنیں ناہیں ہمکا نام دھرئیں
بندوکن کا پکرنا بھول جئی ہو
گڈھیا سے نکس جابا نہ پئی ہو
کہ جب ہم حکم کھاں صاحب کا پئی ہیں
بندوکاں تمری ٹھاکر چھین لئی ہیں
گڈھیا میں کہا ٹھارے بکت ہو
سسر ہم سے کہا تم لڑ سکت ہو

اسی طرح میواتی بگڑتے ہیں اور راجپوتوں کو جواب دیتے ہیں۔ ان کا سردار موئین خاں ہے۔ وہ انہیں خطاب کر کے کہتا ہے کہ تمہارے یہ جھوٹے جھگڑے ٹھیک نہیں۔ تم گڈھی سے نکل آؤ اسی میں تمہاری خیر ہے ورنہ دنیا میں تمہاری ہنسی ہوگی۔ ہماری تلواروں سے تمہارے منہ پھر جائیں گے اور تمہارا گڈھ گرادیا جائے گا اور تم کو نکلنا

ہوگا آخر اس وقت بھی تو منتیں کرو گے:

شالی طرف دھوموں[۶۸] خاں دلاور
لیے محمود پلٹن[۶۹] کو برابر
دکھا کر ہر گھڑی ہر لحظہ تلوار
یہ کہتا تھا انہوں سے کرکے تکرار
نہیں اچھے یہ تمہارے جھگڑا جھیڑے
نکل آؤ گڈھی سے ہمارے نیڑے
یہی اچھا ہے تم کو آؤ سانسی
کرو مت نا تم اپنی جگ میں ہانسی
موہنہ تلواروں کے مارے پھیر دیں گے
گڈھی تمہاری کو دم میں گیر دیں گے
گڈھی سے تم نکس جاؤ گے کھسکے[۷۰]
کرو گے منتاں آؤ گے نہ کھسکے[۷۱]

اسی طرح ولایتی اپنی پشتو اور پنجابی اپنی پنجابی بولتے ہیں۔ پشتو سے میں واقف نہیں ہوں اس لیے اس کی صحت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ پنجابی تو نہایت غلط، پھسپھسی اور ناقابل ذکر ہے۔

الغرض حمزہ خاں، بہادر خاں اور شیخ محمد امان ہر طرح سمجھا کر اٹھ آئے اور اپنی رپورٹ کماندار کو پہنچادی۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو بلا کر ہدایت کردی کہ کل لڑائی چھڑے گی، تم ہر طرح سے تیار رہنا۔ نواب نے اپنی فوج کی تسلی کے لیے پروانہ بھیجا۔ صبح ہوتے ہی خان صاحب فیض اللہ خاں نے اوگم جی اور اگر جی بھومیوں کو کہلا بھیجا کہ جس کو قلعہ سے نکلنا ہو نکل جائے، گولہ باری شروع ہوگی۔ یہ رمضان کی تین تاریخ سنہ ۱۲۶۷ھ اور جمعہ کا دن تھا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر توپیں جھانکیوں میں لگادی گئیں۔ جنوب میں تامڑی[۷۲] کی جوڑی، شمال میں ناگپری[۷۳] کی جوڑی اور مشرق

میں دو بینڈیاں[۷۴] لگادی گئیں۔

شست اندازوں میں محکم یہ نام گنا تا ہے:

شمشیر خاں[۷۵] کے دو فرزند ہیں جن میں (۱) بڑا کپتان تھا اور (۲) چھوٹا اجیٹن۔ (۳) گوہر[۷٦] (۴) شیخ مینڈو (۵) صوبہ دار فتح خاں[۷۷] (٦) شیخ سردار (۷) شیخ امام الدین[۷۸] استاد۔

اس موقع پر مصنف پہلی مرتبہ اپنا تخلص لاتا ہے اور ایک آدھ شعر عبرت کا نقل کرتا ہے:

ہوا جب حکم فیض اللہ خاں کا
بقول عبرت اے محکم کہوں کیا
ادھر سے وہ اودھر سے بہر آہنگ
ہوئے دونوں مقابل برسر جنگ
لگا چھٹنے ہر ایک سو توپ خانہ
ہراساں جس کی آتش سے زمانہ
دھوئیں میں اس طرح اڑ جائے رنجک
کہ جوں بادل میں مارے برق چشمک
نکلنا توپ سے گولے کا رخشاں
گھٹا میں جس طرح مہر درخشاں
وہ بندوقوں کا چھٹنا ہر طرف باڑ
کہ جن کی سینہ مرداں ہوا آڑ
جو ان[۷۹] توپوں سے گولوں کا نکلنا
دہان مار سے من کا اگلنا
یوں گولہ سرخ نکلے تھا شتابی
شب یلدا میں جوں تیر شہابی

اودھر سے گولیاں ایدھر سے گولے
برسنے پھر لگے مانند اولے
زمیں سے آسماں تک کیا کہوں یار
دھوئیں میں ہوگیا عالم دھواں دھار

تین رات گولہ باری ہوتی رہی۔ توپ کے گولوں سے قلعہ کا ستھراؤ ہوگیا۔ عمارتیں گریں۔ برج گرجے' مرزا کی تفنگ سے چاوند سنگھ زخمی ہوا۔ قرولی والے جمہ (جمعہ) خاں کی گولی سے سار دھولی ٹھاکر مارا گیا۔

چوتھے روز فیض اللہ خاں' شیخ محمد امان کو بلا کر دریافت کرتا ہے کہ تم اس گڈھی سے خوب واقف ہو' اس پر ہلہ کرنے کا موقع بتاؤ۔ شیخ نے کہا مغربی جانب کی دیوار بڑی کمزور ہے۔ اسی طرف سے یورش ممکن ہے۔ اس پر ایک پیپل کے نیچے دو بندوقیں لگادی گئیں اور پاس ہی ایک گزدہ[۸۰] لگادیا۔

رسالدار محی الدین خاں[۸۱] سو سواروں کے ساتھ اور ممو خاں[۸۲] اپنے ماتحت سواروں کو لے کر مستعد ہوگئے۔ ادھر مینا بیگ اجیٹن' مظفر پلٹن اور احمد خاں کمیدان' ظفر پلٹن لیے حکم کے منتظر رہے۔ جب حکم ملا تو چاروں طرف سے گولہ باری ایک دم شروع ہوگئی۔ اس روز محصورین کا بہت نقصان ہوا۔ عمارات میں جابجا آگ لگ گئی۔ مغربی فصیل ٹوٹ گئی۔ ایک ولایتی ملک[۸۳] نامی جھٹ سے زینی[۸۴] کے اندر کود گیا۔ اس کے کودنے کا دھمکا راجپوتوں نے سن لیا۔ ان میں سے پچاس راجپوت پہنچے۔ انہیں خیال تھا کہ ہلہ ہوگیا ہے مگر یہاں صرف ایک آدمی نکلا کسی نے اس کے سر پر اٹھا کر ایک پتھر مارا۔ باہر شیر خاں کھڑا تھا۔ اس نے تاک کر گنیش ٹھاکر کے بندوق ماری۔ گولی نشانے پر آئی اور گنیش ٹھاکر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ ٹھاکر کے مرنے سے قلعہ والوں کے اوسان اور بھی خطا ہوگئے۔ انہوں نے امان مانگنے کی ٹھان لی۔ ان کے دو آدمی خان کے پاس آئے اور بولے کہ اب ہماری آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ ہمارے بہت آدمی مارے گئے ہیں۔ اب آپ ہی ہمارا سہارا ہیں۔ ہمارا سارا دم خم نکل چکا

ہے۔ تیج سنگھ جی سچ کہتے تھے۔ ہمیں مغلوب کرلینا کونسی بڑی بات تھی :

کری پھر عرض ان دونوں نے اک ساتھ
چھے مہاں کی آبرو اب آپ کے ہاتھ
گھنو کینو سپایاں گائیو(۸۵) چھے
کہ مہاں تھاں کو لیو اب آسرو چھے
بڑا چھو تھے بڑا چھے بھاگ تھاں کا
تھے لینو ماجنا(۸۶) اب دیکھ مہاں کا
چھو سانچو تیج سنگھ ٹھاکر کو کہبو
چھو کائیں سہج مہاں کو مار لیبو

اس اثناء میں اوگم سنگھ بھی آگیا۔ اس کے ساتھ ایک اور ٹھاکر تھا۔ دونوں مجرا کرکے جاجم پر بیٹھ گئے۔ فوجیوں نے ان کو خاص طور پر طعنے دیئے :

کہاں جاتی رہی اب تیغ رانی
کہا کرتے تھے کیا کیا کچھ زبانی
نہ دیکھی ہم نے ثابوتی تمہاری
گئی کس طرف رجپوتی تمہاری
جو سمجھاتے تھے، دونے ہوتے تھے گرم
کہو اب تو نہ آتی ہوگی کچھ شرم

اوگم سنگھ بالکل خاموش تھا۔ دیر کے بعد اس نے اپنی زبان کھولی اور کہا :

مے آپڑتا ہی یا کیواں چھاں من میں
کہ کائیں سار(۸۷) کاڑی گنوار پن میں
تھے مہاں نے کال بئی اترا(۸۸) دیوچھو
اشا جیسا سوں مرجابو بھلو چھو

سردار فوج نے بہادر خاں اور حمزہ خاں کو باقی راجپوتوں سے گڈھ خالی کروانے کے لیے کہا۔ انہوں نے جاکر ٹھاکروں کو حکم دے دیا لیکن وہ گڈھ چھوڑنے پر مائل نہ ہوئے اور بولے کہ ہمیں تم لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں، تم ہمیں دغا سے مارو گے:

میاں جی کائیں پتیارو چھے تھاں کو
دگا سوں کاڑ ممال نے مار ناکھو

دونوں شخص واپس آئے اور خان صاحب کو رپورٹ کردی کہ راجپوت گڈھ چھوڑنے سے انکاری ہیں۔ ہم نے بہت سمجھا دیکھا۔ فیض اللہ خاں نے اپنے بھائی عبداللہ خاں(۸۹) کو بھیجا کہ اگر راجپوت سمجھانے سے نہیں آتے تو انہیں بہ جبر لاؤ۔ عبداللہ خاں گیا اور اگر سنگھ کو للکار کر بولا کہ اگر دل میں اور ارمان باقی ہے تو بولو، اس کا بھی تدارک کردیا جائے۔ اگر سنگھ بولا: دیکھیے ہم سے دغا نہ کی جائے اور اب ہمارے آدمی نہ مارے جائیں:

دگا ممال سوں کوئی کربا نہ پاوے
منکھ ممال کا کوئی مریا نہ پاوے

عبداللہ خاں نے اطمینان دلایا اور کہا: تم بے کھٹکے ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم لوگ تم کو کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے لیکن سرکار کے آگے ہم سب لاچار ہیں۔ وہ خواہ بخشیں یا سزا دیں مختار ہیں۔

حسن بخش کی پلٹن سب سے اول گڈھ میں داخل ہوئی۔ اس کے نشان بردار کا نام بسنتی(۹۰) سنگھ تھا۔ اس نے جاکر فتح کا جھنڈا لہرایا۔ قیدیوں کو سپاہیوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ سالار فوج نے اسی روز فتح کی خبر ٹونک پہنچوادی۔ نواب نہایت خوش ہوئے اور اسی خوشی میں موہنی کی طرف روانہ ہوگئے۔ بناس(۹۱) پہنچ کر قاصد کو آگے روانہ کردیا تاکہ فوج کو اطلاع ہوجائے۔ قاصد نے راتوں رات پہنچ کر خان صاحب کو حضور کی آمد سے اطلاع دے دی۔ خان صاحب نے فراشوں کو بلوایا، ڈیرے تنبو کھڑے کیے اور سرکاری خیمہ نواب صاحب کے لیے کھڑا کیا گیا۔ صبح کی نماز سے

فارغ ہوکر سالار نے فوج کو راستے پر دو رویہ صف بستہ کھڑا کیا اور آپ نواب صاحب کے استقبال کو بڑھ گیا جب سواری قریب آئی تو فوج نے سلامی اتاری۔ ادھر سلامی کی توپیں چھوٹیں ادھر نواب خیمے میں داخل ہوئے۔ اس موقع پر موجودہ نسخہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے آخری شعر یہ ہیں(۹۲) :

ہوا جو صبح دم اس شاہ کا دید
دلوں کی سب کے حاصل ہوگئی عید
تماشائے طلسمی کرکے حاصل
ہوا جاکر وہ شہ خیمے میں داخل
رہے خدمت میں سب قوموں کے ارباب
گئے باقی ادا کر رسم آداب

میں نہیں کہہ سکتا کہ کتاب کا کس قدر حصہ ضائع ہوا ہے(۹۳) لیکن یہ یقینی امر ہے کہ موہن گڈھ کی فتح پر یہ جنگ نامہ بھی اپنی آخری منزل پر 'تقریباً" پہنچ گیا ہے۔

یہاں اس جنگ نامہ کی بعض خصوصیات کے متعلق مجھے کسی قدر کہنا چاہیے۔ یہ جنگ نامہ نہایت سادہ اور عاری انداز میں لکھا گیا ہے جس میں شاعری دکھانے کا بہت کم موقع حاصل کیا گیا ہے۔ زبان و بیان بالکل صاف ہے۔ بعض اشعار میں گنجلک پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً :

زباں بس تھام لے اپنی یہاں تو
بیاں ہوگی نہ اس کی از سر مو

آخری مصرع اس صورت میں بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ نقل کرتے وقت ایسی اغلاط شامل ہوگئی ہوں۔ اگر مصرع ہذا کو کوئی معنے پہنائے جائیں تو ہمیں اس کو یوں پڑھنا ہوگا... ؎

ثنا ہوگی نہ اس کی یک سرمو

اسی طرح یہ شعر ملاحظہ ہو :

ہوا رخصت گیا موہنی کو ہنونت
مگر سوچا نہ کچھ تقدیر کے پند

"ہنونت" اور "پند" کا قافیہ درست نہیں۔(۹۴) اسی طرح یہ شعر ملاحظہ ہو:

دیا نذرانہ سب نے آخر کار
مگر ہنونت سنگھ نے کی اس میں تکرار

دوسرا مصرع زائد از وزن ہے اور "سنگھ" وزن سے زائد ہے۔ صحیح یوں ہو گا:

ع: مگر ہنونت نے کی اس میں تکرار

کئی شعروں میں قافیے میں تکرار آگئی ہے لیکن یہ غلطی کاتب کے سر ہے نہ ناظم کے۔

مصنف جس انداز سے واقعات بیان کر رہا ہے اور جس بے تکلفی سے مختلف افسروں اور اشیاء کے نام لے رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود سپاہی برادری کا ایک فرد ہے بلکہ اسی مہم میں شریک کار تھا۔ ہم اس کے نام سے ناواقف ہیں۔(۹۵) صرف دو مرتبہ اس نے اپنے تخلص کا استعمال کیا ہے۔ ایک مثال اوپر گزر چکی ہے۔ دوسری مثال نعت کے آغاز میں آئی ہے، جہاں وہ کہتا ہے:

لگا دل نعت ختم الانبیاء پر
جو تجھ سے ہو سکے محکم بیاں کر

میرے نزدیک محکم کا سب سے زیادہ قابل تعریف کارنامہ ٹونک کی اس زبان میں شعر گوئی ہے جو مقامی ہندوؤں اور دیہاتیوں کی زبان ہے۔ یہ زبان جے پوری زبان کے تحت میں آتی ہے اور اپنی اکثر خصوصیات میں گوالیری یعنی برج بھاشا کی تبع ہے جس میں:

ضمائر:

	ضمیر متکلم		ضمیر مخاطب		ضمیر غائب	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
حالت فاعلی	ہوں	مھے	توں	تھے	اوں-بو	بے
حالت اضافی	مھارو	مھاں کو	تھارو	تھاں کو	اوں کو	بیاں کو
حالت مفعولی	منے	مھاں نے	تنے	تھاں نے	بی نے	بیاں نے

اسم اشارہ

قریب : ایں

بعید : اوں

اضافت

واحد : کو (کا)

جمع : کا (کے)

واحد جمع

واحد	جمع	واحد	جمع
موٹیار (مرد)	موٹیاراں	منکی (بلی)	منکیاں
ماکھی (مکھی)	ماکھیاں	گنڈک (کتا)	گنڈکاں
بانٹریو (بنیا)	بانٹریاں	بانکی (کٹورا)	بانکیاں
بھائی	بھایاں	سانٹو (گنا)	سانٹا
چھالی (بکری)	چھالیاں	کانسو (پیالہ)	کانسا

افعال

واحد :	آیو (آیا)	گیو (گیا)	کروں
جمع :	آیا (آئے)	گیا (گئے)	کراں (کریں)

ماضی

واحد :	ہوں آیو	تو آیو	او آیو
جمع :	مے آیا	تمے آیا	بے آیا

حال

واحد :	ہوں کھاؤں چھوں	تو کھائے چھے	او کھائے چھے
جمع	مے کھاواں چھاں	تمے کھاؤ چھو	بے کھائے چھے

مستقبل

واحد :	ہوں ماروں لو	تو مارے لو	بو مارے لو
جمع :	مے ماراں لا	تمے مارو لا	بے مارے لا

مستقبل دیگر

واحد :	ہوں ڈرپ شوں	تو ڈرپ شی	او (یا) بو ڈرپ شی
جمع :	مے ڈرپ شاں	تمے ڈرپ شو	بے ڈرپ شی

حروف

کائیں = کیا، بی = اس، کی ۔ کیں = کس
جی = جس، جیان = جب ۔ جس طرح، یان ۔ ایسا، کیان = کب (۹۶)،
محکم کو ٹونک کی زبان پر تو پورا پورا عبور ہے۔ اگر اعتراض ہوسکتا ہے تو یہی کہ

اس نے اردو کے محاورے یا روزمرہ کو لے کر اس زبان میں ترجمہ کردیا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے بھی زبان میں کافی مہارت درکار ہے۔ محکم لکھتا ہے:

کہ تھاں سوں کائیں بی بن نے پڑیلی
گڈھی میں لوتھ سگلاں کی سڑلی
پگاں میں پاگ جن جن کے دھرولا
تنکلیا لیر مونڈا میں پھرولا

ان کا ترجمہ ہے:

کہ تم سے کچھ بھی بن نہیں پڑے گی۔ گڈھ میں ساروں کی لاشیں سڑیں گی۔
جن جن کے پیروں میں پگڑی دھرو گے۔ تنکے منہ میں لے لے کر پھرو گے۔

ان شعروں میں فارسی کے کاف بیانیہ کا آنا' اس زبان میں' جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' غیر مستعمل ہے۔

کچھ بھی بن نہ پڑنا' پیروں میں پگڑی دھرنا اور تنکے منہ میں لے کر پھرنا اردو کے محاورے سے تعلق رکھتے ہیں۔

حواشی

(۱) زمانہ حکومت از ۱۸۱۷ء (۱۲۳۴ھ) تا ۱۸۳۴ء (۱۲۵۰ھ) ۔ (ع ۔ خ)

(۲) مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر المتوفی ۱۸۱۱ء۔ (ع ۔ خ)

(۳) وزیر الدولہ نواب محمد وزیر خاں بہادر۔ زمانہ حکومت از ۱۸۳۴ء (۱۲۵۰ھ) تا ۱۸۶۴ء (۱۲۸۱ھ) ۔ (ع ۔ خ)

(۴) اب اس گڈھی کی جگہ صرف ایک ٹیبہ سا واقع ہے جس پر ایک ٹھاکر کا مکان باقی ہے۔ برابر میں موہنی کے نام سے ایک گاؤں آباد ہے جس میں تقریباً دو سو مکانات ہیں۔ (ع ۔ خ)

(۵) ٹونک اور ٹوڈا رائے سنگھ کے درمیان بڑا ٹھکانہ ہے۔ وہاں کے ٹھاکروں سے بھی رؤسائے ٹونک کے مقابلے رہے ہیں۔ (ع ۔ خ)

(۶) نارو یا نروکے (نارو + کے) آمیر (جے پور) کے کچھواہا راجاؤں کی ایک شاخ ہے۔ ریاست الور کے راجا نیز ٹھکانجات انیارہ و لاوہ کے ٹھاکر، راجپوتوں کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ لاوہ کی طرح انیارہ والوں سے بھی نوابان ٹونک کا جھگڑا رہتا تھا۔

(۷) یہ زبان اس علاقے میں ڈھونڈاری بولی کہلاتی ہے۔ (ع ۔ خ)

(۸) راجستھان (راجپوتانہ) کا وسیع و عریض علاقہ زمانہ قدیم کی ذیلی تقسیم کے لحاظ سے ان اہم اقطاع پر مشتمل تھا:

مارواڑ، میواڑ، میوات، ڈھونڈار، ہاڑوتی اور شیخاواتی۔

ڈھونڈار راجپوتانہ کا قلب ہے۔ مغل فرامین میں اسے "ملک ڈھونڈار" لکھا جاتا تھا۔ رنتھنبور اور آمیر اس علاقے کے مشہور قلعے ہیں۔

(۹) خون ۔

(۱۰) ماس ۔ گوشت

(۱۱) پیاسا۔

(۱۲) لڑائی ۔ جھگڑا۔

(۱۳) تنگ ۔ پریشان

(۱۴) روکتی [illegible] = دفاعی فصیل

(۱۵) ورنہ ۔

(۱۶) مال غنیمت۔

(۱۷) پتھر۔

(۱۸) رعیت۔

(۱۹) بیاپنا = سرایت کرنا۔ لاحق ہونا۔

(۲۰) عالم خاں، نواب امیر خاں صاحب کے ہمراہیوں میں سے تھے۔ خود صاحب پلٹن تھے۔ اس دور میں موہنی میں تعلق دار تھے۔ ("واقعات ھفتدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر" از دیوان شمس الدین۔ مخطوطہ۔ جلد اول)۔ (ع۔ خ)

(۲۱) دیوان شمس الدین ان کے لیے لکھتے ہیں:

"سردار یک پلٹن بود و مرد کہن سال و جنگ ھا دیدہ بود" (واقعات ھفتدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر)۔ (ع۔ خ)

(۲۲) مختار الدولہ محمود خاں کے داماد تھے۔ اکثر جنگی مقابلوں میں شریک رہے..... دیوان شمس الدین صاحب نے "واقعات ھفتدہ سالہ ...." میں انہیں متعدد مقامات پر بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"سرخیل سپاھی و مرد دانا و دیرینہ است" نیز: "یکی از امیران کلان سپاہ است" نیز: "در ایام سابق بہ عہدہ رسالداری سرفرازی داشتہ و حال بفضل حضرت الٰہی تبارک بزمانہ نواب (وزیر الدولہ) بمزید قدر دانی آن را بمنصب عالی از زمان ماضی بہ بلند نامی و ارجمندی بخشیدند۔"

لاوہ میں بھی شریک جنگ تھے۔ جنگ موہنی کے وقت ظفر پلٹن کے انچارج تھے۔ (ع۔ خ)

(۲۳) بناس ندی کے کنارے جانب غرب ایک موضع ہے۔ کئی بار ندی کثرت سے آنے پر سیلاب میں بہا اور آباد ہوتا رہا۔ اب کنارے سے کچھ فاصلے پر نیا گاؤں آباد ہوا ہے۔ جو تقریباً ڈیڑھ سو مکانات پر مشتمل ہے۔ (ع۔ خ)

(۲۴) یہاں "سلگی" ہونا چاہیے۔

(۲۵) ہمیر پور کا ٹھاکر تھا۔ ہمیر پور ٹوڈا رائے سنگھ کے راستے میں ایک ٹھکانے کا نام ہے جو ہزار بارہ سو مکانات پر مشتمل ہے۔ (ع۔ خ)

(۲۶) راجپوتانہ کا انگریز اے۔ جی۔ جی۔ اجمیر میں رہتا تھا۔ سنہ ۱۸۴۸ سے ۱۸۵۲ء تک اس عہدے پر سرجان لو (۱۸۸۰۔ ۱۷۸۸ء) متعین تھا۔ "لوس" غالباً "لو" کا عوامی تلفظ ہے۔

(۲۷) راجستھانی میں چچا کے لیے مخصوص لفظ "کاکا" ہے۔ عموماً (پشتو اور سندھی کی طرح) محض بزرگ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(۲۸) کنے = پاس۔

(۲۹) صاحب۔

(۳۰) بیٹھنے کے لیے کرسی ڈلوادی۔

(۳۱) ہماری نذر قبول کی۔

(۳۲) خوشبو۔ عطر

(۳۳) نلیتا۔ خریطہ کا مخرب۔ خریطہ = تھیلی۔ اصطلاح میں اس شاہی حکم کو کہتے ہیں جو امرا و رؤسا کے نام جاری کیا جائے۔

(۳۴) جھوٹ موٹ۔

(۳۵) گھات، کمین گاہ۔

(۳۶) غالباً یہ وہی محمد امان خاں ہیں جو رسالدار تھے اور انیارہ و لاوہ کی جنگوں میں بھی شریک تھے۔ ٹونک کے واقعات میں ان کا برابر ذکر ملتا ہے... اس مضمون میں آگے چل کر انھیں شیخ محمد امان لکھا ہے۔ (ع ۔ خ)

(۳۷) حمزہ خاں کا قیام تعلق دار کی حیثیت سے اس وقت نئے ٹیلے میں تھا۔ (ع ۔ خ)

(۳۸) دیوار گرادو

(۳۹) بہادر۔

(۴۰) مرد۔

(۴۱) خاص مقصد کے حصول کی خاطر۔

(۴۲) سلام، احترام سے جھکنا، ماتھا ٹیکنا۔

(۴۳) کتے۔

(۴۴) کاگ، کاگلا = کوا۔

(۴۵) گنا (گنا نہ دے بھیلی دے)

(۴۶) زبانی جمع خرچ۔

(۴۷) خیر، خیریت، تندرستی۔ مراد ہے ہمت، قابلیت۔

(۴۸) نصیحت۔
(۴۹) باہر بھجوادو۔
(۵۰) حویلی، محل، ایوان۔
(۵۱) پلنگ، چھپر کھٹ۔
(۵۲) خاموش۔
(۵۳) تشویش، فکر، گھبراہٹ۔
(۵۴) پیالہ مراد کھانا۔
(۵۵) کمزور۔
(۵۶) ساتھ۔
(۵۷) جلدی۔
(۵۸) بے خوف، بے جھجک۔
(۵۹) راجا رام چندر جی کا لقب۔
(۶۰) گرجنے والی۔
(۶۱) پولی، کھوکھلی مراد ہے پھونکنی۔
(۶۲) سروہی = دودھاری تلوار۔
(۶۳) راجستانی زبانوں میں مکانی لاحقہ "پور" کو "پر" (پ پر فتحہ) بولا جاتا ہے۔ مراد ہے جودھ پور۔ چند اشعار پہلے "کھرم پر" بھی جگہ کا نام ہے۔ یعنی خرم پور۔
(۶۴) ایک قسم کی توپ، ہمسنال ۔ گج نال۔
(۶۵) بکری۔
(۶۶) بے چارے، یتیم۔
(۶۷) جوتیاں۔
(۶۸) یہ جلال آباد کے رہنے والے تھے۔ (ع ۔ خ)
(۶۹) یہ پلٹن، غالباً" مختار الدولہ محمود خاں کی قائم کردہ تھی۔ اس وجہ سے اس نام سے موسوم رہی۔ (ع ۔ خ)
(۷۰) بدحال، تہی دست، ناتواں۔

(۷۱) گھگھیاتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے۔

(۷۲) تانبے سے تیار کردہ توپ۔

(۷۳) تانبے پور کی بنی ہوئی توپ۔

(۷۴) چھوٹی توپیں۔

(۷۵) جنگ نامہ موہن گڈھ کے مخطوطوں میں یہ نام میاں شمشیر علی ہے۔

(۷۶) گوہر خاں توپچیوں کے جمعدار تھے۔ موہن گڈھ کے واقعے سے ایک سال بعد ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں لاوہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ (ح ۔ خ)

(۷۷) نواب امیر خاں کے رسالداروں میں تھے۔ موہن گڈھ کے معرکے کے وقت صوبہ دار تھے۔ (ح ۔ خ)

(۷۸) نواب وزیر الدولہ کے زمانے میں پٹا بنوٹ کے استاد تھے۔ (ح ۔ خ)

(۷۹) نسخہ "ب" میں بجائے "جوان" ، "ہوا" درج ہے جو زیادہ موزوں ہے۔

(۸۰) ایک قسم کی چھوٹی توپ، زنبورک۔

(۸۱) یہ غالباً وہی محی الدین خاں رسالدار ہیں جو غدر کے موقع پر (بادشاہ کی مدد کے لیے) دہلی جانے والوں میں پیش پیش تھے۔ (ح ۔ خ)

(۸۲) ٹونک کے مشہور رسالداروں میں تھے۔ انبارہ اور لاوہ کے مقابلوں میں اچھے کارنامے انجام دیئے اور موہن گڈھ کے موقع پر بھی انہوں نے اپنے فن اور تجربے کا خوب مظاہرہ کیا۔ (ح ۔ خ)

(۸۳) نواب کی فوج میں چونکہ ولایتیوں کی کثرت رہتی تھی۔ یہ ولایتی بھی ان ہی جاں بازوں میں ایک تھا جس نے اس موقع پر ریتی میں کود کر داخل ہونے میں پہل کی اور فتح و کامرانی کا سبب بنا۔ (ح ۔ خ)

(۸۴) چھوٹی دیوار جو قلعہ کے گرد بناتے ہیں اور اس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ رکھتے ہیں۔

(۸۵) کاٹنے کا عمل۔

(۸۶) اوقات۔

(۸۷) عطر، نچوڑ، رس، وقعت، عزت، قدر و قیمت۔

(۸۸) طعنے

(۸۹) عبداللہ خاں توپ خانے میں اجیٹن تھے۔ جنگ موہنی کے ایک سال بعد ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں لاوہ میں ہونے والے سانحے میں مارے گئے۔ (ع - خ)

(۹۰) نسخہ "الف" میں یہ مصرع آتا ہے:

نشان بردار بسنتی سنگھ تھا نام

لیکن نسخہ "ب" میں بشنی سنگھ ہے جو وزن کے اعتبار سے موزوں بیٹھتا ہے۔

(۹۱) راجستھان کا مشہور دریا جو کوہ آبو سے نکل کر راج محل اور ٹونک ہوتا ہوا دریائے چنبل سے جاکر ملتا ہے۔ اس کا شیریں و شفاف پانی اپنی صفائی' پاکیزگی اور ہضم کے لحاظ سے افادیت میں ہمیشہ مشہور و ممتاز رہا ہے۔ (ع - خ)

(۹۲) نسخہ "الف" (داخلہ نمبر ۶۳۷۲) جو یہ مضمون لکھتے وقت شیرانی صاحب کے پیش نظر تھا' اس وقت بھی ناقص الآخر تھا۔ اس نسخے میں فی صفحہ ۱۲ شعر ہیں۔ مضمون لکھے جانے کے بعد کسی وقت اس کے آخر سے تین صفحے مزید ضائع ہوگئے چنانچہ اب اس میں ۳۵ اشعار اور کم ہوگئے ہیں اب اس کے آخری شعر (صفحہ ۵٦ پر) یہ ہیں:

کہ آتا ہے وزیر الدولہ نواب
سپہر عدل کا مہر جہاں تاب
تو پھر کہنے لگا سالار لشکر
ابھی تیار ہو لشکر سراسر

(۹۳) خوش قسمتی سے نسخہ "ب" جو یہ مضمون لکھے جانے کے بعد کسی وقت مجموعہ شیرانی میں اضافہ ہوا ہے' مکمل ہے۔ تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون پر قلم کرتے وقت نسخہ "الف" میں آخر سے ۱۶۸ اشعار کم تھے اور آج کل ۱۶۸ + ۳۵ = ۲۰۳ ابیات کی کمی ہے۔

(۹۴) اگرچہ دونوں نسخوں میں یہاں "پند" ہی درج ہے تاہم یقینی ہے کہ یہاں لفظ "پنت" ہوگا جو "پنتھ" کی ایک شکل ہے اور جس کے معنی راستہ' طور طریقہ اور انداز کے ہیں۔

(۹۵) مضمون ہذا کی ابتدا میں درج تعارفی نوٹ میں مولانا عمران خاں مرحوم نے "محامد علیہ" کے حوالے سے محکم کا نام محمد اسمعیل خاں اور وطن اسلام نگر بتایا ہے۔ مزید نسخہ "ب" کے اختتام پر چند اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ "محکم" کا وطن مالوف ملتان تھا لیکن عرصہ تیس برس سے وہ ٹونک کے کسی محلے (یا گاؤں) اسلام نگر میں قیام پذیر تھا۔ نیز یہ کہ ملتان سے ٹونک آنے میں

مختارالدولہ محمود خاں ذریعہ بنے تھے۔ اس سے یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ خود بھی محمود پلٹن ہی سے تعلق رکھتا تھا' جس کا ذکر اس مضمون میں آیا ہے۔ بہرحال وہ اشعار یہ ہیں :

قلم لے تو یہیں پر تمام اپنا لکھ اب آگے تو مخام نام اپنا
ہے اس عاصی کا اسمٰعیل خاں نام یہ مخام ہے مگر مشہور ہنام
وطن اس کا قدیمی شہر ملتان ہے اب خوش باش وہ نزدیک سلطان
یہاں رہتے ہوئے گزرے ہیں سی سال ز احسان خدا (با) آل و اطفال
ذریعہ سے مگر مختار الدول کے یہاں آیا تھا ملک اپنے سے چل کے

(۹۶) اس کے بعد مضمون کے مسودے میں خاصی جگہ چھوڑی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مزید تفصیلات دینے کا ارادہ تھا۔

❑❑❑

مخزن الغرائب و انیس العاشقین

مؤلفہ احمد علی سندیلوی

(از ماہنامہ "ہمایوں" لاہور بابت ستمبر ۱۹۲۴ء)

یہ اور اس کے بعد آنے والا مضمون ایک دلچسپ ادبی نوک جھونک کی دو کڑیاں ہیں۔ اس بحث کی ابتدا مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے ایک مضمون "تذکرہ مخزن الغرائب" سے ہوئی جو مارچ ۱۹۲۴ء کے تعارف میں چھپا تھا۔ اس کے بعد پریزیڈنسی کالج کلکتہ کے پروفیسر محفوظ الحق کا مضمون "تذکرہ مخزن الغرائب پر ایک نظر" کے عنوان سے "معارف" کے جون ۱۹۲۴ء کے شمارے میں طبع ہوا۔ اس مباحثے کی تیسری کڑی شیرانی صاحب کا مضمون "تذکرہ مخزن الغرائب و انیس العاشقین مولفہ احمد علی سندیلوی" ہے جو "ہمایوں" (لاہور) کے شمارۂ ستمبر ۱۹۲۴ء میں مولوی عبداللہ (ڈاکٹر عبداللہ چغتائی) کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یہ بات خود چغتائی صاحب مرحوم نے مجھے بتائی تھی۔

اس مباحثے کی اشاعت پذیر ہونے والی آخری کڑی پروفیسر محفوظ الحق کا "جواب الجواب" ہے۔ جو غالباً" معارف ہی کے کسی قریبی شمارے میں چھپا تھا۔ پھر بظاہر یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ بقول چغتائی صاحب "بابا" (شیرانی صاحب) نے اس آخری مضمون کا جواب لکھنے کا وعدہ کیا

تھا۔ انہی دنوں کسی تقریب سے بابا کا کلکتہ جانا ہوا۔ وہاں پروفیسر محفوظ الحق بڑے تپاک سے ملے اور ان کی دعوت کی۔ واپسی کے بعد ایک دن میں نے بابا کو مضمون کی یاد دہانی کرائی تو انہوں نے مجھے پیار سے جھڑک دیا "چل پلنگے! اب کوئی مضمون شائع نہیں ہوگا۔ پٹھان پروفیسر محفوظ الحق کے گھر کھانا کھا آیا ہے۔"

حسن اتفاق سے مجھے شیرانی صاحب کے کاغذات میں خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا پروفیسر محفوظ الحق کے "جواب الجواب" کے جواب میں تحریر کردہ مضمون بعنوان "حد جواب" مل گیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ مضمون بھی چغتائی صاحب کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ گویا شیرانی صاحب کلکتہ جانے سے قبل مضمون کا ابتدائی مسودہ تحریر کر چکے تھے۔

عبداللہ چغتائی صاحب کے نام سے بحث میں حصہ لینے کی، میرے خیال میں دو تین وجوہات ہیں۔ ایک تو اس بحث میں شیرانی صاحب کے مملوکہ بعض اہم مخطوطات کا ذکر آتا تھا، جس سے بالواسطہ ان کے قیمتی کتب خانے کی تعریف ہوتی تھی اور یہ ان کی شرمیلی طبیعت کو گوارا نہ تھا۔ دوسرے "معارف" کے ساتھ پہلے ہی "تنقید شعرالعجم" کے ضمن میں پرخاش چلی آرہی تھی۔ پھر یہ کوئی ٹھوس علمی کام بھی نہ تھا۔ ایک ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ تھی۔ لہٰذا شیرانی صاحب نے مضامین پر اپنا نام دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ان پانچوں مضامین کو راقم نے ایک تعارفی مضمون کے ساتھ شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی کے مجلّہ "تحقیق" (چھٹا شمارہ ۱۹۹۲ء) میں چھپوا دیا تھا۔ (مرتب)

ماہ جون سنہ ۱۹۲۴ء کے "معارف" میں مولوی محفوظ الحق صاحب، لیکچرار عربی و فارسی، پریسیڈنسی کالج، کلکتہ کا ایک مختصر مضمون، مولوی احمد علی سندیلوی کی تالیف تذکرۂ مخزن الغرائب پر میری نظر سے گزرا ہے۔ میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا ہے

کہ مولوی محفوظ الحق نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مضمون ”تذکرۂ مخزن الغرائب“ (”معارف“ بابت ماہ مارچ ۲۴ء) کے بعض غیر اہم پہلوؤں کو غیر ضروری فروغ دیا ہے۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو مخزن الغرائب کی قیمت یا اس قیمت کے حساب میں غلطی چنداں اہم سوال نہیں ہے۔ یہ امور بائع اور مشتری سے تعلق رکھتے ہیں اور عام دلچسپی کا کوئی سامان پیدا نہیں کرتے۔ مولانا شروانی نے بہ سبیل لطیفہ ایک بات کہی تھی کہ قیمت فی شاعر ایک پیسہ ٹھہری، اسی شرح سے ایک سو پینتیس روپیہ قیمت دی گئی۔ اس میں ممکن ہے کہ مولانا کو سہو ہوگیا ہو یا یہ کہ ردوبدل کے بعد دو اور تین پیسہ فی شاعر کے نرخ سے شرح ٹھہری ہو۔ بہرکیف وہ کچھ بھی ہو لیکن مولوی محفوظ الحق صاحب کا محاسبانہ اعتراض میری نگاہ میں وقیع نہیں ہے۔ کیا اس قسم کی کوشش سے مولوی صاحب کا اصل مقصد اس امر کا اعلان ہے کہ خدانخواستہ مولانا شروانی صاحب حساب میں کمزور ہیں۔ لیکن لطیفے پر لطیفہ یہ ہے کہ خود مولوی صاحب نے اپنی صحیح حساب دانی کا کوئی شان دار نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ تین ہزار ایک سو اڑتالیس پیسوں کے انتالیس روپے تین آنے بتائے ہیں حالانکہ فی الواقع انچاس روپے تین آنے ہوتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مولوی صاحب اس موقع پر کاتب کا رسمی عذر پیش نہیں کریں گے۔

نواب صدر یار جنگ کے مضمون کا جو اہم پہلو ہے، میں افسوس سے دیکھتا ہوں کہ اس کے متعلق مولوی صاحب نے ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔ اس سے میرا مقصد سید انشاء اللہ خاں انشا کے حالات کے متعلق وہ متضاد بیانات ہیں جو احمد علی سندیلوی نے مخزن الغرائب میں اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے اپنی تالیف آب حیات میں درج کیے ہیں۔ درحقیقت اگر دیکھا جائے تو مولانا شروانی نے اپنے اس تبصرے سے بہت بڑی علمی اور ادبی خدمت کی ہے۔ آب حیات آزاد کے سحر بابل کے طلسم شکن واقعتاً نواب صدر یار جنگ ہیں۔ اس سے قبل تذکرہ میر تقی میر پر دیباچہ لکھتے وقت بھی انہوں نے آب حیات کے بعض غیر تاریخی بیانات کی معقول تردید کرکے

صحیح اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد مرحوم کی اس تصنیف میں بعض ایسے بیانات مشاہدہ کیے جاتے ہیں جن کی تسلیم سے تاریخی ذوق ہمیشہ ابا کرتا رہے گا مثلاً آب حیات کا وہ بیان جس میں چھوساقن امیر خسرو علیہ الرحمتہ کو حقہ پلاتی دکھائی گئی ہے، کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ گویا مولانا آزاد مرحوم کے نزدیک تمباکو، جس کو پرتگالی فرنگی گیارھویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں لاتے ہیں، اس عہد سے تین سو سال قبل یعنی آٹھویں صدی ہجری میں رواج پاچکی ہے۔

بہرحال اس انکشاف کے لیے ہم کو نواب صدر یار جنگ کا سپاس گزار ہونا چاہیے اور جو اصحاب میری طرح ان کے پر مغز اور عالمانہ مضامین کا، جو وقتاً" فوقتاً" ملک کے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، شوق سے مطالعہ کرتے رہے ہیں، میرے ساتھ اس رائے کے اظہار میں ضرور شریک ہوں گے کہ مولانا شروانی کا رتبہ بلحاظ ادبی نقد نہایت رفیع ہے۔ اب تک وہ ایک مصروف ادبی زندگی بسر کرتے رہے ہیں اور ہمارے ملک کے رسائل ان کی تحقیقات عالیہ کے منت گزار ہیں کیونکہ اردو صحافت کی جس قدر قلمی امداد مولانا ممدوح نے کی ہے ہماری زبان کے صرف چند ادیب ہی اس پائے تک پہنچ سکتے ہیں۔

ہم مولوی محفوظ الحق صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے مولف تذکرہ مخزن الغرائب کے حالات، جو فی الواقعہ مولانا شروانی کے مضمون سے رہ گئے تھے، بہم پہنچا کر ہمیں مستفید کیا۔ تاہم میں اس امر کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جن امور میں انہوں نے مولانا صدر یار جنگ سے اختلاف کیا ہے وہاں مجھ کو شک ہے کہ صحیح رہبری کا حق ادا نہیں کیا بلکہ اگر مولوی صاحب مجھ کو اجازت دیں گے تو یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ بعض مواقع پر خفیف خفیف غلط فہمیاں بھی اضافہ کردی ہیں یا بعض باتیں جن کا بیان ہونا ضروری تھا ذکر نہیں کیں۔ مثلاً:

احمد علی سندیلوی اپنے والد کے حالات میں کسی انقلاب کی بنا پر صغر سن میں ہی سندیلہ کو خیرباد کہہ کر راہ گرای عالم مسافرت ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولف کے الفاظ ہیں:

"از مشیت الٰہی در اوضاع والد بزرگوارم از گردش فلکی اختلال واقع گردیدہ بندہ از صغر سن از خانہ برآمدہ بغربت افتادم۔"

مولوی صاحب اس واقعے کو قریب قریب حذف کرگئے ہیں۔ علیٰ ہذا عزت الدولہ سہراب جنگ کے ہاں مولف کی ملازمت کا واقعہ' جس کا ذکر مولوی صاحب نے کیا ہے' بے حد مورد شک ہے۔ میرے خیال میں مولف سہراب جنگ کا ملازم نہیں تھا بلکہ ان کے وسیلے سے نجف خان تک رسائی حاصل کرکے بادشاہی رسالے میں معقول مشاہرے پر ملازم ہوجاتا ہے۔ اسی موقع پر صاحب تذکرہ کا بیان ہے کہ :

"رفتہ رفتہ کہ بیان آن طول دارد در خدمت مغفور شہید نواب عزت الدولہ میرزا حسن سہراب جنگ طاب ثراہ کہ خلف الصدق میرزا محمد محسن کہ برادر کلان نواب صفدر جنگ بودند' رسیدم و ایشان ازراہ قدر دانی کہ در طبع و نہاد بزرگ زادگان و بزرگ منشان ودیعت است بہ آئین شائستہ و بحرمت تمام مجوز ملازمت بندہ بہ جناب نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان بہادر غالب جنگ الحسنی گردیدہ بمرسوم تمیز داخل رسالہ پادشاہ جم جاہ شاہ عالم بہادر دام اللہ ملکہ فرمودند۔"

مولوی صاحب کی یہ رائے غالباً" ان کے انگریزی پیش رووں کے اثرات میں قائم ہوئی ہے۔

نواب صدر یار جنگ نے فرمایا تھا:

"نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے سرکاری ملازم تھے۔ وہاں اہل کمال کا مجمع تھا ان کو بھی استفادہ کا موقع ملا۔ اسی فیض صحبت کا نتیجہ یہ تذکرہ ہے۔"

مولوی صاحب اس بیان کی تردید میں تحریر فرماتے ہیں :

"لیکن میرا خیال ہے کہ میرزا نجف خاں کی سرکار کا یہ فیض خاص نہیں کیونکہ میرزا نجف خاں نے سنہ ۱۱۹۶ھ میں قضا کی اور یہ تذکرہ ان کی وفات کے بائیس سال بعد ۱۲۱۸ھ میں لکھا گیا ہے علاوہ بریں مولف خود کہتا ہے کہ نجف

خاں کی وفات کے بعد اس نے یہ حالات فراہم کیے اور اپنے استاد مرزا قتیل کی فرمائش پر ان کو تذکرہ کی صورت میں ترتیب دیا اس لیے واقعتاً" مولف کا ذوق اور میرزا محمد حسین (کذا) قتیل کی تحریر (کذا) اس تذکرہ کی تالیف کا باعث ہے۔"

مولف کا قول ہے:

(۱) "کہ از سن سیزدہ چہاردہ سالگی الی یومنا ہذا کہ ہمگی پنجاہ وچہار مرحلہ از عمر طی گشتہ اکثری از قسم شعر و غزل بہ نظر در آوردم و اوقات شبانروزی خود را مصروف این فن داشتم و از مطالعہ دواوین گاھی خود را معاف نمی داشتم چون بزبان فارسی و سیاق و سباق کلامِ و محاورۂ روزمرۂ این زبان چندان بلدیت نداشتم و فرصت دست نمی داد کہ از زبان دانان کسب این معنی کنم از اکثر اصطلاح و استعارہ و محاورہ عاجز و عاطل می ماندم و تلذذ بہ عدم بضاعت نوعی کہ باید و شاید بکامِ جان نمی رسید۔"

اس سے یہ مطلب اخذ ہوتا ہے کہ مولف تیرہ چودہ سال کی عمر سے دشت شعر و سخن کی سیاحی میں مصروف تھا لیکن فارسی محاورات اور روزمرہ سے عدم واقفیت کی بنا پر شعرخوانی میں اس کو پورا پورا لطف حاصل نہیں ہوتا تھا اور نہ ایسا موقع میسر تھا کہ زبان دانوں کی صحبت سے مستفید ہو کر یہ بات حاصل کر لے۔

(۲) جب وہ نواب عزت الدولہ سہراب جنگ کے توسط سے نجف علی خاں کی سرکار میں پہنچ کر دہلی آگیا تو یہاں اس کو یہ بات میسر آئی۔ یاران ہم جنس و ہم مذاق کی صحبت نصیب ہوئی۔ یہیں اس کو اہل خراسان و عراق و فارس کے ساتھ ہم زبانی کا موقع ملا اور ان کے ساتھ ہر دم نشست و برخاست رہنے سے فارسی محاورے پر بھی عبور حاصل ہوگیا چنانچہ نواب نجف خاں کی وفات کے تاسف آمیز ذکر کے موقع پر مولف کہتا ہے:

"بعد انتقال نواب موصوف غفران پناہ اختلال کلی در اوضاع اکابر و اصاغر و اہالی

و موالی حضرت دهلی راه یافته فتنه را چار طرف بازار گرم گشته' یاران مجموع که از اره جدا نمی گشتند مثل اوراق درختان پریشان گشتند و بنوعی از جا بجائی شدند که باد صرصر خود را باگرد شان نمی تواند ملحق سازد۔ لشکر که موج به آسمان می زد باخاک برابر و ناچیز گشته۔ اکثر بزرگان و دوستان که از دیدن آنها حیات تازه داشتم درین انقلاب .شربت شهادت و شوراب ممات نوش شان شد و از همدمان فراموش گشتند۔ اکنون در یاد آن عزیزان و دوستان اشک رمانی نثار روح آن ها می سازم۔ خدای عز و جل جمله را بیامرزاد۔ خلاصه شب و روز در یک جا بامردم خراسان و عراق و فارس صحبت گرم می داشتم تا از برکت صحبت و فیض مجالست ایشان بی بهره نماندم کم و بیش پی به محاورهٔ فارسی بردم درمیان سیاه و سفید فرق توانستمی کرد:

"جمال هم نشین در من اثر کرد

وگرنه من همان خاکم که هستم"

(۳) اس اثنا میں جو معلومات اس کو اپنے خراسانی' عراقی اور خطہ فارس کے دوستوں سے بہم پہنچی مولف ان کو کاغذات کے پرچوں پر علیحدہ علیحدہ لکھتا رہا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ان اشعار کو مجموعہ بیاض کی شکل میں ترتیب دے دے لیکن اس کے دوست میرزا محمد حسن قتیل نے مشورہ دیا کہ اشعار ہر اعتبار سے مدون ہو چکے ہیں' بہتر ہو گا کہ اس کو بہ ترتیب حروف تہجی تذکرے کی شکل میں لکھ دو۔ چنانچہ مولف نے اسی مشورے پر عمل کیا۔ اس کا بیان ہے:

"اکثر اشعار از زبان عزیزان خراسان و عراق و فارس گوش زد فقیر شده بود بر کاغذ پاره ها علیحده علیحده جمع آمده بود خواستم که این همه اشعار را فراهم ساخته جهت مشغولی خاطر در قید بیاض آرم که صحبت بی نفاق است و بارها اتفاق استاذی افصح الفصحا و اکمل ابلغا میرزا محمد حسن المتخلص به قتیل که واقعی کشته راه دوست است ...... فرمود که اشعار از هر قسم بسیار فراهم شده اگر بطرز تذکره طریق

تہجی رعایت کردہ آید چہ کہ خوانندہ این بہ آسانی ہر کدام شاعر را کہ بخواہد اشعارش بر آوردہ بخواند بصواب نزدیک تراست بحسب فرمودۂ آن وحید عصر این جواہر زواہر بطریق تہجی در رشتہ تحریر کشیدہ آمد۔"

اب ظاہر ہے کہ اسی مواد کو جو دہلی کے قیام کے زمانے میں مولف نے، جب کہ نجف علی خان زندہ تھے، اپنے ایرانی دوستوں کی ہم بزمی میں جمع کیا تھا، بجائے بیاض کی شکل میں ترتیب دینے کے بہ ترتیب حروف تہجی تذکرے کی شکل میں جمع کردیا۔ اس طرح دیکھا جاتاہے کہ مولف کے بیانات مولانا شروانی کے قول کے موید ہیں۔

یہاں ایک اور امر اضافہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مرزا قتیل کا نام محمد حسن ہے نہ محمد حسین اور نہ وہ مولف کے استاد معلوم ہوتے ہیں۔ مولف نے استاد کا لفظ بہ نظر احترام اضافہ کردیا ہے۔ اگر مولوی صاحب مرزا قتیل کے حالات پر، جو مولف نے اسی تذکرے میں بیان کیے ہیں، ایک نظرڈال لیں گے تو یہ شبہ جس میں ان کے ساتھ ان کے انگریزی پیش رو بھی شریک ہیں، رفع ہوجائے گا۔ قتیل کے حق میں مولف کے یہ الفاظ ہیں:

"نہایت یار باش و دوست پرست و ظریف است۔ سی سال است کہ کہ فقیر با ایشان فرط محبت و اخلاص دارد و بسا اتفاق افتادہ کہ در یک جا بودہ ایم۔ آنچہ یارانہ از راہ شوخی و ظرافت بہ فقیر می کند اگر تحریر آن نماید ضحک و فضیحتی خودم است:

گر ہمہ سنگ ور ہمہ چوب است
ہرچہ از دوست می رسد خوب است

بلاشبہ درین زمان قحط الرجال ذات او از غنایم روزگار است و دل مردۂ من بآب لطف یاری او زندہ و تازہ است۔"

اس عبارت سے واضح ہوتاہے کہ ان کے تعلقات دوستانہ و بے تکلفانہ تھے نہ استادانہ و شاگردانہ۔

ضخیم تذکروں کے ذکر میں مولوی محفوظ الحق صاحب نے تذکرۂ نشترِ عشق کا بھی ذکر کیا ہے اور مصنف کا نام انہوں نے نواب قلی خاں بتلایا ہے حالانکہ ان کا نام حسین قلی خاں ہے۔ میں نے یہ تذکرہ پروفیسر شیرانی کے ہاں بچشم خود دیکھا ہے۔

میں اس امر کے سمجھنے سے بھی قاصر ہوں کہ مولوی خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانے کے نسخہ مخزن الغرائب کو مولوی صاحب چنداں قدیم نہیں مانتے جب کہ کتب خانہ بوڈلین کے نسخے کو جو ۱۲۲۴ھ کا نوشتہ ہے درالمصنفین کے نسخہ نوشتہ سنہ ۱۲۲۰ھ سے دوسرے درجے پر مانتے ہیں حالانکہ بانکی پور کے کتب خانے کا نسخہ بھی ۱۲۲۴ھ ہی کا مرقومہ ہے۔

مخزن الغرائب کے قدیم نسخوں کے سلسلے میں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کا نسخہ، جو اس وقت میرے پیش نظر ہے، درالمصنفین کے نسخے سے بھی قدیم ہے اور ابھی تک اسی کو شرف اولیت حاصل ہے۔ اس نسخے کی تاریخ کتابت سنہ ۴۶ جلوس شاہ عالم مطابق سنہ ۱۲۱۹ھ ہے اور مقام کتابت لکھنؤ ہے۔ ایک اور لحاظ سے بھی اس نسخے کو امتیاز حاصل ہے یعنی یہ کہ وہ مولف کے اصل مسودہ سے منقول معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایسے آثار اور قرائن موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ یہ نسخہ خود مولف کے پاس رہا ہے کیونکہ بعض مقامات پر اس میں حک و اصلاح بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض معاصرین کے حالات، جو اصل مسودہ میں شامل نہیں تھے، بعد میں حاشیے پر اضافہ کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اصحاب قابل ذکر ہیں:

سید انشاء اللہ خاں انشاء، حضرت شاہ علی اکبر، میاں فرخ حسین حرمان، سید میر علی حریق، غلام فخر الدین خاں حیرت، مولوی مصطفیٰ علی خاں گوپاموی خوش دل، جواہر لال دبیر، حاجی عابد صفاہانی، سید تقی میر (شاعر مشہور)، لچھمی نرائن محبت، میرزا ابوالمعالی عالی وغیرہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسماء مصنف کی پہلی اشاعت سنہ ۱۲۱۸ھ[1] میں، اگر

درحقیقت اس وقت تک کوئی اشاعت ہوچکی تھی' داخل ہونے سے رہ گئے تھے' وہ اس نسخے میں اضافہ کردیئے گئے۔

تعجب ہے کہ اس نسخے میں خود خادم کے اشعار نہیں ملتے حالانکہ فہرست اسماء میں حرف "خا" کے خاتمے پر یہ الفاظ نظر آتے ہیں : "خادم سندیلہ مولف تذکرہ۔" میں یہاں ان کے ایک شعر پر قناعت کرتا ہوں :

بدیر و کعبہ چہ جوئی خدا کجاست کہ نیست

بطوف پردۂ دل شو صفا کجاست کہ نیست

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ احمد علی سندیلوی اپنے مجموعہ بیاض کے قدیم ارادے کو نہیں بھولے' جو انہوں نے انیس العاشقین کی صورت میں پورا کیا اور شکر ہے کہ انیس العاشقین آج بھی موجود ہے۔ پروفیسر شیرانی کی کتابوں میں جہاں اور علمی نوادر محفوظ ہیں انیس العاشقین کا نسخہ بھی موجود ہے۔ یہ نسخہ مدد علی کاتب نے نواب ابوالقاسم خاں کے ارشاد سے لکھا تھا۔ تاریخ کتابت مذکور نہیں۔ میں ذیل میں اس کی فہرست ہدیہ ناظرین کرتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرست' جس کو مولوی صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے' مکمل معلوم نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ احمد علی سندیلوی نے اپنے لیے ایک خاص بیاض تیار کی تھی۔ اس بیاض کے ضمن میں' بعد میں انہوں نے مختلف بیاضوں اور تذکروں کو موقع بموقع شامل کردیا اور اصل بیاض حمد و نعت سے شروع ہوکر کہیں آخر میں جاکر ختم ہوتی ہے :

۱۔ سلسلہ اصل بیاض مشتمل بر حمد و نعت و منقبت۔

۲۔ اشعار بر مضامین مختلفہ مشتمل بر ہشتاد فصول۔ یہ کسی نامعلوم بیاض کا انتخاب ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر بقول مولوی صاحب اس میں تراسی فصلیں بتاتے ہیں لیکن موجودہ بیاض میں صرف اسی فصلیں ہیں۔ جن کی فہرست حسب ذیل ہے :

(۱) در مراقبہ و ذکر۔

(۲) اشعار کہ مریدان بہ پیران نویسند۔

(۳) اشعار که پیران به مریدان نویسند۔
(۴) در تاسف و ندامت۔
(۵) در ذکر شعر و سخن۔
(۶) در ذکر عشق و عاشق۔
(۷) ناز معشوق۔
(۸) ادا و جلوه و خرام وغیره۔
(۹) در شوق و استغنا و واقف بنودن معشوق از حال عاشق۔
(۱۰) رسوائی و بیباکی عاشق و حجاب معشوق۔
(۱۱) در شبیهه معشوق و بی مثل صورتش۔
(۱۲) در صفت بعضی از زیور و دیگر اسباب آرائش معشوق۔
(۱۳) در وارد شدن دوست۔
(۱۴) در محویت عاشق از دیدن معشوق۔
(۱۵) در ذکر بوسه و خنده و تبسم و دشنام۔
(۱۶) در رفتن معشوق۔
(۱۷) در سرراه گرفتن معشوق۔
(۱۸) در برآمدن معشوق بالای بام۔
(۱۹) در ذکر غسل و وضو و حمام و روزه و نماز معشوق۔
(۲۰) در بیان گریستن و غمگین شدن و چین پیشانی معشوق۔
(۲۱) در ذکر صبح و طلوع آفتاب و بیدار شدن معشوق۔
(۲۲) در ذکر ماهتاب۔
(۲۳) در پایان آمدن شب وصل و آمد سحر۔
(۲۴) در بیان حال دل و دیدهٔ عاشق۔
(۲۵) در ذکر یوسف و زلیخا و لیلیٰ و مجنوں و شیریں خسرو و فرهاد و امثال آن۔

(۲۶) در ذکر گل و بلبل و شمع و پروانه و سرو و قمری۔
(۲۷) در بیان عاشق شدن معشوق و داغ سوختنش۔
(۲۸) در ذکر دیوانه و مجنون و زنجیر۔
(۲۹) در ذکر صید و صیاد۔
(۳۰) در ذکر بهار و می و ساقی و مطرب۔
(۳۱) در ذکر قهوه و قلیان و تریاک۔
(۳۲) در ذکر کعبه و بت خانه و شیخ و برهمن و تسبیح و زنار۔
(۳۳) در ذکر کشتی و دیگر متعلقات آن و کوه و بیابان۔
(۳۴) در ذکر مکتب و طفل و ادیب۔
(۳۵) در تابستان و زمستان۔
(۳۶) در صفت عیوب اجزائے حسن۔
(۳۷) در عالم هزل و لطیفه۔
(۳۸) در وصف معشوقانه هر فرقه۔
(۳۹) در بازیها۔
(۴۰) در ستایش سلاطین و اسپ و خیل۔
(۴۱) اشعار متفرقه۔
(۴۲) در اظهار دوستی غایبانه و آغاز آشنائی و محبت نهانی۔
(۴۳) در اخفای عشق و محبت از بیم رسوائی۔
(۴۴) در وداع کردن معشوق۔
(۴۵) از مقیم به مسافر۔
(۴۶) در ذکر نامه و پیام۔
(۴۷) در شوق و آرزوی وصال۔
(۴۸) در یاد و فراموشی۔

(۴۹) در قرب معنوی و اتحاد و لطف نهانی۔
(۵۰) در فراق۔
(۵۱) در بی قراری و ترغیب صبر و تسلی۔
(۵۲) در ذکر حسرت و محرومی و حیرت و سر گشتگی۔
(۵۳) در غم و درد و گریہ و آہ و نالہ و فریاد۔
(۵۴) در سراغ و جستجوی گم گشتہ خود۔
(۵۵) در خواب دیدن معشوق۔
(۵۶) در شکوہ و شکایت و گلہ۔
(۵۷) اشعار شوقیہ و شکایت آمیز۔
(۵۸) در بیان بی وفائی معشوق۔
(۵۹) در محل عذر و اعتراف تقصیر و اظہار بی گناہی۔
(۶۰) در ذکر صلح و جنگ و رنجش و آشتی۔
(۶۱) در واسوخت و طعنہ و کنایت معشوق۔
(۶۲) در رشک۔
(۶۳) در عہد و پیمان۔
(۶۴) اشعار انتظار۔
(۶۵) در قدوم مسافر و مہمان۔
(۶۶) در عید نو روز و سیر باغ و صحرا۔
(۶۷) عرض احوال و حسن طلب۔
(۶۸) در شکر عطیات و تحسین و آفرین۔
(۶۹) در دعوئ صدق و وفا آشنائی و رضا و تسلیم۔
(۷۰) بہ تقریب ارسال تحف بہ ہمدیگر۔
(۷۱) اشعاری کہ بزرگان بہ فرزندان نویسند۔

(۷۲) در مواعظ و نصائح۔

(۷۳) جواب ناصح۔

(۷۴) در محل عبرت۔

(۷۵) در بیان عزلت و قناعت و شکست نفس و استغنا۔

(۷۶) متضمن بر مطالب مختلفہ۔

(۷۷) در عیادت و تقریب فصد و بیماری و ذکر طبیب۔

(۷۸) در تہنیت۔

(۷۹) در تعزیت۔

(۸۰) در دعا۔

۳۔ انتخاب از تذکرۃ المعاصرین شیخ محمد علی حزیں (ڈاکٹر اسپرنگر کے ہاں اس کا چوتھا نمبر ہے) سلسلہ اصل بیاض متضمن بر اشعار عمر خیام' ناصر علی' اسیر' ظہوری' صانع بلگرامی' محمد توفیق کشمیری' عبدالقادر بداونی۔

۴۔ انتخاب تذکرہ سرخوش (ڈاکٹر اسپرنگر کے ہاں اس کا نمبر تیسرا ہے)۔

۵۔ ایک نامعلوم تذکرہ کا انتخاب جس میں بہ ترتیب حروف تہجی مفصلہ ذیل شعرا کا کلام ہے:

(الف): معزز خان افسر' ملا اسحاق' قزلباش خان امید' میرزا استغنا' اطہر خان اطہر' خواجہ انور' میر اسد اللہ بخاری' میرزا فقیر اللہ آفریں' شیخ فخر الدین اطہر' میرزا شفیعائے اثر' میرزا ایما عموی میرزا ابو علی ہاتف۔

(ب): بیرمن خاں' بدیعای سمرقندی۔

(ت): عبداللطیف خاں تنہا' شاہ رضائے تسلیم' میرزا فتح علی بیگ۔ تسکین' میرزا محسن تاثیر' ملک سلطان تمکین' توفیق' خواجہ نور اللہ تحقیق۔

(ج): ارجمند بیگ جنوں' مرزا محمد علی جم۔

(ح) : نواب حفیظ اللہ خاں، میرزا فتح اللہ حیرت، شیخ عبدالحمید، میرزا اسمٰعیل حجاب، حیدر ذوالفقار، محمد رستم حیرت شاگرد عبدالقادر بیدل۔

(خ) : میر صدیق خان، خان میرزا خلیل، نواب خان دوران صمصام الدولہ بہادر، امتیاز خان خالص۔

(ر) : میر کمال الدین رسوا، نواب روح اللہ خاں عالمگیری، عنایت اللہ راضی، میرزا رفیع رافع یزدی، راکو پنڈت راکو، راہید (کذا)[۲] رافت، محمد علی رائج، ریاضی، سلطان علی بیگ رہی، رضا۔

(ز) : محمد میرک زاکی، نواب زیب النساء بیگم۔

(س) : محمد طاہر سخن ور، خواجہ عبداللہ سامی، سال مرد (کذا)، سخنہ کار (کذا)، حاجی فریدون سابق، ساجد، میرزا سید محمد، ملا عبدالحکیم ساطع۔

(ش) : میرزا شمس الدین شوکت، حکیم حسین شفائی، شادمان، شاپور طہرانی۔

(ص) : صامت صفاہانی، صامت کشمیری، شیخ محمد مسلم صنعتی، صفی قلی خاں ماوراء النہری، صاحب مسیح صفاہانی، میر صیدی صفاہانی، محمد صوفی مازندرانی، صفی قلی، آغا رضا صبا، میرزا لطف اللہ بیگ صہبا، نواب ابو البرکات خان صوفی، حضرت شاہ صادق۔

(ط) : محمد طاہر طاقت، طبعی، میر طبعی کشمیری۔

(ظ) : ابوالمظفر (ظفر)

(ع) : عزیز خان، محمد ہمت عاشق، شیخ عطااللہ عطا، شاہ عاجز، محمد شفیع علیم، میر عین علی، شاہ ابراہیم عزت، نعمت خان عالی، عشرت، میر طاہر علوی۔

(غ) : نواب نوازش خان رونی غافل، خواجہ غیاث، ملا محمد علی غیرت، میرزا فیض الحق

غنا، غروری سبزواری، میرزا بیگ غافل، آغا عبداللہ غواص۔

(ف) : بابا فولاد، فخری، بابا فغانی، شیخ عبدالقادر فدائی، ملا فرح اللہ، فوتی (ہجاگو)، عبدالشکور فائق، میرزا ابوالفتح فاتح شیرازی، میرزا فصیح اوستاد نواب صمصام الدولہ خان دوران بہادر، میرزا فرہاد، ماہر فاخر، محمد بیگ فرصت، میر فائق لاہوری، محمود بیگ فارغ بدخشانی۔

(ق) : قانع، میرزا قلندر، قیصر (ای) ہمدانی، میرزا عبدالغنی بیگ قبول، قلعہ دار خاں۔

(ک) : میرزا کلامی، میرزا بیگ کامل۔

(گ) : شاہ گلشن، میرزا قاسم گرامی خلف عبدالغنی بیگ قبول، شاہ شمس الدین گدا، میرزا شریف گمنام۔

(ل) : میرزا لطفی اصفہانی، ملا لکنت برادر ملا ناطق، حکیم لطف اللہ۔

(م) : ملا مظہری، شیخ عبداللہ محرم، میر محمد معروف، میر محمود، مستغنی کشمیری، شیخ رحمت اللہ ممتاز، میرزا میر، ملتفت خان، معین، محمد علی خاں متین، امان اللہ مروت، نواب فاضل خان منصف عالمگیری، مظہر، حاجی مطیع والی کاشغر، میرزا مقصود کاشی، مومنائے شیرازی، مرتضیٰ خان موالی، قاسم خاں مخلص کشمیری، میر شاہ حسین مناسب، مدہوش قلندر اصفہانی، مشفق، میرزا حسن بیگ معلوم تبریزی، ملا مشرقی، مخلصائے کاشی، محمد رضائے مشتاق۔

(ن) : فرہاد بیگ نیاز، سخن ور خان نکہت، میرزا اسد اللہ نصیر، عبدالغفور نامی، نصیرائے اصفہانی، محمد زماں نافع کشمیری، مولانا نظمی، نصیر طوسی، دلاور خاں نصرت، میر نجات، قاسم نقاش، علی نقی (نقی کمرہ ای؟)۔

(و) : حضرت شیخ عبدالواحد وحدت سرہندی، واصب، حسن وارستہ، خواجہ نور اللہ والہ،

ملا ثنا خاں وحشت، ارادت خان واضح، نواب حفیظ علی خاں وارستہ، میرزا حسن بیگ صفاہانی، محمد طیب والی۔

(ہ): محمد ہاشم ہندو، خواجہ ہاشم دیوانی، میمنت خان (ہما کشمیری)۔

(ی): محمد اشرف یکتا، میرزا یوسف بیگ شاملو۔

پروفیسر شیرانی کا بیان ہے کہ مذکورہ بالا ایک نامعلوم تذکرہ ہے جو محمد اصلح خلف حاجی محمد اسلم سالم کی تالیف ہے۔ حاجی محمد اسلم دراصل ایک کشمیری برہمن تھے۔ شیخ محسن فانی نے انہیں اپنا پسر خواندہ بنایا تھا اور انہیں کے اثرات میں عہد اورنگ زیب خلد مکاں میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اکثر خدمات شاہی پر ممتاز رہے۔ پھر شہزادہ محمد اعظم کی خدمت میں مامور ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے خان ساماں اور داروغہ ابتیاع خانہ بنادیئے گئے۔ "مرات آفتاب نما" میں ہے کہ محمد اعظم نے انہیں منصب وکالت شرعی پر ممتاز کیا۔ عہد فرخ سیر میں وقایع نگار کشمیر مقرر ہوکر کشمیر چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے فرزند محمد اصلح مولف تذکرہ بالا کے حالات کم یاب ہیں۔

۶۔ از روضہ ہفتم بہارستان جامی در ذکر شعرای متقدمین۔ مولوی محفوظ الحق صاحب نے اپنی فہرست نمبر پانچ میں بہارستان کا ذکر کرتے وقت باب ہشتم لکھا ہے۔ اس لیے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بہارستان کے روضہ ہشتم میں جانوروں کی حکایات درج ہیں اور شعرا کا تذکرہ روضہ ہفتم میں آتا ہے۔

۷۔ از مجالس العشاق سلطان حسین میرزا در ذکر حضرت مولوی عبدالرحمن جامی۔ سلسلہ بیاض قدیم: تاریخ وفات جامی و ہاتفی۔

۸۔ انتخاب غزلیات محتشم، اوحدی، اہلی، طاہر بخارائی، جامی، شیخ محمد اعجاز اکبر آبادی، طالب آملی۔ سلسلہ بیاض قدیم: غزالی مشہدی، میر غیاث الدین بدخشانی، رائج، شاہ فقیراللہ آفرین، مصحفی ریختہ گو۔

۹۔ انتخاب از طبقات اکبری۔ اس میں طبقات سے صرف چند شعرا پر قناعت کی

گئی ہے اور بہت جلد قدیمی بیاض کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جس میں شاداں (تکمہ؟)، حکیم سرمد مجذوب (مع حالات)، شیخ محمد قریش ملتانی، جامی، میرزا خلیل اور نواب مظفر خاں کا کلام نظرافروز ہوتا ہے۔

۱۰۔ انتخاب از تذکرہ صائب ہمدانی۔ بعد میں قدیمی بیاض کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

۱۱۔ غزلیات بہائی، نظیری (سات غزلیں)، محتشم کاشی (انتیس غزلیں)، بابا فغانی، میلی۔ گویا یہ وہ حصہ ہے جو مولوی صاحب کے ہاں نمبر ۶ کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۲۔ اشعار از سفینہ میرزا محمد حسن مغفور خلف الصدق میرزا محمد محسن برادر کلاں ابوالمنصور خان نواب صفدر جنگ۔ یہ بیاض بھی ایک نادر اور کم یاب چیز ہے۔ بعد میں سلسلہ بیاض قدیم جاری ہوجاتا ہے۔

۱۳۔ ترکیب بند حکیم شفائی صفاہانی، وحشی یزدی، میرزا فصیحی، میرنی سبزواری۔ سلسلہ بیاض قدیم۔

۱۴۔ انتخاب از مثنویات عطار و جامی۔ سلسلہ بیاض قدیم۔

۱۵۔ غزلیات جامی، خواجہ حسن دہلوی، شریف تبریزی، تقی کاشی۔ سلسلہ بیاض قدیم۔

۱۶۔ غزلیات خسرو، اہلی، آہی، ریاضی، جامی۔

۱۷۔ قطعات اساتذہ۔ سلسلہ بیاض قدیم۔

۱۸۔ عبارت نثر: پند شیخ عبداللہ ملتانی، اسامی قافیہ، اسامی خطوط۔ سلسلہ بیاض قدیم۔

۱۹۔ قواعد علم قوافی از تصنیف مولانا جامی۔ سلسلہ بیاض قدیم۔ مختصر وافی در قواعد علم قوافی تصنیف مولانا جامی۔

۲۰۔ برخی در علم عروض۔ ذکر تشبیب و قصیدہ و قطعہ۔

۲۱۔ انتخاب بعض صنائع۔ اقسام نظم۔

۲۲۔ تاریخ گوئی۔

۲۳۔ بیاض گم نام۔ یہ بیاض اس حصے پر مشتمل ہے جو مولوی صاحب کے نمبر ۷، ۸، ۹، ۱۰ کے ذیل میں ملتا ہے۔ انیس العاشقین کا یہ بہترین حصہ ہے۔ پروفیسر شیرانی کا بیان ہے کہ اس حصے میں مولف نے بندہ علی خاں المخاطب بہ نواب شیر افگن خاں کی بیاض سے کام لیا ہے، جو کلیم پانچ فصول پر بہ تفصیل ذیل منقسم ہے:

فصل اول: در ذکر اشعار مشائخ۔

فصل دوم: در ذکر اشعار علماء۔

فصل سوم: در ذکر اشعار سلاطین متضمن بر هفت فرقہ:

(الف): فرقہ اول سلاطین صفویہ۔

(ب): فرقہ دوم سلاطین گیلان۔

(ج): فرقہ سوم سلاطین دودمان حضرت صاحب قران۔

(د): فرقہ چہارم سلاطین دکن۔

(ہ): فرقہ پنجم سلاطین مقدم و موخر ہر کشور۔

(و): فرقہ ششم جمعی کہ از طرف مادر نسب شان بسلسلہ علیہ صفویہ می رسد یا شرف دامادی این خاندان یافتہ اند۔

(ز): فرقہ ہفتم۔ صدور و وزرا و امرا۔

فصل چہارم: در ذکر اشعار استادان متقدم۔

فصل پنجم: در ذکر اشعار اساطین شعرای متاخر۔

مولف انیس العاشقین نے اس بیاض کا انتخاب کرتے وقت بے حد اختصار سے کام لیا ہے اور اس کی اصلی ترتیب کو، جو تاریخی تھی، حروف تہجی کی ترتیب سے بدل دیا ہے جس سے بعض اوقات عجیب غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں۔ مثلاً نواب بندہ علی خاں نے جہاں سلطان حسین بایقرا کے اشعار کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد اس کے فرزند بدیع الزمان میرزا کے اشعار درج کردیئے ہیں اور سرخی میں یوں لکھ دیا ہے "بدیع الزماں

میرزا ولد سلطان مزبور۔" اب چونکہ احمد علی کے ہاں ترتیب بہ حروف تہجی ہے اس کے ہاں بدیع الزماں کا نام ظہیر الدین بابر کے نام کے بعد آیا ہے۔ کاتب نے اصل بیاض سے بدیع الزماں کے لیے وہی اصلی سرخی نقل کرلی ہے یعنی "بدیع الزماں میرزا ولد سلطان مزبور۔" جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ناواقف شخص بدیع الزماں میرزا کو ظہیر الدین بابر کا فرزند مان لے گا۔ اسی سلسلے میں یہاں چند الفاظ نواب بندہ علی خاں کے لیے کہنا ضروری ہیں۔

نواب سید بندہ علی خاں نعمت اللہی باسطی، نواب غیرت خاں صلابت جنگ کے فرزند اور نواب عزت الدولہ شیر افگن خاں بہادر صفدر جنگ کے پوتے ہیں۔ موخر الذکر فردوس آرام گاہ محمد شاہ کے دربار میں معزز امراء میں سے تھے۔ سابق میں ان کا خطاب غالب جنگ تھا۔ مآثر الامرا میں اس خطاب کے چھن جانے کا قصہ غازی الدین حیدر کے حالات میں یوں مذکور ہے کہ جب بادشاہ نے غازی الدین خاں کے منصب و خطاب کی بحالی کا حکم دیا۔ اس وقت غازی الدین خاں اور عزت الدولہ دونوں موجود تھے۔ غازی الدین خاں نے عرض کی کہ سابق میں فدوی کا خطاب غالب جنگ تھا۔ اب یہ خطاب عزت الدولہ کو مل گیا ہے۔ اس وقت فدوی اور عزت الدولہ دونوں موجود ہیں۔ اگر ارشاد عالی ہو تو ہم دونوں تلوار کے ساتھ باہم جنگ کریں پھر جو غالب آئے۔ وہی غالب جنگ کے خطاب کا مستحق قرار پائے۔ بادشاہ اس پر مسکرائے اور فرمایا کہ اچھا میں تم کو غالب جنگ کا خطاب عطا کرتا ہوں اور ان کو صفدر جنگ کا۔

نواب غیرت خاں صلابت جنگ کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔ صرف اسی قدر معلوم ہوسکا ہے کہ ان کا نام حبیب اللہ تھا۔ نواب سید بندہ علی خاں کو بعد میں اپنے دادا کا خطاب شیر افگن خاں مل جاتا ہے۔ افضل الدین ثابت نے ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تخلص "سبقت" تھا۔ میں یہاں ان کے دو شعر، جو کسی قدیم بیاض سے ملے ہیں، درج کرتا ہوں:

ہرجا کہ می نشینم و ہر سو کہ می روم

آرام کوی یار . ز یادم نمی رود

در گلخن دھر گرچہ خاریم

از باغ و بہار یادگاریم

بندہ علی خاں خود ثابت کے شاگرد اور مرید تھے۔ عقیدت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ یہ مصرع ان کی انگشتری پر منقوش تھا :

ع شیر افگن خان مرید ثابت است

گلشن علی جونپوری المتخلص بہ گلشن نے اپنی تالیف "صورت حال" میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب میں ابتدائے جوانی میں دہلی گیا تو ایک نوجوان رئیس زادہ بندہ علی خاں المخاطب بہ شیر افگن خاں کا ملازم ہوگیا۔ نادر شاہی حملے میں گلشن علی بندہ علی خاں ہی کے پاس تھا۔ خود بندہ علی خاں گلشن سے بے حد محبت کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی بیاض میں جہاں ان کا نام لکھا ہے "برادر عزیز حفظ اللہ تعالیٰ" کے الفاظ کے ساتھ لکھا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بندہ علی خاں کو شعر و سخن کا نہ صرف شوق تھا بلکہ یہ شوق عشق کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ دہلی میں ان کے گھر پر مشاہیر شعرا کی آمدورفت رہتی تھی۔ ہر وقت باکمالوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ سید موصوف خود شعر کے بڑے زبردست مبصر تھے۔ اپنی بیاض میں انہوں نے ایک الگ فصل میں اپنے دوستوں کا کلام درج کیا ہے۔ اس پر سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے منتخب اور چوٹی کے شاعر تمام کے تمام ان کی فہرست احباب میں شامل ہیں۔ اس فصل کا عنوان "احبائے معاصرین" ہے جس میں یہ نام شامل ہیں :

(۱) شمس الدین فقیر جن کو بندہ علی خاں سخن آفرین بے نظیر کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ (۲) نصرت اللہ خاں نثار۔ (۳) میر محمد عظیم ثبات۔ یہ ثابت کے فرزند ہیں۔ (۴) میرزا جانجاناں مظہر۔ (۵) محتشم علی خاں حشمت۔ (٦) رشید خاں علوی۔ (۷) سراج الدین علی خان آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ۔ (۸) آیت اللہ نثار۔ (۹) میر مرتضیٰ حیدر۔ (۱۰)

نظیر بیگ خادم۔ (۱۱) معنی یاب خاں۔ (۱۲) شاہ قابل۔ (۱۳) عبدالغنی بیگ قبول۔ (۱۴) قاسم یار خاں قسمت۔ (۱۵) میرزا حیدر قلی۔ (۱۶) شاہ گلشن (۱۷) زاہد علی خاں سخا۔ (۱۸) برادر عزیز گلشن علی جون پوری حفظ اللہ تعالیٰ۔ (۱۹) میرزا گرامی خلف قبول۔ (۲۰) شیخ عبدالرضائے متین۔ (۲۱) میر فیض علی نصیری۔ (۲۲) مرزا محمد علی وفا۔ (۲۳) آقا صالح برہان۔ (۲۴) آقا لطیف۔ (۲۵) شرف الدین علی خان پیام غفرلہ۔

سید بندہ علی خاں اگرچہ شاعر تھے تاہم انہوں نے شعر گوئی کے مقابلے میں شعر فہمی کے مذاق کو زیادہ نشوونما دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر بہت ہیں لیکن شعر شناس بہت کم ملتے ہیں۔ یہ شعر کے حقیقی جوہری تھے اور ان کی طبیعت قدر تاً" اس کام کے لیے موزوں تھی چنانچہ ان کے مذاق صحیح اور انتخاب سلیم کا نتیجہ بیاض زیر بحث ہے۔

سید بندہ علی خاں نے زیادہ تر ایک خاموش لیکن ادبی زندگی بسر کی ہے۔ اپنے عہد کی سیاسیات سے ان کو بہت کم سروکار رہا ہے۔ اس لیے ان کے واقعات زندگی تاریخ عہد میں نہیں ملتے مگر علمی میدان میں کئی کارنامے یادگار چھوڑے ہیں جن کا آج سراغ لگانا بھی دشوار ہے۔ لیکن جو معدودے چند معلوم ہیں میں یہاں ذکر کرتا ہوں:

(۱) سب سے مقدم یہی بیاض ہے جو چار سو اکتیس اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں اکتیس سطریں اور ہر سطر میں دو شعر ہیں۔ اس بیاض کے مآخذ حسب ذیل ہیں:

(الف) بیاض میرزا صائب۔ بیشتر حصہ اسی بیاض سے ہے۔

(ب) کشکول بہاء الدین عاملی۔

(ج) بیاض عبدالباقی نہاوندی مولف مآثر رحیمی۔

بندہ علی خاں کی بیاض کی آخری دو فصلیں، جن میں شعرائے متقدمین و متاخرین کے انتخابی اشعار درج ہیں، بے حد اہم ہیں۔ یہاں ہم ان کے سلیقہ انتخاب اور مذاق صحیح کا بہترین ثبوت پاتے ہیں۔

اس بیاض کا اصلی اور قدیمی نسخہ بھی تذکرہ مخزن الغرائب اور انیس العاشقین جیسے نوادر کی طرح پروفیسر شیرانی کے کتب خانے میں موجود ہے جس میں خود نواب بندہ علی

خاں نے اپنے قلم سے عبارت ذیل تحریر کی ہے:

"این نسخہ مسودہ مجموعہ ھست کہ خاکسار ترتیب می دھد۔ آن چہ درین ثبت یافتہ بیش تر نقل بیاض میرزا صائب علیہ الرحمتہ و قدری از کشکول شیخ بھائی علیہ الرحمتہ و قلیلی از روی مجموعہ نوشتہ آقا عبدالباقی نہاوندی مولف مآثر رحیمی و کمتری از بیاض ھای متفرقہ باشد۔ امیدوار ھست کہ انشاء اللہ تعالیٰ تکمیل یابد و ازین عاصی یادگاری ماند و مقبول اھل دل گردد۔ بنا بر تعجیل این چند جزو کہ بعض جا مغشوش است و قابلیتی نداشت اما . بمقتضای المامور معذور پیشکش قبلہ فرزندان شریف حسن خان صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نمودہ فی سنہ ۱۱۵۶ھ۔"

(۲) سنہ ۱۱۶۱ھ میں انہوں نے ایک اور بیاض تیار کی جس کی تقسیم ابواب و فصول بعینہ بیاض اول کے مانند ہے۔ البتہ اس میں شعرائے متاخرین کی فصل غیر حاضر ہے اور اس کے بجائے دو نئے طبقے لکھے گئے ہیں جن میں پہلا اشعار اطبائے مقرب سلاطین سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا ان کے معاصر احباب سے متعلق ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ یہ بیاض بھی اصلی اور قدیمی ہے اور نواب بندہ علی خاں نے اپنے قلم سے اس پر ذیل کی عبارت درج کی ہے:

"ہو الباسط۔ مجموعہ اشعار منتخب غزلیات و مقطعات و قدری از قصاید تالیف بندۂ عاصی بندہ علی باسطی ابن حبیب اللہ المخاطب بہ غیرت خان نعمت اللہی در سنہ ھزار و یک صد و شصت و سہ ہجری صورت اتمام یافت۔"

سنہ ۱۲۱۱ھ میں یہ نسخہ سلطان محمد میرزا الصفوی الموسوی الحسینی بہادر خاں المتخلص بہ طلوعی کے کتب خانے کی ملک میں تھا اور خود طلوعی نے بعض حواشی پر اپنے اشعار لکھے ہیں۔ یہ نسخہ بھی آج پروفیسر شیرانی کے بے مثل کتب خانے میں ہے۔

(۳) نواب شیر افگن خاں کا تیسرا علمی کام دیوان افضل الدین ثابت کو ترتیب دینا ہے۔ بندہ علی خاں ثابت کے مرید ہونے کے علاوہ اس کے ممدوح بھی تھے۔ ثابت کے دیوان میں ان کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس کا مطلع ہے:

زہی خیال بلند تو آسمان سخن
فزود نسبت شعر تو قدر و شان سخن

جو دیوان میرے پیش نظر ہے پروفیسر شیرانی کا مقبوضہ ہے اور لطف یہ ہے کہ دیوان بھی وہی ہے جس کو نواب شیر افگن خاں نے ترتیب دیا ہے۔ اس پر ان کی مہر مورخہ ۱۱۵۱ھ موجود ہے اور ذیل کی عبارت انہی کے قلم سے مرقوم ہے:

"آن چہ مسودات اشعار حضرت پیر و مرشد برحق میر افضل الدین محمد ثابت قدس اللہ سرہ العزیز بدست آمدند غلام ازلی بندہ علی فراہم آوردہ استکتاب کنانیدہ و این نسخہ متبرکہ را تواضع مشفق..... نثار علی خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نمود حق تعالیٰ توفیق مطالعہ کرامت فرماید و ازین دولت مستفید گرداند۔"

اسی دیوان کا ایک اور نسخہ بندہ علی خاں نے اپنے دوست مولوی محمد پناہ کو عنایت کیا تھا جو اب برٹش میوزیم میں موجود ہے (فہرست قلمی کتب فارسی برٹش میوزیم، صفحہ ۷۰۹)

یہ اوپر مذکور ہوچکا ہے کہ بندہ علی خاں کی موجودہ بیاض میں صرف پانچ فصلیں ہیں۔ ان فصلوں کے بعد انیس العاشقین میں ایک اور فصل ملتی ہے جس کا عنوان یہ ہے:

"فصل ششم در ذکر اشعار مردم متفرقہ از سلف و خلف۔"

ممکن ہے کہ خان موصوف نے اس کو بعد میں اضافہ کردیا ہو۔ اب میں پھر انیس العاشقین کی فہرست کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

۲۴۔ غزلیات: اس میں ردیف وار بترتیب حروف تہجی "الف" سے لے کر "ے" تک مختلف شعرا کی غزلیں مندرج ہیں۔

۲۵۔ مستزاد مولانا روم، شیخ عطار، ہاشم، فخرالدین صفاہانی، ابن حسام، میرزا بیدل۔ سلسلہ بیاض قدیم: قطعہ اشرف ماژندرانی بخدمت زیب النسا بیگم متعلقہ ارادت فہم خواص، رباعیات سحابی نجفی، بابا طاہر عریاں (یہاں مولوی محفوظ الحق صاحب نے بابا

فغانی کا نام لکھا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بابا طاہر کا نام ہے اور رباعیاں بھی انہی کی منقول ہیں)۔ اسی موقع پر یعنی نمبر(۱۱) کی ذیل میں مولوی صاحب نے لکھا ہے "شرح غزلیات امیر خسرو دہلوی" خدا جانے اسپرنگر صاحب کیا سمجھے۔ یہ اصل میں امیر خسرو کے شعر ذیل کی تشریح ہے جس کے نو معنے بتائے جاتے ہیں:

بر سریر ای پیل تن شاھی و بسیار است بار

زان مرنج ای ابرو باغ ار گویمت بسیار بار

۲۶۔ مثنویات: قضا و قدر از محمد قلی سلیم، سراپا از میر سید علی مہری، معراج الخیال از علی رضا تجلی، شیریں فرہاد وحشی، مثنوی سوز و گداز از ملا نوعی۔

۲۷۔ قصائد سلمان ساوجی، مولانا امیدی در منقبت، کمالی سبزواری در منقبت۔

۲۸۔ ترجیع بند: حکیم شفائی، مولانا شانی، شیخ سعدی۔

۲۹۔ ساقی نامہ مولانا محمد صوفی رحمتہ اللہ علیہ۔ سلسلہ بیاض قدیم: حالات و کلام نظامی، حافظ، شوکت، عرفی، ملک قمی۔ احوال و غزلیات میرزا محمد علی خاں صبا خلف نواب محمد قلی خاں بن میرزا محسن برادر نواب صفدر جنگ۔

۳۰۔ مخمسات طالب، شیدا، صبحی، جمالی، شاہی، ریاضی، قربان، حافظ نعمت الہٰی، سیدا، مقیمی، ہلالی، محمود، حسابی، صالحی، ہزالی، خرد، سیدا، ہاشمی، ختہ[۳]۔

حواشی

(۱) مخزن الغرائب کے اختتام کی تاریخ قطعہ ذیل سے معلوم ہوتی ہے جو کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے:

این تذکرہ از لطف قدیر و قیوم
گردید بمخزن الغرایب موسوم
تاریخ تمامیش مرا شد در خواب
"ختم صحف" از ھاتف غیبی معلوم
= ۱۲۱۸ھ

(مرتب)

(۲) یہ نام نہایت غریب بلکہ مہمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرزا عبداللہ رافت لکھنوی ہیں جو میرزا محمد کاظم دہلوی کے بیٹے تھے اور جن کا ذکر تذکرہ ریاض العارفین میں صفحہ ۲۵۲ (بخش اول، مرتبہ سید حسام الدین راشدی، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء) پر آتا ہے۔

میرے خیال میں انیس العاشقین کا مخطوطہ مملوکہ شیرانی صاحب اس مقام پر مجروح ہے اور شاعر کے نام کا اول و آخر حصہ مٹ چکا ہے یعنی یہ صورت بن گئی ہے:

میر(زا عبد) اللہ

اب "زا عبد" کو "را حید" پڑھنا عین ممکن ہے۔

(مرتب)

(۳) مطبوعہ مضمون کے آخر میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کا نام، پتہ اور تاریخ یوں درج ہے:

"احقر عبداللہ، چابک سواراں لاہور۔ مورخہ ۲ر اگست سنہ ۳۴ء"

(مرتب)

□□□

حدِ جواب

(از مجلہ "تحقیق" چھٹا شمارہ، ۱۹۹۲ء، شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی)

مولانا محفوظ الحق صاحب کا "جواب الجواب" میری نظر سے گزرا ہے۔ میں ابتداء ہی میں یہ بات صاف کیے دیتا ہوں کہ میں نے وہ مضمون صرف دو غرض سے لکھا تھا۔ اول یہ کہ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کے کمال اور فارسی کے میدان میں ان کے پائے کا اعتراف کروں۔ دوسرے اس مضمون کے متعلق، جس پر مولانا شروانی اور مولانا محفوظ الحق صاحب جیسے فاضلوں نے اپنی قیمتی معلومات پبلک کی خدمت میں پیش کی تھیں، کچھ مفید اور مزید اطلاعات بہم پہنچاؤں۔ درحقیقت ایسا کرنے میں، میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے کوئی برا کام نہیں کیا۔ دنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ چراغ سے چراغ جلا کرتا ہے۔ اس میں کسی صاحب کو برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ میں نے مولوی محفوظ الحق صاحب کا مضمون بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے لیکن اس کے دوران میں جو جو خفیف غلطیاں میری نظر پڑیں میں نے اپنے مضمون میں ان کا ذکر بھی کردیا۔ اس سے خدانخواستہ مولوی محفوظ الحق کے کمال علمی کی تنقیص مقصود نہیں تھی بلکہ میں تو اور محظوظ ہوں کہ پر۔سیڈنسی کالج، کلکتہ کے افق پر ایک اور نیا ستارہ چمکا ہے جو اپنی علمی تحقیقات اور جدید انکشافات سے ایرانیات کے میدان میں ہماری معلومات کے ذخیرے کو گراں قدر بنادے گا۔ درحقیقت میرے مضمون میں اگر کوئی ایسی بات ہے جس سے مولوی صاحب کو رنج و افسوس ہوا تو میں بغیر کسی تامل کے سب سے پہلے ان سے معافی مانگتا ہوں۔ دل آزاری میرا شیوہ نہیں اور نہ ذاتی حملے میں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ساتھ ہی ہمیں یہ امر فراموش نہیں کردینا چاہیے کہ تنقیص بغرض تنقیص ایک غلط اصول ہے۔ علاوہ بریں چھوٹی چھوٹی اغلاط صرف بتانے کے لیے ہیں نہ جواب دینے کے

لیے۔ اس سلسلے میں یاد رہے کہ جس طرح انہوں نے ببیل لطیفہ مولانا شروانی کی حسابی غلط فہمی ظاہر کی تھی، میں نے بھی اسی متعدی ہوا سے اثر پذیر ہو کر لطیفے پر لطیفہ پیش کیا تھا اور آخر میں اشارہ بھی کردیا تھا کہ میں امید کرتا ہوں کہ مولوی صاحب اس موقع پر کاتب کا رسمی عذر پیش نہیں کریں گے۔ کیونکہ مذاق اس میں یہی تھا کہ عین اس موقع پر جہاں کہ انچاس ہونا چاہیے وہاں بدقسمتی سے کاتب انتالیس لکھتا ہے:

ہمین ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست

مولوی صاحب کو میں ہر طرح سے اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ میں نہ ان کو اور نہ مولانا شروانی کو فن حساب میں کمزور مانتا ہوں، اگرچہ مسلمان بالعموم اس فن میں کمزور مانے جاتے ہیں۔ اس لیے اس کے تحت میں مولانا کا ثبوت صفائی پیش کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔

اب میں مولوی محفوظ الحق صاحب کی دس دفعات کی بابت، جو انہوں نے میرے خلاف لگائی ہیں، اپنا ثبوت صفائی پیش کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

> "افسوس اس امر کا ہے کہ انہوں نے بعض ایسی باتیں بیان کی ہیں جو کسی طرح صحیح اور قابل قبول نہیں اور مزید افسوس اس لیے ہے کہ گو وہ مضمون مولانا حافظ محمود خاں شیرانی جیسے فاضل اہل قلم کے مشورے سے لکھا گیا ہے لیکن اس پر بھی بعض ایسی صریحی (کذا) غلطیاں نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر حیرت و استعجاب کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

میں بصد ادب مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ مضمون میرے قلم سے نکلا ہے اور جو امداد میں نے اس میں پروفیسر شیرانی سے لی ہے اس کا اظہار بھی کردیا ہے۔ اس کے باوجود مولانا مصر ہیں کہ پروفیسر شیرانی کو بھی درمیان میں شامل کرتے ہیں۔ یہ اس لیے میں کہتا ہوں کہ وہ اپنا مجرم مجھ ہی کو گردانیں اور پروفیسر شیرانی کو شریک جرم قرار نہ دیں۔

(۱) پہلا الزام میرے خلاف یہ ہے کہ میں نے مولانا کی نسبت یہ کہا کہ انہوں نے "بعض غیر اہم پہلوؤں کو غیر ضروری فروغ دیا ہے۔" بے شک یہ بیان میرا ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ: "ان کا اعتراض صحیح نہیں کیونکہ ہم (کذا) نے

بعض غیر اہم پہلوؤں کو فروغ نہیں دیا ہے۔"

میں اس قدر اضافہ کرتا ہوں کہ یہ میری رائے ہے۔ مولوی صاحب کے نزدیک قیمت کا معاملہ اور ہندی کی چندی بے حد اہم ہو لیکن میرے نزدیک اور میں کیا ہر ہم دوست شخص کی نگاہ میں، جو چیز اس مضمون میں درحقیقت اہم ہے وہ مولانا شروانی کے وہ بیانات تھے جو انشا کے حالات پر جدید روشنی ڈالتے ہیں اور انھی کے متعلق مولوی صاحب نے ایک لفظ بھی تعریف کا نہیں کہا۔

(۲) میں ان کے نمبر دو کے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ میں اس کے متعلق اوپر کہہ چکا ہوں۔

(۳) مولوی محفوظ الحق صاحب نے جو کچھ کہا ہے میں تسلیم کرتا ہوں۔

(۴) میں اب بھی مولانا شروانی کے اس بیان کو کہ "نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے سرکاری ملازم تھے۔ وہاں اہل کمال کا مجمع تھا۔ ان کو بھی استفادہ کا موقع ملا۔ اسی فیض صحبت کا نتیجہ یہ تذکرہ ہے۔" تسلیم کرتا ہوں۔ اور میں کیا تسلیم کرتا ہوں، مصنف کا یہ اپنا بیان ہے۔ میں نے مصنف کی اصل عبارت بجنسہٖ نقل کردی ہے اور نہ اس سے زیادہ کوئی دلیل (د) برہان پیش کی ہے۔ اب بھی اگر مولوی محفوظ الحق صاحب معقول نہ ہوں تو میں مجبور ہوں۔ وہ میرے بیان پر تو کیوں یقین کرنے لگے جب کہ مولانا شروانی کے بیان کو قبول نہیں کیا اور ان کے بیان کو کیا مانتے جب کہ خود مصنف مخزن الغرائب کے بیانات (کو) نہیں مانا۔ مولوی صاحب کی دلیلیں اس بارے میں، جو کچھ ہیں، دور از صحت ہیں۔ نجف خاں کی وفات اور مخزن الغرائب کی تکمیل کے عہد تک بے شک بائیس سال کا زمانہ ہوتا ہے اور اس زمانے میں، میں مانتا ہوں کہ مولوی صاحب کا یہ طباع مصنف خاموش نہیں رہا اور کچھ نہ کچھ کرتا ضرور رہا لیکن یہ ہماری سمجھ کا پھیر ہوگا اگر ہم اس تذکرے کی تالیف کی عزت نجف خانی دور کو نہ دیں کیونکہ اس سبھا نے احمد علی سندیلوی میں وہ جوہر پیدا کردیا جس نے آگے جاکر اسے مخزن الغرائب کا مصنف بنادیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تذکرے کے اختتام کے بعد جب اس نے دیباچہ کے لیے قلم اٹھایا تو اس کو بائیس سال پہلے کی نجف خانی بزم یاد آگئی جب کہ پہلی مرتبہ اس ضخیم مجلد کے لیے اس نے فارسی شعرا کے کلام و حالات کی یادداشتیں

ایک بیاض بنانے کی امید میں رکھنا شروع کی تھیں اور جو بعد میں قتیل کی تحریک پر تذکرہ کی شکل میں تدوین ہوئی۔ اسی بناء پر مولانا شروانی نے اگر اس تذکرے کو نجف خانی دور کے "فیض صحبت کا نتیجہ" مان لیا تو کیا گناہ کیا اور میں نے اگر ان کی تائید کردی تو کون سے کبیرہ کا مرتکب ہوگیا۔ بہتر ہوتا کہ مولوی صاحب مجھ پر اعتراض کرنے کے بجائے خود مصنف کے بیان پر ٹھنڈے دل سے غور فرماتے۔ مولانا جن کو میرے دلائل بیان کرتے ہیں، میرے دلائل نہیں ہیں بلکہ خود مصنف تذکرہ کے بیانات جن کو میں نے خود مصنف کی زبان میں اپنے خلاصے کے ساتھ اپنے مضمون میں دے دیا ہے۔ اب جو صاحب خود مصنف کے بیانات کو تسلیم نہ کریں اور انہیں محض حریف کے دلائل کہہ کر ٹال دیں ان کو کیا سمجھایا جائے۔

مولوی صاحب دریافت فرماتے ہیں:

"کیا چندر بھان برہمن، ملک شہید، لالہ ذوقی رام حسرت، لالہ سرب سنگھ دیوانہ، انشاء اللہ خاں انشا اور میر تقی میر وغیرہ شعرا کے حالات اور ان کا کلام بھی اس کو خراسانی، عراقی اور خطہ فارس کے دوستوں سے ملا تھا اور کیا جواہر لال دبیر کے حالات بھی، جو تذکرہ کی تالیف کے وقت کل سترہ برس کا (تھا) اور میرزا نجف خاں کی وفات کے پانچ سال بعد پیدا ہوا تھا، مولف تذکرہ نے خود میرزا نجف خاں کی حیات میں اس کی سرکار کے خراسانی، عراقی اور خطہ فارس کے دوستوں سے حاصل کیے تھے۔"

یہ اور اس قسم کے اعتراضات غالباً" مولوی صاحب نے مجھ کو بوجھے مارنے کے لیے کیے ہیں۔ وہی مثل کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ۔ جاٹ نے کہا تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو۔ تیلی نے کہا درست قافیہ تو ملا ہی نہیں۔ جاٹ نے جواب دیا قافیہ نہیں ملا تو کیا ہوا بچہ بوجھے تو ضرور مرو گے۔ اگر مولوی صاحب کا یہ منشا ہے کہ میں اس قسم کے اعتراضات کے کولھو کے نیچے بوجھے مروں اور ان کا اس سے کچھ دل خوش ہوتا ہے تو بسم اللہ میں تیار ہوں۔ ہم پنجابی ہیں۔ بوجھ اٹھانے میں بنگال، بہار اور گوپامو (کذا) والوں سے مضبوط ہیں ورنہ اگر مجھ سے سچ بات کہلوائی جائے گی تو صاف کہوں گا (مولوی صاحب معاف کریں) کہ یہ اعتراض طفلانہ ہیں اور اصلی بحث

بہت دور ہیں۔ میں اسی قدر کہوں گا کہ مخزن الغرائب سنہ ۱۲۱۸ھ میں تکمیل پاتا ہے اور ہے نجف خانی سبھا کا فیضِ صحبت۔ اگر مولوی صاحب اس بیان میں کوئی تناقض اور تضاد دیکھتے ہیں تو یہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے یہ دعویٰ کب کیا کہ سارے حالات میرزا نجف خاں کی حیات میں خراسانی اور عراقی دوستوں سے حاصل کیے تھے' جس کی مولوی صاحب نے اس زور و شور سے تردید کی ہے۔ میں نے تو اس سوال کو چھیڑا ہی نہیں اور اس کے متعلق اگر مولانا بے تاب ہیں تو میں پھر یہی کہوں گا کہ وہ اپنی اس قسم کی مشکلات کا حل صاحب مخزن الغرائب کے دیباچے سے کرسکتے ہیں جہاں اس غریب نے اپنے تمام ماخذوں کی فہرست دے دی ہے۔

"خراسانی' عراقی اور خطہ فارس کے دوستوں سے کیا خاص مدد ملی ہوگی کہ (بقول مولوی صاحب) اس کو کاغذات کے پرچوں پر علیحدہ علیحدہ لکھتا رہا۔"

اب میں اس کا کیا جواب دوں سوائے اس کے کہ پھر صاحب تذکرہ کے بیانات دہرادوں۔ احمد علی فرماتے ہیں :

"اکثر اشعار از زبان عزیزان خراسان و عراق و فارس گوش زد فقیر شدہ بود و برکاغذ پارہ ہا علیحدہ علیحدہ جمع آمدہ بود۔ خواستم کہ این ہمہ اشعار را فراہم ساختہ جہت مشغولی خاطر در قید بیاض آرم کہ صحبت بی نفاق (است) و بار بالفاق۔ استاذی افصح الفصحا و اکمل البلغا میرزا محمد حسن المتخلص بہ قتیل کہ واقعی کشتہ راہ دوست (است) .... فرمود کہ اشعار از ہر قسم فراہم شدہ اگر بطرز تذکرہ طریق تہجی رعایت کردہ آید چہ خوانندۂ این بآسانی ہر کدام شاعر را کہ بخواہد اشعارش بر آوردہ بخواند' بصواب نزدیک تر است۔ بحسب فرمودۂ آن وحید عصر این جواہر زواہر بطریق تہجی در رشتہ تحریر کشیدہ آمد۔"

اس لیے میں اس اعتراض کو بجنسہٖ مع شکریہ واپس کرتا ہوں۔

"مولوی صاحب نے مولانا شروانی کے اس بیان' نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں .... کے فیض صحبت کا نتیجہ یہ تذکرہ ہے' کی تائید فرمائی ہے اور میرے بیان' میرزا نجف خاں کی سرکار کا یہ فیض خاص نہیں' کی تردید میں اپنے دلائل پیش کیے ہیں لیکن ان کے دلائل اور طویل اقتباسات (کذا) سے صرف اتنا پتہ چلتا

ہے کہ مولف...... " وغیرہ وغیرہ

میں نے اس موقع پر مولوی صاحب کے کسی بیان کی تردید نہیں کی بلکہ مولانا شروانی اور خود مولوی صاحب کے بیانات کو آمنے سامنے رکھ کر خود تذکرہ کا بیان پڑھا اور اپنی طرف سے اس قدر اضافہ کیا ہے کہ مولف کے بیانات مولانا شروانی کے قول کے موید ہیں۔

اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مولف تذکرہ نے صرف ان معلومات پر، جو نجف خانی دور میں اس کے ہاتھ لگی تھی، قناعت کی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ، جیسا مصنفوں کا دستور ہے، احمد علی نے بھی "زھر گوشہ خوشہ یافتم" (کے مصداق) اپنی تلاش ہر سمت میں جاری رکھی اور ہر ذریعہ سے اپنا کام لیا۔ چنانچہ اپنے ایسے ماخذ کی اس نے علیحدہ تفصیل دے دی ہے اور کتابوں اور تذکروں وغیرہ کے نام دیباچے میں گنادیئے ہیں۔

میرے سامنے دو بیانات تھے ایک تو مولانا شروانی کا کہ "اسی فیض صحبت کا نتیجہ یہ تذکرہ ہے" دوسرے مولوی صاحب کا کہ "میرزا نجف خاں کی سرکار کا یہ فیض خاص نہیں۔ مولف خود کہتا ہے کہ نجف خاں کی وفات کے بعد اس نے یہ حالات فراہم کیے اور اپنے استاد میرزا قتیل کی فرمائش پر ان کو تذکرہ کی صورت میں ترتیب دیا۔"

میں نے مولف کے بیانات پڑھ کر اپنے ذہن میں یہ نتیجہ نکالا کہ مولوی صاحب کا پہلا بیان جو شروانی صاحب کے قول کی تردید کرتا ہے صحیح نہیں کیونکہ درحقیقت اس دور کا فیضان ضرور شامل ہے کیونکہ مصنف خود اس کا قائل ہے۔ مولوی صاحب کے دوسرے بیان کے متعلق مولف کچھ نہیں کہتا۔ مولوی صاحب کا تیسرا بیان کہ قتیل کی فرمائش پر تذکرے کی صورت میں ترتیب دیا، کسی قدر غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے کیونکہ مصنف کہتا ہے کہ میں اس مجموعے کو بیاض کی شکل میں ترتیب دینا چاہتا تھا لیکن قتیل نے کہا کہ بیاض کثرت کے ساتھ ملتی ہیں، اس کو تذکرے کی صورت میں ترتیب دو۔ اس سے ظاہر ہے کہ قتیل کا صرف مشورہ ہے نہ فرمائش۔ اس روشنی میں اگر میں شروانی صاحب کے قول کی تائید کروں تو میں نے کونسا ظلم کیا۔

(۵) میں مولوی صاحب کے اس بیان کو، کہ انہوں نے قتیل کا نام محمد حسن لکھا

اور کاتب نے محمد حسین بنادیا' ماننے کے لیے تیار ہوں' اگرچہ میں نے مولوی صاحب کا اصل مسودہ نہیں دیکھا ہے' لیکن مولوی صاحب نے کتابت کی جو اور غلطیاں دکھائی ہیں اس سے مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ "معارف" جیسا علمی رسالہ اس قدر غفلت سے ساتھ نکالا جائے کہ جس میں کاتب مصنف کا شریک غالب بن جائے۔

آگے چل کر قتیل کی استادی کے ذکر کے وقت مولوی صاحب نے لکھا ہے:

"مولوی صاحب صرف اسی تصحیح پر بس نہیں کرتے بلکہ میرے متعلق ایسا فقرہ بھی تحریر فرماتے ہیں جو شریعت تنقید میں ناجائز اور مذاق سلیم کے منافی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "اگر مولوی صاحب مرزا قتیل کے حالات پر' جو مولف نے اسی تذکرے میں بیان کیے ہیں' ایک نظر ڈال لیں گے تو یہ شبہ جس میں ان کے ساتھ ان کے انگریزی پیش رو بھی شریک ہیں' رفع ہوجائے گا۔"

میں ناظرین سے سوال کرتا ہوں کیا میرے اس جملے میں کوئی ایسا بیان ہے جو قانون نقادی کی رو سے ممنوع یا مذاق سلیم کے خلاف ہے؟ مولانا (نے) خیال ظاہر فرمایا ہے کہ میں نے یہ فقرہ ان کے "مضمون کی وقعت گھٹانے کے لیے" لکھا ہے لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں مولانا میرا مقصد غلط سمجھے۔ اگر میرے دل میں ان کے مضمون کی وقعت نہ ہوتی یا اس کو کافی دلچسپ نہ مانتا تو خود کیوں اسی مضمون پر خامہ فرسائی کرتا۔ رہا انگریزی پیش رووں کا سوال تو یہ کوئی ایسا گہرا راز نہیں ہے اور مولوی صاحب نے خدا جانے کیوں تجاہل عارفانہ اس موقع پر اختیار کیا ہے۔ ورنہ جب وہ ڈاکٹر پرلیش کی فہرست سے' جو کہ جرمن زبان میں لکھی گئی ہے' واقف ہیں تو کیا برٹش میوزیم کی فہرست کتب قلمی سے واقف نہیں ہوسکتے۔ اس فہرست میں ریو نے جہاں مصنف کو عزت الدولہ سہراب جنگ کا ملازم مانا ہے وہاں اس کو قتیل کا شاگرد بھی مانا ہے۔ سو اتفاق سے یہی دونوں باتیں مولوی صاحب کے مضمون میں بھی درج تھیں اس لیے میں نے دونوں جگہ "مولوی صاحب کے انگریزی پیش رو" والا فقرہ لکھ دیا۔ میں یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے یہ دونوں باتیں ریو سے لی ہیں۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ریو کو تو مولوی صاحب سے توارد ہوئی ہے۔

(۶) اسی نمبر میں مولوی صاحب نے حسین قلی خاں مصنف نشترِ عشق کے نام

میں غلطی کے متعلق، جس کا میں نے اپنے مضمون میں بسبیل تذکرہ ذکر کیا تھا، معارف کے کاتب کا قصور بتایا ہے، جس کو میں تسلیم کرتا ہوں۔

(۷) میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بوڈلین کتب خانہ کا نسخہ کیوں مولوی خدا بخش خان مرحوم کے نسخے سے فائق ہے۔ ان کے متعلق خود مولوی صاحب کا بیان اس قسم کا تھا کہ مجھ کو تعجب کا اظہار کرنا پڑا۔[۱]

اب جب کہ مولانا نے اس گتھی کو سلجھا دیا ہے، میں ان کے اس بیان کو تسلیم کرتا ہوں اور اپنا تعجب واپس لیتا ہوں۔ میں حیرت اسی لیے کر رہا تھا کہ نہ میں نے بوڈلین کتب خانہ کا نسخہ دیکھا ہے اور (نہ) خدا بخش مرحوم کا۔

(۸) یہاں سے گویا مولانی صاحب میری غلطیاں بلکہ بقول ان کے صریحی (کذا) غلطیاں، جن کا وہ تمہید میں ذکر کرچکے ہیں، بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ میری عبارت ذیل سب سے پہلے انھوں نے نقل کی ہے:

"پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی، پروفیسر اسلامیہ کالج، لاہور کا نسخہ، جو اس وقت میرے پیش نظر ہے، دارالمصنفین کے نسخے سے بھی قدیم ہے اور ابھی تک اس کو شرف اولیت حاصل ہے۔ اس نسخے کی تاریخ کتابت سنہ ۴۶ جلوس شاہ عالم مطابق سنہ ۱۲۱۹ھ اور مقام کتابت لکھنؤ ہے۔ ایک اور لحاظ سے بھی اس نسخے کو امتیاز حاصل ہے یعنی یہ کہ وہ مولف کے اصل مسودہ سے منقول معلوم ہوتا ہے اس میں بعض معاصرین کے حالات، جو اصل مسودہ میں شامل نہیں تھے، بعد میں حاشیہ پر اضافہ کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اصحاب قابل ذکر ہیں:

سید انشاء اللہ خاں انشاء، حضرت شاہ علی اکبر، میاں فرخ حسین حرمان، سید میر علی حریق، غلام فخر الدین خاں حیرت، مولوی مصطفیٰ علی خاں گوپاموی خوشدل، جواہر لال دبیر، حاجی عابد صفاہانی، سید تقی میر (شاعر مشہور)، لچھمی نرائن محبت، میرزا ابوالمعالی عالی وغیرہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسماء مصنف کی پہلی اشاعت سنہ ۱۲۱۸ھ میں، اگر درحقیقت اس وقت تک کوئی اشاعت ہوچکی تھی، داخل ہونے سے رہ گئے تھے

وہ اس نسخے میں اضافہ کردیے گئے۔"

یہ ایک صاف سا بیان ہے، لیکن مولانا محفوظ الحق صاحب نے ابتدا میں اس کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ : "مولوی صاحب نے مندرجہ بالا سطور میں چند در چند غلطیاں کی ہیں۔" گویا سماعت مقدمہ سے پیش تر سزا سنادی گئی ہے یا بقول انگریزوں کے گھوڑے کے آگے گاڑی کھڑی کردی ہے۔

(الف) ان چند در چند اور صریحی غلطیوں میں سب سے اقدم یہ ہے کہ میں نے مولوی مصطفیٰ علی خاں گوپاموی خوشدل تخلص کا نام بھی دیا تھا۔ اب "ہمایوں" کے کاتب اور مولوی محفوظ الحق صاحب نے بخوای یکی را دو کرو و دو را چار کرو، مصطفیٰ علی خاں خوشدل کی شان یکتائی کو گوارا نہ کرکے ان کی ذات واحد میں ثنویت قائم کردی۔ شکر ہے کہ ان کو اقانیم ثلاثہ میں تقسیم نہ کردیا گیا۔ لیکن مولوی صاحب نے کاتب صاحب ہمایوں سے سبقت لے جانے کی امید میں کفرو اسلام کی تقسیم کو مد نظر رکھتے ہوئے بے چارے مصطفیٰ علی خاں خوشدل کو ہندو اور مسلمانوں میں نصف نصف تقسیم کردیا۔ مولوی مصطفیٰ علی خاں کو مسلمانوں کے حوالے کردیا اور گوپاموی خوشدل کو ہندوؤں کے لیے محفوظ رکھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"انہوں نے مولوی مصطفیٰ علی خاں کے بعد ایک شخص گوپاموی خوشدل کا ذکر کیا ہے اور بظاہر نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ہندو بزرگ ہیں۔"

اور اب مجھ کو سبق دیا جاتا ہے کہ گوپاموی خوشدل کسی شخص کا نام نہیں بلکہ اس کے معنی ساکن گوپاموی کے ہیں۔ میں مولوی صاحب کے اس جدید انکشاف کا بے حد شکر گزار ہوں۔ مولانا ثبوت کے لیے قدرت اللہ کا نتائج الافکار پیش کرتے ہیں لیکن اگر وہ مخزن الغرائب ہی کو ملاحظہ فرمالیتے تو اس غلط فہمی سے بچ سکتے تھے۔ اس میں صاف مولوی مصطفیٰ علی خاں کا تخلص خوشدل لکھا ہے۔

(ب) ان چند در چند غلطیوں میں میری دوسری غلطی حسب ذیل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"دوسری غلطی یہ کہ مولوی صاحب نے جہاں اور معاصرین کا ذکر کیا ہے . . . . . منجملہ ان کے میرزا ابوالمعالی عالی کا بھی نام لیا ہے اور چونکہ ان کا نام میر (میر تقی) اور

محبت (لچھمی نرائن) کے بعد آیا ہے اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہی ابوالمعالی ہیں جن کا ذکر مولف تذکرہ نے حرف میم میں کیا ہے۔ اگر یہ واقعی وہی ابوالمعالی ہیں تو مولوی صاحب نے سخت غلطی کی ہے۔"

آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو میری اغلاط بتانے کا اس قدر جوش ہے کہ اگرچہ وہ میری موہومہ غلطی پر خود مطمئن نہیں ہیں تاہم اس کا شمار میری صریحی (کذا) غلطیوں میں کر رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایک عالم کا یہ رویہ ہونا چاہیے؟ ذرا ان الفاظ پر غور کیا جائے: "اگر یہ واقعی وہی ابوالمعالی ہیں تو ------ مولوی صاحب نے سخت غلطی کی ہے۔" مولوی صاحب بتانے چلے ہیں میری اغلاط لیکن اب شرطیہ جملوں پر اتر آئے ہیں۔ اب میں اپنی خطا کا اقرار کرتا ہوں اور ندامت کے ساتھ معترف ہوں کہ بے شک میری مراد اسی ابوالمعالی عالی سے ہے جس کا ذکر مولف نے حرف میم میں کیا ہے۔ مولوی صاحب میری یہ سخت غلطی اس طرح ثابت کرتے ہیں:

"یہ ابوالمعالی مولف تذکرہ کے معاصر نہ تھے کیونکہ ان کے حالات میں خود مولف مخزن الغرائب لکھتا ہے: میرزا ابوالمعالی مشہدی' شیخ محمد علی حزیں در تذکرۃ المعاصرین ذکر او نمودہ' ..... چونکہ تذکرۃ المعاصرین سنہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ وہ یعنی مرزا ابوالمعالی مخزن الغرائب کی تالیف سے کوئی ۵۳ سال قبل مرچکے تھے۔"

دیکھیے میں نے ابوالمعالی عالی کا ذکر کیا تھا اور مولوی صاحب نے میری تردید و تجہیل کے ذوق میں غریب مرزا ابوالمعالی مشہدی کو بے گناہ اور بے قصور پکڑ لیا اور پھر ستم ظریفی یہ کہ سارا الزام میرے سر تھوپ دیا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ کرے ڈاڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔ چنانچہ: "لیکن مولوی صاحب ان کو مولف مخزن الغرائب کے معاصروں میں داخل کرتے ہیں جو باعث حیرت ہے اس کے علاوہ ایک امر قابل غور یہ بھی ہے کہ مولف تذکرہ نے میرزا ابوالمعالی کے نام کے ساتھ عالی تخلص کا ذکر نہیں کیا اور نہ حزیں نے اپنے تذکرے میں ان کے تخلص کا ذکر کیا ہے لیکن مولوی صاحب اس ابوالمعالی کے ساتھ بھی عالی تخلص کا ذکر کرتے ہیں۔"

یک شد نہ دو شد یعنی اس احقر عبداللہ نے نہ صرف اس کو معاصر مانا بلکہ دوسری غلطی یہ کی کہ اس کے نام کے ساتھ عالی کا تخلص بھی اضافہ کردیا۔

بعد میں مولوی صاحب نے دو اور ابوالمعالیوں کا ذکر کیا ہے جن کا تخلص عالی ہے۔ ایک تو ابوالمعالی نیشاپوری اور دوسرے میرزا ابوالمعالی معروف بہ وزارت خاں۔

میں مولانا کو اس کدو کاوش کے ساتھ میری اغلاط کی فہرست کو مکمل کرنے پر مبارک باد دیتا ہوں اور ساتھ ہی تعجب کا اظہار کرتا ہوں کہ انہوں نے مخزن الغرائب (کے ہر) ابوالمعالی کی تلاش کرلی لیکن پھر بھی اصلی ابوالمعالی کا جو اسی کتاب کی فہرست ہی میں درج ہے اور جو مصنف کا معاصر بھی ہے' پتہ نہ لگاسکے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مولوی صاحب ان لوگوں میں سے نہیں جو کتاب سے بالشت بھر اونچی نظر رکھتے ہیں۔ اب میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ وہ دوبارہ مخزن الغرائب کو دیکھیں اور وہاں ابوالمعالی ان کو مل جائے گا۔ میں مختصراً اس کے بعض حالات ذیل میں حوالہ قلم کرتا ہوں۔[۳]

(ج) میری تیسری غلطی' جو کہ بقول مولوی صاحب نہایت سخت اور افسوس ناک ہے' یہ ہے کہ میں نے انشاء اللہ خاں اور میر تقی وغیرہم کے متعلق یہ کہا کہ ان کے حالات جو پہلی اشاعت سنہ ۱۲۱۸ھ میں' اگر درحقیقت اس وقت تک کوئی اشاعت ہوچکی تھی' داخل ہونے سے رہ گئے تھے' بعد میں اضافہ کیے۔ میری اس "اہم غلطی" کو مولوی صاحب (نے) ایک طویل بحث کے ذریعہ سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ (یہ) درحقیقت اس قابل نہ تھی کہ میرے مخدوم اس پر اپنا وقت ضائع کرتے کیونکہ اول تو یہ میری رائے ہے۔ دوسرے بحیثیت نقاد ان کا یہ بھی فرض تھا کہ پیش تر اس کے کہ میری تردید میں ساعی ہوتے' مخزن الغرائب کے اصلی نسخے کا سراغ لگاتے اور پھر اس کی رو سے مجھ کو قائل کرتے یا کم از کم اس نسخے کو' جو پروفیسر شیرانی کی ملک ہے' دیکھتے اس کے بعد اپنی رائے قائم کرتے۔ اب حالت یہ ہے کہ میرے مخدوم نے نہ احمد علی کے اصل نسخے کو دیکھا ہے اور نہ پروفیسر شیرانی کے نسخے کو لیکن تردید بغرض تردید کر رہے ہیں۔ وہ اپنے دلائل سے میری ایک مفروضہ غلطی کے طشت از بام کرنے میں ساعی ہیں حالانکہ اس تگ و دو میں ذرا سی سمجھ کی ضرورت ہے۔ ایک مصنف سنہ ۱۲۱۷ھ میں ایک مسودہ تیار کرتا ہے۔ کیا وہ اس کو دوسال بعد اپنی تصنیف

میں شامل نہیں کرسکتا؟ میں نے تذکرہ کی تاریخ ۱۲۱۸ھ کے متعلق کوئی سوال نہیں اٹھایا ہے لیکن اس سے یہ تو ناممکن نہیں ہوجاتا کہ احمد علی چند شعرا کے حالات اس کے دوسرے سال یعنی سنہ ۱۲۱۹ھ میں اضافہ کردے آخر ۱۲۱۸ھ اور ۱۲۱۹ھ میں فرق ہی کتنا سا رہ جاتا ہے؟ کم سے کم دو دن کا اور زائد سے (زائد) دو سال کا اور اس عرصہ میں ایسے ضخیم تذکرے کی' جیسا کہ مخزن الغرائب ہے' بیسیوں نقول تیار نہیں کی جاسکتیں۔ مصنف ان ایام میں میرزا زین العابدین کا ملازم اور لکھنؤ میں مقیم ہے اور لکھنؤ ہی میں پروفیسر شیرانی کا یہ نسخہ تیار ہوا ہے۔ بعض معاصرین کے حالات جو حاشیہ میں ملتے ہیں' اگر وہ اصل نسخے میں تھے تو میں پوچھتا ہوں کہ اس نسخے میں حاشیے پر کیوں ہیں؟ کیا کاتب ایسے ہی لوگوں کے ذکر کے لکھنے میں' جو مصنف کے ہم عصر ہیں' ہر ہر جگہ نقل کے وقت دو دو ورق لوٹ گیا؟ پھر یہ حالات بھی طویل ہیں مثلاً انشاء اللہ خاں کے پورے تین صفحوں کے حاشیوں پر ہیں۔ پھر یہ حالات کاتب کے قلم سے نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے خط میں جو اگرچہ پختہ اور کاتب کے خط سے بہتر ہے پھر بھی نستعلیق نہیں ہے۔ اس کتاب میں موقع موقع پر خود متن میں جگہ چھوڑی گئی ہے۔ بعض جگہ کسی غیر قلم میں وہ جگہ پر کردی گئی ہے اور بعض جگہ ابھی تک خالی ہے۔ بعض موقعوں پر کاتب کوہدایت کی گئی ہے کہ یہاں جگہ چھوڑ دے مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ یہاں دس سطروں کی جگہ چھوڑ دیں۔ بے شمار موقعے ایسے موجود ہیں جہاں شاعر کے حالات میں مزید اضافے کیے گئے ہیں جن کو کوئی سمجھ دار آدمی کاتب کی فروگزاشت کے نام سے یاد نہیں کرسکتا بلکہ ان اضافوں کا صحیح منشا متن میں مزید اضافہ اور اس کی ترقی ہے مثلاً اثیرالدین اخسیکتی کے حالات متن میں یوں لکھے ہیں:

"اثیرالدین اخسیکتی۔ وی از شعرای اساتذہ است و باخاقانی معاصر و معارض است۔ از وست۔"

لیکن اخسیکتی پر ۱۲ کا ہندسہ ڈال کر حاشیے پر یہ اضافہ کردیا:

"از شہرستان فرغانہ ماورا النہر بودہ"

اسی طرح اثیرالدین ابہری کے واسطے متن میں لکھا ہے:

"اثیرالدین ابہری از حکماء عصر خود بودہ تصانیف عالی در حکمت دارد۔ ازوست۔"

لیکن اس نسخے میں اثیرالدین کے نام کے اوپر کسی اور قلم میں بین السطور لکھا ہے۔ "اسمہ مفضل بن عباس" اور "از وست" سے پہلے ۱۲ کا ہندسہ ڈال کر اسی قلم سے لکھا ہے:

"کتاب کشف و بیان و ھدایہ از جملہ تصانیف اوست۔"

مولوی صاحب اس قسم کے اضافوں کو کاتب کی فروگذاشت کہیں گے لیکن میں اس بارے میں ایسے لوگوں کی رائے کا متبع ہوں جو ان چیزوں کے متعلق مولوی صاحب سے بہتر تجربہ رکھتے ہیں۔ میں یہاں بعض اور مثالیں دیتا ہوں:

میر سید علی مصور کے واسطے متن میں یہ عبارت ہے:

"میر سید علی مصور جدائی تخلص شاعر نیکو بیانست در عہد اکبر بادشاہ در ھند بودہ شیخ عبدالقادر بدایونی ذکر وی را کردہ این چند بیت از وست۔"

لیکن "ذکر وی را کردہ" پر سرخ روشنائی سے قلم پھیر کر حاشیے پر لکھا ہے:

"گوید کہ حیثیات بسیار دارد۔ بر صفحہ تصویر وی کارنامہ ایست و در ھندوستان ثانی مانی بودہ و قصہ امیر حمزہ در شانزدہ جلد مصور باھتمام وی اتمام یافتہ ھر جلدی صد ورق و ھر ورقی یک ذرع و در ھر صفحہ صورتی میر دیوانی تمام کردہ۔"

اس کے بعد متن میں تین شعر لکھ کر اور آخری شعر کے خاتمے میں ۱۳ کا ہندسہ ڈال کر حاشیہ میں برابر ہی ایک شعر لکھ دیا۔ اسی شعر کے آخر میں پھر ۱۴ کا ہندسہ ڈال کر دوسرے مقام پر دو اور شعر لکھے ہیں۔

"جدائی" کے بعد ہی بادشاہ قلی جذبی کا نام آتا ہے اور آٹھ اشعار کلام کے نمونے میں دیئے ہیں۔ اس کے بعد "جذبی مذکور" حاشیے پر سرخ روشنائی میں لکھ کر تین شعر اور دیئے ہیں۔ اب دوسری جگہ "تتمہ جذبی مذکور" دے کر دو اور شعر لکھ دیئے ہیں۔

اس قسم کی سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ متن کی اصلاح اور ترقی منظور ہے۔ کاتب سے جو فروگذاشتیں ہیں وہ علیحدہ ہیں لیکن اس بحث کے ختم کرنے کے لیے میں اس قدر کہتا ہوں کہ پروفیسر شیرانی کا نسخہ ایک اور نسخے سے' جو غالباً" اصل ہوگا' منقول ہے کیونکہ ابتدا میں تمام ایسے شعرا کی' جو متن میں مذکور ہیں' فہرست دے دی گئی ہے لیکن ایسے شعرا جن کا ذکر حاشیے پر آتا ہے' اکثر

ایسے ہیں جن کا نام فہرست میں شامل نہیں۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ اضافے اس نسخے کے اصل نسخے سے نقل کیے جانے کے بعد کیے گئے ہیں۔ جس اصل سے یہ نسخہ منقول ہے۔ اس میں قریباً" تین ہزار شعرا کا ذکر تھا جب کہ موجودہ نسخے کی فہرست میں کل نام تین ہزار چھیاسٹھ ہیں۔ نیز حاشیے پر جن شعرا کا ذکر ہے ان کے نام اکثر کر کے فہرست میں داخل نہیں ہیں۔ چنانچہ نہ انشاء اللہ خاں کا نام فہرست میں شامل ہے اور نہ میر تقی میر کا' نہ شاہ علی اکبر کا' نہ مولوی مصطفیٰ علی خاں گوپاموی خوشدل کا' نہ دبیر کا۔ یہی نہیں بلکہ صرف ردیف "حا" میں اس قدر لوگوں کے نام بعد میں غیر قلم سے اضافہ ہوئے ہیں:

میاں فرخ حسین حرمان' سید میر علی حریق' غلام محی الدین خاں حیرت' شیخ محمود حیراں' حب' حقیقی' محمد رستم حیرت' حسرت سندیلی' میرزا اسمٰعیل حجاب' شبورام حیا' محمد علی حشمت' شاہ حیرت' ذوقی رام حسرت۔

(۹) اس نمبر کے متعلق مجھ کو کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ میں خادم کے اشعار کے لیے محفوظ الحق صاحب کا شکر گزار ہوں اگرچہ میں خادم کی شاعری کا چنداں قائل نہیں ہوا جیسا کہ اس سے پیش تر اس کی نثر نویسی کے نمونوں سے۔

(۱۰) میں اس نمبر کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن مولوی صاحب کے ایک جملے: "اور غالباً" مولوی صاحب بھی میرے ہم نوا ہیں" نے مجھ کو کچھ کہنے پر مجبور کیا ہے۔ میرے مخدوم نے مجھ کو ناحق اپنا ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"آخر میں ایک ایسے امر کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں جو خاص اہمیت رکھتا ہے یعنی یہ کہ فارسی کا سب سے ضخیم تذکرہ کون (کذا) ہے۔ مولانا شروانی کا خیال ہے کہ وہ مخزن الغرائب ہے اور خود میرا بھی یہی خیال تھا اور غالباً" مولوی صاحب بھی میرے ہم نوا ہیں لیکن میں ناظرین کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ مخزن الغرائب سب سے ضخیم تذکرہ نہیں ہے بلکہ صحف ابراہیم مولفہ نواب علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی ہے..... جس میں بقول ڈاکٹر برش ۳۲۷۸ شعرا کا حال موجود ہے...... تذکرہ مخزن الغرائب میں ۳۱۴۸ شعرا کا حال درج

ہے۔ اس لیے (اول الذکر) میں ۱۳۰ شعرا کے حالات زیادہ ہیں۔"

اگرچہ ہم ابھی تک ضخیم ترین تذکرے کے وجود سے واقف نہیں ہیں لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ "صحف ابراہیم" کے مقابلے میں قاضی محمد صادق خاں اختر کے تذکرہ "آفتاب عالم تاب" کا دعویٰ غالباً" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے جو سنہ ۱۲۳۸ھ میں شروع ہوتا ہے اور ۱۲۶۹ھ میں ختم ہوتا ہے اور جس میں ۴۲۶۸ شعرا کا حال مذکور ہے۔ اگر اس تعداد میں دس شعرا کا حال اور زیادہ ہوتا تو اس تذکرے میں "صحف ابراہیم" کے مقابلے میں پورے ایک ہزار شعرا کا ذکر زیادہ ہوتا۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قاضی محمد صادق اختر، صاحب مخزن الغرائب کے مقابلے میں بے حد فاضل شخص ہے۔

حواشی

(۱) محفوظ الحق صاحب کے بیان کو محتاط الفاظ میں بھی غیر محتاط کہا جاسکتا ہے۔ ایک ہی سال میں کتابت شدہ دو مخطوطوں کی مثال جڑواں بھائیوں کی سی ہوتی ہے لیکن مولوی صاحب کا انداز بیان ملاحظہ کیجیے:

"ایک نسخہ مولوی خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانہ میں ہے لیکن وہ چنداں قدیم نہیں برٹش میوزیم (لندن) کا نسخہ بھی پرانا نہیں البتہ بوڈلین لائبریری کا نسخہ دارا مصنّفین سے دوسرے درجے پر ہے۔"

اور صورت احوال یہ ہے کہ جو نسخہ "چنداں قدیم نہیں" وہ شوال ۱۲۲۴ھ کا مرقومہ ہے اور جو قدیم ہے وہ صفر ۱۲۲۴ھ کا اور یہ آٹھ ماہ کا فرق زیر بحث تذکرے کی ضخامت کے پیش نظر اور بھی غیر اہم ہوجاتا ہے۔ (مرتب)

(۲) اس مقام پر مسودہ میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ (مرتب)

حصۂ دوم

شخصیات

مخدوم شیخ بہاء الدین برناوی

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت اگست ۱۹۲۷ء ،
نومبر ۱۹۲۷ء و اگست ۱۹۲۹ء)

مخدوم شیخ بہاء الدین ان چند نامور بزرگوں میں سے ہیں، جنہوں نے فن موسیقی میں غیر معمولی کمال پیدا کیا ہے۔ مسلمانوں میں اگر امیر خسرو دہلوی کو اس فن کا موجد قرار دیا جائے تو مخدوم بہاء الدین قطعاً" اس کے خاتم ہیں۔ تعجب ہے کہ تاریخ میں ان کو کوئی شہرت حاصل نہیں، البتہ موسیقی نگاروں میں فقیر اللہ اپنی تصنیف "راگ درپن" میں ان کا نام نامی سب سے پہلے ذکر کرتا ہے اور پورے ایک ورق میں ان کے حالات دیتا ہے۔ ذیل کی سطور "کتاب چشتیہ[1]" کے بیانات پر مبنی ہیں، جو حضرت علاالدین ثانی برناوی (سنہ ۱۰۰۷ و ۱۰۸۸ھ) کی تصنیف ہے، جس کا ایک نسخہ غالباً" بخط مصنف سنہ ۱۰۶۶ھ کا نوشتہ ایک گم نام حالت میں راقم تک پہنچا ہے۔ پیشتر اس کے کہ مخدوم کے حالات ہدیہ ناظرین کیے جائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خانوادۂ برناوہ کے بعض مختصر حالات تاریخی دلچسپی کی غرض سے یہاں درج کردیئے جائیں۔

قرن ہفتم ہجری میں خواجہ ابو منصور برادر حقیقی شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کی اولاد سے ایک قبیلہ ہرات سے ترک وطن کرکے جنگ و غزوات کے سلسلے میں ہندوستان وارد ہوگیا اور پانی پت سے چالیس کوس کے فاصلے پر قریہ سرسل میں آباد ہوگیا۔ ان ایام میں مسلمانوں کی ہندوستان میں بہت کم آبادیاں تھیں اور قریہ سرسل سے لے کر پانی پت یا میرٹھ تک درمیان میں کہیں کوئی مسلمان بستی موجود نہ تھی۔ سرسل ایک وسیع اور بلند مقام پر واقع تھا اور یہ مہاجر انصاری یہیں آباد ہوگئے۔ ان نو آباد کاروں

نے اپنے دینی جوش، علمی روایات اور زہد و اتقا کے اثرات سے بہت جلد اس بستی کو ایک مسلمان قصبے کی صورت میں بدل دیا۔ جمعہ کی نماز میں سات سو نو سو کے درمیان نمازی موجود ہوا کرتے تھے۔ ان انصاریوں میں پہلے سربر آوردہ شخص حضرت خواجہ جلال ابن خواجہ اسلم ہیں، جن کے حالات سے ہم واقف نہیں۔ اسی قدر علم ہے کہ جہانگیر کے عہد تک ان کی پختہ قبر، چونے کے کام کی مزجج، جس پر آیات قرآن پاک منقوش تھیں، موجود تھی اور خلق اللہ اس کی زیارت کو جاتی تھی۔ خواجہ جلال الدین کی چھٹی پشت میں خواجہ شرف الدین انصاریوں کے سرسل سے ہجرت کرجانے کی بنا پر دہلی جاکر بس گئے، خواجہ بے حد مالدار تھے اور اپنی دولت مندی کے لیے ضرب المثل تھے۔ اس وقت ان کے فرزند حضرت مخدوم شیخ بدرالدین بہت کم عمر تھے۔ خواجہ بدرالدین نے دہلی میں تعلیم پائی اور علوم نقلیہ و عقلیہ سے فارغ ہوکر منارۂ شمسی کے قریب ایک مدرسہ بنالیا اور وہیں طلبہ کو درس دینے لگے۔ حضرت مخدوم ان طالب علموں کے جمیع مایحتاج، کھانا، لباس وغیرہ وغیرہ ضروریات کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح تیس سال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے وعظ کے لیے دربار میں دعوت دی۔ حضرت مخدوم تشریف لے گئے اور وعظ فرمانے لگے۔ اس اثنا میں ایسا اتفاق ہوا کہ ایک جلیل القدر ہندو خودمختار مہاراجہ نے، جس سے بادشاہ بھی سیاسی حالات کی بنا پر دوستی کا خواہش مند تھا، اپنا سفیر مع قیمتی تحائف کے روانہ کیا۔ سفیر دربار میں حاضر ہوا۔ یہاں حضرت مخدوم کا وعظ ہورہا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ بادشاہ تک اس کی آمد کی اطلاع پہنچاتا۔ عرصے تک منتظر رہا۔ آخر بیتاب ہوگیا۔ عرض بیگی نے زیادہ وقفہ مناسب نہ سمجھ کر سفیر کی اطلاع سلطان کے گوش گزار کردی۔ سلطان نے عین مجلس وعظ میں ایلچی کو بلالیا اور تحفوں کا معائنہ ہونے لگا۔ حضرت مخدوم نے اپنا وعظ بند کردیا اور کاغذ کے پرچہ پر آیت پاک **"قل متاع الدنیا قلیل"** لکھ کر چلتے بنے۔ بادشاہ نے پیش کش کے معائنے کے بعد پھر وعظ کے جاری رکھنے کی خواہش کی لیکن حضرت مخدوم تشریف لے جاچکے تھے۔ اتنے میں کاغذ کے پرچے پر نظر پڑی۔ سلطان نے وہ آیت پاک پڑھی اور بے حد شرمندہ ہوا۔ حضرت مخدوم بدرالدین، حضرت مخدوم شیخ نصیرالدین محمود اودھی چراغ دہلی کے مرید بن گئے۔ انہی سے آپ کو

خرقہ خلافت اور لقب "صاحب ولایت" ملا اور کچھ عرصے کے بعد آپ کو برناوہ کی طرف جانے کا حکم ملا اور لاکھ منڈپ کے ٹیلے پر آپ نے قیام فرمایا۔ برناوہ ان ایام میں ویران پڑا تھا لیکن قصبہ ریاپئی' جس کو کھوانی بھی کہا جاتا ہے اور ٹیلہ مذکور کے شرقی جانب دریائے ہینڈن پر واقع ہے' موجود تھا۔ اس میں رنگھڑ راجپوتوں کی آبادی تھی اور پیشہ کاشتکاری تھا۔ انہوں نے آپ کا نام "اتیت ترک جوگی" رکھ دیا۔ یہ راجپوت رات دن آپ کو مصروف عبادات و ریاضات دیکھتے اور حیران رہتے کہ آپ کے کھانے پینے کا انتظام کہاں سے ہوتا ہے۔

ایک دن راجپوتوں نے صاحب ولایت کی خدمت میں کچھ خربوزے ایک نائی کی معرفت بھیجے۔ حجام نے راستے میں خیانت کی اور بعض اچھے اچھے خربوزے کیکر کے نیچے پتوں میں چھپادیئے اور باقی خربوزے لے کر خدمت میں پہنچا آپ نے دیکھتے ہی اسے فرمایا کہ بھائی تم جو خربوزے کیکر کے نیچے چھپا آئے ہو ان کے کھانے کے لیے ایک گیدڑ پہنچ گیا ہے لیکن چونکہ ایک کالی گائے اسی مقام پر چرتی چرتی آگئی ہے اس لیے وہ خربوزے اب تک بچ گئے ہیں۔ تم بہت جلد واپس لوٹو اور اپنے خربوزوں کو بچاؤ اور یہ چند عدد خربوزے جو ہمارے لیے لائے ہو انہیں بھی واپس لے جاؤ۔ حجام کانپتا ہوا خدمت سے رخصت ہوا اور جب کیکر کے پاس پہنچا تو دیکھتا ہے کہ فی الواقعہ ایک گائے اور ایک گیدڑ موجود ہیں۔ صاحب ولایت کی اس کرامت سے نائی بہت مرعوب ہوا اور گاؤں پہنچ کر تمام ماجرا بلاکم و کاست ان رنگھڑوں کو سنادیا۔ اس دن سے رنگھڑ جیسی سرکش قوم آپ کی معتقد ہوگئی اور کئی ان میں سے ایمان بھی لے آئے۔ ان ایام میں ان اطراف میں آبادی کم تھی اور جنگل جھاڑیوں کی کثرت تھی۔ گنوار اکثر لوٹ مار بھی کرلیا کرتے تھے' جس میں مویشیوں کے گلہ کی چوری نہایت عام تھی۔ رنگھڑوں نے صاحب ولایت سے آکر عرض کی کہ راہزن ہمارے مویشی گھیر لے گئے ہیں۔ حضور ہماری فریاد سنیں اور ان جانوروں کو واپس منگوادیں۔ آپ نے براہ مذاق فرمایا کہ اگر تمہارے جانور واپس آگئے تو ہمیں کیا دو گے۔ رنگھڑوں نے عرض کی' ہم تمام مویشی نذر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے جواب دیا یہ تعداد تو بہت کثیر ہے۔ رنگھڑوں نے کہا' اچھا نصف منظور کرلیجئے۔ آپ نے فرمایا' تمہاری بساط سے

زیادہ ہے۔ اس پر انہوں نے کہا' اچھا ربع' سدس یا عشر منظور فرمالیں لیکن آپ بدستور انکار فرماتے رہے۔ آخر فیصلہ اس بات پر ہوا کہ رنگھڑ تھوڑی سی چھاچھ بھیج دیا کریں۔ قصہ مختصر جب یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تو دیکھا کہ ان کے تمام مویشی پہلے سے گھر پہنچ چکے تھے۔

مخدوم صاحب ولایت شیخ بدرالدین ۷۸۸ھ میں (کذا) وفات پاتے ہیں۔ شیخ نصیرالدین بزرگ آپ کے جانشین ہوتے ہیں' جو برناوہ سے شرق کی طرف ہجرت کرکے شیخوپورہ راپڑی[۲] چلے جاتے ہیں۔ ان کے آنے کے بعد پرگنہ برناوہ اور دیگر قصبات و قریات موقوعہ دو آب کو لشکر مغل[۳] آکر لوٹ لیتا ہے اور مخلوق کو ہلاک کرتا ہے۔ جب شیخ قریہ پاڈھم من اعمال پرگنہ چنوار پہنچتے ہیں' آپ کی والدہ انتقال کرتی ہیں۔ ان ایام میں چنوار کا مالک ایک راجہ تھا۔

شیخ ابھی پاڈھم میں مقیم تھے کہ ان کی ملاقات حسن خاں دوتانی سے ہوگئی' جو اس عہد کا سربرآوردہ اور طاقت ور افغان رئیس تھا اور سلطان علاء الدین[۴] بدایونی کا امیر تھا۔ قصہ یہ ہے کہ شیخ کے پاس ایک پرانا قوال تھا۔ جو حسن خاں دوتانی کے ہاں بھی کسی زمانے میں رہ چکا تھا اور حسن خاں کو اس کی آواز بڑی پسند تھی۔ قوال مذکور شیخ کے ہمراہ تھا۔ قوال نے اپنے مخدوم زادے کی خدمت کے خیال سے حسن خاں کے دربار کا رخ کیا' جو اب نہایت طاقت ور رئیس تھا۔ جب وہ خاں کے در دولت پر پہنچا' حسن خاں محل میں تشریف رکھتا تھا اور اندر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ مفلوک اور شکستہ حال قوال کا پیغام خان کے کانوں تک پہنچانے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ قوال جب خان کے ملازمین سے درخواست کرتے کرتے دق آگیا' اس وقت ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے فوراً اپنا ساز سنبھالا اور اس کے ساتھ ساتھ خان کی مدح و ثنا میں بلند آوازی کے ساتھ اشعار گانے لگا۔ حسن خاں نے وہ اشعار سنے' اپنے پرانے قوال کی آواز پہچان لی اور بے تاب ہوکر پا برہنہ محل سے باہر نکل آیا۔ قوال کو اپنی چھاتی سے لگا لیا اس کی بے حد دل جوئی کی اور ساری کیفیت استفسار کی۔ قوال نے برناوہ سے اپنے مخدوم زادے کی ہجرت اور بے سروسامانی کا تمام قصہ بیان کیا۔ حسن خاں مخدوم بزرگ کی ملاقات کا اس قدر مشتاق ہوا کہ خود قریہ پاڈھم پہنچا۔ شیخ

سے ملا اور اصرار کر کے تمام قافلے کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ اپنا مہمان رکھا۔ شیخ کے لیے خانقاہ تعمیر کروی اور بہت سے دیہات خانقاہ کے اخراجات کے لیے وقف کر دیئے۔ شیخ اور ان کے متعلقین کے لیے علیحدہ عمارات تعمیر کروادیں۔

شیخ نصیرالدین ایک بہت بڑے کتب خانے کے مالک تھے' جو تین لاکھ تنکہ میں خریدا گیا تھا۔ ان کے جانشین ان کے فرزند حضرت مخدوم شیخ علاء الدین بزرگ ہوتے ہیں۔ ان کے دو فرزند ہوئے۔

(۱) مخدوم شیخ پیر بودھن۔ (۲) مخدوم شیخ نظام بودھن۔

سلطان غیاث الدین خلجی والی مالوہ شیخ کا مرید تھا۔ شیخ پیر بودھن اپنی شہ زوری کے لیے مشہور تھے۔ پہلوان بھی مشکل سے ان کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ تیراندازی میں بے نظیر تھے۔ شکار کا بے حد شوق تھا۔ قادر انداز اتنے بڑے کہ جانور کے جسم پر جہاں چاہتے تیر مارتے۔ قوت شامہ اس قدر تیز تھی کہ خوشبو کی مرکبات کے اجزا علیحدہ علیحدہ بتاسکتے تھے۔ سلطان حسین شرقی ان کا مرید خاص تھا۔ خود شیخ نئے نئے مرکبات ایجاد کرتے۔ ان کا کارخانہ بھی شاہانہ تھا۔ سلطان حسین شرقی کو خوشبویات اور سرود سے بے حد محبت تھی۔ جب کوئی نیا غالیہ تیار کرتا یا عطر تیار کرتا' "تحفتہ" شیخ کی خدمت میں بھیجتا اور شیخ پیر اپنی سرکار کے جدید عطریات سلطان کے پاس بھیجتے۔ علی ہذا سلطان اپنے دربار کے اعلیٰ گویوں کو' جو فن مزمار و موسیقار میں یگانہ ہوتے' شیخ کی خدمت میں روانہ کرتا۔ علی ہذا اپنے تصنیف کردہ خیال اور چٹکلے جو مقبول عام ہوتے ان پر شیخ کی رائے طلب کرتا اور اکثر اوقات جانبین میں یہ رسل و رسائل اور مراسلات کشتیوں کے ذریعہ سے ہوا کرتی تھی۔

آنحضرت کو سماع کا شوق بہ وجہ خانوادۂ چشتیہ کا رکن ہونے کی کثیر تھا اور اکثر اوقات قول و ترانہ' بطریق مشایخانہ' امیر خسرو کی ایجاد کے موافق سنتے تھے۔ عبادت سے فراغت کے اوقات میں یا عرسوں کے موقعوں پر اکثر سماع ہوتا تھا۔ دکن کے نایک اور کلاونت اکثر جمع ہوتے تھے' جو اپنے رسیلے سروں میں ہر قسم کے پربند اور اقسام سنگیت مثلاً جھومرہ' دھوہ' چترنگ' سرسارتھ' ماٹھ' چندرپرکاس' سورج پرکاس اور دیگر اقسام کے گیت اور ہر طرح کے چند' دھرو' اصول موسیقی اور شاستر کے مطابق

سنسکرت زبان میں سناتے۔ اوروں کی طرح یہ فرقہ بھی اپنی باری میں اپنا اپنا کمال دکھاتا۔ ان ایام میں دھرپد کا، جو تغنی میں آسانی اور مضمون میں سہولت معانی کی بنا پر، ہمارے اس دور جہالت و نادانی میں، جب کہ لوگوں کو مشکلات فن کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے، مقبول و مشہور ہوگیا ہے، چنداں رواج عام نہ تھا۔ جکری (ذکری) جس کے مضامین زیادہ تر بزرگوں اور پیروں کی مدح میں ہوتے ہیں، دہلی کے قوال اپنے سرود و رود میں اور جونپور کے گوینده فرودستی پردے میں گاتے تھے۔ اس جماعت کے لوگ سرکار میں موجود تھے۔ قطب خاں بن حسن خاں دوتانی اس خاندان کا مرید اور موسیقی کا شیدا تھا، اس لیے بڑے بڑے گویے دور دور سے کھنچ کر یہاں جمع ہوتے تھے اور بلدۂ راپڑی مطربوں، قوالوں وغیرہم کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ یہ قوم، جسے عرف عام میں آج کل ''چوکھہ'' کہا جاتا ہے، قطب خاں دوتانی کے میراثیوں کے اولاد میں ہیں، جن کے بزرگ خان موصوف کی داد و دہش کے اوصاف سن کر دکن سے یہاں آئے اور چونکہ اپنے فن میں کامل تھے، قطب خاں کے اشارے سے قدیمی گویوں پر غالب آگئے۔ بعض کا یہ بیان ہے کہ چوکھے، قطب خاں کے قدیمی گویے ہیں، جو تازہ واردوں پر غالب آگئے۔ قطب خاں نے دل کھول کر ان پر انعامات و احسانات کا مینہ برسایا، خلعت اور جاگیریں دیں اور ہر طرح دل جوئی کرکے ان کو راپڑی میں آباد کرلیا۔ اس وقت یہ چوکھے بت پرست اور زنار دار ہندو تھے۔ مخدوم شیخ پیر کی برکت صحبت سے حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ ایام کفر میں ان کے نام ایسے ہوتے تھے، مثلاً پہپ داس وغیرہ۔ ان کے چوکھہ کہلائے جانے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ غسل کرکے اور صاف لباس پہن کر حاضر ہوئے اور اسلام لانے کی نیت سے کلمہ شہادت پڑھا، حضرت مخدوم پیر نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد کیا کہ اب تم چوکھے ہوگئے اور کفر و شرک کی پلیدی تم سے دور ہوگئی۔ الغرض اس قوم کا نام اس روز سے چوکھہ پڑگیا اور اب بھی اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔

مشہور پارچہ باف حافن اسی عہد میں گزرا ہے۔ چونکہ حضرت مخدوم پیر کا مرید تھا اس لیے ہر سال ایک تھان آپ کی نذر کے لیے بھیجتا تھا۔ اس کا کپڑا سبکی، لطافت، باریکی، نرمی اور صفائی کے لحاظ سے مافوق التصور تھا۔ انسان خواہ کتنا ہی غور کرتا۔ اس

کے تار و پود میں تمیز کرنی مشکل تھی۔ حافن صنعت بافندگی میں سب پر گوئے سبقت لے گیا تھا۔ سال بھر میں وہ صرف دو تھان تیار کرتا تھا۔ پہلا پیر کی خدمت میں ارسال کرتا اور دوسرا بادشاہ کی خدمت میں روانہ کرتا اور ان دو تھانوں کے معاوضے سے پورے سال بھر خوش وقتی سے گزران کرتا۔ خوشبوؤں میں انہوں نے ایسے ایسے نادر عطر تیار کیے جن کا داغ کپڑوں پر نہیں آتا۔ ان کی سرکار میں بیسیوں چیزیں جو عجائبات سے مانی گئی تھیں مثلاً چوب عود' عنبر اشہب قسم اعلیٰ جس کا ایک شامہ پانچ ہزار قیمت پاتا ہے اور صرف سلاطین کے خزانوں میں مل سکتا ہے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جب شکار کو جاتے ایک ہی قسم کا جانور اس روز شکار کرتے۔ مثلاً ہرن مارنے شروع کیے ہیں تو ہرن ہی ہرن مارتے۔ دوسرے دن اگر نیلوں کا ارادہ کرلیا ہے تو نیل ہی نیل مارتے۔

جب سلطان علاء الدین بدایونی ضعیف ہوگیا' اس کے غلام نے' جو اس کا وزیر تھا' فریب کرکے بہلول کو سلطان بنادیا اور بہلول کچھ عرصے کے بعد بنگال جاکر مرگیا۔ بہلول نے قطب خاں بن حسن خاں دوتانی کو اپنے منصب پر برقرار رکھا۔ اس کو چچا کے نام سے یاد کرتا تھا۔ پرگنہ راپڑی و چنوار(۵) اس کی جاگیر میں مقرر کردیئے۔ قطب خاں ایک عرصے تک نہایت امن کے ساتھ ریاست کرکے وفات پاگیا۔ اس کے انتقال پر بھدوریہ راجپوتوں نے راپڑی میں فساد مچادیا اور عاصی ہوگئے۔ قطب خاں کے فرزند جو لائق و منتظم تھے' مثلاً مون خاں و تاتار خاں' راجپوتوں سے جنگ کرکے شہید ہوگئے۔ ما.تی چونکہ سلطان سکندر لودھی کے جلوس پر حاضر دربار نہیں ہوئے تھے اس لیے سلطان نے جاگیر و صوبہ داری ان سے لے کر خانخاناں نوہانی کو مرحمت کردی۔ جب خانخاناں راپڑی پر قبضہ کرنے آیا۔ فرید خاں نبیرۂ قطب خاں دوتانی عاصی بن کر قلعہ بند ہوگیا۔ حضرت مخدوم اور آپ کے تمام متعلقین بھی قلعہ میں تھے۔ فرید خاں کچھ عرصے کے بعد قلعہ خالی کرکے چل دیا۔ حضرت مخدوم شیخ پیر نے افغانوں کی بے رحمی' قتل و غارت' حبس و بند کا خیال کرکے قلعہ کا حوالے کرنا مناسب نہ سمجھا۔ محاصرہ برابر چھ ماہ تک اور قائم رہا۔ اس عرصے میں محصورین نے اپنی ثابت قدمی اور استقلال کا شاندار ثبوت دیا۔ آخر طرفین میں صلح ہوگئی اور قلعہ خانخاناں کے حوالے کردیا گیا۔ حضرت شیخ نے راپڑی سے مہاجرت کرکے واپس ہرات جانے کا قصد کیا لیکن جب

سلطان سکندر کو یہ واقعات معلوم ہوئے تو حضرت شیخ کی ہجرت میں اپنی بدنامی تصور کرکے بعض امرا کو حضرت مخدوم کو واپس لانے کے لیے مقرر کیا۔ ان میں ملک ادریس جلوانی اس خاندان کا بے حد معتقد تھا۔ سنبھل سے سرہند تک تمام علاقہ اس کی جاگیراور صوبہ داری میں تھا۔ اس نے قصبہ مبارک آباد عرف برناوہ میں اپنا تھانہ مقرر کیا تھا اور یہیں اس نے اپنی اقامتی عمارات تیار کی تھیں۔ چنانچہ ملک موصوف خود آیا۔ اس وقت حضرت سنبھل تک جاچکے تھے۔ خان موصوف نے اس قدر عجز و انکسار' خوشامد اور چاپلوسی سے کام لیا کہ حضرت پیر برناوہ آنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ آپ جب برناوہ پہنچ گئے' خان نے اپنے تمام ذاتی مکانات و عمارات خالی کرکے حضرت مخدوم کے نذر کردیں اور خود اپنے عیال و اطفال و خدم و حشم سمیت خیموں میں رہنے لگا۔ برناوہ اولا" ٹیلے پر آباد تھا لیکن جب تیموری لشکروں نے اس کو غارت کردیا' ایک عرصے تک ویران پڑا رہا۔ بعد میں یہ قصبہ بلندی سے ہٹ کر نشیب میں آباد ہوا اور اس کا نام مبارک آباد رکھا گیا۔ برناوہ پہنچنے کے سات سال بعد حضرت مخدوم نے انتقال فرمایا۔ آپ نے اپنے برادر شیخ نظام کو بلدۂ راڑی میں روانہ کردیا اور وہاں رہ پڑے۔ خانخاناں نوہانی نے ان کی خوب خدمت کی اور قریات قدیمہ ان کے نام بحال کردیئے۔ انہی ایام میں روضہ راڑی کے متصل قریہ شیخ پورہ آباد ہوا۔ شیخ نظام کی اولاد اب تک وہاں آباد ہے بلکہ بعض قریہ اسوہ' موضع تکلہ اور نظام پورہ میں بھی آباد ہیں اور برناوہ والوں سے ان کی شادی بیاہ اب تک ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت شیخ کے تیر پر "پیر فتح تیر" مرقوم ہوتا تھا۔ ان کی ۹۷ سال کی عمر ہوئی۔ چنانچہ ۷۲ سال راڑی میں رہے' آخری سات سال برناوہ میں گزارے اور سنہ ۹۰۳ھ میں انتقال فرمایا۔

آپ کے جانشین آپ کے فرزند اکبر شیخ بدرالدین ثانی ہوئے۔ اگرچہ جوان تھے لیکن تمام کاروبار آپ کی سوتیلی والدہ "بوا ملکہ" کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ برناوہ سے ترک وطن کرکے واپس راڑی چلے جائیں کیونکہ یہاں کی جاگیر کا کچھ بھروسہ نہیں۔ ممکن ہے بہت جلد ضبط ہوجائے وہاں تمہارے چچا شیخ نظام موجود ہیں اور خدا کے فضل سے جاگیر برقرار ہے۔ آخر بوا ملکہ کی تجویز کو سب نے پسند کیا اور تمام لوگ معہ متعلقین و خدم و حشم قافلہ بنا کر روانہ ہوئے۔ اہل برناوہ و دیگر

قصبات کے باشندوں کو یہ ترک وطن ناگوار ہوا اور اس قدر اصرار کیا کہ شیخ نے اپنا عزم روانگی فسخ کردیا اگرچہ بوا ملکہ راپڑی چل دیں۔ اس موقع پر قصبہ گاڈیلہ کے رئیس ملک سرور نے بڑی ہمت دکھائی۔ اشرفیوں اور روپیوں کی تھیلیاں بھجوادیں اور اکثر مصارف خود برداشت کیے۔ اسی طرح قاضی مبارک ابن قاضی سیٹھن ساکن قصبہ رٹول نے بہت کچھ نذر و نیاز کیا۔ جائیداد کا معاملہ قاضی بابو شہ نے اپنے ذمہ لے لیا۔ قاضی صاحب خود سلطان سکندر کے دربار میں گئے اور جاگیر کے متعلق تازہ فرمان لے کر آئے۔ اس وقت حضرت مخدوم کے قبضے میں ستائیس دیہات تھے اور حکومت ان کو "ملک المشائخ" کے خطاب سے یاد کرتی تھی۔ حضرت مخدوم "بھیا" کہنے کے بہت عادی تھے۔ عمر بھر میں ایک سفر کیا' وہ بھی حضرت شیوخ العالم گنج شکر کی زیارت کے لیے اجودھن اور پٹن تشریف لے گئے جب قصبہ تھارہ میں پہنچے' وہاں کے رائے راوت ڈولا نے اپنی دختر آپ کی کنیزی کے لیے پیش کی اور اصرار کیا کہ اگر مخدوم نے منظور نہیں فرمایا تو راوت زادی عمر بھر بے نکاح رہے گی۔ آخر آپ نے رائے زادی کو قبول کرلیا۔

مشائخ چشتیہ کی تقلید میں آپ کو سرود و سماع سے کمال دلچسپی تھی لیکن پائے کوبی سے محترز رہے۔ ظاہر ہے کہ نغمہ انسان کو فانی خطرات سے ہٹا کر باقیات صالحات میں لے جاتا ہے اور رقت و نرمی کے دروازے دل پر کھول دیتا ہے۔ سرود سازوں اور مطربوں کی جماعتیں آپ کی سرکار سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور حاضر باش تھیں۔ ان کو وظیفہ برابر ملتا تھا۔ از انجملہ دہلی کے قوال جو حضرت امیر خسرو کے طرز میں قول' ترانہ' نقش' چہار اصول' ذو بحر' فارسی اور غزل میں بے نظیر تھے۔ یہ فرقہ جکری (ذکری) پیراں اور خیالات دہلوی آہنگ میں ممتاز تھا۔ فرقہ سنگیتاں اور نایک مختلف قسم کے پربند اور سنگیت اصول موسیقی کے مطابق عمل میں لاتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر نایک گوپال اور بیجو دیوانہ کے مقلد تھے۔ ہر طرح کے پربند' دھوہ' ماٹھ' جھومرہ' چند اور دھرو' سنسکرت' تلنگی اور دراوڑی زبانوں میں گاتے تھے اور خاص خاص اوقات میں اپنا مجرا کرتے تھے۔ جونپور اور خیر آباد کے قوال' جکری اور خیال' جو اکثر صاحب کرامت بزرگوں کی تصنیف ہوتے تھے' پست زمزموں اور فرودست پردوں میں سناتے تھے۔ دیار سندھ اور

ملک ٹھٹھہ کے گویے اقسام لما' پا بجلا' ڈاکھتا کی نغمہ پردازی میں ممتاز تھے۔ میوات کے خوش لہجہ مطرب جو فن سادرہ میں کامل و اکمل تھے' ہمیشہ سرکار میں حاضر رہتے۔ مخفی نہ رہے کہ سادرہ کا ایک موجد قدیم میرگیان نامی تھا۔ ان زبانوں میں اس کے اشعار اور کبیسری بے حد مشہور تھے۔ میرگیان کے بعد میر گنگل باشندۂ قصبہ گڑگانوہ' جو دہلی کے قریب ہے' صنعت سادرہ میں گوئے سبقت لے گیا۔ میر موصوف نے دلآویز پردوں اور حالت خیز تانوں کے ساتھ سادرہ کو سرود و قید و فرودست کے اختلاط سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اس کی یہ اختراع بہت مقبول ہوئی اور میر گنگل مشائخ کی خانقاہوں اور شاہی درباروں میں بے حد مشہور ہوگیا۔ جب میر ملازمت سے مستعفی ہوا' پادشاہ نے گڑگانوہ اس کی جاگیر میں دے دیا۔ پادشاہ نے بہ وقت رخصت میر سے کہا کہ تو افیونی آدمی ہے اور افیونی کے لیے شیرینی کی بے حد ضرورت ہے' اس لیے ہم تجھے گڑگانوہ عنایت کرتے ہیں' تاکہ تیرا بڑھاپا چین سے گزر جائے۔ یاد رہے کہ گڑ ہندی زبان میں قند کو کہتے ہیں۔ میر گنگل حضرت مخدوم کے عہد میں زندہ تھا۔ ان سے کئی مرتبہ ملنے آیا اور جدید اسلوب جو سادرہ میں اس نے اضافہ کیے تھے سنائے۔ خود آنحضرت کی شان میں اس نے کئی کبیسریاں بنائیں' جن میں سے بعض اب تک قوالوں میں مطبوع ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب ان چیزوں کے قدر دان باقی نہ رہے۔

آپ کا انتقال ۱۲ ذی حجہ سنہ ۹۴۹ھ کو بروز چہار شنبہ ہوا اور آپ کے جانشین بایزید ابن مخدوم شیخ پیر بودھن ہوئے۔ آپ کی والدہ شیخ یوسف قدس سرہ ساکن قصبہ سکیٹ کی اولاد سے ہیں' جن کی تصنیف "تحفۃ النصائح" مشہور عالم ہے۔ آپ کی مجالس اعراس شاہانہ ٹھاٹھ پر ہوا کرتی تھیں' جن میں آٹھ آٹھ دس دس قسم کے گوشت' علی ہذا القیاس حلوے کی رکابیاں شامل ہوتی تھیں۔ آپ کی مجالس کے عطر بھی اس قدر تیز اور دیرپا ہوا کرتے تھے کہ ان کی خوشبو آٹھ آٹھ روز تک کپڑوں سے نہیں جاتی تھی۔ دیگر مجالس ضیافات میں بھی اسی تکلف اور سیرچشمی سے کام لیا جاتا تھا اور دہلی تک کے قوال کھنچ کھنچ کر آجاتے تھے۔ جب آپ نے عزم کعبہ کی نیت سے برناوہ کو خیرباد کہا اور اکبر آباد پہنچے' اکبر بادشاہ نے آپ سے ملاقات کی خواہش کی اور بڑی تعظیم و تکریم سے ملا اور خود جاکر ایک کاسہ میں عطر خاصہ لاکر آپ کے لباس میں ملا اور فاتحہ خیر کے

لیے درخواست کی اور کئی خوان اشرفیوں اور روپیوں سے بھرے آپ کے ملازمین کے حوالے کیے۔

آپ کی فیاضی' سخاوت اور سیرچشمی کے حالات سن کر ارباب مراد دور دور سے آتے اور فائز المرام واپس جاتے۔ آپ کی سرکار میں ایسی ایسی اشیاء جمع تھیں کہ سلاطین کو بھی نصیب نہ تھیں۔ جلال الدین اکبر کو ابتدائے ایام جلوس میں ایک سدھائے ہوئے چیتے کی ضرورت ہوئی۔ تمام سرکاروں میں تلاش کروالیا لیکن نہیں ملا۔ جب آنحضرت کو معلوم ہوا' آپ نے فوراً اپنے ہاں سے سدھایا ہوا چیتا بھجوادیا' جس سے بادشاہ بے حد خوشنود ہوا۔ اس سرکار میں خوش الحان پرندوں مثلاً بلبل' طوطی وغیرہ کی کثیر تعداد موجود تھی۔ علی ہذا شکاری طیور' شاہین و باز وغیرہ کثرت سے تھے۔ یہی حالت دیگر حیوانات کی تھی۔ آپ کی سرکار میں دو زنجیر فیل کم از کم ہمیشہ رہے۔ آپ کی فیاضیوں کے قصے سن کر ایک بڑی تعداد محتاجوں اور درویشوں کی جمع ہوئی۔ اور آں حضرت نہایت کشادہ پیشانی سے ان کی خوراک' لباس اور دیگر ضروریات کے کفیل تھے۔ علما و فضلا' صوفیہ اور طلبہ کی' جو ہمیشہ آپ کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے' خشک چندی بھی مقرر تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور جماعت بھی موجود ہوگئی تھی جو "عاشق طعام" کے نام سے موسم تھی۔ ان احدیوں کا وظیفہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے آٹھ پہر کھانا تھا۔ جو بات کرتے کھانے کی' جو شعر پڑھتے کھانے کا اور جو کبیسری ان کے منہ سے نکلتی' کھانے پر ہوتی۔ آنحضرت ان لوگوں کی شوخ چشمیاں اور گستاخیاں برداشت کرتے تھے۔

چونکہ برناوہ میں کثرت آبادی کی وجہ سے آنحضرت کو تکلیف ہوتی تھی' آپ نے حضرت بدرالدین ثانی کی اجازت سے برناوہ سے ہٹ کر اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے ایک نیا قریہ بنام شیخوپورہ آباد کیا۔ قبہ مطہرہ سے یہ مقام نصف کوس کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں آب کرسنی اور مشرق میں دریائے ہینڈن رواں ہے۔ سب سے پہلے جامع مسجد بنائی گئی۔ قریہ سے باہر دہلی کی سڑک پر عید گاہ تعمیر ہوئی۔ بعد میں عمارات جماعت خانہ' خانقاہ و عبادت گاہ تیار کی گئیں۔ پھر حویلیاں بنائی گئیں۔ ایک کثیر خلق آباد ہوگئی۔ پھر آپ مع خدم و حشم و متعلقان یہاں تشریف لائے۔ اہل حرفہ و

رعایا بھی آ آکر آباد ہوگئے۔ یعنی جو لوگ راپڑی سے آپ کے خاندان کے ساتھ آئے تھے' سب یہیں آکر رہنے لگے اور بعض برناوی بھی یہیں آکر آباد ہوگئے۔ علی ہذا قضاۃ و علما و حفاظ بھی اٹھ آئے۔ قوم بنی اسرائیل کے بعض ارکان مثلاً خواجہ نصیرالدین' خواجہ عجائب' خواجہ لاڈو اور ملاں الہ بخش بھی چلے آئے۔ قبیلہ افغاناں میں سے داؤد ناغر نے اپنی حویلی یہیں بنوائی۔ ان کے ہم قوم' جو ڈیرہ میں آباد تھے' وہیں رہے لیکن ان کے ارادت مندانہ تعلقات بدستور جاری رہے۔ عرس کے موسم میں یہ اور ان کی عورتیں آتیں۔ عورتیں زنانہ میں چلی جاتیں اور مردوں کو خاص جماعت خانہ میں عوام سے علیحدہ جگہ دے دی جاتی کیونکہ انہیں شہریوں کے ساتھ میل جول مقصود نہ تھا۔ ان کی عورتیں چوڈولوں میں سوار ہوکر آتیں' جو اکثر مرقع و مکلل ہوتی تھیں۔ ان کے پردوں پر موتی اور جواہرات ٹکے ہوتے تھے۔ ان لوگوں کی خوش اعتقادی اور پیر پرستی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک روز آنحضرت کے کسی خدمت گزار کا لڑکا پتنگ اڑانے لگا۔ ہوا سے پتنگ نے ڈیرہ کے افغانوں کے گھروں کا رخ کرلیا۔ یہ جہال اس خیال سے کہ کوئی امام زادہ پتنگ اڑا رہا ہے' تعظیماً" سب کے سب کھڑے ہوگئے اور جب تک پتنگ اڑتا رہا کھڑے رہے۔ یہاں دو آب میں دو پرگنے آپ کی توجہ اور مساعی سے آباد ہوئے۔ پہلا پرگنہ پروت ہے۔ اس علاقے میں جاٹوں کی ایک قوم سلکھلاں تھی۔ سلکھلے راہزنی اور لوٹ مار میں مصروف تھے اور خلق خدا ان کے ہاتھوں سے نالاں تھی۔ ان کو اس علاقے میں آباد کردیا گیا اور قرب و جوار کے پرگنات سے دیہات لے کر اس میں ملحق کردیئے گئے۔ اب قصبہ پروت حاکم نشین مقام بن گیا ہے اور یہ قوم زراعت و کاشتکاری میں مصروف ہے۔ دوسرا پرگنہ اقوام ناکواں اور تینواں میں آباد کیا گیا۔ اس کا نام جلال آباد رکھا گیا۔ آپ کی تاکید اور توجہ سے ان قوموں نے راہزنی و دزدی کو چھوڑ دیا ہے' جس سے رعایا و مسافرین کو بہت آرام ہوگیا ہے۔

آپ کے معاصرین اور احباب میں یہ بزرگ شامل ہیں:

(۱) شیخ ذکریا و شیخ علاء الدین از اولاد حضرت گنج شکر (۲) بندگی عبدالوہاب بخاری و شیخ محمد بخاری (۳) شیخ رکن الدین متولی (۴) شیخ گدائی ابن شیخ جمالی شاعر جو صدر الصدور عہد اکبری ہیں۔ یہ بزرگ علوم عقلیہ و نقلیہ میں ممتاز تھے۔ شیخ گدائی ایک

مرتبہ مہمان بھی رہے اور اس سرکار کی پر تکلف مہمانداری و شان و تجمل دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میں اس بیان سے گریز کر کے ایک اور بات پر آتا ہوں۔ شیخ گدائی جب شیخوپورہ سے واپس دہلی لوٹے، راستے میں مبارک نامی ایک غلام، جو قریہ درگاودہ میں مقیم تھا، مل گیا۔ کہنے لگا آپ میرے آقا کی ضیافت سے آتے ہیں۔ بھلا اب میں آپ صاحبان کو میرے گھر دعوت کھائے بغیر کیسے جانے دیتا ہوں۔ مبارک نے اس قدر اصرار کیا کہ شیخ نے دعوت منظور کرلی۔ شیخ کے ساتھ اس روز خدمتگاروں کے علاوہ اسی شرفا و اقارب تھے۔ میاں مبارک نے ان کے لیے فوراً ۸۰ بکریاں ذبح کرائیں اور ہر ایک کا خلاصہ ہر مہمان کے سامنے قاب میں لاکر پیش کیا گیا۔ تیتر، بٹیر، ہرن، گائے وغیرہ کا گوشت علیحدہ تھا۔ مختلف رنگ کے کھانے اس قدر تعداد میں چنے گئے تھے کہ ان پر نظر ڈالنے سے مہمانوں کی بھوک اڑ گئی اور شیخ گرامی نہایت گرویدہ ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

اولاد میں آپ کے دو فرزند تھے۔

(۱) شیخ علاء الدین (۲) شیخ قطب الدین۔

جلال الدین اکبر نے ان کے منصب دار بنانے پر بہت اصرار کیا لیکن آنحضرت نے منظور نہ کیا۔ اسی سلسلے میں اکبر نے انہیں قریہ کھوانی جاگیر میں دے دیا۔ دونوں نے عالم جوانی میں انتقال کیا۔ ان کی وفات پر حضرت مخدوم نے مکہ معظمہ جانے کا عزم مصمم کرلیا اور اپنے نبیرہ شیخ بہاء الدین کو صاحب سجادہ اور قائم مقام بنا کر رخصت ہوئے اور مکہ مطہرہ میں بتاریخ ۵ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۸۷ھ انتقال کیا۔ فقیر اللہ مصنف "راگ درپن" شیخ بہاء الدین برناوی کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"شیخ بہاء الدین برناوہ قدس سرہ در سنہ دو جلوس شاہ جہانی جہان بی مدارا را پدرود کرد از اکابر زادھا بود۔ در سن بیست و پنج سالگی ترک باطنی اختیار کرد۔ ترک ظاہری داشتند۔ چوں فقیر و فقیر زادہ بودند، سبب ترک ایشان این است کہ بر آھو قابو کردہ رفتہ بود کہ بہ تفنگ جان شکری نماید۔ آھو پیش آمدہ بزبان فصیح

به شیخ گفت که بهاء الدین باین کار خلق کرده اند یا کار دیگر هم داری۔ دانست که کسی می گوید۔ به چپ و راست نگاه کرد۔ کسی بنود که به ‌بیند۔ آهو دو سه قدم پیش آمده نخستین حرف بر زبان راند۔ دانست که دیگری می گوید۔ به یمین و یسار نگاه کرد۔ کسی نبود که به نظر در آید۔ آهو چند گامے دیگر پیش آمده گفت۔ منم آهو که باتو میگویم۔ آهو آهو گیر این معنی دارد و همان سخن را بر زبان راند تفنگ فروهشته اختیار کرد (کذا)۔ عارف نامی ملا عبدالرحمٰن جامی چه نیکو فرماید۔ مثنوی:

خواهش از جانب مانیست درست
هرچه هست از طرف تست به تست
چون بما خواهش تو راست شود
مو بمو بر تن ما خواست شود
حیف باشد که نه بینی تو عیان
آں که پر باشد ازو جمله جهان
در دیاریکه سراپا خوشی است
روز و شب کار تو سرگین کشی است

الغرض بیست و پنج سال به جهاں نوردی گذراند۔ صحبت اکثر فقرای باب الله دریافت و کسب سنگیت در دیار دکن کرد و ساز نواختن آموخت۔ بعد از آنکه سش به پنجاه رسید۔ مامور شد که بوطن برگردد۔ وطن او برناوه که از دیهات جهنجانه از پرگنات میان دو آب است رسیده متمکن گردید و شگفت آنکه باز شکار می کردند۔ اغلب که مامور بودند۔ دیگر همخوانگی با اهل خانه نکرد٬ ترک و تجرد تمام داشت۔ سروپای سبز رنگ همیشه می پوشید تا زنده بود۔ می گفت این لباس در برداشتم که الٰهی پیام ‌بمن رسید۔ در علم مارگ مثل او (در) دیار دکن هم نشان ندهند۔ از گیت و دهرپد و خیال و ترانه نیکو تصانیف که چوتکلا خواندن

مشکل ترین جمع تصانیف سرودن است (کذا) رباب' بین' امرتی را خوب می نواخت۔ خیال نام سازی اختراع کردہ غریب شکل داخل تت است۔ دو سازندۂ خوب از شاگردان ایشان بافقیر بودند۔ عیبی کہ در آن ساز دیدہ شد' این بود کہ غیر از شدن پہلوان نواختہ نمی شد۔ ساز باید بہ اختیار این کس باشد نہ گویندہ و سازندہ بہ اختیار ساز و رسن۔ یک صد و ہفدہ سالگی رحلت نمودند۔ در وطن خویش فقیر را صحبت ایشان میسر نہ شد اما از ثقات احوال سعادت منوال شنیدہ۔"

آپ کا حافظہ نہایت زبردست تھا۔ بچپنے کی تمام باتیں یاد تھیں حتیٰ کہ اشخاص کے حلیے اور صورتیں تک بتا سکتے تھے۔ مولانا الیاس دہلوی نے بسم اللہ شروع کرائی۔ حرف شناسی اور ہجا خوانی کے مراحل قاضی عارف ابن حبیب اللہ برناوی نے طے کرائے۔ بعد میں ملا انور ساکن قصبہ رہتک' جو میراں سید علاء الدین ساکن قصبہ کنانہ کے داماد اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں ممتاز تھے' تعلیم دیتے رہے۔ شیخ الہ داد پانی پتی بھی آپ کے معلم رہے۔ پھر کتاب شرح عقائد فضیلت مآب میراں سید عبدالشکور دہلوی سے "تیمنا" و "تبرکا" پڑھی۔ آپ نے انہی ایام میں ایک قصیدہ عربی زبان میں لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ لسان الغیب ہے اور ہمارے فہموں سے بالا ہے:

شرح مجموعہ گل مرغ سحر داند و بس
کہ نہ ھر کو ورقی خواند و معانی دانست

تحصیل کے بعد آپ ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہوگئے۔ اکثر نماز سحر کے بعد شکار کے بہانے سے جنگلوں میں نکل جاتے اور تیس تیس کوس' دن بھر میں' پھر لیتے۔ شہ زور بے حد تھے۔ ان کی کمان کو دوسرا شخص نہیں چڑھا سکتا تھا۔ تیر ان کا خطا نہ جاتا تھا۔ اس کی درازی گیارہ بارہ مٹھی کے درمیان میں تھی۔ اس کی پیکان ایک بالشت لمبی ہوتی تھی۔ ہرن اور گوزن کے لیے ایک ہی تیر کافی ہوتا تھا۔ ان کی کمان بغدادی تھی' جس کی قیمت اسی روپیہ تھی۔ ابتدا میں آپ کو شکار کمین گاہی پسند تھا' جسے ہندی میں بوکارہ کہتے ہیں۔ شکار کے مناسب موقعوں اور دیگر امور کے دلالت کے لیے ایک

بلوچی شکاری، جس کا نام سادھار تھا، ان کے ساتھ رہتا، اور شکار میں جو تیر اخرج ہوتے، سب سادھار لے لیتا اور ہر ہرن کے واسطے سادھار کو پانچ تنگہ انعام کے ملتے۔ اس عہد کے پانچ تنکے آج کل کے پانچ روپیہ کے برابر ہیں۔ عرصے تک شکار اسی طرح کھیلتے رہے۔ بعد میں تیر کے شکار کو چھوڑ کر بندوق سے شکار کھیلنے لگے۔ اس علاقے میں سب سے پہلے آپ ہی نے بندوق کا استعمال کیا ہے ورنہ یہ حالت تھی کہ لوگ بندوق کی آواز سے دہشت کھاتے تھے اور جب کبھی اس کی آواز سنتے کانپ جاتے اور بھاگ جاتے۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ بعض دیہاتی گھاس کاٹ رہے تھے، اتنے میں آپ نے بندوق چھوڑی۔ بندوق کی گرج سن کر ان پر اس قدر خوف و ہراس غالب ہوگیا کہ سب کے سب زمین پر لوٹنے لگے ان کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ جب خوف کسی قدر کم ہوا تو رونے لگے۔ آں حضرت دور سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ قریب جاکر پوچھا، بھائیو تمہیں کیا ہوگیا، جو اس قدر بے قرار ہو۔ ان دہقانوں نے جواب دیا کہ آپ کچھ نہ پوچھیے، ہم زندہ نہیں ہیں بلکہ مردہ ہیں۔ آپ نے کہا، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ۔ بولے کہ یکایک ایک گرج ہوئی اور کوئی چیز بجلی کی طرح ہمارے پیٹ میں سے نکل گئی اور ہم کو زخمی کردیا۔ آپ نے فرمایا، اپنا اپنا زخم بتاؤ تاکہ تمہارا علاج کیا جائے۔ جب انہوں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا، تمام اعضا صحیح و سالم تھے اور محض آواز کی دہشت سے یا گولی کے پاس سے گزرنے پر ان کو اپنے مرجانے کا وہم ہوگیا تھا۔

بندوق کے شکار میں سب سے مشکل دانوں گھات ہے، جس میں درخت کی شاخ اور پتوں کو اپنے سامنے رکھ کر شکاری ان کی آڑ میں ہرن تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ شکاری کو اپنا تمام جسم سمیٹ کر اس شاخ یا پتوں کی آڑ میں کرکے چلنا پڑتا ہے۔ بندوق علیحدہ ہے۔ مدد کی غرض سے ایک دو آدمی بھی پیچھے پیچھے ہیں۔ اس حالت میں یہ لوگ سانس دبا کر نہایت آہستگی کے ساتھ ہرن کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ ہرن کو نہ تو ان کی آہٹ ہوتی ہے اور نہ شبہ ہوتا ہے۔ یہ کام، اس میں شک نہیں، بڑی کاریگری کا ہے اور اس فن میں حضرت کو

یدطولیٰ تھا۔ اس شکار میں سادھار کے فرزندوں کمال اور اسمٰعیل نے خوب نام پیدا کیا۔ اس فن میں ان کی شہرت سن کر جہانگیر بادشاہ نے انہیں بلوایا اور دونوں نے شکار میں اپنا کمال دکھایا۔ چنانچہ ایک دو شاخوں کی آڑ میں لے جاکر انہوں نے جہانگیر کا ہاتھ ہرن کی پیٹھ پر رکھوا دیا' پیشتر اس کے کہ وہ بھاگے۔ اس طرح یہ ہنر اس سرکار سے نکل کر سلاطین اور امرا تک پہنچ گیا۔ جہانگیر نے دونوں بھائیوں کو جداگانہ منصب دیا۔ بعد میں آپ کو شکار سے نفرت سی پیدا ہوگئی۔ تاہم دوست احباب مجبور کرکے لے جاتے۔ ایک دن ایسا ماجرا پیش آیا کہ آپ بندوق آگے کیے ایک ہرن کا پیچھا کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ بندوق چھوڑیں۔ اتنے میں اس ہرن نے اپنا منہ ان کی طرف کیا اور ان کے کان میں یہ آواز آئی کہ اے ولی اللہ یہ کیا حرکت ہے۔ اس آواز کے آتے ہی ان کا قلب الٹ گیا۔ بندوق ایک طرف پھینک دی۔ ہرن کسی طرف غائب ہوگیا اور اس قدر اثر ہوا کہ آپ نے شکار کھیلنا بالکل ترک کردیا۔ عبادات و اوراد و وظائف میں مشغول ہوگئے۔ آپ نے اپنے جد امجد کے حج کو جانے کے بعد تمام دنیاوی اشیاء قریات' جاگیرات' انعامات و وظائف و فتوحات و نیازات' اجناس و متاع' لباس' اثاث البیت' ہتھیار' گھوڑے' مویشی وغیرہ وغیرہ کو ترک کردیا اور مرحوم کی جو اشیاء ان کی وفات کے بعد مکہ سے واپس آئیں' وہ بھی عزیزوں اور مستحقوں میں تقسیم کردیں۔ اسی لیے آپ کو خاتم التارکین کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ ہمیشہ سیرو سفر میں رہے۔ اتفاقیہ چند دنوں کے لیے وطن میں آجاتے۔ انہوں نے اکثر مقامات میں سفر کیا ہے۔ دکن' گجرات' کھنبایت' جونپور' پٹنہ' بہار' پنڈوہ' سرہند' لاہور' پٹن' اجودھن' ہانسی و حصار وغیرہ مقامات میں ان کے بہت دوست تھے۔ ان میں سے بعض کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ دہلی میں حضرت گنج شکر کی اولاد میں سے شیخ احمد و شیخ محمود' شیخ عبدالوہاب بن شیخ محمد دہلوی بخاری۔ ان کا سیرو سفر' شکار و عبادات اور مجالس سماع و سرود میں بہت ساتھ رہا ہے۔ دیگر شیخ عبدالکریم بخاری ابن شیخ محمد بخاری' شیخ اسلم بخاری' شیخ کمال مانڈووال' شیخ قطب عالم از اولاد شیخ عبدالعزیز چشتی کسکی اور اسی خاندان

کے شیخ جلال اور شیخ شاکر محمد' شیخ عبدالحق دانشمند' محقق و مصنف مشہور شیخ کمال متوکل خلیفہ شاہ نظام نارنولی' جو دہلی میں مقیم تھے۔ شیخ کمال کو سرود سورٹھ سے کمال الفت تھی لیکن اس پردہ میں طرز قدیمہ میں فارسی نہ تھی۔ شیخ نے آنحضرت سے التماس کی۔ آپ نے یہ فارسی بہ اختراع جدید لکھ دی۔ منہ قدس سرہ:

کشتہ درد غمش را غم کجا
از برای جرح او مرہم کجا
گر تمامی جسد او سوزن زنند
ور ازو خواهند او را دم کجا

شیخ کمال یہ فارسی اپنے مرغوب طبع سرود میں سن کر بے حد محظوظ ہوئے اور باقی عمر یہ چیز ہمیشہ ان کی مطبوع رہی۔ مذکورۂ بالا سب دہلوی مشائخ ہیں۔ اب دیار میان دو آب کے مشائخ کا ذکر کیا جاتا ہے:

ازاں جملہ شاہ اعلیٰ پانی پتی (پتی) ہیں' جن کی عمر سو سال سے بھی متجاوز تھی۔ شیخ حاجی ابن شیخ شہاب پانی پتی (پتی)' آنحضرت کے پسر خال ہیں۔ انہی کے بھائی شیخ فرید ہیں' جن کے فرزند شیخ احمد دانشمند' مشہور عالم ہیں۔ خواجہ ناصر چشتی' ساکن قریہ براس من اعمال کرنال' از اولاد خواجہ مودود چشتی۔ شیخ نظام تھانیسری' شیخ حسین بوہری' شیخ عزیز اللہ از اولاد شیخ عبدالقدوس گنگوہی' شیخ ابوسعید' شیخ طاہر صاحب سجادہ' شیخ صادق۔ قصبہ جھنجھانہ سے شیخ مزکی' جو شیخ عبدالرزاق کی اولاد سے ہیں۔ پیر زادگان نانوتہ سے سید غلام محمد ہیں' جنہوں نے عین عالم سماع میں جان دی۔ یہ میراں سید مصطفیٰ کی اولاد سے ہیں۔ سید صابر علی کو فن سرود سے بے حد الفت تھی۔ اشعار میں نئی نئی طرز ایجاد کیں۔ شعر و کبیسری میں جو جو اختراع کرتے' آنحضرت کو سناتے اور داد چاہتے۔ ان کے سازندے' مزامیر عجیب طریقے سے بجاتے تھے۔ ایک طبل کمر سے باندھ لیتے۔ دائرہ اور رباب یک ضرب افغانوں کی طرح بجاتے اور بجاتے وقت رقص بھی کرتے۔ سہروردی پیر زادے' دہلی کے بخاری جن کے مرید ہیں' دہلی سے نکل کر کوہ

شمالی کے دامن میں آباد ہو گئے ہیں۔ چنانچہ قریہ بھٹ، بھنہ، بھنبی وغیرہ انھوں نے آباد کیے ہیں۔ ان میں سے شاہ محمد قابل ذکر ہیں۔ جب اکبر بادشاہ نے بلوایا، آپ نے کہلا بھیجا، ہمیں دونوں طرف سے پیغام طلب آیا ہے جو غالب آئے گا وہی اپنے پاس بلالے گا۔ یہ کہہ کر چادر اوڑھ کر لیٹ گئے اور جاں بحق تسلیم کردی۔ قصبہ سرساوہ سے شیخ حسین، جو خاندان چشتیہ قلندریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حاجی ابراہیم د۔لبنی (دیوبندی)، جنھوں نے عرب، مکہ، روم اور شام کا سفر کیا تھا۔ آنحضرت نے بعد میں انہیں دیوبند جانے کا حکم دیا۔ وہیں متاہل ہوئے اور شہرت حاصل کی۔ آنحضرت کے دو آبی دوستوں میں شیخ پیر میرٹھی شطاری بھی ہیں، جو اپنے خیالوں کو رواجی راگوں میں باندھ کر آنحضرت کو سناتے اور رواد طلب کرتے۔ شیخ پیر کے کلام میں اکثر بنا بنی، نوشہ، عروس، زلف و گیسو، خط و خال وغیرہ کے مضامین ہوتے تھے۔ ایک دن آنحضرت نے مذاقاً" کہا، شیخ تم تو قدیمی مجرد ہو، نہ کبھی دولہا بنے نہ دلہن دیکھی، پھر یہ مضمون تمہیں کہاں سے سوجھتے ہیں۔ یہ کہا اور دونوں ہنس پڑے۔ پائے کوبی اور رقاصی میں شیخ پیر کو بڑا کمال تھا۔ رقاصی کے وقت نیا جوڑا پہنتے اور بعد میں فوراً قوالوں کو بخش دیتے۔ شیخ موصوف نے ایک مرتبہ سو من آٹے کی ایک روٹی پکوائی اور اس کے ٹکڑے کرکے لوگوں میں تقسیم کیے۔ شیخ عبداللہ، ساکن قریہ بھٹ (جو قصبہ لونی کے قریب ہے)، آپ کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اجمیر میں خواجہ حسین حضور صاحب سجادہ، ان کی عادت تھی کہ کبھی کسی دولت مند کی تعظیم نہیں کرتے، خود شہنشاہ جلال الدین اکبر کو بھی تعظیم نہ دی حالانکہ اکبر نے ان کی جوتیاں جھاڑ کر سامنے رکھی ہیں۔ پٹن میں شیخ تاج محمود صاحب سجادہ تھے۔ شیخ نظام نارنولی، جب آنحضرت اجمیر تشریف لے گئے، نارنوں گزر ہوا۔ شیخ نظام کو خبر لگی۔ سنتے ہی دوڑے آئے اور کمال تپاک سے ملے۔ احمد آباد میں شیخ محمد قطب گجراتی، شاہ علی گجراتی۔ قیام گجرات کے زمانے میں آنحضرت آپ کے مہمان رہے۔ شیخ علی نے اپنا ہندی کلام، جو عجیب پر لذت بحور میں لکھا تھا، آنحضرت کو سنایا اور اپنا ہندی رسالہ[۶] جو نکات و دقائق موحدانہ پر مشتمل تھا، ہدیہ دیا۔

سید محمد بخاری گجراتی بلدۂ کمنبایت میں، میراں سید مزمل و سید مدثر جونا گڑھ میں، شیخ عیسیٰ سندھی، برہانپور میں ان کا تکیہ تھا۔ قنوج، لکھنؤ، بلگرام، پھانی، جیوراس، اودھ، بنارس، الہاباد، جونپور، پٹنہ، حاجی پور، بہار وغیرہ وغیرہ تک میں آپ کے احباب موجود تھے۔ آگرہ میں شیخ صوفی دانشمند آپ کے محبوں میں تھے۔ انہوں نے فنون ہندیہ سیکھ کر فارسی زبان میں ان کے تراجم کیے ہیں۔ سلوک میں رسائل لکھے ہیں اور دیگر علوم میں بھی اپنی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ قصبہ جھنجھانہ ان کا مولد تھا۔ گوالیار میں شیخ محمد غوث کے فرزند شیخ فہیم اللہ سے سلسلہ اتحاد قائم تھا۔ انہوں نے شیوہ سماع میں بعض جدید اضافے کیے تھے۔ علی ہذا فن نغمہ میں نئے طرز معرف کیے تھے۔ فتح پور میں شیخ سلیم چشتی کے فرزندوں میں شیخ بایزید و شیخ قطب الدین سے کمال دوستی تھی۔
حضرت مخدوم کی شان میں قاضی جلال الدین قاضی لاڈ نے ذیل کے ابیات لکھے ہیں:

ای آنکہ پای بوسیت آمد شفای ما
باشد کہ وارھانیم از درد پای ما
خاک جناب پیر چو آب حیات ماست
داروئے از طبیب بگیرو بلای ما

ذیل کے امرا سے آپ کی ملاقات یا دوستی تھی:

(۱) نواب خانخاناں ابن بیرم خاں

(۲) شاہ نواز خاں ابن ------- خان خانخاناں۔ اجمیر میں صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی۔

(۳) نواب شیخ فرید بخاری دہلوی المخاطب بہ مرتضیٰ خاں۔ ان سے پرانے مراسم تھے لیکن صرف ایک مرتبہ ملاقات کی۔ آنحضرت قریہ چاندپور میں، جو بلدۂ فرید آباد اور پلول کے نزدیک ایک بلندی پر واقع ہے۔ (چاند پور اور فرید آباد مرتضیٰ خاں کی جاگیر میں تھے)، مقیم تھے۔ اس گاؤں میں پاپڑی کے درخت بہت تھے۔ آنحضرت یہ درخت کٹوا کر ساز، رباب و خیال و دیگر مزامیر تیار کرا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ملاقات ہوئی۔

(۴) شیخ حسن ساکن قصبہ کیرانہ، جن کو بعد میں مقرب خاں کا خطاب ملا۔ ان سے قدیمی تعلقات تھے کیونکہ مقرب خاں شیخ جلال پانی پتی کی اولاد میں تھے۔

(۵) سلطان سلیم خود آپ کی زیارت کو برناوہ آتا ہے اور کئی خوان روپے اور اشرفی کے پیش کرتا ہے۔

اپنے اسلاف کی پیروی میں آپ کو حسن صوت اور نغمہ سرود سے کمال رغبت تھی۔ قوالوں کی جماعت ہمیشہ آپ کے ہمراہ رہتی۔ جماعت چوکھہ مخدوم شیخ پیر کے زمانے سے ان کے خانوادے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس فرقے کا کمال صرف پربندھ میں محدود تھا۔ آنحضرت کی توجہ اور تربیت سے ہر قسم کے نغموں مثلاً پربند، چند، دھرو، قول، ترانہ، فارسی، نقش، جکری (ذکری)، خیال دہلوی، چٹکلا، فرودستی، سادرہ، میواتی بشن پد، دھرپد و دیگر اصناف سخن میں یکتا ہوگئے۔ لیکن آنحضرت کی وفات کے بعد، جب موسیقی پر عام زوال آیا اور دھرپد کو قبول عام کا خلعت ملا، ان لوگوں نے دھرپد ہی کو اپنا مایہ بساط بنالیا۔ شعر:

سرود چیست کہ چندین فنون عشق دروست　　سرود محرم عشقست و عشق محرم دوست

ان کے علاوہ دوسرے گویندے اور سازندے ہمیشہ آتے جاتے رہتے تھے اور آپ کے انعامات سے مالا مال ہوتے تھے۔ آپ کو جو فتوحات ملتی تھیں، درویشوں اور قوالوں پر خرچ کرتے تھے۔ سرود سنتے وقت آپ کے سامنے کسی کو دخل بے جا یا شوخی کی مجال نہ ہوتی، نہ بیگانے کو آنے کی اجازت تھی۔ اگر کوئی ایسی نازیبا حرکت کرتا، آپ فوراً اس مکان سے رخصت ہوجاتے اور سفر اختیار کرتے۔ اگرچہ یوں بھی آپ کا وقت سیر و سفر میں گزرا ہے اور وطن میں بہت کم قیام کیا ہے۔ سرود کا آپ کو اس قدر شوق تھا کہ جب کبھی کسی باکمال گویے کا نام سنتے بے قرار ہوجاتے، خواہ نزدیک ہوتا خواہ دور، آپ فوراً اسے ملتے اور اس کا گانا سنتے۔ ملک کے مشہور استاد مثلاً نایک کرن، نایک ہرناتھ، نایک چرجو، نایک ساہو، الہ داد ربابی، سودھر ربابی، بازو ربابی، بھگوان ربابی، پربین خان بینکار، کربین خاں وغیرہ وغیرہ اکثر آپ کی خدمت میں آتے رہتے۔ نیل کنٹھ، جو

فن موسیقار و مزمار میں سب پر فائق تھا' آنحضرت اس فن کے نکات و دقائق پر اکثر اس کے ساتھ گفتگو کرتے۔ نیل کنٹھ بھی آپ کی صحبت کو غنیمت جانتا اور ملازمت میں رہتا۔ اس کا بیان تھا کہ اس عہد میں اس فن کو آنحضرت کے سوا سمجھنے والا کوئی موجود نہیں۔ مجھ کو رنج ہوتا تھا کہ اس فن کا دنیا میں کوئی قدر دان نہیں رہا' میں نے ناحق اس کے سیکھنے میں عمر ضائع کی' ہمارے عہد کے موسیقی شناس اس ہنر کے غوامض اور باریکیوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ آنحضرت حقیقی معنوں میں اس کے رمز شناس اور نکتہ دان ہیں۔ نیل کنٹھ کو آپ سے اس قدر محبت تھی کہ آپ کی صحبت میں ہمیشہ خوش و خرم نظر آتا اور جب جدائی ہوتی ملول اور بے قرار ہوجاتا۔ میاں تان سین کو آپ سے غائبانہ عقیدت تھی۔ اس نے اپنے فرزند کو حضرت صاحب ولایت کے نذر کیا تھا اور ہر سال پچیس اشرفی نذرانہ شیخ صدرالدین کے حوالہ کرویا کرتا۔ لیکن تان سین کو آپ نے صرف ایک مرتبہ سنا اور وہ بھی اس کی وفات کے قریب۔ آپ کو جب معلوم ہوا کہ ممالک دکن میں ایک ایسی جماعت ہے جن کو گندھرپ کہتے ہیں۔ وہ موسیقی کو فن کی حیثیت سے تحصیل کرتے ہیں۔ آبادی کو ترک کرکے صحراؤں میں مقیم ہیں اور انہی مقامات میں اپنے فن کی ورزش میں مشغول ہیں۔ اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ اس فن شریف کے نغمات نامحرموں اور نااہلوں کے کانوں تک نہ پہنچیں کیونکہ آبادی میں جو لوگ اس فن میں مصروف ہیں ان کا سرود' روش کتب قدما کے مطابق نہیں ہے۔ اصلی نغمات کے تحفظ کے خیال سے گندھرپ ان سے احتراز کرتے ہیں کہ کہیں ان کی اغلاط ان میں سرایت نہ کرجائیں۔ اسی لیے انہوں نے جنگلوں میں رہنا پسند کیا ہے اور اس فن کو کتابی اور قدیم وضع کے مطابق تحصیل کرتے ہیں۔ یہ سن کر آنحضرت سیدھے دکن تشریف لے گئے اور جماعت گندھرپ کے متعلق تحقیقات کی۔ جب وہاں کے باشندوں کو معلوم ہوا کہ آنحضرت گندھرپوں کے سننے کے کمال مشتاق ہیں' انہوں نے کوشش کرکے ان تک خبر پہنچائی۔ جب گندھرپوں کو علم ہوا کہ ایک ماہر موسیقی دہلی سے چل کر ان کے سننے کے

لیے دکن تشریف لائے ہیں' بڑی خوشی سے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تمام ساز و آلات اپنے ساتھ لائے۔ آنحضرت ان کا نغمہ سن کر بے حد محظوظ ہوئے کیونکہ قواعد فن موسیقی کی وہ ہر طرح سے پابندی کرتے تھے۔ ان کی زبان' ہاتھ' تال' پکھاوج' بین' جنتر' رباب اور دیگر آلات موسیقی ہم آہنگ تھے۔ سبد اور نسبد کی پوری پوری رعایت کرتے تھے۔ سبد کے موقع پر تھاپ پڑتی اور نسبد کے تال کے وقت کسی چیز پر ضرب یا تھاپ نہ دیتے بلکہ تال ہاری اس وقت تال کو ہوا میں چھوڑ دیتا اور پکھاوجی اپنا ہاتھ مردنگ پر الٹا کر دیتا اور دستک زن ہوا میں اپنے ہاتھ کھول کر قوانین سبد کی تعمیل کرتا۔ مجرا ختم ہوجانے کے بعد گندھرپوں نے آپ سے موسیقی کے متعلق بعض سوالات کیے' جن کا آنحضرت نے معقول جواب دیا۔ پھر آنحضرت نے اپنے بعض شکوک ان سے دریافت کیے لیکن وہ لوگ جواب نہ دے سکے۔ کہنے لگے کہ ہمارے ہاں رکھیسر ہوا کرتے تھے۔ آپ کا اس فن میں رکھیسر کا مرتبہ ہے۔ ہم آپ کے سامنے کیا منہ کھول سکتے ہیں۔

آنحضرت کے اشعار' مناجات' توحید' دلائل وحدانیت' قدرت الہٰی کے کمال' پندوموعظت' مناقب مشائخ وغیرہ مضامین پر شامل ہیں۔ آپ نے تعریف حسن' خط و خال' زلف و گیسو' غمزہ و کرشمہ کے موضوع پر کبھی نہیں لکھا۔ جکری (ذکری) میں چونکہ قدیم الایام سے بزرگوں کے شجرے کا ذکر ہوتا ہے' اس لیے آپ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہر سرود میں ایک ایک جکری حضرت صاحب ولایت سے لے کر حضرت خواجہ معین الدین سجزی قدس سرہ' تک تصنیف کی اور جو راگ اور تال جس جس جکری کے ساتھ قدیم سے مخصوص ہیں' انہیں تالوں اور پردوں میں انہیں رہنے دیا اور کوئی تجاوز جائز نہ رکھا' کیونکہ آپ کو اسلاف کے خلاف جانا منظور نہیں تھا اس لیے آپ نے اپنی جکری' للت' بلاول' دیساکھ' ٹوڈی' سیام بیراری' دھناسری' اساوری' دیوگری' پوربی' کلیان' کانڑہ' بھاکرہ اوز گنڈ میں' جیسا کہ قدما کا دستور تھا' باندھی۔ خال خال موقع پر بعض تبدیلیاں بلحاظ مضامین و آہنگ و لہجہ ضرور روشناس کیں' جن سے

الفاظ زیادہ دل ربا اور نغمہ زیادہ دل پسند ہوگیا۔ آپ کا کلام متقدمین کے رنگ میں اس قدر مخلوط ہے کہ کوئی اس کو پہچان نہیں سکتا اور نہ نظم میں تخلص لانا آپ کا دستور تھا' جس سے آپ کا کلام دوسروں کے کلام سے ممیز ہوتا۔ آپ نے ارادہ کرکے کبھی کچھ نہیں لکھا بلکہ ذوق و وجدان کی حالت میں جو چیز ذہن میں آئی' قوالوں کو خلوت میں بلا کر اسی وقت تعلیم کردی۔ پھر کسی اور پردے میں اور چیز تصنیف کی' اسی وقت قوالوں کے حوالے کردی۔ آپ نے اپنا کلام جمع کرنے کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ بعض وقت ایسا ہوتا کہ ایک چیز پہلے تعلیم کردی گئی ہے' بعد میں پھر وہی چیز از سرنو ذہن میں آجاتی۔ اس وقت قوال عرض کردیتے کہ اس سے پیشتر ہم کو اس کی تعلیم مل چکی ہے۔

خیال اور چٹکلہ : ان کا مبدا و منشا بلاد فردوست بلدۂ جونپور اور خیرآباد ہیں۔ اس فن میں آپ کو عجیب مہارت حاصل تھی۔ اس صنف نغمہ کے نکات تمام اقسام تغنی سے ممتاز ہیں۔ آنحضرت کو اس فن سے مناسبت طبعی ہونے کے علاوہ روایاتی اطلاعات وراثتاً" بہت کچھ حاصل تھیں کیونکہ سلطان حسین شرقی بادشاہ جونپور حضرت مخدوم قدس سرہ کا مرید تھا اور جو تازہ سرود اور خیال وہ تصنیف کرتا' فوراً ان کی خدمت میں ارسال کرتا اور رائے طلب کرتا۔ قصہ مختصر آنحضرت کی معلومات اس فن میں بے قیاس تھی۔ آپ نے جو خیال تصنیف کیے' ان اطراف اور ممالک پورب میں ان کا بہت رواج ہے۔ قدما کا کلام بھی آپ کے کلام کے ساتھ آمیز ہوگیا ہے۔ معلوم رہے کہ خیال اور چٹکلہ نغمہ کی مشکل ترین صنف ہے۔ اس کے متعلق ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ "اٹنک رکھوا چڑھنا دکھوا"۔ چھوٹے درخت سے اس کو یوں مثال دی گئی ہے کہ خیال اور چٹکلہ چند معدود الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتا' نہ اس میں ردیف و قافیہ کی قید ہے' بلکہ چند فصیح الفاظ میں ایک اعلیٰ مضمون بند کرکے کسی لطیف و نازک پردہ میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ یہ چند الفاظ عجیب و غریب نازک و رقیق نغمے' نرم و پست آہنگ' ترانہ مختلف الصوت و گوناگوں' پیچ در پیچ زیر و بم اور تانوں میں گانے پڑتے ہیں۔ یہی الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں لیکن ہربار

نیا نیا زمزمہ' آواز شدید و غیر شدید اور الحان شیریں و پر حلاوت میں ادا کیا جاتا ہے۔ سامع ان گوناگوں اور رنگ برنگ کے زمزموں سے بے حد لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن ان نغمات کا کماحقہ' ادا کرنا ہر قوال کا کام نہیں بلکہ جو لوگ اس فن کے شیدائی تھے' دوسری اقسام نغمہ کی طرف رخ نہیں کرتے تھے اور دھرپد و بشن پد کی طرف توجہ مبذول نہیں کرتے بلکہ اس کی حفاظت کے لیے عام نغمات کے سننے سے احتراز کرتے کہ مبادا آپ کا مذاق اجنبی چیزوں کی آمیزش سے ناقص اور داغ دار ہوجائے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ان فرودستی خیالات اور چٹکلوں کے لیے بعض سرود مخصوص ہیں' جن کو پردۂ فرودستی یا ہندوستان کہتے ہیں۔ چنانچہ للت' کراسی' سیام بیراری' ٹوڈی فرودستی' دیوگری (دیو گیری)' پوربی فرودستی' کلیان فرودستی اور کانڑہ فرودستی ان کے لیے مخصوص ہیں۔ چونکہ ان کا ہر سرود دیار فرودست کی طرف منسوب ہے اس لیے ان کو فرودستی کہا جاتا ہے۔ جو نغمہ کہ ان میں سب سے زیادہ مشکل اور دقیق ہوتا ہے' اصطلاح میں اس کو قید کہتے ہیں۔ قید کی تانیں نکالنا ہر گویے کی مجال نہیں۔ خود کلاونت اس کی ادائیگی میں عاجز ہیں۔ انہوں نے اس کا نام "ترکیا راگ" رکھ دیا یعنی وہ راگ جس کو ترک جانتے ہیں اور درویش و مشائخ سنتے ہیں۔ بشن پد اور دھرپد کے گویندوں کی یہ طاقت نہیں کہ قید سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ فی زمانا مطرب اور قوال جو چیز خیال کے نام سے گاتے ہیں اس کو اصلی خیال سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ لوگ محض رسماً" و تقلیداً" اسے گاتے پھرتے ہیں' نہ اصلی خیال سے اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ اس سے مماثلت۔ لیکن اب مستمع بھی ایسے ہی رہ گئے ہیں جیسے گویندے ہیں۔ متاخرین قوالوں میں شیخ بچھو ایک مشہور و معروف ہستی ہے۔ سلاطین و مشائخ کے درباروں اور درگاہوں میں مقبول و محترم تھا۔ جس طرح دھرپد میں تان سین نے نام پیدا کیا۔ اسی طرح خیال و چٹکلہ میں شیخ بچھو بے مثال ہے۔ جب موصوف آنحضرت کی خدمت میں آیا آپ کے خیال سن کر دنگ رہ گیا کہ اپنی خورد سالی میں میں نے یہ چیزیں صرف بڑاتم بوڑھوں اور استادوں سے سنی ہیں یا آج آپ کے ہاں۔ اس فن میں رسائی کے

باوجود میں ان تمام شرائط و دقائق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اب ان نغمات قیدیہ اور لحجات فرودستیہ کا واقف کار دنیا میں باقی نہیں رہا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ آج کل کے قوالوں نے خیال اور چٹکلہ کا کس قدر ستیاناس مارا ہے۔ اس نے عرض کی کہ حضور جبھی تو قدما اس فن کے اخفا میں کوشش کرتے تھے اور بے استعدادوں سے بچاتے تھے۔ جب مشائخ اس کو سنتے تھے تو مجلس کو اغیار و اجانب سے خالی کروا کے بلکہ حجرہ کے دروازے بند کرکے ایسی دھیمی سروں میں سنتے تھے کہ اگر کوئی دروازہ کے پٹوں پر کان دھر کر سننا چاہتا تو نہ سن سکتا۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ یہ فن کہیں بے اصول لوگوں کے ہاتھ نہ آجائے۔ اور عام سرود کے ساتھ مل کر بازاری نہ بن جائے۔ شیخ بچھو کا بیان ہے کہ میں اس فن کو اپنے بزرگوں سے چھپ چھپ کر دزدی کے طریقے پر سیکھتا تھا۔ جب انہیں میری چوری کی اطلاع ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے' تو اپنی نادانی سے اس فن کے اوصاف کو ضائع کرنا چاہتا ہے' جس میں خود اس فن کی تباہی مضمر ہے۔ مگر جب انہوں نے مجھ کو اپنے شوق میں کامل پایا انتہاہا" کہا کہ فن موسیقار اسرار الٰہی میں سے ہے اور ہر کس و ناکس اس کے سیکھنے کا اہل نہیں ہے کیونکہ یہ سرود پیچ در پیچ اور دشوار ہے۔ اگر اس کو آشکارا کردیا جائے تو عوام تحریف و تغلیط کرکے اس کو ردی بنادیں گے اور اس کی ندرت' پاکیزگی اور صفائی داغ دار ہوجائے گی۔ شیخ بچھو کا قول ہے کہ ہم جو کچھ بزرگوں سے سنتے آئے تھے' آج آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کیونکہ اس کنوارے سرود میں آج بازاری گویوں نے رد و بدل اور تبدیلیاں پیدا کرکے اس کو بالکل بے نور کردیا ہے۔ شیخ بچھو کہا کرتا تھا کہ میرے بعد اس فن کا کوئی مرد میدان نہیں ہے۔ البتہ وہ دو بھائی' ماکھو اور حمزہ حاجی پوری ہماری روایات کو ایک محدود حد تک باقی رکھ سکیں گے مگر ان کے بعد اندھیرا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بچھو کی وفات کے بعد دونوں بھائیوں نے شہرت حاصل کی۔ جب یہ دونوں بھائی یعنی ماکھو اور حمزہ آنحضرت کے پاس آتے تو اپنے نغمات آپ کے کانوں کے پاس منہ لاکر سناتے اور آنحضرت جس کسی کو سنوانا چاہتے اس کو اپنے پاس بٹھالیتے۔ ایک

مرتبہ راقم حروف کو آنحضرت نے اس طرح سننے کا موقع دیا تھا لیکن کس قدر افسوس ہے کہ موجودہ عہد کے لوگ ان نغمات قدیمہ کے تلذذ سے بالکل عاری ہیں۔ قصہ کوتاہ دونوں بھائیوں نے گذارش کی کہ ہم صرف یہ چیزیں آپ کی خدمت میں سناتے ہیں کیونکہ یہیں ان کی داد ملتی ہے۔ آپ نے استفسار کیا کہ آخر مجالس سلاطین میں کیا چیزیں سنی جاتی ہیں اور کون سے سرود پسند کیے جاتے ہیں۔ جواب میں کہنے لگے کہ وہ چیزیں نہایت سادہ اور معمولی ہیں اور ہر قسم کے کمال سے معرا ہیں مثلاً بعض سادہ فارسیاں اور معمولی خیال۔ یہی چیزیں سلاطین و امراء کو پسند آتی ہیں اور انہی پر ہم کو انعام ملتا ہے حالانکہ کمال کے نقطہ نظر سے وہ چیزیں بالکل معمولی اور رسمی ہیں۔ ہم نرم اور نازک تانوں کو اپنی بلند اور ناخوش آوازوں میں سناتے ہیں۔ ان سے یہ جماعت خوش ہوتی ہے اور اہل مجلس داد دیتے ہیں۔ اس لیے یاد رہے کہ خیال اور چٹکلوں کا علم نہایت دشوار ہے اور اس عہد میں نہ اس کے کامل گویندے ہیں اور نہ نکتہ چین مسمع ہیں۔ قوال جو چیز رسماً" و تقلیداً" سناتے رہتے ہیں' اس کو خیال کہنا لفظ کا غلط استعمال ہے۔

یہ بات جو مشہور ہے کہ فن دھرپد تمام اقساط تغنی میں دشوار ہے' کوئی اصلیت نہیں رکھتی کیونکہ اگر یہ چیز مشکل ہوتی تو جس طرح اور مشکل فن مفقود ہوگئے دھرپد بھی ناپید ہوجاتا۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے زمانے کی طبائع ہر کام میں آسانی ڈھونڈتی ہیں۔ اگر دھرپد مشکل ہوتا تو جس طرح فنون پربندھ' سنگیت' خیال' ہندوستان' فرودست' قید' قول اور ترانہ امیر خسرو معدوم ہوگئے' یہ فن بھی معدوم ہوجاتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یوماً" فیوماً" اس کو ترقی ہورہی ہے۔ عوام اور شعرا اس کی طرف مائل ہیں کیونکہ اس کی زبان عام فہم۔ گوالیری ہے' جس کا مطلب مسمع آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور اس کی تانیں بھی سہولت کے ساتھ ادا کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے طبیعتیں مشکلات سے ہٹ کر آسانی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ اگرچہ دھرپد کی تانوں کی شیرینی اور اس کے الفاظ کی ملاحت میں کوئی شک نہیں لیکن زمان سابق میں کبھی کسی اولیاء اللہ نے

اس کو نہیں سنا اور نہ اس پر رقص و سماع کیا۔ لیکن اب جب کہ زندگی کی ہر صنف میں تغیر واقع ہو رہا ہے، پرانے اصول اور قواعد بدلے جا رہے ہیں اور طبیعتیں دوسرے رنگوں میں رنگی جا رہی ہیں، جس کا جو جی چاہے کرے۔

آپ کے ہاں ایک قوال محبت نامی سرانہ کا متوطن تھا۔ وہ "نسبتاً" اور قوالوں سے زیادہ مستعد اور ذکی تھا۔ شعروانی اور کبیسری میں اپنے اقران پر ممتاز تھا۔ اس کی آواز بڑی رسیلی تھی۔ حتیٰ کہ امراء و سلاطین میں بھی مشہور ہوگیا۔ دنیاوی امرا میں اس کا بڑا رسوخ تھا اور ہر جگہ عزت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ ایک دن بیداری کے پردے میں ایک خیال آپ نے موزوں کیا اور قوالوں کو سکھانے لگے، ان میں محبت قوال بھی موجود تھا۔ وہ ہندوستانی قید تھے، جس میں ایک ایسا مشکل نکتہ آگیا تھا کہ قوال اس کو ادا نہیں کرسکتے تھے۔ آپ نے محبت کی ملامت کو کہ میاں تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ راگ اور تان کے ادراک میں تمہارے متعلق لوگوں کا اس قدر اعلیٰ خیال ہے اور یہ ذرا سی پیچ دار چیز نہیں سمجھ سکتے۔ آخر محبت نے محنت کرکے اس راگ کو ادا کردیا۔ اور برابر ایک ماہ تک اس کی مشق کرتا رہا۔

قسم قول و ترانہ، فارسی، عربی بیت و غزل کی ابتدا حضرت امیر خسرو نے کی ہے۔ گویا خدا کو منظور تھا کہ یہ فن امیر خسرو سے ایجاد ہو اور حضرت بہاء الدین پر ختم ہوجائے۔ آپ نے جو قول اور ترانے امیر کے تتبع میں لکھے ہیں۔ ان میں اور امیر کے کلام میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ آنحضرت کے قوال دہلی میں علماء و مشائخ کی مجلس میں قوالی کر رہے تھے اور ایک قول سرپردہ کے پردے میں انہوں نے گانا شروع کیا۔ اہل مجلس نے "متفقاً" خیال کیا کہ یہ حضرت امیر کا کلام ہے کیونکہ ایسے صنائع اور تراکیب کے برتنے کی کسی اور کی مجال نہیں۔ جب ان سے کہا گیا کہ یہ قول حضرت بہاء الدین کی تصنیف ہے، سب متحیر اور انگشت بہ دنداں رہ گئے وہ قول یہ ہے:

ما سوی اللہ ما سوی اللہ

الا فی و ھم خاطی فیہ باللہ

دونوں "ماسوائے اللہ" کے مختلف معنی ہیں۔ پہلا کلمہ بطریق سوال ہے۔ دوسرے میں لفظ "ما" نافیہ ہے۔

آنحضرت کا بیان ہے کہ حضرت امیر سے پیشتر فارسی ابیات کو ہندی سرود میں نہیں گاتے تھے بلکہ قدیمی بارہ ولایتی مقامات میں مع ان کے تمام اصول و فروع کے۔ اس غنی کو نقش کہا جاتا ہے۔ یہ ایجاد حضرت سلطان المشائخ کے عہد میں شائع ہوئی۔ یہ بات کسی کے خیال میں نہیں تھی کہ خلاصہ نغمات ہندی و فارسی کی آمیزش سے ایک نیا مرکب تیار ہو سکتا ہے۔ امیر نے یہ کیا ہے کہ ملک بالائی کے منتخب پردوں کو لے کر ہندی منتخب چیزوں کے ساتھ' جنہیں گیت اور پربند کہتے ہیں' جوڑ دے دیا ہے اور آج کوئی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ یہ راگ دراصل دو مختلف چیزیں ہیں۔ انہوں نے صرف انہیں ملا ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس سے پیش تر ان کے پوست یا حشویات کو دونوں سے علیحدہ کر کے ان کے اصلی مغز کو لے لیا ہے اور ایسا جوڑ بٹھا دیا ہے کہ دونوں اجنبی ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک جسم ہو گئے ہیں۔ جس طرح دو مناسب رنگوں کو ترکیب دے کر ایک نیا رنگ پیدا کر دیا جاتا ہے اور اس کا نیا نام رکھ دیا جاتا ہے مثلاً نیلے اور زرد کو ملا کر جو رنگ بنتا ہے اس کو سبز رنگ نام دے دیا جاتا ہے' یہی حال امیر نے کیا ہے کہ مختلف اصوات کو آمیز کر کے ایک نئی چیز پیدا کر دی ہے جو سب ہم آہنگ ہیں۔ اسی لیے ان کے نام جداگانہ رکھ دیئے گئے ہیں۔ ایسی ایجاد بغیر فیضان الٰہی نہیں ہو سکتی۔ حضرت امیر کے ایجاد کردہ پردے یہ ہیں :

(۱) ساز گیری	(۲) سرپردہ	(۳) باخرز	(۴) موافق
(۵) محیر	(۶) زیلف	(۷) حجاز	(۸) عشاق
(۹) فرغنہ	(۱۰) حسینی	(۱۱) یمن	(۱۲) ہوا

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ :

(۱) ساز گیری : للت اور ۔عباس کا خلاصہ لے کر پردۂ ولایتی میں آمیز کر دیا ہے۔ اس کی

دو قسمیں ہیں۔

(الف) "بوسلیک" جس میں .صباس کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

(ب) "رہائی" جس میں للت کا عنصر ٹوڑی کے ساتھ زیادہ غالب ہے۔

(۲) "سرپردہ" اس میں دیساکھ کو آمیز کیا ہے۔

(۳) "باخرز" اس میں سرود دیس کار غالب ہے۔

(۴) "موافق" میں ٹوڑی کا خلاصہ موجود ہے۔

(۵) "محیر" میں براری کا انتخاب ہے۔ بعض نے برعکس کہا ہے۔ یعنی "موافق" میں پردۂ براری بتایا ہے اور "محیر" میں ٹوڑی بتائی ہے۔

(۶) "زیلف" میں کھٹ راگ کا خلاصہ ہے۔

(۷) "حجاز" میں اساوری کا ملخص ہے۔

(۸) "عشاق" میں دیوگری اور سارنگ کا مغز ہے۔

(۹) "فرغنہ" میں مالوہ کا انتخاب ہے۔

(۱۰) "حسینی" میں سرود کانڑہ۔

(۱۱) "یمن" بسنت اور ہنڈول سے بنا ہے۔

(۱۲) "ہوا" میں میگھ راگ' گونڈ اور ملار کو نغمہ ولایتی کے ساتھ آمیز کیا گیا ہے۔

(صفحہ ۲۴۵)

لیکن گوجری اور کلیان سے جو نئے ترنمات پیدا کیے' ان کا کوئی خاص نام نہیں رکھا' اگرچہ ان میں بھی فارسی نغموں کو آمیز کیا ہے لیکن ان پردوں میں جو چیزیں گائی جاتی ہیں' حضرت امیر نے ان کے علیحدہ علیحدہ نام رکھے جو ذیل میں مرقوم ہوتے ہیں:

(۱) قول	(۲) ترانہ	(۳) معروفی	(۴) صوت
(۵) بسیط	(۶) دو بحر	(۷) چہار اصول	(۸) نقش
(۹) فارسی	(۱۰) غزل		

۱۔ "قول" امیر کی اصطلاح میں اس چیز کا نام ہے کہ اس کے برداشت میں تاناتلی قلب

اور ایک معروفی منضم کرکے چھوڑ دیں اور دونوں برداشت میں گوناگوں لہجے' موافق نغمات' سنگیت اور پربند باندھ دیں اور ہر مصرع کے ساتھ جداگانہ ترانہ باندھ کر گائیں' خواہ وہ بیت عربی ہو یا فارسی یا دو تین موزوں الفاظ ہوں یا نثر کے کلمات معدودہ ہوں۔ جب ان کو کسی پردے میں بجایا جائے گا تو وہ قول کہلائیں گے۔ اگر شرائط مذکورہ میں کسی ایک کی بھی کمی ہوگی تو وہ ناقص کہلائے گا۔ بشن پد اور دھرپد میں جو تال آتے ہیں' قول میں ہرگز نہیں آتے کیونکہ اس کے مخصوص طریقے پربند سے لے کر قول کے واسطے مخصوص کردیئے ہیں۔ پربند کے تمام تالوں میں سے صرف یہی مشہور ایک دو تال قول میں آتے ہیں۔

۲۔ "ترانہ" وہ ہے کہ قول کے "طرق" کے مطابق یعنی تال کے مطابق قوانین قول سے مضروب کرکے صرف تاناتلی قلب بغیر فارسی یا عربی کے باندھ دیں لیکن یہ ایسے دل کشا اور جان فزا نغمات ہوتے ہیں کہ سامعین کو بے حد محظوظ کرتے ہیں اور فارسی کلمات کے اقتران سے کفایت کرتے ہیں۔ بعض متاخرین نے "ترانہ" کو اور تالوں میں بھی باندھا ہے۔

۳۔ "معروفی" اس کو کہتے ہیں جس میں مجرد دو تین تاناتلی باآواز بلند نغمات قول سے زیادہ باندھی جائیں۔ یہ معروفی فارسی میں بھی انعقاد پاتی ہے۔ اس کو پربند اور گیت کے ساتھ بھی مناسبت ہے۔ امیر کے دور میں پربند کا بہت رواج تھا' چنانچہ جب نایک گوپال آیا تو وہ گیت اور پربند گاتا' اس کے جواب میں امیر کے شاگرد قول بجاتے اور پربند کے تانوں کا جواب قول کے نغموں سے دیتے اور مسلمان اس فن میں ممتاز تھے۔

۴۔ "صوت": مصطلح وہ ہے کہ جب فارسی یا عربی شعر کے گاتے وقت ابتدا میں جو بلند آواز نکالتے ہیں اور اس کا گانا شروع کرتے ہیں' اسے صوت کہتے ہیں۔

۵۔ "بسیط" وہ ہے کہ جس طرح بیت کے دونوں جانب بعض اول و آخر میں تاناتلی رکھ دی جاتی ہے' اسی طرح مصرع کے اول و آخر میں بھی تاناتلی باندھ دی جاتی ہے

اور تانوں کی نزاکت سے دل لبھایا جاتا ہے۔

۶۔ "دو بحر" وہ ہے کہ ایک ضرب میں تال کو معہ ترانہ لایقانہ دو قسم میں منقسم کرکے مضروب کرتے ہیں یعنی اسی تال کو کبھی سرعت اور تعجیل کے ساتھ بجاتے ہیں اور کبھی نرمی اور آہستگی کے ساتھ۔

۷۔ "چہار اصول" اصطلاح میں وہ ہے کہ چار بیتوں کو ایک ہی پردے میں معہ چہار ترانہ جداگانہ اور چہار تال علیحدہ کے باندھ دیں اور یا ایک فارسی میں چار تال مضروب کریں اور یہ قسم بھی گیت اور پربند کے مشابہ ہے۔

۸۔ "نقش" وہ صنف ہے، جس میں آہنگ ایرانی ہندی راگ سے زیادہ اور لہجہ ملک بالا اس میں غالب نمودار ہو اور ہندی لحنیں اس میں مخلوط ہوں لیکن مغلوب حالت میں۔

۹۔ "فارسی" اصطلاح میں وہ ہے کہ ایک بیت میں تاناتلی کو مقرون کریں۔

۱۰۔ "غزل" وہ قسم ہے جس میں ایک غزل یا اس کے انتخابی ابیات سادہ رنگ اور تال میں بغیر تاناتلی کے باندھ دیں۔ اس قسم میں پردۂ ولایتی مغلوب کردیتے ہیں بلکہ بعض اقسام میں نہیں لاتے۔ اس کو جکری اور بشن پد سے زیادہ مشابہت ہے۔

حضرت امیر کی یہ بعض مخترعات و اصطلاحات ہیں۔ انہیں مبتدعات پر تاتاری اور صامتی قوالوں نے حاوی ہوکر امیر کے تمام دقائق اور صنایع کو اشاعت دی اور مشائخ عظام کی خدمت میں سناتے رہے اور وہ اس نئی قسم کی قوالی پر وجد و سماع کرتے تھے۔ اس عہد کے قوال[۷] بھی تعلیم یافتہ قاری اور زاہد و متقی ہوا کرتے تھے اور امرا و اغنیا کے دروازوں پر نہیں جاتے تھے بلکہ اغنیا کے سامنے تغنی سے انکار کردیتے تھے۔ اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آتی ہے کہ ایک بادشاہ نے دہلی کے قوالوں کو قوالی کی غرض سے بلایا۔ قوال جب دربار میں آئے تو دیکھا کہ سلطان بلند تخت پر جلوس فرما ہے۔ قوالوں

نے اپنے دل میں خیال کیا کہ ہم ہمیشہ بزرگان دین کی مجلسوں کے عادی ہیں' جہاں مشائخ عظام کے برابر بیٹھ کر سرود سرائی کرتے تھے' یہاں دنیا دار کے تخت کے پائین بیٹھ کر ہمیں گانا پڑے گا۔ اس میں بزرگان دین کی سبکی ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کچھ گاؤ۔ وہ خاموش رہے۔ دوبارہ حکم دیا کہ سناؤ۔ اس پر انہوں نے اعوذ باللہ پڑھ کر پنج آیت شروع کردی۔ بادشاہ کلام الٰہی کے ادب کے خیال سے تخت سے اتر آئے اور فرش پر قوالوں کے برابر آبیٹھے۔ اس پر انہوں نے فارسی میں اپنی قوالی شروع کردی۔ بادشاہ واپس تخت پر جابیٹھے۔ قوالوں نے از سرنو قرات کلام پاک شروع کردی۔ بادشاہ کو دوبارہ تخت چھوڑ کر فرش پر آنا پڑا۔ اس مرتبہ انہوں نے اپنے کمال سے بادشاہ کو اس قدر مبہوت کیا کہ تخت پر بیٹھنا اس کو یاد ہی نہیں آیا۔ سبحان اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب قوال بھی بزرگوں کی عزت کو بحال رکھنے کے لیے ایسے ایسے حیلے تراش لیتے تھے۔ یا اب یہ زمانہ ہے کہ بزرگ زادے اور امام زادے بھی اپنی حرمت نفس کی پرواہ نہیں کرتے' قوال تو کس شمار و قطار میں ہیں۔ اب نہ وہ اصول رہے اور نہ وہ وضع داریاں رہیں۔ ہمارے عہد میں تمام قواعد و ضوابط بالائے طاق رکھ دیئے گئے ہیں اور کوئی ان قواعد کی پابندی نہیں کرتا۔ اس زمانے میں جو قول اور ترانے رائج ہیں وہ سرتاپا غلط ہیں۔ نہ معنے کے لحاظ سے درست ہیں' نہ غنا کے لحاظ سے' نہ اصولوں کی پرواہ ہے' نہ تانوں کی۔ ایسے ہی ان کے قول ہیں اور ایسی ہی ان کی فارسی ہے۔ اب سب کی رغبت دھرپد کی طرف ہے۔ اس لیے قوال بھی اپنی معاش کمانے کے لیے اس کو سیکھ لیتے ہیں اور اپنا پیٹ بھرلیتے ہیں۔ فن کے ضوابط اور اس کی پابندی سو یہ معلوم ہے۔ چند قدیم فارسی جو بعض پرانے قوالوں کی وجہ سے رائج ہیں وہ بھی بہت جلد مفقود ہوجائیں گی کیونکہ ابنائے زمانہ افعال رذیلہ کی طرف راغب ہیں۔ قدما میں یہی نغمے قلوب کو حقیقت کی طرف جذب کرتے تھے اور موجود سرود شیطان کے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ان نغموں پر صوفیہ و بزرگان دین نے اپنی جانیں دے دی ہیں لیکن دھرپد کے سننے سے آج تک یہ بھی نہیں سنا گیا کہ کسی کو حال آیا ہو' جان دینا

درکنار۔ ان ایام میں اگر کوئی صوفی بشن پد یا دھرپد کے نغموں پر رقص کرتا تو کوئی قوال اس کے لیے استقامت نہ کرتا اور نہ اس کے قریب پھٹکتا۔ وہ یہ کہتے کہ اس صوفی کا ایک پاؤں اگر مصلے پر ہے تو دوسرا نجاست میں ہے اور سماع' جو ایک قسم کی عبادت ہے' پلیدی سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ الغرض قدما کے ان تمام حدود و ضوابط کو اس عہد میں نہایت بے دردی کے ساتھ توڑ دیا ہے اور سد سکندری کو یاجوج کندری(۸) اور ماجوج تتبزی(۹) نے منہدم کردیا ہے اور ناپاکی کا غبار ریاحین گلزار کے رخساروں پر بیٹھ گیا ہے۔

مخدوم بہاء الدین کا بیان ہے کہ اصطلاحات مسطورہ کے علاوہ امیر خسرو کی اس فن میں اور بھی مخترعات ہیں' جو پرانے قوالوں میں رائج تھیں۔ ازانجملہ ایک یہ ہے کہ جب "فارسی" یا "ترانہ" میں نغمہ ایرانی غالب ہو اور بروجہ احسن نمودار ہو اور سرود ہندی مغلوب ہو تو اس کو "مہرہ" کہتے ہیں۔ اگر صورت نغمہ تیج در تیج ظاہر ہو تو اس کو "مقامات" کہتے ہیں۔ چنانچہ اب بھی قوال اپنی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ فلاں قوال اچھے "مہرہ" کے ساتھ گاتا ہے یا فلانا مغنی "بے مہرہ" ہے اور بغیر "ادائے مقامات" کے تغنی کرتا ہے یا فلانا مطرب "مقامات" کے بجانے اور ترنمات کی ادائیگی سے "عاری مہرہ" ہے وغیرہ وغیرہ۔

"فال نہال" ایک اور چیز ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر "فارسی" اور ہر "پردہ" میں مضمون کی رعایت کی جاتی ہے۔ مجالس عرس و شادی و غمی وغیرہ میں ذرا سوچ کر غزل خوانی کی جاتی ہے۔ جو فارسی کہ مضمون کے لحاظ سے خوشی اور شادی پر مشتمل ہو' ایسی چیز مجالس نکاح' ختنہ و مکتب نشینی کودک وغیرہ میں پڑھی جاتی ہے۔ اصطلاح میں یہی "فال نہال" ہے۔ جو فارسی کہ مضامین اندوہ و ملال و رنج و غم پر شامل ہو' اس کو مجالس مصائب و شیون و ماتم میں پڑھنا چاہیے لیکن اگر خوشی کا سرود ماتم میں یا ماتم کا سرود خوشی میں گایا جائے تو یہ قوال کی جہالت کی علامت ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شخص' مسعود کی شادی تھی۔ مغنی جو آیا اس نے ایک بیت شروع

کردیا جس کا ایک مصرع یہ ہے:

از برای کشتن مسعود مضرمی شود

اس سے ایک بری فال لی گئی اور سنا ہے کہ وہ شادی بھی نامبارک ثابت ہوئی۔ مغنی کو چاہیے کہ وہ موقع اور محل کو شناخت کرلے۔ اسی طرح سے اس کو صوفی کی حالت کی تمیز ہونی چاہیے۔ اگر صوفی مقام فراق میں ہو اور مغنی اپنی جہالت سے وصال کی چیز چھیڑ دے تو محض ہذیان سرائی ہے۔

"ریختہ" ایک اور اصطلاح ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو "فارسی" بلحاظ مضمون خیال ہندی کے مطابق ہو اور دونوں زبانوں کے الفاظ ایک ہی تال اور ایک ہی راگ میں باندھے گئے ہوں اور دونوں کو تضمین دے کر پڑھیں تو اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ یہ ریختہ ہر پردے میں باندھی جاسکتی ہے اور اس سے بڑا لطف ملتا ہے۔

امیر کے بعد اور لوگوں نے بھی جدید بدعتیں کی ہیں لیکن ہم ان سے درگزر کرکے صرف ایک کا ذکر کریں گے، جس کا دیار پورب میں بہت رواج ہے۔ اس ملک میں نغمات خسروی رائج نہیں ہوئے، اس لیے ضرورتاً انہوں نے "فارسیوں" کو سادہ راگ اور افتادہ تانوں میں باندھ دیا ہے۔ ان میں قواعد کی پابندی کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

قدیم زمانے میں ایک بزرگ تھے۔ ان کا نام شیخ علائی تھا۔ انہوں نے ہر راگ فارسی باندھا ہے اور ہر بیت میں اپنا تخلص "علائی" بھی مذکور کیا ہے۔ قاضی محمود کی جکری (ذکری) کی طرح ان کے کلام نے شہرت حاصل کی۔ یہ قسم "علائی" کے نام سے یاد کی جاتی ہے چنانچہ قوال آپس میں کہا کرتے ہیں کہ فلاں قوال کو اتنی "علائی" یاد ہیں اور فلاں کو اتنی۔ "علائی" کا ایک بیت راگ کانڑا میں یہ ہے:

علائی معتکف شو گہہ بکعبہ گہہ بدیرے

ایں جا جز خدا چوں نیست غیرے (کذا)

ہمارے عہد کے غریب قوالوں کو تو اب یہ "فارسیاں" بھی یاد نہیں رہیں۔ وہ اپنی

مرضی کی "فارسیاں" بنالیتے ہیں اور انہی کو گاتے پھرتے ہیں۔ ایسی ہی مخلوق ہے اور ایسے ہی ان کے گویئے ہیں۔ بعض فارسیاں بعض کلاونتوں نے بھی بنائی ہیں۔ بعض تان سین کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور بعض اس کے فرزند تان ترنگ خاں کی طرف منسوب ہیں اور ایک مقدار ایسی بھی ہے جو اوروں کی طرف منسوب ہے۔ اکثر مطرب انہیں گاتے بجاتے پھرتے ہیں اور ان میں دھرپد اور بشن پد کی تانیں ادا کرتے ہیں اور اس کو دھرپد کی "فارسی" میں داخل کرتے ہیں لیکن یہ "فارسی" نہ ادھر ہے' نہ ادھر ہے۔ مجھے نظامی کا شعر یاد آگیا:

کلاغی تگ کبک در گوش کرد   تگ خویش تن را فراموش کرد

"سادرہ" : یہ ایک عجیب و غریب روش ہے جو لطیف نغموں اور شریف الحانوں پر شامل ہے۔ اس میں روح پرور تانیں کوٹ کوٹ کر بھردی ہیں۔ آنخضرت اس فن میں بھی سب پر گوئے سبقت لے گئے تھے اور اس صنف میں بھی کمال انہی پر ختم تھا۔ اب ان کی وفات کے بعد گویا یہ صنف بھی مردہ ہوگئی۔ آنخضرت کہتے تھے کہ اس فن کی ولادت گاہ دیار میوات ہے۔ اس کے قدیم اساتذہ میں میر گیان کا نام ہم تک پہنچا ہے اور قدیم سادرے اسی میرگیان کے اشعار اور کبیسری میں ملتے ہیں۔ میوات کی بولی میں یہ کلمات قند و شکر کی طرح شیریں اور با حلاوت معلوم دیتے ہیں۔ اس فن کے آخری استادوں میں میر گنگل کا نام نہایت معروف ہے۔ اس نے اس قدر ترقی کی ہے کہ قدما سے بھی بازی لے گیا۔ اس فن میں اس نے نئی صورتیں اور جدید صنعتیں پیدا کیں۔ بعد میں وہ جونپور چلاگیا۔ وہاں اس نے "فرودستی" نغموں اور لہجات ہندوستان کو "سادرہ" میں داخل کرکے اس پر نیا رنگ چڑھا دیا' جس سے "سادرہ" میں عجیب لطافت اور لوچ پیدا ہوگیا اور مقبول عوام ہوگیا۔ میر گنگل کے یہ اضافے میر ہمن صامتی دہلوی کے' اسی میدان میں اضافوں سے کسی حال میں کم نہیں ہیں اور جو کام ان دونوں شخصوں نے کیا کسی اور سے نہ ہوسکا۔ یہ فن سادرۂ نادرہ میواتی زبان میں اور سرہند و لاہور کی بعض زبانوں میں ملتا ہے' جس میں چند مصرعے یا محدودہ فقرے

ڈھاڑی قوم کی طرز میں ہوتے ہیں، جسے وہ اپنی اصطلاح میں بیسری کہتے ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے وہ بالعموم ممدوح کی دلاوری، شجاعت، سخاوت، فتوت اور مروت کے ذکر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں جنگ آزماؤں، شہسواروں، میدان کارزار کے معرکوں اور مقتولوں کا ذکر، جو استعارات و تشبیہات سے پر ہوتا ہے، نرم اور ملائم پردوں میں کیا جاتا ہے اور ہر مصرع میں مختلف تانیں جو دل نوازی اور دل آویزی میں ایک دوسرے سے بہتر ہوتی ہیں، جمع کر دی جاتی ہیں۔ بعض الفاظ میں لمبی تانیں بہ سبیل درنگ ایسے طور پر لی جاتی ہیں کہ عین طول کی حالت میں معقول حرکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ ہر حرکت میں ایک سکون اور ہر سکون میں گوناگون ظاہر و پوشیدہ تفخیم و ترقیق نغمات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جس طرح قند کے ذکر سے انسان کا منہ میٹھا نہیں ہوسکتا، اسی طرح ان کے ذکر سے انسان لذت اندوز نہیں ہوسکتا۔ ہمیں اسی قدر تسلیم کرلینا چاہیے کہ فن سادرہ اعلیٰ فنون کے طبقے میں شامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر گنگل، ساکن گڑگانوہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی ایک لڑکی تھی، اسی کو تعلیم دی تھی۔ دختر نے اپنی اولاد کو سکھایا تھا۔ اب اگر اس فن کا کچھ شمہ باقی ہے تو وہ اس لڑکی کی اولاد میں تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن طویل مدت گذر جانے کی وجہ سے اس فن میں بھی خرابی اور تباہی نے اپنا راستہ بنالیا ہے۔ جس طرح امیر خسرو کی "فارسی" کا قوالوں نے ستیاناس کیا ہے، اسی طرح میواتی گویوں نے "سادرہ" کی جڑ ماردی ہے۔ آنحضرت کو، جیسا میں پہلے گذارش کرچکا ہوں، اس فن میں بہ حد غایت کمال تھا۔ آپ کی مجلس میں اکثر قدیم سادرے پڑھے جاتے تھے اور اگر کبھی، اس میں کوئی کبیسری چھڑگئی تو چونکہ جنگ و معرکہ اس کے لوازمات سے ہے، اس لیے آپ کے خیالات معاً روح اور نفس کی آویزش کی طرف رجوع ہوجاتے، جس کو ہندوی زبان میں مایا برنبھ کہتے ہیں کیونکہ اس مرشد کے اشعار میں مدح و قدح، جنگ و جدال اور خط و خال کے مضامین نہیں باندھے جاتے تھے بلکہ آپ کا کلام ذکر توحید، وعد و وعید، مذاکرہ، مواعظ و نصائح، مناجات اور مناقب اولیاء اللہ سے معمور ہوتا ہے۔

آنحضرت نے دیار ٹھٹھہ کی زبان میں بھی اشعار لکھے ہیں جن کو اسی دیار کے سرود میں باندھا ہے۔ فن تما و پانجلا جس کو ملتانی اور لاہوری زبانوں میں گایا جاتا ہے' اس قسم کے اشعار بھی اس امام ہمام نے انہی مقامات کے سرود میں تصنیف کیے ہیں۔ علیٰ ہذا چندو اور دھرو میں' جو تلنگانہ' دراوڑ اور کنڑی لغات میں ہوتا ہے' آپ کا کلام یادگار ہے۔

دھرپد میں چند مصرعے یا فقرے گوالیاری زبان اور سنکیرن سرود میں ہوتے ہیں۔ دھرپد کی طرف اگرچہ آپ کی چنداں رغبت نہ تھی لیکن اس فن کے تمام دقائق و مضامین میں بہ حد غایت درک تھا اور اس کی تمام اصطلاحات پر عبور تھا۔ فرماتے تھے کہ دھرپد کو راجہ مان گوالیری کے عہد سے رواج ملا ہے۔ اس راجہ کو موسیقی سے بے حد الفت تھی۔ اگرچہ ایک طرح سے دھرپد راجہ مان کے عہد سے قدیم ہے لیکن راجہ مان نے اس میں شک نہیں کہ اس کو نئی آب و تاب دے دی ہے۔ اس کی تہذیب و ترمیم میں بے حد مشقت کی ہے اور اس کو اس قدر خوبصورت اور دلفریب بنا دیا ہے کہ ہر شخص اس کا والہ و شیفتہ بن گیا اور سنگیت کی گرمی بازار سرد پڑ گئی کیونکہ فن سنگیت کا اکتساب قدما کی کتب اور تحصیل علوم نقلیہ پر انحصار رکھتا ہے اور لوگوں کی ہمتیں ان ضوابط مشکلہ کے استحصال سے عاجز ہیں۔ پس علمی رکاوٹ کی مشکلات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے اپنی تمام توجہ دھرپد کی طرف منعطف کرلی کیونکہ یہ صنف نغمہ بہت آسان ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں قوانین کتابی کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس کا مطلب بھی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ وہ گوالیر کی زبان میں' جو نرم و ملایم' فصیح و ملیح' شیریں و فتنہ خیز و عشق انگیز بلکہ فسق ریز ہے' چند مصرع ہوتے ہیں' جو آسان راگ اور تال میں بربست کیے جاتے ہیں اور صریح الفہم ہونے کی وجہ سے سب کی توجہ اس کی طرف مائل ہوگئی ہے اور قواعد کتابی سرود کو نسیا" مسیا" کردیا گیا ہے۔ راجہ مان کے بعد یہ صنف نغمہ اور بھی مقبول ہوتی گئی اور جب میاں تان سین کو شہرت حاصل ہوئی اور انہوں نے راجہ رام اور اکبر بادشاہ کے نام پر دھرپد

نفیس مضمون اور ملیح تانوں میں بستہ کیے اس وقت سے اس کی رونق دوبالا ہوگئی اور اب ترقی کے قدم اور بھی تیز مار رہا ہے۔

جب راجہ مان دھرپد کی ترویج و تشیع سے بہت خوش ہوا' اس نے چاہا کہ بابا بھنون کو سنا کر داد طلب کرے۔ یہ بھنون اپنے فن میں نایک اور فاضل تھا اور اپنے عہد کا مشار الیہ تھا اور اب گوشہ نشینی اختیار کرکے انزوا میں رہتا تھا اور زہد و ریاضت میں مشغول تھا۔ سنگیت' چند' دھرو اور پربند کی تصنیف اس کا مشغلہ تھے' جن کی سرود سرائی اس کے مذہب و آئین کے مطابق داخل عبادت تھی۔ مخلوق تعظیما" اس کو بابا بھنون کہا کرتی تھی۔ ایک دن راجہ مان نے بابا بھنون کی خدمت میں حاضر ہوکر بابا کو اپنا دھرپد سنایا' جس کے سننے پر بھنون نے اپنے دل میں نفسانی حلاوت کا جذبہ محسوس کیا۔ بہت رنجیدہ ہوا اور راجہ کو اس نے بد دعا دی اور بولا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے اس دل ربا فن کو رواج دے کر شاستر کی کتابوں کی بنیاد جڑ سے کاٹ دی ہے کیونکہ سہولت اور آسانی کے پیدا ہوجانے سے کوئی شخص بھی قواعد موسیقار کی تحصیل میں کوشش نہیں کرے گا اور نہ قواعد تغنی کی پابندی کرے گا۔ اے راجہ تو نے ہمارے مقدس فن میں کھنڈت ڈالی ہے' تو اپنے افعال کی سزا بھگتے گا' جس طرح قدما کے علوم کی جڑ تو نے کاٹی ہے' اسی طرح تو بھی نامراد رہے گا اور تیری ریاست تباہ ہوجائے گی۔ راجہ مان بابا کے پاس سے بہت غمگین لوٹا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ کو بد دعا لگ گئی اور اس کا راج تاراج ہوگیا اور اس کی نسل منقطع ہوگئی۔

ایک دن نایک گن سین پسر نایک ساہو جس کا نام فاضل تھا اور فن دھرپد میں اسم بامسی فاضل تھا' آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور مجرے میں پربند قدیم و جدید سناتا رہا۔ بعد میں ان کی خوبی اور عدم خوبی کا ذکر آگیا۔ آہستہ آہستہ دھرپد کا بھی ذکر چھڑگیا۔ اس فاضل نے اور اور نادر چیزیں اپنے حوصلے اور ہمت کے مطابق سنائیں۔ آنحضرت نے انہیں سنا اور پسند کیا۔ بعد میں فرمانے لگے کہ قدیم نایک دھرپد کو اور ہی ترکیب سے بستہ کیا کرتے تھے یعنی دھرپد میں "جت" کا انضمام لازمی جانتے تھے کیونکہ

"جت" کے وصل سے دھرپد کے چار چاند لگ جاتے ہیں اور جب دھرپد میں "جت" نہ ہو تو وہ ناقص اور ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنے گویوں کو حکم دیا کہ وہ دھرپد، جس کو کانڑہ راگ میں مع "جت" باندھا گیا ہے، ہمارے دوست فاضل کو سناؤ۔ دیکھیں اسے پسند آتا ہے یا نہیں۔ مطربوں نے نرم اور آہستہ لحنوں میں راگ شروع کیا۔ فاضل نایک اس دھرپد کی حلاوت و طراوت، تانوں کی تراوٹ اور الفاظ کی سلاست پر بالکل مفتون ہوگیا۔ اس پر رقت کی حالت طاری ہوگئی۔ چشم پر آب ہوا۔ جب حواس درست ہوئے، پانی منگوا کر وضو کر کے دوگانہ ادا کیا، اور عرض کرنے لگا کہ سرود گوئی کا یہ حق ہے، اس سے مافوق متصور نہیں ہوسکتا۔ گن سین اکثر روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ہمیشہ اپنے علمی معلومات کا دائرہ وسیع کرتا اور کتابی قواعد، سر، پرستار، کھند میر، تال پرستار، سنکھیا میر، پاتال میر، شٹ، اوشٹ وغیرہ کے متعلق آنحضرت کے خدام سے استفسار کرتا رہتا۔ بعض فوراً سمجھ جاتا، بعض اس کی فہم میں نہ آتے۔ اس تبحر کے باوجود گن سین قواعد کے میدان میں عاری و عاطل تھا۔ مختصر یہ کہ گن سین کی سمجھ میں شت اور اوشٹ نہ آئے لیکن آنحضرت کی محبت کی برکت سے اس کے اخلاق کی اصلاح ہوگئی۔ اس میں خصائل حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ آگئے۔ نماز و روزہ اور دیگر احکام دین کا پابند ہوگیا۔ اس نے ایک مسجد بھی بنائی۔ اس کے لیے امام و موذن مقرر کیے۔ سخاوت پرست، ایثار پسند، متواضع اور مہمان نواز بن گیا ورنہ اس فرقے کی بے باکی اور مذہب سے بیگانگی ضرب المثل ہے۔

"بشن پد" آنحضرت نے ہر راگ میں باندھا ہے۔ بعض کبیر جولاہے کی تقلید میں اور بعض سورداس نابینا کے طرز میں۔ ان میں وہی زبان ہے، وہی سرود اور مقررہ تال ہیں۔ ان میں وہی عجیب و غریب تانیں ہیں جن کو "رام رموہ" کہا جاتا ہے۔ ان کے مضامین درویشانہ اور صوفیانہ ہیں، جو مواعظ سلوک اور مناجات پر شامل ہیں۔ بعض "پدوں" میں حقائق تصوف کا بھی اظہار کیا ہے، لیکن وہ ردی اور ثقیل تانیں جو بشنوؤں اور بیراگیوں میں عام رائج ہیں اور جن کو بلالی تانیں کہا جاتا ہے، آنحضرت نے

ترک کردیں اور ان کی بجائے نفیس اور روشن نغمے وضع کردیئے' جس سے اس صنف میں عجیب شگفتگی اور دل آویزی پیدا ہو گئی ہے۔

آنحضرت کے پاس اکثر بیراگی بھی آتے تھے اور اپنے شعر اور کبیسری سناتے رہتے تھے۔ ان میں ایک کا نام داس گھنون تھا' جو زبردست فاضل اور پنڈت اور زاہد و تارک تھا اور اپنے کمالات اور علمی فضیلت کے لیے مشہور تھا۔ رائے' راجپوت اور سکھ راجہ اس کے بے حد طالب اور معتقد تھے۔ وہ ہجوم عام سے بھاگتا اور سیر و سفر میں اپنا وقت گزارتا۔ متصوفانہ پدوں کو مختلف سرود میں باندھنے کے لیے بے نظیر تھا۔ اس کی ایک عادت تھی کہ اپنے اکثر "پد" سول فاختہ (اصول فاختہ) کی تال میں باندھتا اور کہتا کہ میں ان متکبر کلانوتوں کو جلانے کے لیے ایسا مضروب کرتا ہوں کیونکہ وہ سول فاختہ پر بہت نازاں ہیں۔ دعوے کرتے ہیں کہ فرقہ بیراگی اور بیشنوئی اس حرفہ سے ناواقف ہیں۔ میں بھی ان "پدوں" کو اسی تال میں باندھتا ہوں تاکہ جب وہ میرے "پدوں" کو اسی تال میں مضروب دیکھیں گے تو ہار مان جائیں گے۔ قصہ کوتاہ داس گھنون اپنی قوم میں لاثانی اور مقبول تھا اور وحدت ذات میں قدم رکھتا تھا۔

ایک دن گفتگو ہو رہی تھی۔ اتنے میں آنحضرت کی زبان سے نکلا کہ یہ لوگ خواہ کتنا ہی حقیقت کی بادیہ پیائی کریں اور تصوف کو اپنا شعار بنالیں لیکن دوئی اور بیگانگی کا رنگ ان کے دل سے دور نہیں ہوتا کیونکہ اگر ان سے دوئی نکل جاتی تو یہ چھوت' جو کھانے پینے میں ہم سے کرتے ہیں' زائل ہوجاتی اور یکتائی پیدا ہوجاتی۔ داس گھنون نے یہ بات سنی۔ کچھ جواب نہ دیا اور اپنے موقع کا منتظر رہا۔ کچھ مدت کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ آنحضرت اور داس گھنون اکٹھے بیٹھے تھے۔ ہندو کثیر تعداد میں جمع ہوگئے۔ رائے اور راجپوت آتے اور داس جی کو ڈنڈوٹ کرتے اور نہایت ادب سے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھ جاتے۔ اتفاقاً اسی وقت ایک دیگ' سنبوسوں کی بھری' گرما گرم' کوئی شخص آنحضرت کے لیے تحفہ میں لایا۔ داس گھنون نے یہ موقعہ اپنے اتحاد اور یکتائی کے ثابت کرنے کے لیے غنیمت جانا۔ اپنے معتقد راجپوتوں کی کوئی پروا نہ کی۔ اٹھا اور

سیدھا دیگ کی طرف بڑھا۔ اس کا سرپوش الگ پھینک دیا اور اس میں سے سنبوسے نکال کر اس نے کھانے کا ارادہ کیا۔ آنحضرت اور اس کے تمام معتقد یہ حرکت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ آپ فوراً اٹھے اور بغیر وقت ضائع کیے اس کی طرف لپکے اور پوری قوت کے ساتھ سنبوسے اس کے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیئے۔ داس جی اس پر رنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے کہ اے امام کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرا احترام ان راجوں اور راایوں میں بنا رہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ان دولت مندوں کی مطلق پروا نہیں کرتا اور میری نگاہ میں خس کی برابر ان کی وقعت نہیں۔ میں اخلاص یک جہتی اور یکتائی کے عقیدے میں مضبوط ہوں اور اس پر کسی طرح زد ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ آنحضرت اس کی اس یگانگت' اعتقاد' صفائی اور یک رنگی کے معترف ہوئے اور بولے کہ داس جی وہ بات اس روز میں نے محض مذاق میں کہہ دی تھی۔ اس کا یہ مقصد نہیں تھا کہ مجھ کو تمہاری یگانگت میں شبہ تھا یا تمہارا امتحان مقصود تھا۔ یہ کھانا پینا محض ظاہر بینوں کے لیے ثبوت ہے ورنہ مقصود خلوص نیت ہے۔ وہ ہندو اپنے پیر کی یہ حرکت دیکھ کر نہایت بے تاب ہوئے اور بار بار رام رام کہتے تھے لیکن ادب کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

داس جی مہاراج نے ایک دن' آنحضرت سے رخصت ہوتے وقت ایک بات کہی' جس سے مفہوم ہوتا تھا کہ اب اس عالم میں جسمانی ملاقات نہیں ہوگی۔ وہ بات یہ تھی کہ حضرت میں آپ کی خدمت میں ایک ضروری پیغام بھیجوں گا۔ قصہ یوں ہے کہ جب داس جی کی وفات کا زمانہ قریب آیا اور ان پر اپنی وفات ظاہر ہوگئی' اپنے شاگردوں کو بلایا اور کہنے لگے کہ میں نے راگ بلاول میں ایک "پد" بنایا ہے' تم اس کو سیکھ لو لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا چوتھا فقرہ' میں صرف ایک بار بتاؤں گا۔ اس کے بعد انہوں نے پہلے تین مصرعے شاگردوں کو خوب اچھی طرح سکھا دیئے۔ پھر شاگردوں سے فرمایا کہ اب تمہارے امتحان کا موقع آتا ہے۔ میں اس چوتھے مصرعے کو صرف ایک مرتبہ ادا کروں گا اور میری وصیت ہے کہ یہی "پد" میری طرف سے' مخدوم بہاء الدین کی

خدمت میں، میرا آخری پیغام ہے، جس کو تمہارا فرض ہے کہ ان تک پہنچا دو اور وہ چوتھا مصرع یہ ہے:

داس گھنون جیوں جل ترنگن جل میں جل جو سمائے

یعنی داس گھنون دریا کی لہروں کی طرح ہے کہ لہریں دریا میں اٹھتی ہیں اور اسی میں غائب ہوجاتی ہیں۔ اس ماتمی "آبھوگ" کے اختتام پر داس جی کا طائر روح ان کے قفس تن سے پرواز کرگیا۔ اس پد کے پہلے تین مصرعے یہ ہیں:

اے من نام پائیں مانیں تھیں دکھ سکھ بھائے
یہ جو کچھو کو سپنو سو و یکھنت جائے رے بہ جائے
جے بچن ست کرن کی ہے تے میں کہی سنائے
داس گھنون جیوں جل ترنگن جل میں جل جو سمائے

داس جی کے شاگردوں نے بڑی تلاش کے بعد آنحضرت کا پتہ لگایا، اور ایک دن آکر گرو جی کا پیغام لا سنایا۔ آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ آنحضرت داس کے "پدوں" کو بہت دوست رکھتے تھے۔

فن پربند: اس کو سنگیت بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تحصیل قدما کی کتابوں اور استاد کامل کی رہنمائی پر منحصر ہے۔ اس فن کے دقائق میں آپ کو اس قدر کمال تھا کہ مرجع و مآب بن گئے تھے۔ انہوں نے اس فن کے قواعد کا از سر نو احیا کیا۔ اس میں اس قدر درک حاصل کیا کہ نایک اور گندھرپ اپنی مشکلات آپ سے حل کرتے تھے اور استفادہ کرتے تھے۔ یاد رہے کہ اس فن کے اشعار بالتمام سنسکرت زبان میں ہیں، جو ہندوؤں کی سب سے مقدس اور متبرک زبان ہے یعنی اس کو وہی درجہ حاصل ہے، جو مسلمانوں میں عربی کو حاصل ہے۔ سنسکرت، معلم کامل اور استاد فاضل کی رہنمائی کے بغیر نہیں سیکھی جاسکتی۔ ہندوؤں کے وید اور پران اور منتر اسی زبان میں ہیں اور اسی زبان میں ان کے گیت اور پربند ہیں۔ آنحضرت اس زبان میں بے تامل بلیغ عبارت، جو استعارات سے مملو ہوتی تھی، بنا سکتے تھے۔ آپ نے "پربند" اسی زبان میں اور اس

کے قواعد و ضوابط کے مطابق باندھے ہیں تاکہ اس فن کا طالب ان کے ذریعے سے اس کے ضوابط و قواعد پر بھی عبور کرسکے۔ اس زمانے میں بہت کم لوگ سنسکرت کے فاضل ہیں اور اس کا رواج جاتا رہا ہے۔ آپ نے طلبہ کی سہولت کی غرض سے "پربندوں" میں تمام قواعد کتابی جمع کردیئے ہیں تاکہ مبتدی قدما کی کتابوں کی تلاش کیے بغیر اس کے ضوابط و قواعد معلوم کرسکے۔

علم موسیقی کی بنا سات ابواب پر ہے' جس کو "پست ادھیا" کہا جاتا ہے :

(۱) "سر ادھیا" (۲) "تال ادھیا" (۳) "راگ ادھیا" (۴) "پربند ادھیا" (۵) "ناد ادھیا" (٦) "بر کیرن ادھیا" (۷) نرت ادھیا"۔

ان کے قواعد بے شمار ہیں۔ اگر لکھنے بیٹھوں تو میری کتاب لمبی ہوجائے۔

اختراع ساز خیال:

اس ساز کے اختراع کی یہ وجہ ہوئی کہ عنفوان شباب سے آپ کو سرود سے بے حد محبت تھی۔ چونکہ آپ نے اور مشائخ کی طرح فتوحات کے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا اور تمام علائق دنیوی سے قطع تعلق کرکے جادۂ تجرید و تفرید اختیار کرلیا تھا' اس لیے آپ سازندوں اور قوالوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ یہ قوم طمع پیشہ ہے اور قناعت اور توکل پر رہ نہیں سکتی اور نہ فقرو فاقہ پر گزارہ کرسکتی ہے۔ ایک طرف یہ عدم استطاعت' دوسری طرف سرود کا انتہائی شوق و ذوق۔ ان اثرات میں آپ نے سوچا کہ کوئی ایسا شیریں آواز آلہ تیار کرنا چاہیے' جس سے کوئی شخص واقف نہ ہوسکے اور کسی کو پتہ نہ لگے کہ کیا ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی آپ نے اس ساز کا نمونہ قلمدان کی شکل میں تیار کیا۔ اس کے شکم میں تمام ضروریات مثلاً تار' سار' گردانک اور گرہ وغیرہ مخفی کردیں۔ اب وہ ایک ایسی چیز بن گئی کہ اگر ظاہر میں دیکھئے تو خیال کریئے کہ قلم دان پڑا ہے۔ اس اخفا کی یہ وجہ تھی کہ آپ بے حد شرمیلے اور حیادار واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ آپ بھی اور اولیائے کرام کی طرح

سرود کو دوست رکھتے تھے۔ لیکن آپ کو منظور نہ تھا کہ سرود سازی کے سلسلے میں آپ کا نام آئے اور کوئی ساز بجائیں یا کوئی نغمہ گائیں۔ عوام میں اس امر کے اقدام سے آپ کو حیا مانع تھی۔ اس طرح پچاس ساٹھ سال کی عمر تک آپ نے اس ساز خیال کو ہمیشہ پوشیدہ رکھا۔ جب کبھی جنگلوں میں ہوتے یا مقام خلوت ہوتا' اس قلم دان نما ساز کو نکال کر اپنا دل بہلاتے اور بعد میں پھر اس کو تہہ کرکے اور اس کی درزوں کو بند کرکے قلم دان کی شکل میں بنادیتے اور غلاف چڑھا کر اپنے سامنے پڑا رہنے دیتے۔ اس راز کی کسی دوست یا غیر کو خبر نہ تھی۔ سبحان اللہ ایک وہ زمانہ تھا جب دنیا میں اس قدر حیا موجود تھی یا اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ اشراف زادے اور مخدوم زادے' امرا و روٴسا کے دربار میں بغیر کسی شرم و حجاب کے گاتے بجاتے اور ناچتے پھرتے ہیں اور اس کو اپنا تمغائے امتیاز سمجھتے ہیں۔ اس بے باکی اور بے حیائی کو عین ہنر خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے تمام پرانی رسموں کو یک قلم مٹا دیا ہے۔ زہد و تقویٰ' ریاضت و مجاہدت کو ترک کردیا ہے اور سرود کو' جو مشائخ کی غذائے روح تھا' نفسانی جذبات کے بھڑکانے کا آلہ کار بنالیا ہے۔ جس ناپاک استعمال کے احتمال کی بنا پر متشرعین نے اس کو حرام بنایا تھا' ان تمام احتمالات کو انہوں نے سچ کرکے دکھا دیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس راز کے کھلنے کا یہ باعث ہوا کہ لاڈن چوکھہ کو اس ساز کے اوصاف اتفاقیہ معلوم ہوگئے۔ وہ بہت مصر ہوا کہ آنحضرت مجھ کو اس کا بجانا سکھلادیں۔ آخر آپ نے اس کی دل شکنی گوارا نہ کی اور سکھا دیا۔ اس طرح لاڈن اس ساز کے استعمال کو سیکھ گیا اور بخوبی کامل ہوگیا۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ نواب مقرب خاں ساکن کیرانہ کو بھی' جسے آنحضرت بمنزلہ فرزند عزیز جانتے تھے' اس آلے کی خوبیوں کی اطلاع ہوگئی اور لاڈن پسر داوٴد چوکھہ سے اس کو سنا اور جب کبھی آتے اس کو اشتیاق کے ساتھ سنتے۔ اسی اثنا میں استاد شریف' جو فن موسیقی میں فاضل زمانہ تھا' خراسان سے ہندوستان آیا اور شاہی دربار میں اس کی تقریب ہوئی اور بادشاہ نے اس کو منصب دار بنادیا۔ مقرب خاں نے ابتدا ہی سے استاد شریف سے دوستی کرلی تھی اور آپس میں بہت جلد محبت اور

دوستی قائم ہوگئی۔ بر سبیل تذکرہ ایک دن مقرب خاں نے "خیال" کا ذکر استاد شریف سے کیا۔ استاد نے اس کے دیکھنے کا بے حد اشتیاق ظاہر کیا اور مصر ہوا کہ کسی نہ کسی طرح اس نو ایجاد ساز کو دکھاؤ۔ مقرب خاں اس معاملے میں متامل تھا کیونکہ وہ آنحضرت کے مزاج سے واقف تھا۔ آخر یہ حیلہ کیا کہ لاڈن آنحضرت سے پوشیدہ استاد شریف کے پاس جائے اور اس کو بجا کر دکھائے۔ استاد شریف اس ساز کو سن کر بے حد محظوظ ہوا۔ کہنے لگا کہ میں نے موسیقار پر تمام کتابیں پڑھ ڈالی ہیں اور ہر قسم کے سازوں کو، خواہ ایرانی ہوں یا ہندوستانی، استعمال کیا اور ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خامی دریافت کی ہے لیکن اس ساز میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ وہ گویا انسانی جذبہ رکھتا ہے کہ ہر نوا کے ادا کرنے پر قادر ہے اس کے بعد لاڈن سے استاد نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ آنحضرت سے ملوں، تم میری ان سے تقریب کراؤ اور اجازت لاؤ۔ یہ موقع ایسا تھا کہ لاڈن کو تمام واقعہ بلاکم و کاست کہنا پڑا۔ آپ کو اس افشا کا رنج ہوا لیکن بعد میں آپ نے اپنی ایجاد کو آشکارا کردیا۔ کسی سے نہ چھپاتے اور ہر ایک کو تعلیم دیتے۔ اب اس کی طرح طرح کی شکلیں بننے لگیں اور بہت کچھ اضافے کیے گئے۔ جب "خیال" کی شہرت عام ہوگئی، بادشاہ جہانگیر نے اس کے سننے کا اشتیاق ظاہر کیا اور آنحضرت لاڈن خیالی کو لے کر گئے اور جہانگیر اس کو سن کر نہایت خوش وقت ہوا۔ اس موقع پر جہانگیر کو ایک مذاق بھی سوجھا۔ لاڈن اور آنحضرت اور اپنے درمیان ایک پردہ کھنچوا کر، اس نے نیل کنٹھ کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ بتاؤ یہ کیا ساز بج رہا ہے۔ نیل کنٹھ اس آواز پر دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر عرض کی کہ اس کے تار لوہے کے معلوم ہوتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا تمہارا یہ خیال تو صحیح ہے لیکن آگے؟ نیل کنٹھ بولا کہ اس میں سار بھی موجود ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ بھی سچ ہے لیکن نام بتاؤ۔ نیل کنٹھ نے گزارش کی کہ جس قدر ساز معلوم ہیں، ان سے یہ بالکل علیحدہ چیز ہے اور نہ کسی ساز میں اس قدر گھلاوٹ اور رسیلا پن موجود ہے۔ بادشاہ نے پردہ ہٹانے کے لیے اشارہ کیا۔ ملازموں نے تعمیل کی۔ نیل کنٹھ نے دیکھا کہ آنحضرت مسند پر بیٹھے ہیں اور لاڈن چوکھ ان

کے سامنے خیال بجا رہا ہے۔ نیل کنٹھ دوڑ کر آپ کے قدموں میں جاگرا۔ آپ نے فرمایا'اے نیل کنٹھ! کھل کھیلنا یہاں مناسب نہیں' یہ بادشاہ کا دربار ہے۔ اس کے بعد جہانگیر کو اس کے نام رکھنے کا خیال آیا۔ پوچھا کہ کیا نام رکھا جائے۔ نیل کنٹھ نے عرض کی' جو بادشاہ سلامت پسند کریں۔ اس پر بادشاہ نے فرمایا کہ س کا نام "سر کبمیر" یا "گن کبمیر" رکھنا مناسب ہوگا کیونکہ اس میں سے مختلف اصوات نکلتی ہیں۔ (آئندہ کئی ورق نصف رہ گئے ہیں اس لیے بے تعلق و بے ربط اطلاع ملتی ہے)۔ آنحضرت نے ارشاد کیا کہ اس کا نام "بادست" یا "نادست" رکھا جائے تو مناسب ہے' ورنہ میں تو اس کو "خیال" کہتا ہوں کیونکہ عرف میں "خیال" مشہور ہے۔ دوسرے درویشوں کی ہر بات اور ہر فعل کو عوام الناس "خیال" کہتے ہیں لہٰذا اگر اس کا نام خیال رہا تو اس سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ درویشوں کی ایجاد ہے۔ علی ہذا اس میں تواضع کی علامات بھی ہیں یعنی وہ متقدمین کے آلات کے مقابلے میں سادہ' مختصر' آسان اور سہل ہے۔ کچھ اس بنا پر بعد میں یہ ساز "خیال" ہی کے نام سے پکارا گیا۔ اس ساز میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جس طرح دیگر مزامیر میں نیا سرود شروع کرتے وقت ٹھاٹھ بدلنا پڑتا ہے' اس کے سار اور تار کی تحریک و تقلیب کی جاتی ہے اور ساروں کو اکھاڑ کر ان کی مقررہ جگہ سے دوسری جگہ منقلب کرنا ہوتا ہے۔ اس میں یہ بات نہیں ہے۔ نہ کسی تحریک اور انتقال کی ضرورت ہے۔ جہاں ایک مرتبہ اس کو مرتب کرلیا' پھر اس کے ٹھاٹھ میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور اس ٹھاٹھ میں دنیا بھر کی چیزیں بجائی جاسکتی ہیں۔ اس ساز میں چار سار ہوتے ہیں لیکن ایک سطح پر نہیں ہوتے بلکہ مختلف سطحوں پر کوئی بلند اور کوئی پست ہیں اور تمام سروں کو ان چار ساروں میں اس حکمت سے بند کردیا ہے کہ من بعد ان کے ہٹانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح اس کے سات تار ہیں' جن میں اختلاف نہیں ہے یعنی جب ان کا "اچل ٹھاٹھ" ایک مرتبہ شروع میں معین کردیا' پھر کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں رہی۔ اس زمانے میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض اشخاص "خیال" کی صورت بدل بدل کر اس کا نام جدید ساز رکھتے ہیں۔

کبھی ڈھولک کی شکل کا، کبھی اور مزامیر کی طرح کا لیکن وہ اس کی ظاہری شکل جس طرح چاہیں بنالیں لیکن اس کی اصطلاح یعنی ٹھاٹھ میں کیا کر سکتے ہیں ایسی نادانی کی حرکات سے آنحضرت کی شہرت کی کیا تنقیص ہو سکتی ہے، اگرچہ وہ خود شہرت طلب نہیں تھے، کہ اشعار میں اپنا تخلص تک نہیں لائے۔

خیال نوازوں میں جن لوگوں نے شہرت پیدا کی، پہلا یہی لاڈن چوکھہ تھا، جس کا ذکر اوپر آگیا۔ دوسرا خیال نواز میر علاول تھا کہ لاڈن کے بعد اس نے اپناہاتھ اس ساز پر خوب جمایا اور سب سے سبقت لے گیا۔ میر علاول کسی بنا پر آنحضرت سے جدا ہو کر دکن چلا گیا۔ وہاں کے ماہرین اس ساز کو دیکھ کر پھڑک گئے۔ علاول کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ بادشاہوں نے اسے اپنے درباروں میں بلایا اور خوانین نے محلات میں اور خوب خوب انعام دیئے۔ ملازمتیں اس کو دیتے تھے اور وہ منظور نہ کرتا تھا۔ چونکہ اس نے آنحضرت کی صحبت میں پرورش پائی تھی، اس لیے دنیوی اسباب سے ہمیشہ بے پروا اور بے نیاز رہا اور خالی ہاتھ وطن آیا اور اپنے فقر و فاقہ پر قانع رہا۔ خدا بخش، ایک اور مشہور خیال نواز ہے، جو کلاونتی، خیالی، فارسی، قوالی اور دیگر کمالات میں ممتاز تھا۔ اس کو بھی امرا اور خوانین بلاتے رہے لیکن اس طریقے کو ننگ درویشی خیال کر کے استغنا اور قناعت میں بسر کی اور امرا کا تعلق قبول نہ کیا۔ اگر "خیال" درباروں میں چلا جاتا تو شاید آج زیادہ رواج پاتا۔ خیال نواز بہت کم ہوئے ہیں اور وہ جو باقی ہیں، وہ بھی عنقریب رحلت کرنے والے ہیں اور ان کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چشمہ خشک ہو جائے گا۔

آنحضرت کی سب سے عجیب ایجاد ساز کھٹ رس ہے۔ سفروں میں آنحضرت کی عادت تھی کہ تمام قسم کے ساز اپنے ہمراہ رکھتے تھے لیکن ان کی وجہ سے ہمیشہ تکلیف رہتی تھی۔ اس تکلیف کے دور کرنے کے لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ ان تمام سازوں کی بجائے ایک ہی ساز ایسا بنالیا جائے، جس میں ہر ایک کا لطف موجود ہو۔ اس خیال سے یہ ساز اختراع کیا۔ کھٹ رس کے معنی چھ مزے یا لطف کے ہیں، یعنی یہ:

ایک ساز چھ سازوں کا مزہ رکھتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک طرف لکڑی میں خیال بنالیا ہے دوسری طرف ساز سرمنڈل جس کے بائیس تار موجود ہیں۔ اس کی سیدھی بغل میں رباب کو جگہ دی گئی ہے' جس میں تمام ریشمی اور آنت کے تار کھینچ دیئے گئے ہیں اور نیچے گھوڑی بنادی ہے۔ بکری کی کھال' جو طبلہ رباب کے لیے لازمی ہے' بڑی حکمت سے خیال کے بطن میں جگہ دے کر' اس کو اندر کی طرف مڑھ دیا گیا ہے۔ اس طرح سے کہ گھوڑی کے دونوں پچھلے پاؤں کھال پر قائم ہیں۔ سرمنڈل کی بائیں بغل میں بین کو جگہ دی ہے اور ساریں قائم کردی ہیں اور آہنی تار کھینچ دیئے گئے ہیں۔ سیدھے پہلو میں ساز انبرتی کو جگہ ملی ہے اور الٹے پہلو میں سارنگی موجود ہے۔ گھوڑے کے بال کمانچہ میں لگادیئے ہیں اور زہ کے ساتھ بڑی آسانی سے بجتے ہیں۔ یہ ساز صورت انسانی کے مشابہ ہے۔ گجرات میں اس ساز کا رواج ہوگیا ہے اور عرسوں میں قاضی محمود کی جکری اسی ساز پر بجائی جاتی ہے۔ اس ساز سے وہی شخص کام لے سکتا ہے' جو ان چھیوں سازوں کے استعمال میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔

آنحضرت ہمیشہ آلات موسیقی کے بنوانے میں مشغول رہتے تھے' اس لیے خراد اور درودگر جنگلوں میں بھی آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ اچھی اچھی لکڑیاں تلاش کی جاتیں' ساز بنائے جاتے اور ہر آئندہ و رونده کو دیئے جاتے۔

ذیل میں بعض ایسے ہندی اشعار' شیخ بہاء الدین کے درج ہیں' جو مصنف کتاب نے ان کی بعض کرامتوں کے ذکر میں دیئے ہیں:

خواجہ خضر کی ملاقات کے لیے:

دایم حیات کائم کرامات ملاقات نعمت باو نہ ہم
ندی تیر درم بھاری بھیر پسرت مرہت ہونہال تماری رم پرم
رحم کیجے کرا تھیں' دیجے گا کیوں زاوری سم
تم کھواجہ کھدر دے مہتر الیاس رہ دوو پاس یا جگت میں اگم

برائے طلب لقائی سلطان الاولیا:

کاری کاج تماری ہوں تو ٹمکت بہو کرکے بہتیرو
آج بھاگ جاگ پڑے ہمارے پرسن درسن پاوت نیرو
انندی انند مہا ہو دکھ سب موتن گنو سویرو
نرپت بھئی تپت سب ناسی اولیاء چرنن لگ مانتھو میرو

برائے بارش:

کاہے رے بدراناں برست کاہے تھی ناہن گرجت کاہے ناں جھرلاوت
کاہے نھے برکھلات ہوت برمن من نوتن چتوت کاہے نھے تان گھوگھو رناوت
چتر وساتر وہی اما ہو داتا میگھ کہاوت
گربن پیا کوٹا جسم گٹ تھیں ادل بدل لے آوت

بارش کے بند ہونے کے لیے:

اب من مانیوں ری بدرا نیکی بھانت جر جر آیو
نیکی میں گھنائی تو نیکمیں کرج سنایو نیکمیں نیکمیں تیں تو رہس رہس جھڑلایو

ایک پرانی مثل باندھی

ان نینن کا یہی بسیکھ ہوں تجھ کو دیکھوں توں منجھ کو دیکھ

خیال:

کیسیں کی سمروں توہ ں پنچل نوکھوں کھوڑولی
اودا تیک بک باد کرت رہے باہے کاج نبولی
آنک للاری لکھی تو تیسی نیتی لیک گانٹھ کو گھولی
جی استھر کینی بدھنا تن کی سدا کلولی

سادرہ:

اے اے بھائی جیتا مصاف ساہن سرتاج
جس ری تو بلانت نت راج
(یہ سادرہ جہانگیر اور خرم کی جنگ کے موقع پر لکھا گیا تھا)

خیال برائے شفا:

ٹھاکر گروا کچھو چیت نہ دھری
جیتی اپرادھ اپرادھی کرے
(مہا چھین روگی کی بیدن اپنی میا تھیں کہن میں ہری)

برائے شفائی الفارسیہ:

دولت ہمیشہ رام تو کار جہاں باکام تو
نیکی بود بانام تو این رہنمائے امام تو (کذا)
دنیائے دون غلام تو باشد ازو آرام تو
دادم بکس انعام تو از جنس خاص و عام تو

(وتاناتلی آں این ست: اے جان ما ناوانی وردے نادانی)

۱۷ ربیع الآخر، پنج شنبہ سنہ ۱۰۳۸ھ آپ کی تاریخِ وفات ہے۔

حواشی

(۱) "فہرست مخطوطات شیرانی" (صفحہ ۶۹) میں اس کا نام "چشتیہ بہشتیہ یا فردوسیہ قدسیہ" دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(۲) راپڑی، ضلع مین پوری تحصیل شکوہ آباد میں مین پوری شہر سے کوئی ۴۵ میل جنوب مغرب میں، دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر آج کل ایک معمولی گاؤں ہے۔ ابوالفضل سرکار آگرہ کے محالات میں اس کا ذکر کرتا ہے لیکن سلاطین دہلی کے دور میں یہ نہایت اہم اور حاکم نشین شہر تھا۔ سلطان بہلول لودھی اور شاہ حسین شرقی والی جون پور کے مابین محاربات میں اس کا بہت ذکر آتا ہے۔ (مرتب)

(۳) یہ اشارہ ہے تیمور کے حملہ دہلی کی طرف، جو ۸۰۱ھ میں ہوتا ہے، جس کو صاحب کتاب چشتیہ ۷۸۸ھ کے قریب کا واقعہ مانتے ہیں۔ (حاشیہ مولف)

(۴) سلطان علاء الدین، سلاطین دہلی میں خاندان سادات کا آخری بادشاہ تھا۔ اپنے باپ سلطان

محمد شاہ کی وفات پر سنہ ۸۵۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ سنہ ۸۵۱ھ میں بدایوں گیا تو وہاں کی آب و ہوا بہت پسند آئی اور دہلی چھوڑ کر بدایوں کا قیام اختیار کیا۔ بالآخر اوائل ۸۵۵ھ میں بہلول لودھی کے حق میں تخت دہلی سے دستبردار ہوکر بدایوں پر قناعت کرکے بیٹھ گیا بقول فرشتہ بدایوں میں سنہ ۸۸۳ھ میں انتقال کیا۔ (مرتب)

(۵) یہ بھی دریائے جمنا کے کنارے پر ایک قلعہ تھا۔ آئین اکبری میں آگرہ کے توابعات میں اس کا نام "جنوار" دیا ہے۔ (مرتب)

(۶) اس رسالے کا نام "جواہر اسرار اللہ" ہے اور اس کی زبان گجراتی اردو ہے' جس کو ان ایام میں گوجری کہا جاتا تھا۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔ (حاشیہ مولف)

(۷) بقول مصنف قوال چار فرقوں میں منقسم ہیں :

۱۔ "صامتی" جو میر صامت کی اولاد سے ہیں۔ صامت دراصل اس قوال کا نام ہے جو بادشاہ وقت کی منادی کے باوجود جمنا عبور کرکے حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ صامت ابتدا میں جاہل مطلق تھا لیکن پیر روشن ضمیر کی نظر فیض اثر نے اس کو باکمال بنا دیا۔ اس کا شمار اولیاؤں میں ہوتا ہے۔ حضرت صاحب کرامت نظام الدین اولیاء نے اس کو خلافت دی ہے بلکہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صامت چوڈول نشین تھا اور حضرت کے خلفا نے آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کا چوڈول اٹھایا ہے۔ اسی لیے مشائخ چشتیہ اب تک صامتیوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ صامت شاعر بھی تھا اور ذیل کے دو اشعار اس کے ہیں :

گر مرا یار یار خواهد بود   بخت و دولت بکار خواهد بود
صامتی از لبت چو جرعہ کشید   سالها در خمار خواهد بود

صامت کی اولاد صامتی کہلاتی ہے۔

۲۔ "تاتاری" تاتار ایک قوال کا نام تھا جو اپنے وطن اوش سے آکر دہلی میں اقامت گزین ہو گیا۔ اس کی اولاد تاتاری کہلاتی ہے۔ تاتاری عزت میں صامتیوں کے مساوی مانے جاتے تھے۔ ایک وقت آیا جب کہ تاتاریوں کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا۔ فی زمانا جو لوگ اپنے آپ کو تاتاری کہتے ہیں وہ دراصل تاتار خانی ہیں' جو بسلسلہ ملازمت تاتار خاں کے پاس تھے۔ جب تاتاریوں میں کوئی باقی نہ رہا' تاتار خانی' تاتاری بن بیٹھے۔

۳۔ "قلو خانی"۔

۳۔ "شمیری" شمیر دراصل ایک بھاٹ تھا' جو تاتاری قوالوں کی صحبت میں رہ کر قوال بن گیا۔ اس کی اولاد "شمیری" کہلائی۔ ان چاروں فرقوں میں آپس میں شادی بیاہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ قوالوں میں اور جماعتیں بھی ہیں' جو اطراف و جوانب سے آکر دہلی میں آباد ہو گئیں۔ مثلاً: (۱) ملتانی (۲) حوض رانی (۳) جھلو (۴) ساکنان سرائے (۵) میراثیان مخادیم (٦) خنجر نواز۔ لیکن ان میں مہتر و بہتر وہی پہلے چار فرقے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ مہتروں کے ہوتے ہوئے کم رتبہ قوال سرود خوانی میں سبقت نہیں کر سکتے۔ صامتیوں اور تاتاریوں میں ان کے اکثر چودھری عالم و فاضل' زاہد و متقی و قاری ہوتے تھے۔ وہ سلاطین و امرا کے درباروں سے محترز تھے اور جادۂ قناعت و درگاہ مشائخ کے سوا کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ (حاشیہ مولف)

(۸) "کندر" کے لیے فرہنگ انندراج میں ہے: "بضم اول و ثالث' مردم کوتاہ' درشت' ستبراندام و خر بزرگ جثہ" (مرتب)

(۹) انندراج میں "لتبنہ" کے لیے لکھا ہے:

"بروزن قلندر (ف) مخفف "لت انبار" است شمس الدین فخری گفتہ:

حسودت بخورد و بخفت است قانع
چو بدنفس مردم خسیس و لتبنہ"

اور لت انبار کی ترجمانی یوں کی ہے:

"لت انبار ولت انبان (ف) مردم شکم پرست' پر خوار را نامند" پھر روحانی' اثیرالدین اخسیکتی اور مولانا روم کا ایک ایک شعر مثال میں درج کیا ہے۔ (مرتب)

مُلّا دو پیازہ اور جعفر زٹلّی

کی مروّجہ سوانح عمریوں کا جائزہ اور تنقید

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت نومبر سنہ ۱۹۳۹ء)

اردو ادب میں ایک یہ رجحان پیدا ہوتا چلا ہے کہ تاریخی اشخاص کے حالات کی جستجو کے وقت ان کی صحیح تاریخ کے فقدان کی حالت میں بعض اہل قلم دنیا کے سامنے ان کی خیالی اور فرضی سوانح عمری پیش کردیتے ہیں۔ تاریخ اور افسانہ میں صرف ایک قدم کا فرق ہے۔ یعنی یہی کہ پہلا حقیقی واقعات سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا خیالی باتوں کو حقیقت کا رنگ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں تخلیط پیدا کردے۔ تو یہ بڑا ظلم ہے اور ہر حال میں طشت ازبام کیے جانے کا مستحق ہے۔ یہ بڑی بے اصولی ہے کہ ایک مصنف قارئین کے ساتھ اپنے فرائض کو پس پشت ڈال کر ان کو ادبی دھوکے میں رکھے اور فرضی حالات کے قصر ان کے مطالعے کے واسطے کھڑے کردے۔ ایسی خداعیاں ہر زبان و ادب میں ہوا کرتی ہیں اور اردو اس بارے میں استثنا پیش نہیں کرتی بلکہ قاعدہ۔ ہم اپنے وقت کو محدود سمجھتے ہوئے صرف دو شخصوں کے حالات سے تعلق رکھیں گے۔ ان اشخاص سے ہمارا مقصد ملا دو پیازہ اور جعفر زٹلی ہیں جن کا ہم علیحدہ علیحدہ تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) مُلّا دو پیازہ

دو پیازہ ایک تاریخی شخص ہے جو اپنی ظرافت کے لیے مشہور ہے۔ جس طرح جوحی عربی میں اور عبید زاکانی فارسی میں۔ اس کے متعلق گذشتہ چالیس پچاس سال میں کافی لٹریچر جمع ہوگیا ہے اور مختلف اشخاص نے اس کے سوانح پر قلم اٹھایا ہے۔ ان میں سے میں ان تالیفات کا ذکر کرتا ہوں جن کا مجھ کو پتہ لگ سکا ہے:

(۱) سوانح عمری ملا دو پیازہ از ہندوستانی سپکولیٹر طبع اول سنہ ۱۸۹۰ء

(۲) سوانح عمری ملا دو پیازہ از ہندوستانی سپکولیٹر باخذ حق تصنیف فضل الدین تاجر کتب قومی لاہور' بازار کشمیری نے سنہ ۱۸۹۱ء میں لاہور کے اسلامیہ پریس میں چھپوائی۔ طبع ثانی قیمت فی جلد ۲ آنہ' ۳۲ صفحات۔

(۲ ب) سوانح عمری ملا دو پیازہ از ہندوستانی سپکولیٹر باخذ حقوق تصنیف خاکسار فضل الدین تاجر کتب قومی و مالک اخبار اشاعت لاہور' بازار کشمیری نے سنہ ۱۸۹۳ء میں لاہور کے رحمانی پریس میں چھپوایا۔ تیسری دفعہ قیمت فی جلد ۲ آنہ۔

(۳) سوانح عمری ملا دو پیازہ از ہندوستانی سپکولیٹر۔ ملک فضل الدین ملک چنن الدین ملک تاج الدین ککے زئی تاجران کتب بازار کشمیری لاہور نے نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لاہور میں طبع کرائی۔ دفعہ پنجم قیمت فی جلد دو آنے۔

کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۲۰ء تک یہ تالیف پانچ مرتبہ چھپ چکی ہے۔

(۴) دو پیازہ از منشی محمد الدین فوق' بار اول سنہ ۱۹۰۲ء میں۔

(۵) ملا دو پیازہ یا ابوالظرفا ملا دو پیازہ کے حالات زندگی مصنفہ منشی محمد الدین صاحب فوق بار دوم در سنہ ۱۹۰۵ء حافظ آبادی پریس لاہور (ناول ایجنسی لاہور کی تاریخی کتب کے سلسلہ میں نمبر۹) قیمت ۲ آنہ۔

(۵ ب) ابوالحسن ملا دو پیازہ کی سوانح عمری مرتبہ منشی محمد الدین صاحب فوق جس کو شائقین کی تفریح طبع کے لیے بہ اجازت مصنف منشی رام اگروال تاجر کتب مہتمم

تعلیمی کتب خانہ پنجاب و پروپرائیٹر اردو اخبار انارکلی لاہور نے فیض عام پریس لاہور میں طبع کرایا۔ بار سوم، قیمت آٹھ آنے، تاریخ ندارد۔ مگر مالک کتاب نے سرخ سیاہی میں اپنا نام عزیز الدین احمد بی۔ او۔ ایل امرتسری اور تاریخ ۲۳۔ ۱۲۔ ۳ درج کی ہے۔

(۶) ابوالحسن دو پیازہ از منشی موصوف قیمت ۴ آنہ، الناظر چوک لکھنؤ۔ [۱]

(۷) ابوالحسن ملا دو پیازہ از منشی موصوف قیمت ۴ آنہ، الناظر بک ڈپو، علی گڈھ۔ [۲]

(۸) ملا دو پیازہ قیمت ۴ آنہ، طبع رام دتامل و علی محمد تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور، سنہ ۱۹۰۵ء سے قبل کی طبع شدہ۔

(۹) سرگذشت ملا دو پیازہ، مینجر کریمی لائبریری، انجمن اسلام، بمبئی [۳]

(۱۰) سرگذشت ملا دو پیازہ۔ حسب خواہش میاں قاضی نور محمد ابن قاضی عبدالکریم تاجر کتب۔ مطبع نامی کریمی واقع بمبئی (باضافہ ملا صاحب کی قیافہ شناسی) سنہ ۱۳۳۳ھ۔

(۱۱) ملا دو پیازہ طبع ۱۸۹۳ء، ۳۲ صفحات، لاہور [۴]

(۱۲) سوانح عمری ملا دو پیازہ، قیمت ۲ آنہ، منیجر تاریخی کتب خانہ لاہور [۵]

(۱۳) سوانح عمری ملا دو پیازہ باتصویر از ایس۔ احمد علی چشتی، حسب فرمائش شیخ گلزار محمد، ۲۲ صفحات قیمت ۲ آنہ۔

ملا دو پیازہ کو بیربل کا حریف اور مدمقابل مانا گیا ہے۔ اس بنا پر کئی لوگوں نے دونوں کے حالات پر یک جائی قلم اٹھایا ہے۔ اس لیے میں بعض ایسی مصنفات کی فہرست بھی یہاں درج کیے دیتا ہوں:

(۱۴) لطائف الشاکری المعروف بہ جواب و سوال ملا و بیربل از علاء الدین عرف اللہ دیا متخلص بہ شاکر رئیس میرٹھ، چمن ہند میرٹھ۔

(۱۵) سوانح عمری بیربل و ملا دو پیازہ، منیجر تاریخی کتب خانہ، لاہور، قیمت ۴ آنہ [۶]

(۱۶) سوانح عمری ملا دو پیازہ و بیربر، کرزن گزٹ، دہلی، قیمت ۴ آنہ۔

(۱۷) سوال و جواب ملا و بیربل حصہ اول از منشی عبدالعزیز خاں، منیجر کریمی لائبریری۔

(۱۸) سوال و جواب ملا و بیربل حصہ دوم از منشی عبدالعزیز خاں، منیجر کریمی لائبریری۔

(۱۹) سوال و جواب ملا و بیربل حصہ سوم از منشی عبدالعزیز خاں' منیجر کریمی لائبریری۔

(۲۰) سوال و جواب ملا و بیربل حصہ چہارم از منشی عبدالعزیز خاں' منیجر کریمی لائبریری۔

(۲۱) سوانح عمری بیربل و ملا دو پیازہ۔ حسب الایمائے منشی بلاقی داس اہالیان مطبع نے کتب انگریزی و اردو و فارسی سے انتخاب اور ترجمہ کر کے تالیف کیا۔ میور پریس دہلی واقع پیپل مہادیو۔

(۲۲) لطائف بیربل و ملاں دو پیازہ مکمل ہر چہار حصہ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب و پبلشرز' کشمیری بازار لاہور نے اپنے مطبع علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں چھاپا۔

اسی طرح بیربل کے حالات میں بھی ملا صاحب کا تذکرہ بسلسلہ لطائف آجاتا ہے۔ اس لیے ایسی تصانیف بھی اس فہرست میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

(۲۳) سوانح عمری راجہ بیربل مصنفہ منشی ہادی حسین صاحب ہادی بنارسی جس کو بابو پیارے لال بھارگو منیجر سلیمانی پریس بنارس نے مطبع سلیمانی محلہ کلٹ گھاٹ شہر بنارس میں چھپوا کر شائع کیا' سنہ ۱۹۲۴ء۔

(۲۴) حیات بیربر مصنفہ ایم عبدالعلی برلاس خادم التعلیم پنجاب۔ لاہور۔ بار اول سنہ ۱۹۰۰ء قیمت ۷ آنہ۔ یہ مصنف رسالہ ہذا کے صفحہ ۴۰ پر "عالی جناب ابوالمذاق سرتاج ظرفا ابوالحسن ملا دو پیازہ" کے مختصر حالات دیتا ہوا کہتا ہے کہ ہم ملا صاحب کی صرف الف با ناظرین کو سنائیں گے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر تاتا جا تک نہیں لکھیں گے۔ وہ اس کے پورے نظارے کے مشتاق ہوں تو ان کے واسطے علیحدہ فوٹو جو ہمارا اپنا لکھا ہوا ہے موجود ہے' دیکھ لیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عبدالعلی برلاس نے ایک علیحدہ رسالہ ملا دو پیازہ کے حالات میں سپرد قلم کیا ہے۔ جس کو ہم (۲۵) شمار کرتے ہیں۔

(۲۶) سوانح عمری راجہ بیربر مصنفہ محمد الدین موج خلف الصدق شمس العلماء حکیم سلطان علی حسب فرمائش شیخ گلزار محمد احمد علی تاجران کتب' مطبع گلزار محمدی لاہور' کشمیری بازار' بار چہارم' قیمت ۴ آنہ۔

(۲۷) لطائف بیربل حصہ اول۔ حسب فرمائش جناب محمد اسمٰعیل صاحب تاجر کتب

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ صاحب۔ مطبع ابوالعلائی آگرہ۔ صفحات ۲۸۔

(۲۸) لطائف بیربل حصہ دوم در مطبع کاشی پریس آگرہ طبع شد۔ قیمت ۲ آنہ۔ دونوں حصوں میں ملا کے لطیفے بھی شامل ہیں۔

(۲۹) عقل کی کان چٹکلوں کی جان معروف بہ سوانح عمری ملا دو پیازہ و بیربل از تصانیف آغا محمد طاہر، نبیرۂ حضرت محمد حسین آزاد۔ ملنے کا پتہ: میر امیر بخش اینڈ سنز تاجران کتب، کشمیری بازار، لاہور۔ صفحات ۴۷، قیمت ۴ آنہ۔

یہ مصنفین جن میں سے اکثر کے نام ہمیں معلوم نہیں۔ اپنی اپنی باری میں ایک دوسرے سے نقل کر رہے ہیں۔ اور سوائے جزویات کے روایتی واقعات کے بیان کرنے میں بہت کم اختلاف کرتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قدیم ہندوستانی سپکولیٹر ہے۔ جس کی سوانح عمری ملا دو پیازہ سنہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی اور اس کی طبع ثانی ۱۸۹۱ء میں، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں، اشاعت پاتی ہے۔ یہ کتاب بعد کے اہل قلم کے لیے ایک ضروری ماخذ اور ذریعہ اطلاع ہے۔ جس میں گویا دو پیازہ کے متعلق تمام روایات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ پچھلے اہل قلم انہی اطلاعات کو دوہراتے رہے ہیں۔ ہندوستانی سپکولیٹر، جو دیگر تصنیفات میں محمد کامل اپنا نام اختیار کرلیتا ہے، دیباچہ میں یوں رقم طراز ہے:

"ملا دو پیازہ، جس کی سوانح عمری ہم لکھنا چاہتے ہیں، ایک ایسا شخص ہے جس کا کسی تاریخ میں حال نہیں پایا جاتا۔ وہ کسی فوج کا کمانڈر نہ تھا، وہ کوئی بہادر سپاہی نہ تھا، وہ کسی بادشاہ کا وزیر نہ تھا، وہ کسی شہنشاہ کا پیر نہ تھا، غرض یہ کہ وہ کسی ایسے عہدے پر ممتاز نہ تھا جس کے سبب سے اس کا حال ہم کسی تاریخ میں دیکھ سکیں۔ وہ اپنی لطیفہ گوئی اور تمسخر کے سبب سے مشہور تھا۔ اس کا چرچا جس قدر تھا یا تو نغز گوئی اور مسخروں میں تھا یا ایسے لوگوں میں تھا جو اس قسم کے آدمیوں کو پسند کرتے ہیں اب ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ ایسے شخص کی سوانح عمری لکھنی کس قدر دشوار ہے۔ ہم نے اس کا حال کچھ عربی اور کچھ فارسی کتابوں سے لیا ہے۔ کچھ اس کے مقلدوں سے

پوچھ کر لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا حال لکھنے میں ہم نے بہت تکلیف اور خرچ گوارا کیا ہے۔ اور اس کا صلہ ہم صرف پبلک پر چھوڑتے ہیں۔" (صفحہ ۲، طبع ثانی سنہ ۱۸۹۱ء)۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو پیازہ کی زندگی کے ضروری خط و خال' میں اپنے سامعین کی آگاہی کے واسطے' ہندوستانی سپکولیٹر کی تالیف سے مختصراً یہاں عرض کروں۔ اس کا بیان ہے : "ملا عرب کے شہر طائف میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ابوالمحاسن تقریباً" نو برس کا تھا جب اس کا باپ ابوالمکارم خدا گنج کو سدھارا۔ متوفی روپیہ والا آدمی تھا مگر اس کی جائیداد جو جس کے ہاتھ لگی دبا بیٹھا اور اس کی بیوہ کے پاس صرف ایک مکان رہ گیا۔ ابوالمحاسن جب بیس برس کا ہوا قبیلہ فاروقی کے ایک سردار عبدالجبار کی بیٹی سراج النساء سے اس کی شادی ہوگئی جو معقول جہیز اپنے ساتھ لائی۔ شادی سے چھ ماہ پانچ روز بعد ابوالمحاسن کی والدہ نے انتقال کیا اب ابوالمحاسن نے بیوی کے مشورے سے تجارت کی ایک دوکان کھول لی۔ دوکان کا حساب سراج النساء خود لکھا کرتی۔ اس کی محنت اور نیک نیتی سے تجارت دن بدن چمکنے لگی۔ شادی کے تین سال بعد ان کے ایک چاند سا بچہ پیدا ہوا۔ محلّہ کی مسجد کے امام کی رائے سے اس کا نام ابوالحسن رکھا۔ جب وہ چھٹے برس میں لگا باپ نے اسے محلے کے مکتب میں داخل کردیا۔ مکتب کے معلم ایک بزرگ عبدالرحمٰن نامی تھے۔ جن کی عمر پچاس برس کی تھی۔ ابوالحسن خوشی خوشی مکتب جاتا اور لکھتا پڑھتا۔ ساتھ ہی اس کو تمسخر کی لت تھی' کبھی زید کی جوتی چھپاتا اور کبھی عمر کی ٹوپی۔

ایک دن بچے اپنے اپنے گھر کھانا کھانے گئے تھے۔ ابوالحسن گھر سے کھانا کھا کر سب سے پہلے مکتب پر پہنچا۔ حسن اتفاق سے استاد صاحب بھی موجود نہ تھے۔ اس نے موقع غنیمت سمجھ کر ایک لڑکے کا سیپارہ استاد کے بستے میں رکھ دیا۔ جب لڑکے مکتب میں آگئے اور پڑھائی شروع ہوگئی۔ اس لڑکے نے اپنا سیپارہ تلاش کیا مگر نہیں ملا۔ ناچار جاکر ملا جی سے رپورٹ کی۔ وہ بہت خفا ہوئے۔ بولے' کیسے نامعقول بچے ہیں

سیپارے چرالیتے ہیں۔ اچھا ان کے بستوں کی تلاشی لو اور جس کے پاس سے سیپارہ نکلے اس کا منہ کالا کرو۔ حکم کی دیر تھی۔ توے کی سیاہی گھروں سے آئی اور ایک چراغ میں اس کو گھولا گیا۔ ابوالحسن نے لڑکوں کے بستوں کی تلاشی لی۔ جب کسی بستے سے وہ سیپارہ برآمد نہیں ہوا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر استاد سے عرض کی' تمام بستے دیکھ لیے' سیپارہ کا کہیں پتہ نہیں اور استاد کے بستے کی طرف اشارہ کرکے کہا' اب یہی ایک بستہ باقی رہ گیا ہے' حکم ہو تو اس کو بھی دیکھ لیا جائے۔ استاد نے اجازت دی۔ انہوں نے بڑھ کر اس بستے کو ٹٹولا اور سیپارہ نکال کر سامنے ڈال دیا۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے اور عرض کی کہ یہ سیاہی حاضر ہے' بندہ کو تعمیل ارشاد کرلینے دیجیے۔ غرض ملا جی خفیف ہوگئے اور لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ابوالحسن ابھی نو سال چھ ماہ کا ہوا تھا کہ اس کی والدہ نے انتقال کیا جس کا قدرتاً" اس کو بہت رنج ہوا۔ ادھر اس کے باپ ابوالمحاسن کے کاروبار تجارت کو بڑا دھکا لگا۔ سراج النساء رتی رتی کی خبر رکھتی تھی۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی نوکروں نے ہاتھ پاؤں نکالے اور دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کیا۔ آٹھ نوکروں میں سے چھ بہت سامال و اسباب لے کر رفوچکر ہوگئے۔ تباہی سے بچنے کے لیے ابوالمحاسن نے دوسری شادی کرلی۔ نئی بیوی' جس کا نام خصیمہ تھا' پرلے درجے کی خودسر' بدمزاج اور پھوہڑ تھی اور اس پر طرہ یہ کہ جاہل مطلق' غصہ ناک پر رکھا رہتا۔ اس کے آتے ہی ابوالمحاسن کا رہا سہا کاروبار بھی بیٹھ گیا۔ سراج النساء کی موت نے اسے دردمند بنادیا تھا۔ مگر خصیمہ کی تشریف آوری نے اس کی خانہ بربادی کو آخری مراحل تک پہنچا دیا۔

ادھر خصیمہ اپنے سوتیلے فرزند ابوالحسن کے ساتھ انتہا درجہ کی بدسلوکی کرتی۔ بات بات پر غصہ ہوتی' آنکھیں نکالتی اور مارتی۔ کھانا کھانے کو نہ دیتی' کپڑا پھٹ جاتا تو سی کر نہ دیتی۔ الغرض اس کا ایسا دہاڑا کر رکھا تھا کہ ناقابل بیان ہے۔ ابوالمحاسن خصیمہ کو بہت سمجھاتا کہ یہ بے ماں کا بچہ ہے' اس پر رحم کرو۔ لیکن اس عورت کے ایک نہ لگتی الٹی صلواتیں سناتی اور کہتی کہ اسے اپنی جیب میں رکھا کرو۔ تو چاہتا ہے کہ لڑکا ناز

و نعمت میں پل کر خراب ہوجائے۔ ملا دو پیازہ اپنی عمر کا بارھواں سال ختم کرتے تک خصیمہ کے جور و تشدد سے پورا پورا تنگ آچکا تھا۔ آخر تنگ آمد بجنگ آمد اس نے یہی تجویز کی کہ جس طرح خصیمہ اس کو دق کرتی رہتی ہے' وہ بھی اس کا ناک میں دم کرے۔ چنانچہ ایک دن موقع پا کر اس نے خصیمہ کے کپڑوں کو چوہے کی طرح کتر ڈالا اور استادی یہ کی کہ کوئی جوڑا سلامت نہیں چھوڑا۔ کچھ روز بعد خصیمہ کو شادی کی تقریب میں جانے کے لیے کپڑوں کی ضرورت ہوئی۔ گٹھڑی کھول کر کیا دیکھتی ہے کہ تمام جوڑے کٹے پڑے ہیں۔ حیران رہ گئی۔ اپنا منہ لپیٹ لیا اور ابوالحسن کو ساتھ لے کر چوہوں کو کوستی اپنے میکے چلی گئی اور ملا کی شرارت پر پردہ پڑا رہا۔ خصیمہ یہاں بھی ابوالحسن کے ساتھ اچھی طرح پیش نہ آئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اس پر ستم توڑتی رہی۔ ملا کو ناگوار گزرا اور وہ کہے بغیر اپنے باپ کے پاس چلا آیا اور یہاں آکر ایک ایسی شرارت کی جس کے خمیازے میں دونوں باپ بیٹوں کو علیحدہ علیحدہ بے وطن بننا پڑا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ طائف کے گلی کوچوں میں ایک نیم پاگل عورت پھرا کرتی تھی جو فربہ اور جسیم تھی۔ اس بنا پر لوگ اسے ثمینہ کہتے تھے۔ ابوالحسن اسے کھانے کا لالچ دے کر ایک روز اپنے گھر لے آیا۔ اور حویلی کا دروازہ باہر سے بند کر کے سیدھا خصیمہ کے پاس پہنچا اور اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا اور درد بھری آواز میں کہنے لگا کہ ابا جان ایک اور عورت گھر میں لے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بڑی خاندانی ہے۔ وہ لوگوں سے اس کی خوبصورتی کی بھی تعریف کرتے ہیں مگر اماں جان! خدا گواہ ہے' وہ آپ کی پاپوش کی بھی برابری نہیں کرتی' چنانچہ میں نے اسے یہ بات سنا بھی دی۔ بہت خفا ہوئی۔ جب کچھ دیر بعد میں نے کھانا مانگا تو مجھے مار کر نکال دیا اور کہا کہ اپنی خوبصورت اماں کے پاس جاکر مانگ۔ یہ کہہ کر ابوالحسن اور بھی زار زار رویا۔ خصیمہ مارے غصے کے لال پیلی ہو رہی تھی وہ ابوالحاسن اور ثمینہ کو کوستی سیدھی گھر پہنچی۔ یہاں ثمینہ بھی موجود تھی۔ خصیمہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جوتی اتار تڑاتڑ مارنا شروع کیا۔ ثمینہ پہلے تو اس ناگہانی حملے پر جھجکی۔

آخر سنبھلی اور پھکنی ہاتھ میں لے کر مقابلے پر اتر آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مار مار کر لہو لہان کردیا۔ ان کی چیخوں سے محلے میں اودھم مچ گیا۔ کئی آدمی ابوالحاسن کے پاس پہنچے اور بولے کہ تمہارے ہاں عجب قیامت برپا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا آیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دیوار پھاند کر اندر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ دونوں عورتیں گتھم گتھا ہیں۔ خسیمہ نے اسے دیکھ کر ثمینہ کو چھوڑ اس پر حملہ کردیا۔ ادھر ثمینہ نے بھی اس پر وار کیا۔ غریب ابوالحاسن اس دوہری مار سے بہت زچ ہوا۔ پیٹھ دکھائی اور بھاگا۔ گھر بار اور بیوی بچہ کو چھوڑ ایسا غائب ہوا کہ نہ مرنے کی خبر آئی نہ جیتے کی۔ خسیمہ نے چار روز کے انتظار کے بعد گھر کے مال اسباب پر قبضہ کیا اور سب کچھ لے کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی اور ابوالحسن اپنے باپ کی تلاش میں حاجیوں کے قافلے کے ساتھ مکہ روانہ ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے تمام قافلے اور سرائیں ڈھونڈ ماریں مگر ابوالحاسن کا پتہ نہ لگا پر نہ لگا۔ مایوس ہوکر ایک قافلے کے ساتھ' جو ایران جارہا تھا' ہوگیا۔ جرنیل اکبر علی' جو ایرانی فوج میں جرنیل کا منصب رکھتا تھا' اس قافلے کا سردار تھا۔ اس نے ابوالحسن میں دلچسپی لی اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس کو عزت و حرمت کے ساتھ رکھو۔ الغرض اس طرح ابوالحسن ایرانی قافلے کے ساتھ مع الخیر ایران پہنچ گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر اور سلطنت ہندوستان کھو کر ایران میں پناہ گزین ہوگیا تھا۔ شاہ ایران نے اس تاجدار بے ملک کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمایوں کے ساتھ ایک شخص مرزا بخش اللہ خاں تھے۔ جو فوج ہمایوں میں کرنیل رہے تھے۔ جرنیل اکبر علی خاں سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ مرزا جب ہمایوں کے ساتھ واپس لوٹے تو انہوں نے ابوالحسن کو جرنیل سے مانگ لیا اور اپنے ساتھ کابل لے آئے۔ کابل کے محاصرے میں کرنیل بخش اللہ خاں مارا گیا۔ جس کا ملا کو ازحد رنج ہوا مگر اس نے شاہی فوج کا ساتھ نہ چھوڑا اور سنہ ۱۵۵۶ء میں' ماچھیواڑہ کی جنگ کے بعد' جب کہ مغلوں کی حکومت ہند میں بار دیگر مستقل ہوگئی' اس نے دہلی میں رہنا اختیار کیا۔ اس وقت اس کی عمر پندرہ سولہ سال کے قریب تھی۔ دنیا کے حوادث اور انقلابات دیکھ دیکھ کر وہ

اس قدر افسردہ ہو رہا تھا کہ اس نے دنیا ترک کردینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس نیت سے وہ شمس الامرا محمد خاں لودھی کی مسجد میں مقیم ہوگیا۔ ایک شریف خاندانی عرب ہونے اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھنے کی بنا پر ہندوستان کے لوگ اس کی بڑی عزت کرتے اور اس کو ملا جی کہا کرتے۔ اس کی شہرت دہلی میں بہت جلد پھیل گئی اور امراء و رؤساء اسے دعوتوں میں بلانے لگے۔ ایک روز کسی کے ہاں ضیافت تھی۔ ان کو ایک خاص قسم کا پلاؤ بہت پسند آیا۔ پاس والے ساتھی سے دریافت کیا کہ "ایں طعام از کدام قسم است"۔ اس نے جواب دیا "از قسم پلاؤ" پھر پوچھا "ایں راچہ می گویند" اس نے کہا "دو پیازہ"۔ آپ بہت خوش ہوئے اور کہا' سبحان اللہ! کیا عمدہ کھانا ہے اور اضافہ کیا کہ جب تک دو پیازہ دسترخوان پر نہ ہوگا میں کسی کی دعوت منظور نہ کروں گا۔ اس روز سے ان کا نام دو پیازہ پڑگیا۔

ملا کی اکبر تک رسائی کے بارہ میں تین مختلف روایتیں ہیں۔ مگر ہم صرف ایک روایت پر قناعت کریں گے' جو یہ ہے کہ فیضی نے دو معتمد بھیج کر اسے دہلی سے اپنے پاس بلوایا اور عبادت خانہ دین الٰہی کا کام اس کے سپرد کیا۔ اول اول ملا نے اس کام کو ناپسند کیا مگر جب فیضی اور ابوالفضل نے اسے اکبر کی مصالح ملکی سمجھاویں تو وہ رضامند ہوگیا۔

اب ملا صاحب کے کچھ لطیفے دیئے ہیں جن میں کئی ایسے ہیں جن میں ملا اور بیربل ایک دوسرے کے حریف بنتے ہیں مثلاً ایک یہ ہے کہ بیربل اکبر کے پاس بیٹھا تھا۔ ملا دو پیازہ کسی دھن میں مستغرق جھکا ہوا زمین کی طرف دیکھتا آرہا تھا۔ بیربل نے پوچھ' ملا جی کیا ڈھونڈتے ہو؟ ملا نے جواب دیا' مدت سے میرا باپ گم ہوگیا ہے' اسے دیکھتا ہوں۔ بیربل نے کہا' اگر میں بتادوں تو کیا دو۔ ملا نے کہا' سارا آپ کا۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ بیربل ایک مرتبہ دہلی گئے۔ راستہ میں فیل بان سے کسی بنا پر خفا ہوگئے۔ واپسی پر بادشاہ سے اپنے سفر کا حال بیان کرنے لگے اور بولے کہ جس نام کے اخیر میں بان ہوتا وہ نہایت شریر اور نٹ کھٹ ہوتا ہے مثلاً فیل بان' گاڑی بان' ساربان' ملا یہ سن کر

مسکرائے اور بولے کہ سچ کہتے ہو مہربان۔

ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک گنوان پنڈت اکبر بادشاہ سے کہہ رہے تھے کہ صبح کے وقت دو کوے ایک جگہ ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھنا بڑا نیک شگون ہے۔ بیربل پاس بیٹھے تائید کرتے رہے۔ ملا نے چپکے سے کان میں کہا' قبلہ عالم! اس بات کو آزمانا چاہیے۔ بادشاہ نے بیربل کو حکم دیا کہ جب کبھی صبح کو دو کوے ایک جگہ بیٹھے دیکھو' مجھے اطلاع دو۔ بیربل موقع کے منتظر رہے۔ ایک دن انہوں نے صبح ہی صبح دو کوے ایک جگہ دیکھے۔ بھاگے ہوئے گئے اور بادشاہ کو نیند سے بیدار کیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ بادشاہ اٹھے مگر نہایت بدمزہ ہوئے۔ موقع پر پہنچ کر دیکھا تو ایک کوا نظر آیا۔ برہم ہو کر بیربل کو دوچار رسید کیے۔ اسی روز جے پور کے ایک ٹھاکر نے ڈولا نذر کیا۔ ملا صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کی' قبلہ عالم! اگر حضور بھی دو کوے دیکھتے تو یہ ڈولا نہ ملتا اور جنہوں نے دو کوے دیکھے ان کا حال تو حضور سے پوشیدہ نہیں۔ بیربل بہت شرمندہ ہوئے۔

ایک لطیفہ یوں ہے کہ بیربل ایک روز نہایت عمدہ پگڑی باندھ کر دربار میں آئے بادشاہ نے دیکھ کر ملا دو پیازہ سے کہا' بیربل کی دستار تمہاری پگڑی سے عمدہ بندھی ہے۔ ملا نے فوراً جواب دیا' حضور عالی! بجا اور درست لیکن یہ تو انہوں نے اپنی بیوی سے بندھوائی ہے۔ بادشاہ نے کہا' اس کا ثبوت؟ ملا نے فوراً اپنی پگڑی اتارلی اور کہا کہ بیربل بھی اپنی پگڑی اتاریں۔ پھر دونوں نے باندھنا شروع کی۔ ملا نے حسب وضع قدیم اپنی پگڑی باندھ لی لیکن بیربل باوجود کوشش کے ویسی نہ باندھ سکے۔ تب بادشاہ مسکرائے اور فرمایا' بیربل! معلوم ہوا کہ ہر کام جو تم سے نہیں ہوسکتا اپنی بیوی سے کراتے ہو۔ بیربل شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ اب ہم لطائف کو چھوڑ کر ملا کی وفات کا ذکر کرتے ہیں۔

سنہ ۱۵۹۹ء میں اکبر نے احمد نگر کو فتح کرنا چاہا اور جہانگیر کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ مگر شہزادہ ناکام رہا اور بادشاہ بذات خود روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں احمد نگر کی حکومت چاند بی بی سے متعلق تھی۔ اکبر کو ملا دو پیازہ سے اس قدر محبت تھی کہ ہمیشہ اس کو اپنے ساتھ رکھتا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ احمد نگر کا محاصرہ ہو رہا تھا۔ بادشاہ سلامت سپہ

سالاری کر رہے تھے۔ دن بھوکی تگ و دو اور گولہ باری سے یہ امید ہوچلی تھی کہ قلعہ جلد فتح ہوجائے گا۔ رات کو ارکان دولت شاہی خیمہ میں جمع ہوئے اور اس دن کے واقعات پر تبصرہ ہونے لگا۔ ایک نے کہا' امید ہے کہ قلعہ کل فتح ہوجائے گا۔ دوسرے نے کہا' حضور کا اقبال بلند ہے۔ تیسرے نے کہا' اس عورت کی کیا حقیقت ہے جو حضور کا مقابلہ کرسکے۔ ملا نے ظریفانہ ترنگ میں کہا کہ یہ حضور کی اقبال بلندی اور اولالعزمی ہے کہ اس عورت کا مقابلہ کرنے آئے ہیں' ورنہ اس کا مقابلہ ساری دنیا کے بادشاہ نہیں کرسکتے۔ ملا کا یہ چبھتا فقرہ سب سمجھ گئے اور خاموش ہوگئے۔ بادشاہ نے بھی سوچا' اگر ملک فتح کرلیا تو عورت کو شکست دی' کیا بہادری کی؟ اور اگر شکست کھائی تو رسوائے عالم ہوئے۔ آخر ملک بخش کر آگرہ کا رخ کیا۔

اس وقت ملا کی عمر ۶۰ برس کے قریب تھی۔ جنگ و سفر اور آب و ہوا کی تبدیلی سے اسے بخار آنے لگا۔ یہ بخار اس کے ایسا پیچھے پڑا کہ دن بدن زیادہ ہوتا گیا۔ شاہی لشکر تیزی سے کوچ کر رہا تھا اور ملا کو ایک سکھپال میں ڈال رکھا تھا۔ ایک دن بادشاہ خود دیکھنے گئے اور آخر لشکر کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ لیکن جب سے ملا بیمار ہوا تھا بادشاہ نے اس کے علاج کا کچھ خیال نہیں کیا۔ وہ کامل ایک مہینہ بیمار رہا۔ آخر ۱۵ رمضان کی صبح کو لشکر میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ملا کا انتقال ہوگیا۔ سب کو رنج ہوا۔ بادشاہ مع درباریوں کے جنازہ میں گئے۔ تمام لشکر اور بادشاہ نے جنگل میں نماز پڑھی اور ایک نزدیک قصبے میں' جس کو ہنڈیا کہتے ہیں' اسے سپرد خاک کردیا۔ ایک ظریف نے کہا' واہ بھئی دو پیازے مر کر بھی ہنڈیا میں رہے۔ وفات کے وقت اس کی عمر پورے ساٹھ سال کی تھی۔ وہ سنہ ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوا تھا اور سنہ ۱۶۰۰ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

دوپیازہ کے متعلق ہندوستانی سپکولیٹر کا یہ بیان ہے جسے میں نے مختصراً اوپر بیان کیا ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے ذرائع معلومات سے مطلق اطلاع نہیں دیتا' اگرچہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے عربی و فارسی کتابوں سے اس کا حال لکھا ہے مگر ان کتابوں کا وہ نام تک نہیں لیتا۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ملا کسی بادشاہ کا وزیر نہ تھا اور نہ

کسی شہنشاہ کا پیر تھا۔ پھر اس کے پاس ایسے کون سے پراسرار ماخذ ہیں جن سے اس کو ملا کے خاندانی حالات، نانا دادا کے نام، ماں باپ کے نام، ان کا پیشہ، خود ملا کے بچپنے کے حالات، اس کی طفلانہ شوخیاں اور شرارتیں، اس تفصیل کے ساتھ جو صرف ایک معاصر یا عینی شاہد دے سکتا ہے دستیاب ہوگئے۔(۷) حالانکہ اس توضیح کے ساتھ اکثر سلاطین کے حالات بھی میسر نہیں۔ یہ تفصیل ہمارے شبہات کو قوی کرتی ہے کہ کہیں یہ تمام قصہ ایک من گھڑت افسانہ نہ ثابت ہو۔ دو پیازہ کے ذکر میں عربی کتب کا ذکر کرنا بالکل بے سود ہے کیونکہ عربی میں اس کے متعلق کوئی چیز موجود نہیں اور نہ ملا طائف میں پیدا ہوا اور نہ عرب کا رہنے والا ہے۔ وہ ہندی محض ہے اور بس۔ فارسی میں جہاں کہیں اس کا ذکر آیا ہے، اسے ہندی ہی لکھا ہے۔ ہمیں اس کے تاریخی بیانات کا حصہ بھی معتبر نہیں معلوم ہوتا۔ ماچھیواڑہ کی مہم کا سال وہ سنہ ۱۵۵۶ء بتاتا ہے۔ حالانکہ وہ اس سنہ سے ایک یا دو سال قبل واقع ہوتی ہے۔ اکبر علی اور بخش اللہ خان اس عہد کے سے نام معلوم نہیں ہوتے۔ اسی طرح شمس الامرا خطاب بھی جدید انداز کا ہے اور ان ایام میں رائج نہیں تھا۔

ہندوستانی سپکولیٹر کا بیان ہے کہ ملا سنہ ۱۵۴۰ء / ۹۴۷ھ میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۶۰۰ء/ ۱۰۰۹ھ میں وفات پاگیا۔ ہمارے پاس اس کی تاریخ ولادت کے جانچنے کا کوئی ذریعہ نہیں اگرچہ یہ بہت ممکن ہے کہ وہ غلط ہو۔ لیکن اس کا سال وفات، جو اوپر دیا گیا ہے، یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ اس تاریخ سے بیس اکیس سال بعد تک وہ زندہ تھا۔ اس کے عیسوی سنین دینا بھی خالی از اعتراض نہیں کیونکہ اگر اس کے سامنے کوئی اصل ماخذ ہوتا تو اس میں سنہ ہجری مذکور ہوتا۔

ہندوستانی سپکولیٹر کا یہ قول کہ فیضی نے ملا دو پیازہ کو بلوا کر عبادت خانہ دین الٰہی کا کام اس کے سپرد کردیا، قرین صحت نہیں کیونکہ اگر ایسی اہم خدمت ملا دو پیازہ کے سپرد ہوتی تو اکبری عہد کی تاریخوں میں یقیناً اس کا ذکر ملتا۔

وہ احمد نگر کے خلاف شاہزادہ جہانگیر کی ایک ناکام مہم کا سنہ ۱۵۹۹ء (۱۰۰۸ھ) بتاتا

نہ ہے لیکن شہزادگی کے ایام میں جہانگیر کبھی جہانگیر نہیں کہلایا بلکہ اس کا نام سلیم تھا۔ تخت نشینی کے وقت وہ جہانگیر نام اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح مولف کا یہ بیان کہ جہانگیر کو سنہ ۱۵۹۹ء میں احمد نگر کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا' بالکل غلط ہے۔ جہانگیر کو دکن کی مہم پر کبھی نہیں بھیجا گیا بلکہ یہ شہزادہ مراد تھا جو سنہ ۱۰۰۳ھ مطابق ۱۵۹۴ء کو بغرض تسخیر احمد نگر روانہ ہوتا ہے۔ مگر امراء کے نفاق اور سوء تدبیر سے یہ مہم ناکام رہی۔ مراد سنہ ۱۰۰۷ھ (۱۵۹۸ء) میں فوت ہوتا ہے۔ اس کی جگہ شاہزادہ دانیال کی تقرری عمل میں آتی ہے اور قلعہ احمد نگر سنہ ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) میں فتح ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس کا یہ کہنا کہ خود اکبر سنہ ۱۵۹۹ء (۱۰۰۸ھ) یا اس کے قریب احمد نگر کے محاصرہ کے واسطے پہنچا صحیح نہیں۔ اکبر کا ارادہ ضرور دکن جانے کا تھا۔ مگر وہ آسیر[۸] سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اور سنہ ۱۰۰۹ھ (م ۱۶۰۰ء) میں اس قلعہ کی فتح کے بعد وہ واپس آگرہ آگیا۔

اس کا یہ بیان کہ دو پیازہ ایک خاص قسم کا پلاؤ ہے' صحت سے بعید ہے۔ کیونکہ ابوالفضل آئین اکبری میں دو پیازہ کی تشریح بالفاظ ذیل کرتا ہے:

"دو پیازہ' دروہ سیر گوشت میانہ فربہ دو دو سیر روغن زرد و پیاز' ربع سیر نمک' ثمن سیر زنجبیل تر' یک یک دام از زیرہ و کشنیز و قاقلہ و قرنفل' دو دام فلفل' پنج قاب شود۔" (آئین اکبری' صفحہ ۳۷' جلد اول طبع نول کشور' سنہ ۱۳۱۰ھ)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک قسم کا قلیہ ہے نہ پلاؤ۔

فارسی میں ملا کے متعلق جو کچھ ملتا یا مل سکتا ہے' ہندوستانی سپکولیٹر اس سے بالکل بے خبر ہے۔ اس کا یہ رسالہ درحقیقت کسی قدیم ماخذ پر مبنی نہیں ہے بلکہ خیالی واقعات کا طومار ہے جس کے واسطے اس کا دماغ اور قلم ذمہ دار مانا جاسکتا ہے۔ رہے لطیفے یہ یقیناً محمد کامل کے عہد سے قبل کے ہیں اور دیگر اشخاص کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اس کا مزار قصبہ ہنڈیا میں ہے' یہ حصہ ہندوستانی سپکولیٹر کے بیان کا البتہ صحیح ہے۔ بعض اردو نگاروں نے اسے ملا عبدالقادر بدایونی کے ساتھ شناخت کیا ہے۔ مثلاً سوانح عمری بیربل و ملا دو پیازہ میں جس کو حسب ایمائے منشی بلاقی داس مالک مطبع'

اہالیان مطبع نے کتب انگریزی و اردو و فارسی سے انتخاب اور ترجمہ کر کے تالیف کیا(۹) (میور پریس دہلی)۔ اس تالیف میں لکھا ہے:

"بعضوں نے اس کا نام ابوالحسن بھی دیا ہے۔ منجملہ نورتنوں کے اکبر کا ساتواں رتن تھا۔ اصل میں گیلان کا رہنے والا تھا۔ بعض طائف کا اور بعض نجد کا بتلاتے ہیں۔ سنہ ۱۸۴۲ء (کذا۔ ۱۵۴۲ء؟) میں پیدا ہوا۔ اکبر کی پیدائش بھی اسی سنہ میں ہوئی تھی۔ دوسرا حسن اتفاق یہ ہوا کہ تاریخ ۱۴ ماہ اکتوبر سنہ مذکور میں جب اکبر پیدا ہوا تو اسی تاریخ کو عبدالقادر بھی بمقام گیلان پیدا ہوا۔ اس کے باپ دادا گیلان کے بادشاہوں کے ہاں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز چلے آتے تھے۔ ہند میں اس کا باپ عبدالرزاق (المخاطب بہ ابوالحسن) آیا اور مظفر شاہ کا اتالیق مقرر ہوا۔ جب مظفر شاہ جوان اور خودمختار ہوا تو عبدالرزاق کو عہدہ قاضی القضاۃ کا عطا کیا۔ عبدالرزاق صلح کل انسان تھا۔ جب عبدالقادر سولہ سترہ برس کا ہوا تو باپ بیٹوں میں ناچاقی ہوگئی۔ بیٹا کٹ ملا اور باپ دنیا دار۔ یہی باعث نا اتفاقی ہوا۔ عبدالقادر مکہ معظمہ چلا گیا۔ عبدالرزاق اس کی تلاش میں نکلا اور مکہ پہنچا۔ بدقسمتی سے جاتے ہی دو تین دن کے بعد دنیا سے کوچ کر گیا اور بیٹے سے ملنے کی حسرت دل میں لے گیا۔ عبدالقادر نے مکہ میں رہ کر دینی علوم حاصل کیے اور بڑی شہرت حاصل کی۔ اب اس کو یہ شوق پیدا ہوا کہ دولت کمائے۔ اس خیال سے وہ ہندوستان پہنچا۔ عبدالقادر کے استاد کا نام بھی عبدالقادر تھا۔ اس نے اپنی لڑکی عائشہ نامی اسے بیاہ دی۔ قصہ مختصر عبدالقادر اکبر آباد پہنچا اور مرزا عبدالرحیم اور زین خاں کی معرفت دربار اکبری میں پہنچا اور رفتہ رفتہ اکبر کا پرائیویٹ سیکرٹری بن گیا۔ ابوالفضل اور فیضی سے عبدالقادر کی نوک جھونک رہتی تھی۔ اس کے بعد سرہنری ایلیٹ کی رائے کا خلاصہ اور ایک مختصر نوٹ کرنل کینڈی کی کتاب سے عبدالقادر کے متعلق دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ فاضل اکبر کے تین سال پہلے سنہ ۱۶۰۲ء میں عالم بقا کو سدھارا۔"

ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام حالات، محض فرضی ہیں۔

اسی عقیدے کی صدائے بازگشت "سوانح عمری ملاں دو پیازہ و بیربل" از تصنیف آغا محمد طاہر نبیرۂ مولانا محمد حسین آزاد میں ملتی ہے۔ (آغا طاہر ہمیں ملا عبدالقادر کے صحیح حالات سے روشناس کرتے ہیں۔ لیکن عبدالقادر کے ملا دو پیازہ کہلائے جانے کی وجہ آغا طاہر یہ دیتے ہیں کہ "بیربر نے باتوں باتوں میں ملا دو پیازہ کی پھبتی کہہ دی ہو گی بس پھر کیا تھا۔ منہ سے نکلی اور کوٹھے پر چڑھی۔ ذرا سی دیر میں تمام شہر میں مشہور ہو گیا۔ یہ بے چارے مولوی سے خاصے ملا دو پیازے بن گئے اور ایسے بنے کہ آج تک وہی نام مشہور ہوا۔"

مگر عبدالقادر اور ملا دو پیازہ دو مختلف اشخاص ہیں اور ان میں خلط کرنا سراسر دیوانگی ہے۔ ملا دو پیازہ درحقیقت ایک تاریخی شخص ہے اگرچہ اس کے حالات ہمیں معلوم نہیں اس کی تصویر مصوروں میں بہت مقبول رہی ہے۔ وہ ایک دبلے پتلے گھوڑے پر جس کی ہڈی ہڈی اور رگ رگ گنی جا سکتی ہے سوار دکھایا گیا ہے۔ اس کی پگڑی نہایت بھاری ہے۔ موٹے جسم بڑے کلّے جبڑے اور بھری ڈاڑھی کا شخص ہے۔ جبے کے پلو نہایت نیچے اور آستینیں نہایت ڈھیلی ہیں۔ یہ تصویر شاہجہاں کے عہد سے ملنے لگتی ہے۔ اس کی کافی نقلیں موجود ہیں۔ جو جانسن کلیکشن یعنی مجموعہ جانسن کے نام سے مشہور ہیں۔ ان مرقعوں میں ملا دو پیازہ کی کئی قدیم تصویریں موجود ہیں۔

محمد صادق شاہ جہان کے عہد کا ایک نہایت ممتاز مصنف اور مورخ ہے۔ اس کی تاریخ "صبح صادق" اور "طبقات شاہ جہانی" جو مشاہیر کے حالات پر ایک نادر تالیف ہے' نہایت مشہور ہیں۔ یہی مصنف ایک اور ضخیم کتاب "شاہد صادق" نامی کا بھی مصنف ہے۔ "شاہد صادق" میں متعدد موقعوں پر ملا دو پیازہ کے "الٰنامہ" کے حوالے اور اقوال ملتے ہیں۔

میرے پاس جے مل تھار کی ایک بیاض ہے جو سنہ ۱۰۶۲ و ۱۰۶۷ھ میں نقل ہوئی ہے۔ اس بیاض میں دو پیازہ کا "الٰنامہ" موجود ہے' جو خود جے مل کا نقل کردہ ہے۔

میرے ہاں ایک اور بیاض ہے' جو گزشتہ صدی کے پہلے ربع کی نوشتہ معلوم ہوتی

ہے۔ اس میں "النامہ" کا مکمل نسخہ موجود ہے جو پورے سولہ صفحوں پر آیا ہے۔ خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل "النامہ" کا نام "مرات المضحکین" ہے چنانچہ خاتمہ کی عبارت ہے:

"تمام شد نسخہ مرآت المضحکین تصنیف ملا دو پیازہ صاحب تاریخ خیر لک من الاولیٰ۔"

"خیر لک من الاولیٰ" سے ۱۰۲۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔

یہ بیاض' جو مختلف خطوط و حکایات و لطائف پر مشتمل ہے' ملا دو پیازہ کی دو حکایتوں کی حامل ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ دو پیازہ کے حالات پر کوئی رسالہ ضرور موجود تھا۔ اور یہ حکایتیں اسی رسالہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان حکایتوں کا مصنف ایک نامعلوم شخص ہے جس کا تخلص اشلغی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دو پیازہ کا فرزند اور شاگرد بتاتا ہے اور اس کے نقش قدم پر چل کر اسی کی شہرت کا طالب ہے۔ اشلغی پہلی حکایت میں ملا کے قیام ایران کے بعض حالات فارسی میں دیتا ہے۔ جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

سنہ ۹۹۰ھ میں ہندوستان سے برداشتہ خاطر ہوکر بکر ٹھٹھہ کے دریا سے گزر کر براہ کیچ و مکران ملا ہرات پہنچا۔ شیعہ آکر اس سے پوچھنے لگے کہ تیرا دین کیا ہے؟ ملا بولا' میں ہندی ہوں۔ ہمارے ہاں دن یوم کو کہتے ہیں۔ انہوں نے الفاظ بدل کر پوچھا' تو دوست کس کو رکھتا ہے؟ ملا نے جواب دیا کہ یہ بات تو اپنی اپنی ضرورت اور مقدار ضرورت پر ہوتی ہے۔ میرے پاس یہ دو گدھے ہیں جو میرا سامان اٹھاتے ہیں اور یہ دو مخدوم زادے رفیق سفر ہیں۔ ان چاروں سے مجھے محبت ہے۔ شیعہ بولے عجیب بے ڈھب انسان ہے۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان۔ کچھ دنوں کے بعد مشہور ہوگیا۔ کہ ملا دو پیازہ ہندی ہرات آگیا ہے۔ اس وقت حسین خاں شاملو نے' جو اس علاقے کا سپہ سالار تھا' اسے بلایا اور مجلس لگی' جس میں مرزا فصیحی(۱۰) اور دیگر شعرائے پایہ تخت شامل تھے۔ مولانا نے اپنے کلام کے فقرات سنانے شروع کیے کہ "الیار میرزا و میرک

ریش دار" اس پر ایسے لوگ جن کے نام میں الفاظ میرزا اور میرک پائے جاتے تھے برہم ہوئے۔ حسین خاں نے سمجھایا کہ ملا تمہارا مہمان ہے' اس سے مت جھگڑو۔ دوسرے دن میرزا نصیحی نے مولانا دو پیازہ کو مہمان بلایا۔ ملا گئے اور کچھ دیر ٹھہر کر رخصت ہوئے نصیحی نے معذرت کے طور پر کہا کہ مولانا معاف کرنا۔ میرے گھر کے لوگ حمام گئے ہیں۔ ملا نے کہا "مہمان نان می طلبد نہ . . ."۔ یہ قصہ حسین خاں تک پہنچا۔ اس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ہر شخص کو ملا کی دعوت علیحدہ علیحدہ کرنی چاہیے۔ الغرض ملا نے دو سردیاں ہرات میں گزار دیں۔ اس وقت بعض مفسدوں نے اس پر یہ تہمت دھری کہ وہ بد مذہب ہے۔ چنانچہ اس بنا پر پورے ایک مہینے اسے قید میں رکھا گیا۔ شیخ عبدالصمد اور دیگر ہوا خواہوں نے مشورہ دیا کہ ملا لوگ تمہارے دشمن ہوچکے ہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں کوئی آزار پہنچائیں اس لیے بہتر ہے کہ تم یہاں سے رخصت ہوجاؤ۔ ملا ہرات سے روانہ ہوکر بلخ میں آگیا اور نذر محمد خان اور ولی محمد سلطان کے ساتھ تعلقات قائم کرلیے۔ یہاں ملا ملتانیوں کی کارواں سرائے میں قیام پذیر تھا جس کے حجرے طالب علموں کے لیے وقف تھے۔ چھ ماہ گزر جانے پر کمرہ کا کرایہ ملا سے طلب کیا گیا۔ اس نے جواب دیا' سرائے طالب علموں کے لیے وقف ہے۔ میں بھی تو طالب علم ہوں۔ کرایہ کیسے مانگتے ہو؟ آخر متولی سے رپورٹ ہوئی۔ اس نے کہا' اگر ملا واقعی صاحب فضیلت ہے تو اس سے کرایہ وصول نہیں کیا جائے گا۔ بصورت دیگر اس کو دینا پڑے گا۔ چنانچہ ملا بلوائے گئے۔ یہ تو چلتی رقم تھے۔ جاتے ہی ایسی ظریفانہ باتیں کیں کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ سب نے مولانا سے درخواست کی کہ آپ کی فضیلت سب پر عیاں ہے لیکن یہ شخص جو آپ کو بلانے گیا تھا اس کا نام محمد صالح ہے اور سمرقند کا رئیس زادہ ہے۔ آج کل نہایت پریشان حال ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ چند کلمے اس کے متعلق کہہ دیں۔ جن سے آپ کی ادبی قابلیت کا سکہ دلوں پر بیٹھ جائے۔ مولانا نے قلم برداشتہ اس کے ذکر میں چار ورق تحریر کردیئے۔ جو اپنے موقع پر درج کیے جائیں گے یہاں اصل فارسی عبارت بھی نقل کردی جاتی ہے:

"درسنه نه صد و نود از خاک پاک هند دل برداشته از دریای بکر تهته گذشته براه کیچ مکران سیار دیار ایران شده داخل هرات گشت. بکاروان سرای آمده ماوی گرفت. الترائی خوارهٔ لعن' چندی جمع شده ملا را اجنبی دانسته گرد آمده سوال نمودند که ای مرد غریب درین دیار بس عجیب چه دین داری؟ بجواب گفت که مامردم هندی هستیم در روزمرهٔ اہل هند "دن" روز را می گویند. حیران شده همه گفتند که کدام کس را دوست می داری. گفت دوست داشتن بقدر ضرورت و درخور احتیاج می باشد. این دو ماده خر است که کاغذ و آذوقه سفر بر می دارد و این دو مخدوم زاده رفیق سفر است. هر چهار را دوست می دارم. تبرائیان گفتند' طرفه مردی است. سوال از آسمان می کنیم جواب از ریسمان می گوید. از سر کوی پرسش و اشلغ در گذشتند. بعد از چند روز اشتهار یافت که ملا دو پیازه هندی داخل هرات است. در آن زمان حسین شاملو سپه سالار آن الکه بود. طلبیده بر روی مولانا مجلسی آراستند. مرزا فصیحی و شعرای پایه تخت هرات را طلب داشتند. و مولانا از فقرات کلام خویش می خواند که مطلق "الیار میرزا و میرک ریش دار" تمام اهل مجلس (که) مسمی باسم میرزا و میرک بود (ند) بهم برآمدند و بشوریدند. حسین خان فرمود که یاران ملا دو پیازه مرد نامور روشناس عالم است' باین مرد بسیار نه پیچید که مهمان دیار شماست. روز دیگر مرزا فصیحی مولانا را مهمان خود کرد. ساعتی نشسته روانه زاویه خود شد. مرزا فصیحی عذر آورد که مولانا معذور دارید مردم خانه بحمام رفته اند. ملا جواب داد که مهمان نان می طلبد نه . . . . مارا بمردم خانه خود چه کار است. این لطیفه بسمع حسین خان رسید. فرمود که بهر اهل این دیار لازم است که یگان یگان بار ملا را مهمان خانه خود نمایند. دو زمستان در هرات بسر بردند. جماعه مفسدان بر ملا تهمت بستند که ملا مذهب ندارد. یک ماه در قید بود. شیخ عبدالصمد برادر شیخ بهاء الدین ولد شیخ حسین عبدالصمد آملی قاضی هرات ملا را طلب داشته گفت که ملا درپی آزار شما

شدند۔ نباشد کہ این مادر بخطایان دست آزار بر شما دراز کنند۔ زود ازین دیار بدر روید۔ ازان جا گریختہ بہ قبۃ الاسلام بلخ آمد بہ نذر محمد خان و ولی محمد سلطان آشنا شد و پیوستہ در محافل فیض مماثل ایشان بار داشتند و درکاروان سرای ملتانیان می بودند۔ چون حجرہای سرای وقف طالب علمان بود۔ بعد شش ماہ اجرۂ آن حجرہ از ملا طلب نمودند۔ ملا گفت اگر این سرای وقف طالب علمان است ماھم طالب علیم و غشی . . . . اجرہ از ما گرفتن از مروت بعید و از جادۂ انصاف بس دور است۔ . متولی خبر کردند کہ در یک حجرہ مردی بچندین فضیلت دعویٰ می کند و در ادای اجرۂ حجرہ توقف می نماید۔ متولی فرمود۔ مردی کہ این ہمہ دعویٰ می کند خالی از حالت نخواھد بود۔ ملیدہ باید۔ اگر شائستہ اجرہ گذاشتن باشد نگیریم ورنہ بستانیم۔ ملیدہ مجلس داشتند۔ اہل مجلس از کلمات نشاط آمیز و محاورات طرب انگیز مولانا خوش دل گردیدہ گفتند کہ اخوندی حقیقت فضیلت شما بر دوستان نیک روشن شدہ و این مردی کہ .طلب شما رفتہ بود' میر محمد صالح نام دارد و یکی از اکابر زادھای سمرقند است و درین روزھا پریشان حال' می خواھم کلمہ چند برحقیقت ایشان مرقوم سازند تا در ضمن آن گویائی شما ظاھر گردد۔ در صفت آن چہار ورق املا نمودند۔ بجای خود نوشتہ خواھد شد انشاء اللہ تعالیٰ[11]

دوسری حکایت اس کی وفات کے ذکر میں ہے جو حسب ذیل ہے:

سنہ ۱۰۲۶ھ میں مولوی المعنوی ملا دو پیازہ نے دارالسلطنت فتح پور[12] میں آکر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ کی ملازمت کی اور چند روز شرف حضوری میں رہے۔ بعد میں اجازت لے کر برہان پور پہنچے اور خان خاناں ولد بیرم خاں کے پاس ٹھہرے۔ خان خاناں ایک روز مولوی کی تصنیف "علم اللہ" کا سرسری مطالعہ کر کے کہنے لگا' مولانا ہم تو تمہاری اس کتاب کا مقصد و موضوع نہیں سمجھ سکتے۔ انہوں نے جواب دیا' نواب سلامت! یہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی کتاب تو ہے نہیں کہ ہر گبر و یہودی اسے پڑھ لے۔ حاضرین یہ جھک سن کر بہت بگڑے اور بولے کہ ایسی باتیں تمہارے حوصلے سے بلند

ہیں۔ خان خاناںؒ نے کہا کہ ملا کی باتوں کو ساری دنیا برداشت کرتی ہے' اس سے جھگڑنا ہماری لیاقت کے خلاف ہے۔ ملا تین سال تک وہاں رہے اور خان خاناں کے حق میں کہا "الخان خانان مجو کعبہ کہ بعد از سالی دروازۂ آن باز شود۔" سنہ ۱۰۲۹ھ میں خاندیس روانہ ہوگئے اور پورے سال بھر ملک عنبر سپہ سالار خاندیس کے پاس ٹھہرے رہے۔ یہاں پانی کی خرابی سے بیمار پڑے اور وطن پہنچنے کے خیال سے روانہ ہوئے۔ مانڈو کے راستے میں موضع پالکھری پہنچنے پائے تھے کہ اس دار فانی سے رحلت کی۔ اشلغی کا قطعہ اور مرثیہ مع اصل فارسی کے ذیل میں درج ہیں:

در سنہ ہزار و بیست و شش مولوی المعنوی ملا دو پیازہ در دارالسلطنت فتح پور آمدہ بادشاہ عادل باذل نورالدین محمد جہان گیر بادشاہ ہندوستان را ملازمت نمودند۔ چند گاہ بشرف حضور معزز گشتہ بکرم عمیم ممتاز شدند:

شاہ دو پیازہ مغز دانش — اوج بینشش بمہر و ماہ رسید
از لطائف فریبی سخنش — عیش را بر فلک کلاہ رسید
از بحار فضائلؔ کرمش — در معنی بگوش شاہ رسید
از نہان خانہ حصول امل — فوج قدرش بشاہ راہ رسید
نیست بزمی کہ ذکر موعظہ اش — نہ بگوش گدا و شاہ رسید
شاعران زمانہ را بسخن — گر بیک گونہ دستگاہ رسید
این بگو فضل را ز فیض ابد — تازہ بابی بصد گواہ رسید
اشلغی پور کمترینہ اوست — کہ بخنہاش خصم کاہ رسید

و از حضرت پادشاہ دین پناہ رخصت گرفتہ بہ برھانپور نزد خان خانان ولد بیرم خان آمدند۔ روزی جلد "علم اللہ" مولوی مطالعہ می فرمودند۔ بغور کتاب نرسیدہ پرسیدند کہ مولانا این کتاب شمارا منشا و معاد نفہمیدیم۔ در جواب گفتند کہ نواب سلامت این کتاب موسیؑ و عیسیٰؑ نیست کہ ھر گبرو یہود بخواند۔ اھل مجلس بھم بر آمدہ گفتند کہ این سخن شما بغایت از حوصلہ روزگار بلند است۔ خان خانان رو

باحباب مجلس و اصحاب فضل کرده فرمودند کہ تمام اهل عالم و بزرگان عدیم المثال سخن ملا برداشته و ما در موہجم' لائق شان اهلیت ما نیست۔ سہ سال در آنجا بسر بروند۔ چنانچہ در باب ایشاں فرماید "الخان خانان ہمچو کعبہ کہ بعد از سالی دروازهٔ آن باز شود۔" در سنہ هزار و بیست و نہم روانہ ملک خاندیس گردیدند۔ یک سال کامل در پیش ملک عنبر سپہ سالار خاندیس گذرانیدند۔ در آنجا از گردش آب بیماری پیدا نموده خواستند (خود را) بخاک مالوف رسانند۔ براه ماندو در قریہ پالکھیری آواز ارجعی الی ربک بگوش رحلت نیوش شنیده بحضرت حق شتافتند۔ آه ازین فلک غدار هر آفتاب ولی کہ از مشرق ایجاد سر بر کرده بہ ظلمت کدهٔ مغرب فنالیش چون گوهر شب چراغ بزیر خاک بخاکستر برابر ساخت۔ و هر طوبیٔ ظلالی کہ از روضہ ازل بآبیاری (قدرت) نشو و نما یافتہ سرسبز و خورم گردید بدم تیشہ اجل (آنرا) در انداخت۔ چنانچہ در مرثیہ ایشان گوید:

هرکس کہ شد بعالم مرگیست در قفالیش
خورم ولی کہ ننهد دل دربی حوالیش
دل بستگی بجوید دل دادهٔ توکل
برکار دهر کاول بر آب شد بنالیش
از ابتدای هستی کس نیست واقف از خود
وندر نما-تش گم زانسان کز ابتدائش
گشت از عدم مہیا اشخاص نوع عالم
کز بدو کرد موجود ایزد پی فنالیش
از مکر دهر ایمن نتوان بزیست یک دم
کاندر دعاش مضمر صد گونہ از دغالیش
بکشای چشم عبرت بر نفس کز خجالت
افکنده سر ببالین در معرض رجالیش

محنت سرای گیتی جای طرب نیامد
کز عیش او مهیا آمد همه جفایش
کس بر نه بست طرفی ازدهر جز ندامت
برخود بدار ماتم بگذر ز ماجرایش
مرد آن جهان دانش کز فوت او جهان را
بے نور مانده دیده از مهر و از ضیایش
گردون چو او نیارد در دور خویش یکتا
گر عمر جاودان را بخشد بخون بهایش
خالی بماند عالم از اهل فضل و دانش
چون رخت خویش بربست از دارِ پر صفایش
شاهان شرق و غربش بودند آرزو مند
تابشنوند حرفی از طبع نکته زایش
در درس علم سنجش کردم سواد روشن
از ماضی و مضارع فارغ شدم برایش
مومن نهاد نامش مام و پدر ز اول
دو پیازه کرد مشهور از فضل خود خدایش
چون شد ز دهر فانی هنگام ماتم او
تاریخ فوتش آمد "بهشت باد جایش"
یا رب چراغ من هم روشن بکن چو نامش
تا بر زبان دهر است از مدحت و ثنایش
از فضل خویش یا رب بر اشغلی به بخشا
بر عفو خویش بنگر منگر سوی خطایش

دو پیازہ کے متعلق یہ بیان، جو اوپر درج ہوا ہے، اردو خوانوں کے بیان سے بالکل مختلف ہے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کے پاس ملا کے صحیح حالات کا بہت کم سرمایہ موجود ہے۔ اردو والے اس کی وفات سنہ ۱۶۰۰ء م ۱۰۰۹ھ میں بیان کرتے ہیں حالانکہ وہ سنہ ۱۰۳۰ھ م ۱۶۲۰ء میں رحلت کرتا ہے جیسا کہ مادہ "بہشت باد جالیش" سے ثابت ہوتا ہے۔ اردو والے اس کا نام ابوالحسن یا عبدالقادر بتاتے ہیں لیکن اصلی نام، جو اس کے ماں باپ نے رکھا تھا، مومن بلکہ عبدالمومن تھا اور دو پیازہ عرف تھا۔ سلاطین و امرا اس کی عزت و توقیر کرتے۔ وہ اپنے زمانہ میں خاصہ ہردلعزیز تھا کہ حسین خاں شاملو اور خان خاناں تک اس کی باتوں کا برا نہ مانتے۔ دنیا اس کے لطائف و نکات سننے کی شائق تھی۔ اس کی مدح و ہجو مشہور تھی۔ اشغلی اس کو جہان دانش کہتا ہے، جس کی رحلت سے عالم ایک دیدۂ بے نور بن گیا ہے اور آسماں کے لیے ایسا مستجمع کمالات شخص پیدا کرنا بہت دشوار ہے۔ وہ اپنی نظم و نثر کے لیے مشہور تھا۔ یہی اشغلی غالباً" ملا کی ایک اور تالیف (ملستان) سے بعض لطیفے نقل کرتا ہے۔ جن میں سے یہاں صاف سے دو لطیفے، جو بعنوان ذیل آتے ہیں، حوالہ قلم کرتا ہوں۔

"ثانیاً" فقرۂ چند از دیباچہ و حکایات "ملستان" الہام نشان در جواب گلستان مصلح الدین شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ تصنیف نمودہ اند در رقم آوردہ"

"الگدائی کوچہ گرد کاسہ گدائی پر از لقمہ ھای رنگا رنگ گدائیدہ در کنج حجرۂ نشست گاہ چون نکبتیان ساختہ بکیفیت گذر خشک و تر خائید و آب نوشیدہ الفاتحہ آلت گدای، مع الاخلاص ریش خند بزرگان، بتکبیر دراز بخواندہ۔ یک بارگی السپاھی زبون بین، گدای را بہ چند لکد خاطر خواہ نواختہ اعتراضید کہ این گیدیان چند رزاق علی الاطلاق خدای را بد آموز ساختہ جایی کہ پارچہ گدائی خوردہ قانع برین شکر باشند۔ مایان را شراب و کباب چہ نوع سر انجام آید۔"

"روزی فرعون لعین خوشۂ انگور در دست داشت و در بزرگی و براقی او ملاحظہ می نمود۔ اندران حالت ابلیس در رسید۔ فرعون از روی تعجب پرسید کہ

کسی این خوشہ را مروارید تواند کرد۔ ابلیس یکی از اسمای رب العزت بران دمید۔
فی الحال مروارید شد فرعون بحیرت ماندہ گفت کہ تو درین کار بسیار استادی۔
گفت مرا باین استادی بہ بندگی قبول نہ کردند۔ تو می خواہی باین حماقت دعوی
خدای بکنی۔"

"ملاحت[۱۳] مقال" میں ملا کے بعض لطائف درج ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی محمد کامل کی تالیف میں نہیں ملتا۔ ان لطائف میں ایک یہ ہے کہ شاہ عرب نے ملا کا نام پوچھا۔ اس نے کہا' دو پیازہ۔ بادشاہ نے ایک مرغا منگوایا اور کہا کہ اس مرغ سے بھی تو دو پیازہ تیار ہوا کرتا ہے۔ ملا نے جواب دیا:

نسبت این مرغ بمن کی رسد
تاج بہ سر دارد و گہ می خورد

شاہ ایران ملا سے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو۔ وہ جواب دیتا ہے' پسر خدایم۔ بادشاہ نے کہا' اگر ایسا ہے تو تم اس قلماقنی کی آنکھیں بڑی کردو۔ ملا نے جواب دیا کہ فراخی چشم اختیار پدرم و فراخی...... باختیار من۔

شاہ ایران ایک روز ملا کو شکار پر لے گیا اور ایسا گھوڑا چڑھنے کو دیا جو پچھلی طرف سے آواز کرتا۔ ملا بار بار منہ موڑ کر کہتا' ہاں ہاں۔ بادشاہ نے پوچھا کہ گھوڑا کیا کہتا ہے۔ ملا نے جواب دیا' پوچھتا ہے کہ شاہ ایران انہی کا نام ہے؟ میں کہتا ہوں ہاں' ہاں۔

ایک دن ملا اپنا گھوڑا داغ کرانے کچہری لے گیا۔ شنکر داس نامی مشرف نے کہا کہ اسپ ہمچو خچر داغ نمی شود۔ اسے واپس لے جاکر ملا نے فی البدیہہ یہ بیت کہا:

اسپ من اسپ است اسپ دیگران چوں خچر است

. . . .

ہندوستان سپکولیٹر نے جو بعض لطیفے ملا کے نام پر دیے ہیں' ان میں سے کئی "ملاحت مقال" میں دوسرے اشخاص کے نام پر دیے ہیں۔ مثلاً دو پیازہ کا ایک روز زمین میں جھک جھک کر دیکھنا۔ بیربل کا اس سے پوچھنا' زمین میں کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ ملا

کا جواب دینا کہ اپنا باپ تلاش کر رہا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یہی لطیفہ کسی قدر فرق کے ساتھ "ملاحت مقال" میں یوں مذکور ہے کہ اکبر نے دریافت کیا کہ بیربل کی اولاد میں سے اگر کوئی لطیفہ گو ہو تو ہمارے پاس لاؤ۔ لوگوں نے کہا' ہے تو سہی مگر حضور اس کی باتوں کو برداشت نہیں کریں گے۔ آخر بادشاہ کے اصرار پر ایک کو لایا گیا جو زمین کو دیکھتے ہوئے آیا۔ بادشاہ نے پوچھا زمین میں کیا دیکھتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ایک عرصے سے میرا باپ اس میں گم ہوگیا ہے۔ اس کی تلاش کرتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا' اگر ہم تیرے باپ کو ڈھونڈ نکالیں تو؟ جواب دیا' آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔"

"ملاحت مقال" میں ایک اور قصہ ہے جس میں کوئی شخص ایک عورت کے ساتھ بدفعلی کا مرتکب ہوتا ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کو معلوم ہوتا ہے۔ وہ فولاد خاں کوتوال کو حکم دیتا ہے کہ اس گندے شخص کا پتہ لگاؤ۔ کوتوال کے آدمی تلاش کو جاتے ہیں اور ایک ایسے شخص کو جو موری کے پانی سے انگلیاں تر کرکے پان میں چونا لگا رہا تھا' لے آتے ہیں۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مجرم یہی شخص تھا۔ یہ قصہ بھی ہندوستانی سپیکولیٹر نے ملا دو پیازہ کے نام پر دیا ہے اور محمد شاہ کی جگہ اکبر کا نام بدل دیا ہے۔

شفیق اورنگ آبادی تذکرۂ گل رعنا میں' جس کا یہ التزام ہے کہ صرف شعرائے ہند مذکور ہوں' ملا دو پیازہ کو "مشاہیر ظرفای زمان و معاریف خوش طبعان ھندوستان" میں شمار کرتا ہے جو جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں ہو گزرا ہے۔ شفیق کہتا ہے کہ میں نے ملا دو پیازہ کی قبر کی زیارت کی ہے جو قصبہ ہنڈیا میں ہے۔ یہ قصبہ دریائے نربدا کے ساحل پر آباد ہے اور قبر سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کا رسالہ اقوال مشہور ہے جو بطریق رسالہ اقوال عبید زاکانی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ گل رعنا کا ورق اس مقام سے دیمک خوردہ ہے۔ اس لیے میں ملا کے پورے حالات اس مخطوطہ سے نقل نہیں کرسکتا۔

دو پیازہ کے "النامہ" یا "مرآت المضحکین" کے دو نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں ہیں۔ ایک کا نمبر ۹۳۹ (و) فہرست آئیو ناف (سنہ ۱۹۲۴ء) ہے۔

دوسرے کا نمبر ۶۷۶، فہرست آئیو ناف (مجموعہ کرزن) ۱۹۲۶ء ہے۔

تذکرہ روز روشن میں مظفر علی صبا لکھتے ہیں کہ ان کا نام ملا عبدالمومن دہلوی ابن ملا ولی محمد عرف ملا دو پیازہ ہے۔ ہر قسم کے علم و فضل سے ان کو کافی حصہ ملا تھا۔ ترکی زبان دانی میں بے نظیر تھے۔ چونکہ طبیعت پر ہزل و مزاح کا رنگ غالب تھا اس لیے ان کی علمی فضیلتوں کو چمکنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک عرصہ تک نواب آصف جاہ نظام الملک بہادر فتح جنگ کی رفاقت میں رہے۔ اور قصبہ ہنڈیا[14] میں، جو قصبہ چمپانیر، من مضافات بھوپال، سے ایک روز کے راستے پر واقع ہے، انتقال کیا اور مزار بھی وہیں ہے۔ "اتراک عالمگیری" ترکی لغت ان کی تصنیف ہے۔ اس میں بادشاہ کی مدح میں لکھا ہے۔

شعلہ قہرش بدریا گر فتد
آب خاکستر بیک دم می شود
روی تیغش کی بود آلودہ زنگ
دارد از خون مخالف آب و رنگ
آسمان از طوغ او ترسان شدہ
روز و شب برخویشتن لرزان شدہ

صبا نے صفحات ۲۱۷ - ۲۲۲ پر ملا کا "النامہ" بزعم خود تمام نقل کردیا ہے۔[15] جو ہمارے نزدیک نصف بھی نہیں ہے۔ وہ ملا کا نام عبدالومن بیان کرنے میں اشلغی کے بیان کی تائید کرتا ہے مگر ہمیں تعجب ہوتا ہے جب وہ دوپیازہ کا زمانہ عہد عالمگیر بلکہ عہد محمد شاہ سنہ ۱۱۳۱ و ۱۱۶۱ھ بیان کرتا ہے۔ نواب آصف جاہ سے مراد نظام اول متوفی سنہ ۱۱۶۱ھ ہیں۔ ان کو آصف جاہ کا خطاب محمد شاہ نے سنہ ۱۱۳۳ھ میں دیا، جب قلمدان وزارت عطا کیا ہے۔ عہد عالمگیری میں ان کا خطاب چین قلیچ خان بہادر تھا.... اندر من[16] کی چہار گلشن میں دو پیازہ کا مزار ہنڈیا میں بتایا گیا ہے۔

دو پیازہ کی قبر کا ایک اور زائر سید کریم علی، میر منشی ریزیڈنسی اندور ہے، جو اپنی

تاریخ مالوہ میں' بذیل ہنڈیا' رقم طراز ہے:

"ہنڈیا آگے سرکار تھا' بڑا شہر غدار تھا۔ مرہٹوں نے اسے یہاں تک لوٹا' بالکل اجڑ گیا' چھوٹا گانو رہ گیا۔ برلب نربدا اس شہر کی آبادی تھی۔ کوسوں تک بستی تھی' گرد شہر کے شہرپناہ تھا۔ شہر اجڑ گیا' شہرپناہ جنگل میں کھڑا رہ گیا۔ نربدا کے کنارے شہر پختہ بنا تھا۔ مولف نے دیکھا تھا۔ اس قلعہ میں ملا دو پیازہ کی قبر اور اس قبر کے پیچھے بی بی چپاتی اور میاں قلیا کی دو قبریں اور مسجدیں و درگاہیں و مقبرے بے انتہا جنگل میں عمارتیں ہر جا۔" (تاریخ مالوہ' صفحہ ۲۲۵' سنہ ۱۳۹۰ء' مطبع رتن پرکاش' رتلام)

ان چند امور سے' جو "تمثیلا" میں نے بیان کیے ہیں' یہ نہ سمجھا جائے کہ فارسی کے تمام ذرائع ملا کے سلسلہ میں ختم ہوچکے ہیں۔ اگر تلاش جاری رکھی جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے باقی ماندہ حالات بھی دریافت ہوسکیں گے۔ لیکن اس مشتے نمونہ از خروارے سے اس قدر ضرور واضح ہوتا ہے کہ اردو خوان اب تک اس کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانے سے قاصر رہے ہیں۔ اس تعلق میں انہوں نے صرف ہندوستانی سپکولیٹر کو اپنا راہبر بنالیا ہے اور جو اعتراض اس کی اطلاعات کے خلاف پیش کیے جاسکتے ہیں' وہی اعتراضات دو پیازہ کے باقی سوانح نگاروں پر بھی عائد کیے جاسکتے ہیں۔

(۲) میر جعفر زٹلی

ان کی نسبت میں نے "پنجاب میں اردو" لکھتے وقت فہرست مخطوطات ہندوستانی' انڈیا آفس کی سند پر عبارت ذیل لکھی تھی:

"میر جعفر اصل میں نارنول کے باشندے ہیں اور سید عباس کے فرزند ہیں جن کا پیشہ دکانداری تھا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں۔ ان کے بعد دو بہنیں ہوئی تھیں۔ اور پھر ان کے چھوٹے بھائی صفدر ہوئے۔ میر کی کم عمری میں ان کے والد کے انتقال کا واقعہ پیش آیا۔ چچا نے' جن کا نام میر سرور تھا' سرپرستی کی۔ مکتب میں تعلیم پانے کے بعد ملازمت کی تلاش میں نکلے... .. الخ

اس کے کئی سال بعد ولیم اروِن کا بیان ذیل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جریدے میں میری نظر سے گزرا: (حاشیہ بر مرزا جعفر زٹلی نارنولی)

"زٹلی' جس تخلص سے مرزا جعفر اپنے اشعار لکھتا ہے' ہندی لفظ زٹل سے' جس کے معنی بکنا' باتیں بنانا اور ہرزہ گوئی ہیں' ماخوذ ہے۔ اس کی کلیات کی کئی اشاعتیں ہیں۔ ایک نسخہ' جو ڈاکٹر اشپرنگر کی ملک تھا' اب برلن میں کتب خانہ Konigliche میں موجود ہے۔" (دیکھو اس کی فہرست صفحہ ۸' نمبر ۱۶۳۸)

بیل.صفحہ ۱۸۶ پر لکھتا ہے[۱۷] کہ وہ شاہی سکہ کے بیت کے جواب میں مضحک نگاری کی بنا پر فرخ سیر کے حکم سے قتل کیا جاتا ہے۔ مورخ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتے مگر اس کے وقوع کا امکان ہے کیونکہ (میر) عبدالجلیل بلگرامی واقعہ نویس سیوستان کو ایک بے ضرر رپورٹ کی بنا پر بلا کر برخاست کردیا گیا تھا۔

زٹلی کے بارے میں مزید تفصیل ایک اردو رسالہ میں ملتی ہے جس کا نام "زر جعفری" یعنی سوانح عمری میر جعفر زٹلی از ہندوستانی سپکولیٹر ہے۔ (اشاعت جان محمد و محمد اسمٰعیل' کشمیری بازار' لاہور' سنہ ۱۸۹۰ء' طبع سنگی' تعداد صفحات ۳۶)۔ اس رسالے

سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اجداد ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، جب یہ بادشاہ بار دوم ہندوستان آیا اور ہیمو سے جنگ آزمائی کی۔ یہاں انہیں جاگیر مل گئی اور جہانگیری عہد تک ان پر شاہی مہربانی ہوتی رہی۔ مگر شاہ جہاں کے زمانہ میں جاگیر چھن گئی اور شاعر کا باپ میر عباس کسب معاش کے واسطے دکان کھولنے پر مجبور ہوا۔ جعفر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جلوس عالمگیری سنہ ۱۶۵۸ء (۱۰۶۸ھ) کے وقت اس کی ولادت ہوئی۔ میر عباس کی دوسری اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا صفدر (نامی) ہے۔ یہ خاندان بھر میں سب سے خورد اور بڑے بھائی سے ساڑھے پانچ برس چھوٹا تھا۔ ان کے بچپنے میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ میر سرور نے اپنے فرزند اکبر کے ساتھ جعفر کو مکتب میں بٹھا دیا۔ آخر میں سرور نے ان کی تمام جائیداد خورد برد کردی اور ان کی بسر اوقات عسرت کے ساتھ ہونے لگی۔ انتقال کے وقت جعفر کی عمر ساٹھ برس کی تھی لیکن سال وفات معلوم نہیں۔ کلیات میں وہ اپنی ایک رباعی میں کہتا ہے کہ یہ رباعی لکھتے وقت اس کی عمر ساٹھ برس سے زیادہ ہے۔

ذیل کے فارسی شعر تمباکو کی تعریف میں اس کے قلم سے نکلے ہیں:

طرفہ شغلی (است) شغل تنباکو
که ز آن شغل غم فرو گردد
ہمدم است این بہ وقت تنہائی
طبع بادی ازو نکو گردد

لیکن اس کی خصوصی طرز ان غزلیات پر منحصر ہے جن میں فارسی اور ہندی الفاظ بصورت ریختہ نظر آتے ہیں۔" (پچھلے مغل، صفحہ ۲۸۷ - ۳۶۱، جریدۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، جلد ۷۳، ۱۹۰۴ء)۔

دو پیازہ کی طرح میر جعفر کے یہ حالات پڑھ کر مجھ کو تعجب ہوا کہ یہ ابتدائی حالات اتنی تفصیل کے ساتھ کس طرح میسر آگئے۔ آخر ایک عرصے کے بعد "زر جعفری"(۱۸) کی اشاعت دوم کا ایک نسخہ مجھے مل گیا جو جان محمد و اللہ بخش تاجران

کتب' لاہور' بازار کشمیری نے عزیزی پریس لاہور میں' غالباً" سنہ ۱۸۹۸ء میں' چھپوایا ہے۔ اس نسخہ کو دیکھ کر میری بدگمانی اور بڑھی اور رفتہ رفتہ یہ خیال میرے ذہن نشین ہوگیا کہ ہندوستانی سپکولیٹر نے یہ کتاب محض اپنے دماغ سے لکھی ہے۔ البتہ کلیات سے ضرور امداد لی ہے۔ اس میں بھی ایک سے زیادہ موقع پر لغزش کی ہے۔ مگر ابتدائی حالات' جو زیادہ تر اس کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں' محض فرضی ہیں۔ ہندوستانی سپکولیٹر اپنے دیباچہ میں رقم طراز ہے:

"سچ تو یہ ہے کہ مورخ اپنے ہی مسودوں کی کانٹ چھانٹ سے فرصت نہ پاتے تھے۔ تذکرہ نویس اپنے ہی حال و قال میں مست تھے۔ ان کے خیال میں یہ کس باغ کی مولی تھی۔ اس لیے ذکر تک نہ کیا اور کرتے بھی کیوں۔ ان کے زعم میں ان کا ذکر ہی مناسب نہ تھا۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ اگر ان کا ذکر ان کی کتاب میں نہ ہوگا تو اس سے ان کی قدر کیا کچھ کم ہوجاوے گی؟ بلکہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ عوام الناس نے ان کی کتابوں کو تو رکھا طاق پر اور ان کے حالات دل میں۔ اب چونکہ تہذیب کا زمانہ ہے۔ ہر ایک قسم کی سوانح عمریاں تیار ہیں۔ اس لیے اے ناظرین جس طرح ہوسکا' اتر سے پچھم سے پورب سے دکن سے جو کچھ ملا ہم آپ کے لیے لائے ہیں۔"

ہماری رائے میں یہ ایک غیر ذمہ دارانہ بیان ہے۔ غور کرنے کا موقع ہے کہ جب نہ مورخوں نے اور نہ تذکرہ نویسوں نے جعفر زٹلی کے حالات قلم بند کیے تو آخر یہ حالات' جو جزئیات کی حد تک مفصل ہیں' کن ذرائع سے حاصل کیے گئے؟ مشرق مغرب اور اتر دکن تو کوئی ماخذ نہیں مانے جاسکتے۔ ہندوستانی سپکولیٹر کا یہ کہنا بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ حالات تذکرہ نگاروں نے دیئے ہیں' مصنف نے ان سے واقفیت حاصل کرنے کی بھی تو زحمت گوارا نہیں کی۔ زٹلی کا ذکر میر تقی میر' شفیق اورنگ آبادی' میر حسن دہلوی' مظفر حسین صبا' قایم چاند پوری' قدرت اللہ خاں قاسم اور منشی کریم الدین وغیرہ اپنی

اپنی تالیفات میں تحریر کرتے ہیں۔ "ملاحت مقال" میں بھی اس کے لطائف مذکور ہیں۔ مگر ہندوستانی سپکولیٹر کو ان کا پتہ تک نہیں۔ اب ہم میر جعفر کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

محمد کامل گویا ہے کہ جعفر اپنے ددہال اور ننہال کی طرف سے سید ہے (جملہ معترضہ: ولیم اروِن کا اس کو مرزا بیان کرنا میر و مرزا کے صحیح مفہوم سے بے خبری کی دلیل ہے۔ وہ زٹلی کو مرزا جعفر زٹلی اور اس کے باپ کو میر عباس کہتا ہے۔ ایک یورپین سے ایسی غلطی سرزد ہونا معمولی بات ہے)۔ میر کے اجداد ہندوستان اس وقت آئے۔ جب ہمایوں نے بارثانی آکر سوریوں کی طاقت کو توڑا۔ ان کے مورث اعلیٰ نے ہیموں کی جنگ میں بڑی بہادری دکھائی اور صلے میں معافیاں حاصل کیں۔ جہانگیر کے زمانہ تک یہ خاندان عزت و حرمت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں اس پر ادبار کے بادل چھاگئے۔ معافیاں ضبط ہوگئیں اور خاندان پر کالے دن آگئے۔ فاقوں پر فاقے ہونے لگے۔ سید عباس کی بیوی کشیدہ نکالتی۔ یہ بازاروں میں لے جاکر فروخت کرتا۔ پھر سید عباس نے ایک دوکان کھولی جس سے اتنا ہوا کہ پیٹ بھر کر روٹی ملنے لگی اور چار پیسے بچنے بھی لگے۔ ادھر عباس کے افلاس کی خبر دکن میں اس کے ایک قریبی رشتہ دار کو پہنچی۔ اس نے ایک معقول رقم کی ہنڈوی اس کے نام دہلی بھیج دی۔ اس غیر متوقع امداد سے اس نے اپنے کاروبار کو خوب چمکایا اور خوب نفع کمایا حتیٰ کہ اس کا افلاس ایک قصہ پارینہ بن گیا۔ جب عالمگیر تخت نشین ہوئے اس وقت میر عباس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا' جس کا نام میر جعفر رکھا گیا۔ جعفر کے بعد دو لڑکیاں اور ایک لڑکا صفدر نامی اور ہوئے۔ جعفر سب سے بڑا اور صفدر سب سے چھوٹا تھا۔ ان کی عمروں میں ساڑھے پانچ سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ کچھ عرصے بعد میر عباس اس دنیائے فانی سے عالم باقی کو سدھارا اور خاندان کی کفالت اس کے بھائی میر سرور نے سنبھالی۔ اس نے اپنے فرزند اکبر اور جعفر کو مکتب میں بٹھایا اور اکبر کی نسبت جعفر کی بہن کے ساتھ ٹھہرادی۔ اب میر سرور نے ہاتھ پاؤں نکالے اور بھائی کی جائیداد کو ہضم کرنا

شروع کردیا۔ آخر وہ دن جلد آگیا جب خاندان کو افلاس کا منہ دیکھنا پڑا۔

ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ میر جعفر کے ان ابتدائی حالات کے لیے ہندوستانی سپکولیٹر کے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں ہے۔ ان کے لیے صرف اس کا تخیل ذمہ دار مانا جاسکتا ہے۔ اب ہم "زر جعفری" کے اس حصے سے بحث کرتے ہیں جس میں کلیات جعفر زٹلی کے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ ان کی شان نزول یا عقبی زمین خود ہندوستانی سپکولیٹر کے اپنے تخیل کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ مثلاً زٹلی تخلص اختیار کرلینے کی وجہ میں مصنف نے قصہ ذیل دیا ہے۔ جس کا میں نے اختصار کرلیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"جعفر نے اپنے معلم سے ابو اسحٰق اطعمہ کے چند شعر سن لیے تھے:

جمال برہ بریان و حسن دنبہ فربہ
چنان برند صبر از دل کہ ترکان خوان یغما را
چہ آرائی بمشک و زعفران رخسار پالودہ
برنگ و بوی و خال و خط چہ حاجت روی زیبا را

اس سے جعفر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں ان کے طرز میں کچھ لکھوں۔ چنانچہ اس نے اشیائے خوردنی کا مضمون لے کر ایک درخواست کا یوں خاکہ تیار کیا:

التماس بندۂ درگاہ داد خواہ مولی مقدم موضع میتھی پرگنہ پالک من اعمال مودعہ سرکار سیم صوبہ اروی آنکہ آداب ادرک و کورنشات کدو بجا آوردہ بعز عرض حضرت بادرنگ جی می رساند کہ شریف پرور سلامت۔ بڑھل باغبان از کٹھل کاردار اتفاق کرو۔ چچینڈا چغل خور و چولائی چودھری پیش کار پلول ساختہ از انبہ ایمن و جامن اضافہ ..... از روی تعدی و سختی پستہ تمسک توری گرفتہ حوالہ کریلا کروڑی نمودہ شلغم شقدار گلورہ ساکن موضع گلگل را بستہ از نارنگی نو۔ سندہ و میوہ فوطہ دار و ہلدی بوتاد یک جا کردہ سدا نبل سلائی کھرنی کشاد۔"

معلم نے جب تختی پر یہ مضمون دیکھا' کہا' کم بخت! بیٹھے بیٹھے کیا زٹل ہانکا کرتا ہے۔ بس وہ دن اور آج کا دن ہے کہ جعفر کے نام کے ساتھ زٹلی کا خطاب لگ گیا۔" (صفحہ ۵۰۴)

مگر فہرست ہندوستانی مخطوطات انڈیا آفس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب بیان منشی محمد الدین مولف حیات زیب النسا' یہ شہزادی زیب النسا ہے جس نے جعفر کو زٹلی کا خطاب دیا تھا (فہرست بلو مہارٹ' نمبر ۱۱۳' صفحہ ۷۱' ۱۹۲۶ء)۔

ہندوستانی سپکولیٹر کا بیان ہے کہ زٹلی نے "بھوت بڈار نامہ" اس وقت لکھا تھا جب اس کے استاد کی بیوی کو آسیب کا خلل ہوگیا تھا اور "کچھوے نامہ" ایک اور نظم تو استاد ہی کے حق میں لکھی تھی۔ گویا سب سے پہلے استاد اور استانی پر ہاتھ صاف کیا۔ کہتے ہیں اس کچھوے نامے کی بہت شہرت ہوئی۔ چنانچہ شہزادہ کام بخش نے ازراہ قدردانی بلوایا اور مور چھل اڑانے پر نوکر رکھ لیا۔

کبھی کبھی خود شہزادہ غزل کی فرمائش کرتا۔ چنانچہ یہ غزل اسی کے ارشاد پر لکھی:

اے روئے تو چوں ماہ شب تار جو ہے سو
تجھ سا نکوئی دلبر و دلدار جو ہے سو

از غمزۂ خونریز تو افتادہ بہرسو
برطشت زمیں کشتہ بسیار جو ہے سو

مثلِ تو نباشد بجہاں اے شہ خوباں
لٹکندہ و مٹکندہ برفتار جو ہے سو

از عاشق بیچارہ مکن نخرہ و گھونگھٹ
تا کے بود ایں گرمی بازار جو ہے سو

در آتش و آبست چو ماہی و سمندر
ہر کس کہ بود طالب دیدار جو ہے سو

من پنڈت و پرکھنڈت و حیران تو ہستم
در گردن من زلف تو زنار جو ہے سو

جعفر چہ کسے باشد و کس باغ کی مولی
برحسن تو جبرئیل گرفتار جو ہے سو

مصنف اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"مورچھل والا اگرچہ سگ حضوری سے کم نہیں ہوتا مگر سارا دن سر دربار کھڑے رہنا جان کا خون کردینا ہے۔ تنگ آ کے مورچھل کی ہجو کہی اور شہزادہ کے پاس بھجوائی۔ شہزادے نے عرضی پڑھی۔ لکھا دیکھا:

توبہ ازیں وسوسہ مورچھل
ومبدم از دمدمہ جان درخلل
توبہ ازیں (مسکن) پر شور و شر
مرحلہ پرخطر و خوف و ڈر
از نظر آدمیان شد الوپ
گنبد گردوں ز صدا ہائے توپ
بان و تفنگ است بسر صبح و شام
تیر و خدنگ است دگر والسلام
خاک دریں زیستن و زندگی
جاں بخلل دل بپراگندگی
روز بہ ہیبت گذرد شب بہول
خاک دریں زیستن فعل و قول
پر خس و خاشاک بسر نوکری
نزد خرد بہتر ازیں نوکری
جعفر ازیں کوچہ پس مورچھل
شرم حضوری مکن و لوٹ چل

اس نظم اور اس کے متعلق ہندوستانی سپکولیٹر کی حاشیہ آرائی نے' جو اوپر نقل

ہو چکی ہے، ہمیں پہلی مرتبہ "زر جعفری" کے ایک غیر تاریخی رسالہ ہونے کے متعلق خبردار کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف فارسی سے نہایت معمولی شناسائی رکھتا ہے اور وہ مورچل یا مورچال کو، جو قلعوں کی تسخیر کے وقت محاصرین خندق کی شکل بنالیا کرتے ہیں مور چھل یا مگس ران سمجھ بیٹھا۔ اسی لیے اس کا تبصرہ مور چھل اڑانے اور سارا سارا دن کھڑے کھڑے سوکھتے رہنے کے خلاف ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ نظم میں مور چھل کی مذمت کی گئی ہے، حالانکہ یہ نظم مورچل (دھس یا دمدمہ، مورچا و خندق) سے تعلق رکھتی ہے۔ شاعر اس زندگی کو، جو ہر وقت خطرات سے محصور ہے، بیان کرتا ہے۔ توپوں کی آواز اور ان کے دھوئیں سے گنبد گردوں آنکھوں سے غائب ہے۔ سحر و شام بان چل رہے ہیں یا بندوقیں چھوٹ رہی ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ اس زندگی پر لعنت ہو، ہر وقت جان کا خطرہ لگ رہا ہے اور دل دھڑک رہا ہے۔ ایسی نوکری سے مٹی کی ٹوکری ڈھونا ہزار بار بہتر ہے۔ آخر میں کہتا ہے کہ جعفر اس مورچل سے نکل بھاگ اور لوگوں کی شرم حضوری کی مطلق پرواہ نہ کر۔ لیکن محمد کامل اپنی حاشیہ آرائی جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ امرا ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر ایک کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ گاہے بسلامی برنجند و گاہی بدشنامی خلعت دہند۔ شہزادہ کام بخش نے آنکھیں بدل لیں۔ (میر جعفر) مجلس سے پیشاب کے بہانے نکلے اور سیدھا دکن میں جاکے دم لیا۔ محمد کامل یہ سمجھ رہا ہے کہ جعفر اور اس کا آقا کام بخش دونوں دہلی میں موجود ہیں۔ حالانکہ یہ نظم دکن کے کسی قلعہ کے محاصرے کے وقت لکھی جاتی ہے اور جعفر بجائے دکن کو بھاگنے کے دکن سے لوٹ چلنے کی فکر کر رہا ہے۔

کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر نے ایک مرتبہ، جب خان جہاں بہادر کوکلتاش متھرا میں مقیم تھا، ایک قرآن اس کی خدمت میں پیش کیا۔ ہدیہ کی امید میں بہت انتظار کیا لیکن خان کی طرف سے وعدوں کے باوجود کوئی صلہ نہیں پہنچا۔ اس پر زٹلی نے ان کی ہجو لکھی۔ جس کی ردیف "تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ" ہے۔ مگر محمد کامل بعض بے اصل وجوہ کی بنا پر دونوں میں پرانی عداوت بیان کرتا اور کہتا ہے:

"دوسرے دن ہی خان جہان کوکلتاش کے متھرا پہنچنے کی خبر آئی' جہاں کوکلتاش نے چند ایک دن ٹھہرنا تھا۔ دلی بھر میں اس کی تعریف ہورہی تھی۔ جعفر سے یہ کب ہوسکتا تھا کہ دشمن کی تعریف سنے اور چپ رہے۔ فوراً قلم اٹھاکر قلم بند کیا۔" (صفحہ ۲۷)

اس بیان کا مطلب یہ ہوا کہ جعفر دہلی میں ہے اور خان جہاں متھرا میں' تب جعفر نے یہ ہجو لکھی۔ حالانکہ اس ہجو سے پایا جاتا ہے کہ خان جہان بے فرمان شاہی متھرا میں آکر مقیم ہوگیا ہے۔

چنانچہ:

نیکو کردی نمک حلالی شاباش تیری ہمت کو
آکر ہندوستان اجاڑی تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ
بااین خواری شرم نداری آمدہ متھرا بنشستی!
تیری سدھ بدھ کن بسیاری تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ
مطلب خودراپیش آوردی غارت کردی عالم را
کس کارن تم ہمت ہاری تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ
ملک دکن تسخیر تو کردی نام توا۔بنجاروشن شد
بوڑھے پن میں ایسی خواری تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ
جاٹوں کو تیں پیٹھ دکھائی لاج نہ آئی ڈاڑھی کو
بیٹھ کے کھودی ڈنڈیاساری تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ

محمد کامل کا بیان ہے کہ:

"جعفر دلی میں مقیم ہے کہ اتنے میں اورنگ زیب کی فتح دکن کی خبر دلی پہنچی۔ جعفر نے ظفر نامہ لکھ کر بادشاہ کو خوش کرنا چاہا مگر انہوں نے تو پہلے ہی درباری شعرا کو بے روزگار کردیا تھا۔ جعفر کی دال کیسے گلتی۔ جواب میں یہ فقرہ سنا' ع

ا۔لنست جو ابش کہ جوابش ندھی

ظاہر ہے کہ جعفر جیسے منہ پھٹ اور بے باک نے زبان قلم اور قلم زبان سے کہاں تک کام نہ لیا ہوگا۔ غرض جان پر کھیل کر وہ کچھ لکھا جو عالم گیر کے بارے میں اشاعت نہ پاسکا۔ عالم گیر نے سزا دینی نامناسب سمجھ کر دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ پر عمل کیا جس سے جعفر کے چند دن مزے سے کٹے۔"

یہ تمام بیان ایسا ہے جس کی کلیات کوئی تائید نہیں کرتا اور یوں بھی بجائے خود اپنی آپ تردید ہے اور عالمگیر پر حملہ۔ یعنی جعفر نے دلی میں بیٹھ کر ظفر نامہ لکھا اور بادشاہ کی خدمت میں دکن بھیجا۔ اس وقت حضرت سلامت نے کوئی شنوائی نہیں کی اور نہ جواب دیا۔ مگر جب ہجو لکھی جو بادشاہ کے خوف سے شائع بھی نہ ہوسکی۔ تو بادشاہ نے بعد از خرائی بصرہ دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ پر عمل کیا۔ آخر محمد کامل کو یہ ہجو نویسی کا واقعہ کیونکر معلوم ہوا۔

ہندوستانی سپکولیٹر کا تمام بیان تقریباً" فرضی ہے۔ چونکہ کلیات اس کے سامنے ہے' اس کی امداد سے جو خاکے اس نے تیار کیے صحیح مانے جاسکتے تھے مگر چونکہ اس نے ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کی علت قرار دیا ہے اور ان کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہاں بھی اس نے کافی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ آخر میں اس نے لکھا ہے کہ: "میر جعفر کی تاریخ وفات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ عمر تخمیناً" کچھ ساٹھ سال سے اوپر ہے۔" مگر وہ پہلے لکھ آیا ہے کہ جعفر عالمگیر کی تخت نشینی کے ایام میں پیدا ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فرخ سیر کی تخت نشینی کے وقت قتل کیا جاتا ہے۔ اس حساب سے اس کی عمر ۶۵ سال کی ٹھہرتی ہے۔ نہ ساٹھ سال سے کچھ اوپر۔

ہندوستانی سپکولیٹر کو شکایت ہے کہ زٹلی کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ مگر یہ تذکروں کا قصور نہیں ہے بلکہ اس کا اپنا میں یہاں بعض تذکروں کے بیانات درج کرتا ہوں۔

میر تقی میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:

"مشہور تو زٹلی ہے مگر اپنے زمانہ کا عجیب و غریب انسان تھا اور کاٹنے والی زبان کا مالک تھا۔ شرفا لحاظ کرتے اور کچھ دے دیتے۔ جب کسی کے پاس جاتا دو کاغذ ساتھ لے کر جاتا۔ ایک پر اس کی تعریف اور دوسرے پر ہجو ہوتی۔ اگر مدارات سے پیش آیا، انہوں نے مدح پڑھ دی، ورنہ کاغذ ہجو کو شہرت دی جاتی۔ محمد اعظم عالی جاہ کی ہجو سے بھی نہیں چوکا۔۔۔ ایک روز شاہزادہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ شعر فی البدیہہ اس کی تعریف میں پڑھا:

نگین سلیمان ۰ کہ تابندہ بود

ہمیں اسم اعظم بران کندہ بود

عالی جاہ نے بہت اچھا صلہ دیا۔ ایک روز مرزا (عبدالقادر) بیدل کے ہاں پہنچے۔ اور ان کی تعریف میں یہ مصرع پڑھا:

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو پشّ

مرزا بگڑے اور جلد پیچھا چھڑایا۔ (نکات الشعراء، صفحہ ۳۱-۳۲، سلسلہ انجمن ترقی اردو نمبر ۲۸، مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں)

شفیق اورنگ آبادی اپنے تذکرۂ چمنستان الشعرا میں بیان کرتا ہے کہ: جعفر زٹلی ایک منہ پھٹ اور بیباک شخص تھا۔ اس کی شوخی اس کے کلام سے ظاہر ہے۔ اس کے اشعار مشہور عالم ہیں۔ صاف روزمرہ میں مضامین اس کے ہاتھ آئے ہیں۔ محمد اعظم شاہ کا قول ہے کہ اگر جعفر میں زٹل نہ ہوتی تو وہ ملک الشعرائی کے قابل تھا۔ اس کے روزمرہ اور انداز بیان کا رنگ جدا ہے۔ اور اس طرز خاص میں خوب جولانی طبع دکھاتا ہے۔۔۔۔۔ جب جعفر کو کچھ درکار ہوتا۔ کسی امیر کے پاس دو شعر مدح کے لکھ کر بھیج دیتا۔ اگر اس نے کچھ دیا تو خیر۔ نہیں تو ہجو میں دفتر سیاہ کیا جاتا۔ متسدی اور اہل خدمت درکنار خود ظل سبحانی بھی اس کی آتش بیانی سے بید کی طرح لرزتے۔ ایک دن کسی امیر کے ہاں گیا اور اپنے حال کا پرچہ اس کے سامنے گزرانا۔ امیر نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اور پرچہ واپس دے دیا۔ جعفر نے پرچہ لیا اور امیر کے سامنے پھاڑ کر چلا

آیا۔ حاضرین میں سے کسی نے امیر کو جعفر کا پتہ نشان دیا۔ وہ گھبرایا اور جعفر کو فوراً بلوایا۔ معذرت کرنے لگا کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ جعفر نے جواب دیا کہ اس میں آپ کا قصور نہیں۔ ''من پیش بدادم۔ حضرت پس بدادند۔ من چاک نمودم۔'' قصہ مختصر امیر موصوف نے اس جملہ ہی پر اپنی رہائی غنیمت سمجھ کر جعفر کو بوجہ معقول رخصت کیا۔

مہاسنگ نامی ایک محرر نے جعفر کی کار برآری میں غفلت سے کام لیا اور اپنی تحریر واپس منگوا بھیجی۔ جعفر نے اسی کاغذ کی پشت پر لکھ دیا:

مہاسنگھ جی تم بڑے ڈھینگ ہو
گرڑ پنکھ یا بیل کے سینگ ہو
و ایں چوک جوں غوک رکھتے رہو
لگوڑوں لکوڑوں کو چکھتے رہو

ایک دن جعفر کسی شخص محمد اشرف نامی کی مدح کہہ کر لے گیا۔ ع:

محمد اشرفِ پیغمبران است

شخص مذکور نے مطلق پرواہ نہ کی اور شعر کی داد نہیں دی۔ جعفر نے خفا ہوکر فی البدیہہ یہ پیش مصرع بہم پہنچایا:

نہ ایں اشرف کہ مردود زمان است

(چمنستان شعرا' صفحہ ۶۷ - ۶۹' انجمن ترقی اردو' ۱۹۲۸ء)

میر حسن اپنے تذکرہ میں ، اس کو نادرۂ روزگار کہتے ہیں اور اضافہ کرتے ہیں کہ :
"ادنیٰ اعلیٰ سب اس کا لحاظ کرتے تھے۔ ان ایام میں لوگوں میں شرم و غیرت باقی تھی اس لیے کچھ دے دلا کر اس سے اپنا پیچھا چھڑاتے تھے۔ آج اگر کسی کی ہجو کی جائے تو وہ اپنی مدح تصور کرتا ہے۔ بہر حال میر موصوف مدح و ہجا میں بے مثل تھے ..... ایک روز میرزا بیدل کے گھر پہنچے میرزا ایک مصرعہ کی تلاش میں تھے اس لیے متوجہ نہیں ہوئے۔ پوچھا' قبلہ کوئی مصرع فرمایا ہے؟ میرزا نے کہا' ہاں۔ وہ مصرع یہ تھا

ع لالہ بر سینہ داغ چوں دارد

میر نے کہا' اس کے لیے غور و تامل کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کہہ کر دوسرا مصرعہ فوراً پڑھ دیا جس کو عریاں ہونے کی بنا پر حذف کردیا جاتا ہے۔ قصہ مختصر میرزا بہت برہم ہوئے۔ اور کچھ دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔" (صفحہ ۲۷' تذکرۂ شعرائے اردو)۔

قایم کا بیان ہے: "چونکہ سخن وری کی بنیاد اس نے زٹل پر رکھی تھی اس لیے اسے زٹلی کہنے لگے۔ کلام کو خداداد قبولیت حاصل تھی۔ عزت دار لوگ اپنی آبرو کے خیال سے اس کے ساتھ سلوک سے پیش آتے۔ ایک دن مرزا عبدالقادر کے ہاں وارد ہوئے۔ انہوں نے اس کی نظم و نثر سنی اور چند اشرفی بطور انعام مرحمت کیں۔ بروقت رخصت زٹلی نے یہ مصرع پڑھا: ؎

ظہوری و عرفی بہ پیش تو پَشّ"

(صفحہ ۱۳' مخزن نکات' طبع انجمن ترقی اردو' ۱۹۲۹ء)

میر قدرت اللہ خاں قاسم' مجموعہ نغز میں' رقم طراز ہیں کہ وہ سادات نارنول سے ہے۔ اس کی طبیعت رسا تھی مگر زٹل کہنے پر بہت راغب تھا۔ اس کا قول تھا کہ شعر میں خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں۔ فردوسی و سعدی کا ہم پایہ نہیں مانا جاسکتا۔ زٹل اختیار کرتا ہوں تاکہ ممتاز رہوں۔

(جلد اول' صفحہ ۲۶۷' مجموعہ نغز' لاہور' سنہ ۱۹۳۳ء)

میں بخوف طوالت منشی کریم الدین کے طبقات الشعراء اور مظفر حسین صبا کے تذکرۂ روز روشن سے اعراض کرکے عرض کرتا ہوں کہ یہ صفحات محمد کامل عرف ہندوستانی سپیکولیٹر کی اپنے موضوع سے بے خبری ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جو بے اصولی اس نے عبدالمومن عرف ملادو پیازہ کی حالت میں کی ہے' وہی بے اصولی اس نے جعفر زٹلی کے ساتھ برتی ہے۔ دو پیازہ کے سلسلے میں اردو اہل قلم آنکھ بند کرکے اس کے مقلد ہوگئے ہیں۔ جس طرح زٹلی کے باب میں مغربی مولفین ولیم ارون و پروفیسر بلومہارٹ وغیرہ اس کے متبع ہیں۔ یہاں قدرتاً" یہ سوال ہوگا کہ آخر یہ

ہندوستانی سپکولیٹر یا محمد کامل کون شخص ہے؟ اس سوال کا شافی جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ ہم اسی قدر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مصنف ہے جو کئی تالیفات کا مالک ہے۔ اس کی ادبی کارکردگی کا زمانہ' جہاں تک ہمیں معلوم ہے' سنہ ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی پہلی تصنیف "سوانح عمری ملا دو پیازہ" ہے جو کم از کم پانچ بار چھپ چکی ہے۔ اس کی دوسری تالیف "زر جعفری" ہے جو اسی سال یعنی ۱۸۹۰ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوتی ہے۔ باقی تصانیف ناول کی قسم سے ہیں۔ ان میں ناول "شام نرائن اور پاربتی" بہت مقبول ہوا۔ جو سنہ ۱۹۲۷ء میں بار نہم طبع ہوتا ہے۔ اس میں ایسی شادیوں کی برائیاں' جن میں چھوٹا خاوند اور بڑی بیوی یا اس کے برعکس بڑا خاوند اور چھوٹی بیوی ہو' ایک دلچسپ قصے کے پیرایہ میں بیان ہوئی ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اس ناول پر مصنف کو خلعت بھی عنایت کیا ہے۔

"دلفریب": یہ ناول چار حصوں میں تقسیم ہے جس کے ضمن میں غدر کے حالات اور عیسائی مشنری عورتوں کی عیاریاں' پولیس کی لاپروائی وغیرہ دکھائی گئی ہیں۔

"یوسف و جمیلہ": یہ ایک اخلاقی ناول ہے جس میں طالب علمی کے زمانے کی شادی کی خرابیاں بتلائی ہیں۔ اس ناول کو زیادہ اشاعت کا موقعہ نہیں ملا۔ صرف ایک مرتبہ چھپا ہے۔

ہم صرف اسی قدر تصانیف کا پتہ لگا سکے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اس کی اور بھی تالیف ہو۔ ابتداء میں تصنیف و تالیف کے لیے اس نے ہندوستانی سپکولیٹر اپنا نام اختیار کیا تھا مگر ناول "شام نرائن اور پاربتی" کی اطلاع ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں محمد کامل نام اختیار کرلیا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے:

"اکثر احباب کی خواہش تھی کہ "ہندوستانی سپکولیٹر" نام بہت سے دیسی ناموں میں اچھا نہیں لگتا۔ اس واسطے ہم نے اس کو "محمد کامل" سے بدل دیا ہے۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ محمد کامل بھی اس کا اصلی نام نہیں ہے۔ اس عقدے

کے حل کی تلاش میں میں محمد کامل کے ناشر ملک چنن الدین خلف فضل دین تاجر کتب سے ملا۔ مگر موصوف کے انکار کی بنا پر مجھے اپنی امید میں مایوسی ہوئی ان سے اس قدر معلوم ہوا کہ محمد کامل دہلی کے رہنے والے تھے' جو یقیناً صحیح نہیں۔

حواشی

(۱) صفحہ ۲۵۳' نمبر ۸' الفہرست محمد سجاد مرزا بیگ (حاشیہ مولف)

(۲) ایضاً" صفحہ ۲۵۸' نمبر ۴۷ (حاشیہ مولف)

(۳) ایضاً" صفحہ ۲۶۴' نمبر ۸۱ (حاشیہ مولف)

(۴) ایضاً" صفحہ ۲۷۰' نمبر ۱۳۳ (حاشیہ مولف)

(۵) ایضاً" صفحہ ۳۱۱' نمبر ۴۹۶ (حاشیہ مولف)

(۶) الفہرست محمد سجاد مرزا بیگ' صفحہ ۲۵۹' نمبر ۵۶ (حاشیہ مولف)۔

(۷) یہاں مقابلے کی غرض سے ہم مسٹر ایف۔ جی۔ ڈیلمرک کے استفسار کی ایک عبارت' جو "پنجاب نوٹس اینڈ کوئریز" میں ملتی ہے' نقل کرنی مناسب سمجھتے ہیں' جو ہندوستانی سپکولیٹر کے (رسالہ) "زر جعفری" سے صرف پانچ سال قبل مرقوم ہوئی اور جس میں عام شکایت ہے کہ باوجود تلاش دو پیازہ کے حالات کچھ بھی نہیں ملتے۔ عبارت حسب ذیل ہے:

"مجھ کو ملا دو پیازہ کے صحیح حالات کن ذرائع سے معلوم ہوسکتے ہیں؟ مجھے تمام مسلمانی تاریخوں اور تذکروں سے' جن تک میری رسائی ہوسکی' اس کے تھوڑے سے حالات بھی تو نہیں مل سکے قصوں کی کتابوں میں' جو بازاروں میں بکتی ہیں' اس کو ایک مشہور ظریف بلکہ مسخرہ اور بیربل کا ہم عصر بتایا گیا ہے' جو بیربل کے طرح اکبر کے مقربوں میں شامل تھا۔ یہ بیان میرے نزدیک قابل اعتبار نہیں۔ کیونکہ ملا اگر اس عہد میں ہوتا تو ابوالفضل آئین اکبری میں ضرور اس کا ذکر کرتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہنڈیا' جو صوبجات متوسط میں واقع ہے' اس کا وطن ہے اور اس کا مزار بھی وہیں ہے۔ یہ علاقہ بادشاہ نے اس کی جاگیر میں دے رکھا تھا۔ ایک شخص نے اس سے دریافت کیا کہ تم نے آگرہ کے قریب دوسرے علاقوں پر ہنڈیا کو کیوں ترجیح دی۔ اس نے جواب دیا کہ ہنڈیا دو پیازہ کے لیے مناسب ہے۔ دو پیازہ کو اس نے اپنے "النامہ" میں سیدالطعام کے

معزز خطاب سے یاد کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی قبر پر' جو تاحال ہنڈیا میں موجود ہے' دو کتبے مرقوم ہیں۔ پہلا کتبہ نیچے ٹھیک دروازے پر۔ دوسرا بلندی پر گنبد کے قریب۔ نچلے کتبے کی عبارت یہ ہے: "اے جوان برای خدا بالا نگر" جب دیکھنے والا اوپر جھانکتا ہے تو ان مضحک الفاظ سے دوچار ہوتا ہے: "چہ می بینی گیدی خر۔" (پنجاب نوٹس اینڈ کوئریز' جلد دوم' صفحہ ۹۹۔ بذیل نمبر ۶۰۳' بابت مارچ سنہ ۱۸۸۵ء)۔

پانچ سال کے بعد اس تفصیل کے ساتھ دو پیازہ کے حالات کا معلوم ہوجانا استعجاب انگیز ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر ہندوستانی سپکولیٹر نے ڈ یلمرک کے استفسار کے جواب میں یہ داستان تراشی ہو۔ (حاشیہ مولف)

(۸) آسیر یا اسیر گڑھ نامی مشہور قلعہ شہر برہان پور سے شمال مشرق اور مہو (مئو) سے جنوب مشرق کی طرف سلسلہ کوہستان ست پڑا کے مشرقی سرے پر ایک ۷۵۰ فٹ بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ پرندے کی اڑان کے اعتبار سے برہان پور سے اس کا فاصلہ ۱۵ میل اور مہو سے ۸۰ میل کے لگ بھگ ہے۔ یہ علاقہ مغلوں کے صوبہ مالوہ سے تعلق رکھتا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اسیر گڑھ احاطہ بمبئی میں شامل تھا لیکن آج کل مدھیہ پردیش کا حصہ ہے۔

فرشتہ کے بیان کے مطابق اس قلعہ کی بنیاد چودھویں صدی عیسوی میں آسا اہیر نے رکھی تھی۔ خاندیش کے مسلمان حکمرانوں نے اہیروں سے قلعہ چھین لیا۔ ۱۵۹۹ء میں اکبر اسے فتح کرلیتا ہے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد یہ قلعہ مادھو جی سیندھیا کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۰۳ء میں کمپنی کی افواج نے اس پر قبضہ کرلیا۔ تاہم سرجی ارجن گاؤں کی صلح کے نتیجے میں اسے سیندھیا کو واپس کردیا گیا۔ بالآخر سنہ ۱۸۱۹ء میں یہ مستقل طور پر انگریزوں کے تسلط میں آگیا۔ (حاشیہ مرتب)

(۹) یہ سوانح عمری اگرچہ بعد میں گم نام چھپتی رہی مگر اصل میں مرزا حیرت دہلوی کی تالیف ہے جیسا کہ رسائل ذیل سے ثابت ہے: "سوانح عمری بیربل و ملا دو پیازہ مصنفہ میرزا حیرت صاحب دہلوی۔ حسب ارشاد منشی بلاقی داس مالک کتب خانہ میور پریس دہلی' سنہ ۱۹۱۶ء' مطبع افتخار' دہلی میں منشی محمد ابراہیم کے اہتمام سے چھپا۔"

گویا عبدالقادر بدایونی اور ملا دو پیازہ کو ایک شخص قرار دینے میں مرزا حیرت کی ذہنی اپج ذمہ دار ہے۔ (حاشیہ مولف)

(۱۰) فسیحی ہروی اس عہد کا مشہور شاعر ہے۔ سنہ ۱۰۴۶ھ میں وفات پاتا ہے۔ (حاشیہ مولف)

(۱۱) اس قصہ کے اشخاص و واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ دو پیازہ سنہ ۹۹۰ھ سے بہت بعد ہرات و بلخ گیا ہوگا۔ یعنی قرن یازدہم کے عشر اول یا عشر دوم میں۔ سنہ ۹۹۰ھ میں ہرات اگرچہ صفویوں کے قبضے میں ہے مگر حسین خاں شاملو اس وقت ہرات کا بیگلا بیگی نہیں ہے بلکہ علی قلی خان شاملو (صفحہ ۲۵۱، عالم آرائے عباسی) اور نہ ولی محمد خان و نذر محمد خان بلخ میں مقیم ہیں۔ واقعات اس طرح ہیں کہ عبداللہ خاں اوزبک والی توران (سنہ ۹۹۱ھ و ۱۰۰۶ھ) ہرات و دیگر امصار خراسان سنہ ۹۹۴ھ میں فتح کرلیتا ہے۔ ۱۰۰۷ھ تک ہرات پر اوزبکوں کا قبضہ رہتا ہے۔ جب کہ اوزبکوں کی طاقت آپس کی رقابتوں سے پاش پاش ہوجاتی ہے عباس اپنے جلوس کے بارھویں سال میں ہرات پر قابض ہوجاتا ہے اور عنقریب بعد حسین خاں شاملو بیگلا بیگی خراساں بنادیا جاتا ہے۔ عالم آرائے عباسی میں مذکور ہے کہ جب شاہ عباس سنہ ۱۰۰۹ھ میں ہرات آتا ہے، حسین خان شاملو بیگلر بیگی ہرات مراسم استقبال بجالاتا ہے۔ (صفحہ ۴۱۲، عالم آرای عباسی، طبع طہران) اسی طرح ولی محمد، جو سنہ ۱۷ - ۱۰۱۴ھ میں والی توران ہے، اپنی تخت نشینی سے پیشتر دیر تک والی بلخ رہا تھا اور نذر محمد، ولی محمد کے عہد سلطنت میں والی بلخ تھا۔ ہمارے نزدیک دو پیازہ کی تاریخ سفر ایران ۱۰۱۰ھ کے بعد ہونی چاہیے۔ جب ہرات میں حسین خاں شاملو موجود ہے۔ اور بلخ میں ولی محمد و نذر محمد یا ان دونوں میں سے ایک موجود ہے۔ (حاشیہ مولف)

(۱۲) جہانگیر فتح پور سنہ ۱۰۲۸ھ میں پہنچتا ہے۔ متن میں ۱۰۲۶ھ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ (حاشیہ مولف)

(۱۳) ملاحت مقال، دلپت رائے مخاطب بہ راؤ دلپت سنگھ کا مرتب کردہ حکایات و قصص کا مجموعہ ہے۔ مولف کے بارے میں ریو کا بیان ہے کہ وہ احمد آباد (گجرات) میں پیدا ہوا، جہاں اس کا باپ گلاب رائے متصدی تھا۔ دلپت رائے عربی، فارسی، سنسکرت، پراکرت اور بھاکا میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ آٹھ سال تک اودے پور کے مہاراجا جگت سنگھ (دور حکومت: سنہ ۱۱۴۷ تا ۱۲۶۵ھ) کا ملازم رہا، جس کے لیے اس نے دیوان حافظ کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ دپت رائے دہلی میں مقیم تھا جب احمد شاہ ابدالی کا حملہ (سنہ ۱۱۷۳ھ) ہوا اور اس کے نتیجے میں مولف بھاگ کے جے پور میں پناہ گزیں ہوا۔ یہاں اس نے مہاراجا مادھو سنگھ (اول، سنہ ۱۱۶۳ - ۱۱۸۱ھ) کی ملازمت اختیار کی۔ "ملاحت مقال" اس نے مہاراجا موصوف ہی کی فرمائش پر ترتیب دی تھی جو غالباً راجہ کی وفات کے بعد مکمل ہوئی۔ کتاب کے پہلے حصے میں تیموری بادشاہوں اور ان کے امرا کے واقعات

تاریخی ترتیب سے درج کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں مختلف موضوعات کے تحت متفرق واقعات نقل ہوئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات فارسی، صفحہ ۰۶-۱۰۰۵)۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں "ملاحت مقال" کے کئی مخطوطات موجود ہیں جن میں سے تین ذخیرہ شیرانی سے تعلق رکھتے ہیں (دیکھیے "فہرست مخطوطات شیرانی" مرتبہ ڈاکٹر محمد بشیر حسین، جلد سوم، صفحہ ۳۴ - ۳۳۳)۔ ۱۹۹۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم - اے (فارسی) کی ایک طالبہ نے بطور مقالہ "ملاحت مقال" کی تدوین کی ہے۔ (مرتب)

(۱۴) ہنڈیا، ضلع ہوشنگ آباد میں ایک قدیم اسلامی قصبہ، جو ساحل دریائے نربدا پر دکن کی طرف واقع ہے۔ یہاں ایک مسمار شدہ قلعہ ہے جسے، کہتے ہیں، ہوشنگ شاہ غوری، والی مالوہ نے تعمیر کیا تھا۔ یہ قصبہ بیتول مئو سڑک پر اول الذکر سے اسی میل شمال مغرب میں اور آخر الذکر سے نوے میل مشرق میں ملتا ہے۔ عہد اکبری میں ایک سرکار یا ضلع کا صدر مقام تھا، جو آگرہ دکن کی قدیم سڑک پر آتا ہے۔ اس کے کھنڈرات سے، جو دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں کثرت سے آباد تھا۔ سنہ ۱۸۴۴ء میں مہاراجہ سندھیا نے سرکار کمپنی کے حوالہ کردیا۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں سرکار انگریز نے بعض علاقہ کے بدلے میں، جب پرگنہ نیماور ریاست اندور کے حوالے کیا، ہنڈیا بھی جو داخل نیماور تھا اندور میں شامل ہوگیا۔ (امپیریل گزیٹیر، جلد پنجم صفحہ ۳۰۹ از ہنٹر و ریاست ہائے وسطی ہندوستان بسلسلہ گزیٹیر ریاست اندور، جلد دوم، صفحہ ۲۱۱ از سی - ای لارڈ، سنہ ۱۹۰۸ء)

"ہنڈیا: ہردا تحصیل، ضلع ہوشنگ آباد میں دریائے نربدا کے کنارے پر ہردا تحصیل سے تیرہ میل شمال میں واقع اور اس کے ساتھ ایک پکی سڑک سے ملحق ہے۔ مردم شماری انیس سو۔ کئی لحاظ سے ضلع بھر میں سب سے دلچسپ مقام ہے۔ اس کی تاریخ اساطیری ایام تک پہنچتی ہے۔ اس کے قریب جمدگنی اور سہسر ارجن، ہزار ہاتھ والے راجہ، کے درمیان ملاقات ہوئی۔ قصبہ کا نام نذیرالدین شاہ بلخ کے نام سے مستخرج ہوتا ہے جو فقیر بن کر اور یہاں آکر آباد ہوگیا اور ہنڈیا شاہ بلنگ کے نام سے مشہور ہوا۔ جس غار میں وہ رہتا تھا وہ کے جانکتا تھا۔ اس مقام کی نشانی اب ایک پتھر ہے جس کے لیے کچھ زمین بھی معافی میں ہے۔ تاریخی زمانہ میں ہنڈیا کی اہمیت اس کے دہلی اور دکن کے راستے میں دریائے نربدا کے مقام عبور پر واقع ہونے کی بنا پر تھی۔ مغلوں کے زمانے میں بڑے پیمانہ پر آباد تھا۔ گرد و نواح کی پہاڑیوں میں اس کے آثار اس کی وسعت آبادی

کی شہادت دیتے ہیں۔ آس پاس کے دیہات ایک زمانہ میں شہر قدیم کے محلوں اور شاملات میں تھے۔ تاریخ میں ہنڈیا کا ذکر پہلی بار شاہ غوری والی مالوا کے وقائع میں' پندرھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں' ملتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ہوشنگ آباد' ہنڈیا اور جوگا کے قلعے اس نے ایک ہی دن میں شروع کرکے ختم کردیئے تھے۔ آئین اکبری میں ہنڈیا صوبہ مالوہ کی ایک سرکار ہے جس کے جنگلی ہاتھی مشہور تھے۔ یہاں فوجدار اور دیوان کی نشست تھی جو آس پاس کے علاقے کی نگرانی کرتے۔ زوال مغل سے قبل ہی نئے راستے نے' جو مئو اور برہان پور میں کھلا تھا' ہنڈیا کی اہمیت کو گھٹا دیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں مرہٹوں نے ہردا کو مقام حکومت بنایا جس سے ہنڈیا کا تنزل اور بھی سریع ہوگیا۔ اس کے قدیم آثار اب بھی قابل دید ہیں۔ ہوشنگ (شاہ) کے قلعہ کی بڑی مقدار توریل کے بھرت میں صرف ہوئی لیکن ہنڈیا شاہ بلنگ کے غار کے علاوہ اکبر کے وزیر عبداللہ حسن مصنف "ملا دو پیازہ" کی قبر ابھی تک موجود ہے جس کی شہرت بحیثیت ایک مزاحیہ تالیف کے اب بھی قائم ہے۔" (صوبہ متوسط کی ڈسٹرکٹ گزیٹیر' ضلع ہوشنگ آباد' صفحہ ۲۹۷' از جی۔ایل۔کوربٹ و آر۔وی۔رسل' طبع سنہ ۱۹۰۸ء تھیکر اسپنک اینڈ کو' کلکتہ۔)

سرکاری گزیٹیر کی یہ آخری اطلاع جس میں اکبر کا وزیر عبداللہ حسن "ملا دو پیازہ" کا مصنف بتایا گیا ہے کسی غلط اساس پر مبنی ہے صحیح یہ ہے کہ ہنڈیا میں خود ملا دو پیازہ کی قبر ہے۔ (حاشیہ مولف)

(۱۵) "تذکرہ روز روشن" ۔ تصحیح و تحشیہ محمد حسین رکن زادہ آدمیت' طبع طہران' سنہ ۱۳۶۳ ہجری شمسی' میں ملا دو پیازہ کا ذکر صفحہ ۲۶۳ پر اور "النامہ" صفحہ ۲۶۴ تا ۲۶۷ پر ملتا ہے۔ (حاشیہ مرتب)

(۱۶) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں غلطی سے "چہار گلشن" کے مولف کا نام چترمن کی جگہ اندرمن لکھا گیا ہے۔ "چہار گلشن" رائے چترمن قوم کا ستھ سکسینہ کی تالیف کردہ فارسی زبان میں ہندوستان کی عمومی تاریخ ہے۔ "چترمن نیک گلشن" اس کی تاریخ تالیف ہے جس سے سنہ ۱۱۷۳ھ (م ۱۷۵۹ء) برآمد ہوتا ہے۔ ذخیرہ شیرانی میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے جس کی تاریخ کتابت ۱۲۴۹ھ ہے۔ دیکھئے فہرست مخطوطات شیرانی از ڈاکٹر محمد بشیر حسین' صفحہ ۳۷' نیز ریو صفحہ ۹۰۹ (حاشیہ مرتب)

(۱۷) بیل کے الفاظ یہ ہیں :

"He was put to death, by of the emperor farrukh-siyar, on account of a satirical verse, he had writt wn on the accession of that emperor to the throne of Delhi"

گویا تبیل شاہی سکے کے بیت کا صریحاً" تذکرہ نہیں کرتا اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس کا اشارہ اسی مشہور شعر کی طرف ہے۔

(دیکھئے "این اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری" لندن' ۱۸۹۴ء' ری پرنٹ نیویارک' ۱۹۶۵ء) (مرتّب)

(۱۸) اس کی طبع اول کی صراحت فہرست برٹش میوزیم میں حسب ذیل ہے :

"زر جعفری' یعنی سوانح عمری میر جعفر زٹلی مصنفہ ہندوستانی سپکولیٹر' میر جعفر زٹلی کے مختصر حالات کا خاکہ جس میں اس کے اشعار بکثرت نقل ہیں' لاہور سنہ ۱۸۹۰ء' صفحات ۳۶۔ (فہرست ضمیمہ کتب مطبوعہ ہندوستانی در کتاب خانہ برٹش میوزیم صفحہ ۳۳۱ از بلو مہارٹ ایم۔ اے' سنہ ۱۹۰۹ء' بذیل محمد کامل)۔

یہی اشاعت الفہرست محمد سجاد میرزا بیگ میں بھی مذکور ہے جہاں مصنف کا نام محمد کامل اور مطبع کا نام کانپور اور سال طباعت سنہ ۱۸۹۰ء دیا ہے۔ دیکھو نمبر ۱۳۹ صفحہ ۳۳۵۔ ہمارے خیال میں کانپور بجائے لاہور غلط چھپ گیا ہے' جس طرح محمد کامل بجائے ہندوستانی سپکولیٹر قبل از وقت ہے۔ (حاشیہ مولف)

فیض عثمانی

صحرائے راجپوتانہ کا ایک گم نام فارسی شاعر

(از روزنامہ "جنگ" کراچی بابت ۵ ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء)

فارسی کے ایک گم نام شاعر فیض عثمانی پر شیرانی صاحب کا یہ مضمون مجھے ان کے پرانے کاغذات میں ملا تھا۔ کاغذ خستہ ہے اور تحریر شکستہ اس لیے بدقت تمام نقل کیا گیا۔ کہیں کہیں سے عبارت اور انتخاب سے بعض اشعار مجبوراً چھوڑنا پڑے۔ مضمون اوائل عمر کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے شاعر کے تعارف اور مضمون کی حفاظت کے خیال سے شیرانی صاحب کی صد سالہ تقریب ولادت کے موقع پر اخبار "جنگ" میں شائع کروا دیا تھا۔ (مرتب)

شیخ محمد اکرم عثمانی المتخلص بہ فیض' سنہ ولادت ۲۰ جمادی الثانی سنہ ۱۱۱۲ھ۔ یہ بزرگ بھی اسی سرزمین میں ہو گزرے ہیں جس نے ہزاروں نونہالان و مربیان علم کو اپنے سنسان' ریگستان میں تربیت دی ہے۔

فیض و فیضی شیخ ناگوری کا لیں گے نام ہم
کوئی علمیت میں لے گر امتحان مارواڑ

آپ کا وطن قصبہ ڈیڈوانہ [1] راج مارواڑ ہے۔ آپ نے اپنے پدر بزرگ وار شیخ محمد معظم کی خدمت میں اکتساب علوم کیا۔ اورنگ زیب عالم گیر [2] کے دور میں اگرچہ

آپ کی ولادت فی الوقت فترت[۳] واقع ہوئی لیکن پھر بھی نقادان سخن آپ کے جوہر فضیلت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بعض اوقات مہاراجہ مادھو[۴] سنگھ والی جے پور اور آصف جاہ نظام[۵] الملک دکن کو آپ کی سرپرستی کا فخر حاصل ہوا۔ ورنہ تمام عمر اپنے وطن میں رہے اور جاگیر قدیم اور دیگر خاندانی شاہی رعایات پر بسر اوقات کرتے تھے۔ ہرچند اس وقت بھی دارالخلافہ دہلی کے دروازے باکمالوں کے لیے بند نہیں ہوئے تھے اور وہ شہر کاملین کا اب تک عزت کے ساتھ استقبال کرتا تھا لیکن آپ نے صحبت مخالف ہونے کی وجہ سے تمام عمر میں ایک بار بھی رنگیلے بادشاہ[۶] کے دربار کا رخ نہیں کیا۔ اس طرح سے گویا کنج تنہائی میں پڑے رہنے سے آپ کی شہرت کے چاند کو گہن لگ گیا اور آپ کا جوہر مارواڑ کی نمک سار[۷] جھیل اور خار زار ریگستان سے باہر نہیں چمکا:

کون ویرانے میں لوٹے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لیے

آپ علاوہ علوم رسمی کے ریاضی دان' مہندس' منجم' پنڈت' سنسکرت کے عالم ہونے کے عربی' فارسی اور سنسکرت کے زبردست شاعر تھے۔ اس پر تصنیف اور تالیف کے وصف کو اور زیادہ کیجئے اور اس کے بعد طبیعت کے ایجادی مادہ کو شامل کیجئے' پھر آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ بزرگ موصوف کس مرتبہ کے فاضل تھے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ آپ اپنے متقدم ہم وطنان شیخ ابوالفضل اور شیخ ابوالفیض فیضی سے کسی حال میں کم نہیں۔ بے شک وزارت اور مصاحبت شاہی میں آپ بے نصیب تھے مگر یہاں ہم علمی حیثیت سے بزرگان موصوف کا مقابلہ کر رہے ہیں نہ دنیاوی وجاہت سے۔

میری رائے میں دو تین امور آپ کے کلام میں قابل لحاظ ہیں جو اور شعرا کے کلام سے آپ کے کلام کو ممیز کرتے ہیں۔ اول یہ کہ آپ نے جس استاد کا تتبع کیا' اسی کا رنگ اڑالیا یا یوں کہیے کہ اس کے رنگ میں اپنا رنگ ملالیا۔ جو غزلیں

لسان الغیب خواجہ حافظ کی غزلوں پر کہیں، ان میں وہی سلاست، فصاحت اور شیرینی ٹپک رہی ہے جو خواجہ حافظ کے کلام کو دوسروں کے کلام سے ممیز کرتی ہے۔ جہاں غنیمت، ناصر علی اور غنی کا تتبع کیا ہے، وہاں اسی طرح بڑی ترچھی ترکیبیں، نئی نئی بندشیں اور پرشکوہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جہاں کلیم، کمال، طالب آملی اور نظیری کا رنگ اختیار کیا ہے وہاں انہی بزرگوں کے ہم صفیر اور ہم آواز ہو گئے ہیں۔

دوسرے اکثر صنائع غزلیات میں لائے ہیں جو کسی اور استاد کے کلام میں ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ ان صنائع کے وہ خود ہی موجد ہیں اور خود ہی مقلد۔ مثلاً بعض غزلیں ہیں کہ اگر ردیف جدا کردیں تو بھی غزل ہے اور بامعنی اور اگر ردیف زائد کردیں تو بھی غزل بامعنی ہے۔ فرق یہ ہوگا کہ زمین اور بحر بدل جائے گی مثلاً:

باخصم طناز آمدم از یار تا گشتم جدا
بد خواہ غماز آمدم از یار تا گشتم جدا

اس کو ہم اس طرح بھی پڑھ سکتے ہیں:

باخصم طناز آمدم بد خواہ غماز آمدم

بعض جگہ غزل کی غزل ذولسانین میں چلی جا رہی ہے۔ فارسی عربی مصرعوں کو اس طرح موزوں کردیا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ بس یہی خیال ہوتا ہے کہ حافظ اور سعدی فیض کے قالب میں بول رہے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں:

فلا حکایت منا اذا لقیت بنا
بجای شکر و گلہ آید اشک بر دفیات
اگر تو روی نمائی شکایتم برود
وقد اقول مضی ما مضی علی مافات

یا

ساربان میریم در بابت حدی آغاز کن
نحن اسرعنا بمیعاد الی البیت العتیق

کہیں غزل کی غزل صفت عاطلہ میں چلی جارہی ہے۔ ہم اس وقت صرف ان کی شاعری اور کلام کے متعلق بحث کر رہے ہیں۔ الغرض کلام میں جہاں جس کا رنگ اختیار کیا ہے وہاں ویسے ہی خود بن گئے ہیں۔ ان کی خاص طرز علیحدہ ہے۔ وہ معنی آفرینی میں خاقانی سے ملتے ہیں' شوکت الفاظ میں ظہیر کے مشابہ ہیں۔ ان کی جو ترکیب ہے وہ انہی کی ایجاد ہے۔ بعض جگہ زور میں جہاں آتے ہیں وہاں علمائے کلام و زبان کی بندشوں کو توڑ کر دور نکل جاتے ہیں اور یہ آزادی ان کی دانستہ ہوتی ہے نہ نادانی کی وجہ سے مگر واقعی وہ تصرف اپنی جگہ عجب لطف دکھا جاتا ہے۔ مثلاً شروع غزل کے مقطع میں آپ فرماتے ہیں:

ھرگز نیاید برکسی در دھر گر بند بسی

شاھد عزیز مصرھا علامہ شیراز ھا

ہمیں اس "شیرازھا" میں کلام ہے لیکن یہاں اسی لفظ کی ضرورت ہے خواہ وہ رائج الوقت ہو یا پرانی ٹکسال کا یا سکہ قلب۔ ایسے ہی ایک اور غزل میں آپ نے عجیب التزام روا رکھا ہے:

شو نکی بر رنکی کاکلکی می دارد

شکلکی برگلکی سنبلکی می دارد

تمام غزل میں قافیوں میں یہی ترتیب ہے مثلاً فرغلکی' فلغلکی' بلبلکی۔

جہاں تک ان کا بس چلتا ہے سہل مضمون کو مشکل ترکیب میں چھپا دیتے ہیں۔ اسی طرح سے معمولی اور پیش پا افتادہ الفاظ چھوڑ کر نئے الفاظ و معانی آسمان پر سے لاتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکتا ہے عام محاوروں سے گریز کرتے ہیں اور ادائے مطلب کے لیے نئے نئے الفاظ لاتے ہیں۔ اسی طرح سے نئے خیالات اور نئے معانی پیدا کرنے میں جدت کی ہے۔ ان کا دیوان جس کا تاریخی نام "فیض منیر"[۸] ہے قریباً" دو سو صفحہ کا ہے۔ اس میں علاوہ غزلیات کچھ قصائد امرائے عہد کی تعریف میں' کچھ قطعات بعض قصہ طلب اور بعض تاریخی' دوچار مخمسات' مسدس اور مثلث ہیں (جن میں)

اکثر اپنی غزلوں پر طبع آزمائی کی ہے اب ہم تیمناً" و تبرکاً" کچھ اشعار آپ کے کلام سے نقل کرتے ہیں:

حمد میں:

حمدیکہ دارد سازها با زخمہ این سازها
زان نغمہ دارد رازها صد مختلف آوازها

نیرنگی نیرنگ ها برداشت از دل زنگ ها
آئینہ دارد جنگ ها با شوخی پرواز ها

پنہان شود آن عشوہ گر ہر جاکہ آید در نظر
جوئیم در تفصیل ها یابیم در ایجاز ها

نور شب اندر سینہ ها عکسی است در آئینہ ها
انباز جملہ نازها خود فارغ از انبازها

رنگی است در گلنار ها بویست در گلزار ها
پیداست در اطوارها پنہانست در اندازها

دارد ازو ہر بوستان در ہر بہار و ہر خزان
ہر برگ تازہ راز ها ہر خار خشک اعجازها

نعت میں:

ای کہ چشم خنک آمنہ بر روی تو باز
دست عبداللہی از دست تو برد است فراز

جنت از لطف تو گر رو نکشاید بچہ رو
دوزخ از رحم تو گر سرد نگردد بچہ ساز

ای خوشا معنی عبدیت تو می دارد
راہ آزادی . . . . تا دم باز

دامن بخشش امت بمال تو وسیع
رشتهٔ مغفرت آل تو تا حشر دراز

هر کرا دست وحد بدرقهٔ احسانت
هرگز از شهر حقیقت نرود راه مجاز

ابروت گوشهٔ محراب خدا جویانست
گر تو در قبله نباشی نگزاریم نماز

این مقامی ست که سرمست کند ازمی ذوق
این کلامیست که دربست کند سوی مجاز

گه وحد صورت زیبای تو اوصاف حسین
گه شود خلق حسن از کلمانت ممتاز

چه کند گر نکند لطف تو بر عام وجوب
چه کند گر نکند فیض تو بر خاص جواز

غزلیات:

نگاهی سادهٔ صافی ادائی کرده ام پیدا
هوس ناکی بصورت آشنائی کرده ام پیدا

همی گویند کاندر سایه اش شاهی نصیب آید
مگس رانی من از پر همائی کرده ام پیدا

بدانست خود از سودا کسی نقصان نمی خواهد
دلی از دست دادم دل ربائی کرده ام پیدا

زهی زلفش که سنبل را غلامی داشت پنهانی
دل دیوانه را زنجیر پائی کرده ام پیدا

چو در نرگس مستش به بسیاری نظر کردم
بجان خویش ازین دیدن بلائی کرده ام پیدا

پرورش باید ضرور ای دایه نامهربان
گریه بر احوال تو دارند فرزندان تسپ

چه شور است این که دل بی اختیار است
به مجنون شاید از لیلی گزار است
زبان دشمنان باید بریدن
که شیرین کوهکن را دوستدار است

نگشاوه ام دهن چو صدف سوی قطره اش
چون ابر آذری بسرم آسمان گزشت

باتنگ دلان جز به تبسم نشگفتی
چو غنچه جواب تو همانست و دگر هیچ

دل نفرمود که اشک از سر مژگان گزرد
طفل بشوخ است باستاو خبر می آید

بیگانه آن کسی که به یار آشنا نه شد
دیوانه آن کسی که به کار آشنا نه شد
ناموس ننگ ماست جنون آب و رنگ ماست
فرزانه آن کسی که به عار آشنا نه شد

در راه کعبه خار مغیلان سعادت است
حیف آن برهنه پا که زخار آشنا نه شد

میرم در انتظارت چون صیدهای بسته
در جستجوی خنجر صیاد رفته باشد

مرد آن زمان مروت کاندر کنار خسرو
شیرین نشسته باشد فرهاد رفته باشد

مجنون نمرده باشد زان بادیه نشینی
کاندر حریم لیلی داماد رفته باشد

بلبل چه کرده باشد برجان خود تظلم
وقتی که محمل گل برباد رفته باشد

آنچه قسام ازل خواست بما وابخشید
- - لذت سلبه الطاف بما وابخشید

آنکه از حکمت خود درد و دوای بخشید
توچه دانی که هم از درد مداوا بخشید

غم همانست که برطاعت ما خورده گرفت
غم جان نیست که بگرفت زما یا بخشید

پاک دل بذل کسی مفت گوارا نکند
ابر هر قطره گهر کرد و بدریا بخشید

ازلب بیگانگان بر روی روز افتاده است
راز بیگیری که باهم جز بسرگوشی نبود

شرمها دارد زمین از سجر بیداد چرخ
ورنه جز تر کرده از خون سیاوشی بنود

بنهاده اند مصحف گل پیش عندلیب
با اشک شبنم آن که بخواند وضو کند

صورت ماه تمام است که گرد نقصان
آن کمال است که بگذاشت نجند آخر کار
از سر مهر به دل تنگی گل مهر آورد
صبح بر گلشن ما گفت بجند آخر کار

گر بر رسی به عنقریب باد صبا زهی نصیب
کرده نهان زعندلیب برگ گل ترم بیار

چوگل ای سحر مست آهی هنوز
کلاهت ز سر رفت و شاهی هنوز

دولت آنست که آید بر محمود ایاز
با همه ناز سرافرازی تسلیم و نیاز
تازه جانی دمدش حسن دعای شیرین
خسرو از درد کند برسر فرهاد نماز
برسر خسته ز لیلی چو عماری گزرد
هوش مجنون نه رود در پی آن زینت و ساز

برآمد ناله ای از دل رسیدم من بفریادش
بکنج عزلت خود باز گشتن کردم ارشادش
شبی صید عجب در دام زلفی دیده ام شادش
بامیدی که بنماید سحر رخسار صیادش
بدام زلف او صیدی که نا پرسیده می آید
درین وادی نمی پرسند از صیاد بیدادش

غبار خاطر یارم ازانش یادمی آیم
صفائی گر بخود پیدا کنم بر خیزم از یادش

برو تفرج منع خدا نصیب تو نیست
بهار در نظرت نیست پارسا می باش

زان رو بخویش خواهش نسبت کند درست
روشن به آفتاب بود دودمان شمع

کردند مصحف گل نازل به شان بلبل
افتاد طاق پروین از آشیان بلبل
گل بارخی چو آتش روشن تر از چراغ است
پروانه حیرت آرد اندر مکان بلبل
چون شمع از سرگل آتش زبانه گیرد
پروانه زین رعایت شد میهمان بلبل

هر چند منطق طیر در بوستان عزیز است
اوصاف گل نخواهی غیر از زبان بلبل
بر شاخ گل تجلی از شمع دان طور است
توریت می توان خواند از ترجمان بلبل

در آن عالم که من تعلیم دل بنیاد می کردم
سبق می بردم از مجنون جنون ارشاد می کردم
شنیدم آن ستم گر از غم ما شاد می گردد
ازین شادی به هردم نوحه ای ایجاد می کردم
بروی تیغ بازان زندگی دشوار می افتد
بیاد ابروی جانان بجان بیداد می کردم
گل از باد صبا خوش بود و من چون بلبل بیدل
عبث فریاد می کردم سخن برباد می کردم

جز خویش نبودیم که در خویش نبودیم
آئینه همی دید شکستیم و فزودیم
چون زلف بتان کسوت خود راست نه کردیم
تاریم که در کشمکش فرصت پودیم
در محفل برداشتن نغمه قلقل
پیمانه مصلیٰ است چو مینا به سجودیم
چو سر فلک برهمه آثار همیلیم
ما وقت شناسیم نه دیریم و نه زودیم
در دیدهٔ اغیار چسان جلوه گر آئیم
در بزم نمود آنچه که بودیم نمودیم

خوردیم و بدادیم و بفروا ننهادیم
دهقان ازل کاشته و ما بدرودیم

زجام چشم طناز کسی بی تاب و مدهوشم
جنون سرشار برقم، بی قرارم، وحشت آغوشم
ز درد ساقی و پیمانه شد مستی فراموشم
چو امشب ناگهان در یادم آمد عشرت دوشم

چه گفت چو به یکی دیدنش ز خود رفتم
به هوش باش من این غمزه را دوبار: کنم

خواهد ز دست ناز تو مینا گریستن
کارست آشنای ترا با گریستن
برحال اهل بزم که دل سوز نیستند
باید چو شمع خنده زدن یا گریستن

دل را به درد و داغ مداوا کند کسی
شاید به روی خود در دل واکند کسی
مستغنی است یار به پیشش برابر است
بیهوده آرزو نکند یا کند کسی
طفلان شهر سنگ بدامن گرفته اند
تا خویش را به کوی تو رسوا کند کسی

ز چشم جادوش دارم جنون را تازه سامانی
که در هر عشوه افسونیست' هر غمزه پری خوانی
بهر رنگی که باشی پر تو حق جلوه آراید
بهر فرعون موسائی بهر موری سلیمانی

مسدس:

بر صبا ولوله آید به گلستان گزرد
بلبل افغان کند و بر گل خندان گزرد
قمری از سایهٔ شمشاد پر افشان گزرد
هرکه پروانه صفت بر رخ تابان گزرد
زلف پرتاب بدست آید و از جان گزرد
هرکه از جان گزرد برسرش آسان گزرد

قصه کوهکن و جان دهیش عام کنند
بر ورق' خستگی تیشه زن ارقام کنند
شیرازان چشمه خون ریخته در جام کنند
خون فرهاد' شنگرف صرف نام کنند
تا از و صورت شیرین ز گریبان گزرد
آه ازان سیل که از دیدهٔ گریان گزرد

کارم افتاد به یاری که سوی خویش ندید
پایم افتاد به راهی که کران نیست پدید
بایدم رفت به جائی که کس آن جانه رسید
حاجت بدرقه ای نیست بباست دوید

قطرہ اشک ہر آن سو کہ ز دامان گزرد
ہم چو آن دیو کہ از بند سلیمان گزرد

حواشی

(۱) ڈیڈوانہ' سابق ریاست جودھپور (مارواڑ) میں جودھپور شہر سے کوئی ۱۳۰ میل شمال مشرق میں رتن گڑھ' ڈیگانہ سیکشن پر ریلوے اسٹیشن اور نہایت قدیم تاریخی بستی ہے۔ اکبری دور میں یہ سرکار ناگور کا محال تھا۔ آج کل بھی بدستور ضلع ناگور کا پرگنہ (تحصیل) ہے۔ ڈیڈوانہ میں بہت سی مساجد اور دیگر تعمیرات پر سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے کتبات موجود ہیں۔ ان میں قدیم ترین کتبے سلطان فیروز شاہ تغلق (سنہ ۷۵۲ھ - ۷۹۰ھ) کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکبر' شاہجہان اور اورنگ زیب کے متعدد کتبات ملتے ہیں۔ ایک کتبہ محمد شاہ اور ایک بہادر شاہ (ظفر) کے نام کا بھی حال ہے۔ (مرتب)

(۲) سنہ ۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۸ھ (۱۶۵۸ء - ۱۷۰۷ء)

(۳) فترت دو پیغمبروں کے درمیانی زمانے کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو بادشاہوں کے عہد ہائے حکومت کے درمیانی وقفے کو بھی' جس میں تخت خالی رہے فترت کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ اصطلاح شاید اس لیے لائی گئی ہے کہ اورنگ زیب سنہ ۱۰۹۲ھ سے لے کر تا حین حیات دکن کی مہمات میں مصروف رہا اور اس طویل عرصے میں پایہ تخت دہلی میں کوئی بادشاہ موجود نہ تھا۔ (مرتب)

(۴) مہاراجہ مادھو سنگھ اول ولد مہاراجہ سوائی جے سنگھ ثانی (متوفی ۱۷۴۳ء) سنہ ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) میں اپنے بڑے بھائی مہاراجہ ایشوری سنگھ کی وفات پر ریاست جے پور کی گدی پر بیٹھے اور سنہ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں انتقال کیا۔ دلپت رائے اپنی تالیف "ملاحت مقال" میں برگ ۲۲ پر لکھتا ہے کہ مہاراجہ مادھو سنگھ کی تاریخ وفات "قاضی اکرم فیض کہ مرد عالم بود و تقرب بہ شطرنج بازی داشت' چہ خوش گفتہ : غم عالم = ۱۱۸۱ھ" (مرتب)

(۵) غالباً نظام الملک آصف جاہ اول مراد ہیں جنھوں نے سنہ ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۴ء) میں ریاست حیدر آباد کی بنیاد رکھی اور کوئی پچیس برس حکومت کرنے کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں بمقام برہان پور وفات پائی۔ "متوجہ بہشت" سے تاریخ وفات ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) نکلتی ہے۔ (مرتب)

(۶) محمد شاہ (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء و ۱۷۴۸ء) (مرتب)

(۷) ڈیڈوانہ کے مقام پر سانبھر کے بعد راجستھان کی دوسری بڑی نمک کی جھیل واقع ہے۔ (مرتب)

(۸) اس نام سے ۱۱۹۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ شاعر نے خاصی طویل عمر پائی ہوگی۔ (مرتب)

❑❑❑

حصۂ سوم

متفرّقات

گناہ

بہ تقلیدِ حضرت آغا شاعر دہلوی

(از "مخزن" لاہور' بابت جون ۱۹۰۲ء و جولائی ۱۹۰۲ء)

اے چہرے پر جھریوں[۱] والے بوڑھے تیری رگوں میں خون کا نام نہیں ہے۔ تیرے ارغوانی رخساروں پر بڑھاپے کا یاسمینی نور برس رہا ہے۔ تیرے سیاہ اور گھنے بال بگلے کے پروں کی طرح سفید ہوگئے ہیں جن کو نہ کسی رنگریز کے قابل تعریف ہاتھوں نے رنگا ہے اور نہ انہیں کوئی خضاب ہمیشہ کے لیے سیاہ کرسکتا ہے۔ ان کی طبیعت اسی طرح بدل گئی ہے' جس طرح تیری جوانی کا زمانہ گزر گیا۔ ہاں ذرا سچ کہنا کبھی تجھے اپنا گزشتہ اور حسرت آمیز زمانہ یاد آیا۔ کیا تو نے اس گزرے ہوئے پربہار وقت کو یاد کرکے کوئی ٹھنڈی سانس اپنے مرجھائے ہوئے دل سے کھینچی۔ کیا کبھی گزشتہ زمانے کی یاد نے تیرے دل کو میلا کیا اور کیا تو نے عمر کا ادنیٰ سے بھی ادنیٰ حصہ زمان رفتہ کی تلاش میں بسر کیا۔ اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو مجھے تیری حالت پر افسوس آتا ہے۔ مگر تو قابل رحم ہے۔ آہ بوڑھا ہے' ضعیف ہے' معذور ہے۔ میں تیری مدد کرتا ہوں اور تجھ کو تیرا گزشتہ زمانہ یاد دلاتا ہوں۔

اے سفید پلکوں والے بوڑھے وہ دن تجھے یاد ہے جب تو اپنی خاک میں مل جانے والی ماں کی آغوش میں دودھ پی رہا تھا۔ جب تو اپنے ننھے ننھے لال ہونٹوں سے کچھ اس انداز سے ہنسا کرتا تھا کہ تیری ماں کا دل اس کے پہلو میں اسی طرح تڑپ جاتا تھا جس

طرح تیرے دودھ کے سفید سفید دانت تبسم کے وقت بجلی گرایا کرتے تھے۔ جب تو اپنی روشن اور سیاہ مگر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والی آنکھوں سے پہروں آسمان پر خوبصورت چاند کے مکھڑے کو گھورا کرتا تھا اور اپنی نازک کلائیوں کو حرکت دے دے کر چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے اشارے کیا کرتے تھا اور خدا جانے تو نے چاند میں کونسی بات دیکھ پائی تھی کہ گھنٹوں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتا تھا۔ تجھے اپنی وہ کلکاریاں یاد ہیں جنہیں تو اپنے نرم و نازک لبوں سے نکال کر ہوا کے تموج کے ذریعے سے چاند کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ کیا تجھے اپنی وہ بے سود کوشش یاد ہے جب تو چاند کو اپنی آغوش میں کھینچنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر تھکا دیا کرتا تھا اور جب تجھے اپنی امید میں مایوسی ہوتی تھی تو ہنستے ہوئے چہرے سے بسورنے لگتا تھا اور کچھ دیر بعد مہین مہین چیخیں، جو چھوٹے سے گلے اور پیارے لبوں سے دل فریب معلوم ہوتی تھیں، سنائی دینے لگتی تھیں۔ پھر تیری ماں آجاتی تھی اور تجھے روتا دیکھ کر (اگرچہ تیری آنکھوں سے کوئی بھی در اشک نہیں گرتا تھا) چھاتی سے لگالیتی تھی اور تو اس کا خون، جسے دنیا والے دودھ کہتے ہیں اور جو تجھے آب کوثر سے زیادہ میٹھا اور مزیدار معلوم ہوتا تھا، چسر چسر کرکے پینے لگ جاتا تھا۔ اگرچہ تو اس وقت فرشتے سے زیادہ معصوم اور روح سے زیادہ پاک تھا لیکن پھر آدم کا بیٹا تھا۔ آدم کا گناہ تیرے عنصری خمیر میں موجود تھا اور آج یہ پہلا دن تھا کہ تو نے گناہ کے دروازے میں پہلا قدم رکھا اور دودھ پیتے پیتے شوخی سے یا یوں کہو سادگی سے اپنی بے قصور، اپنی بے گناہ اور اپنی بے خطا ماں کی چھاتی میں زور سے کاٹ کھایا اور جب اس نے بے چین ہوکر تجھے اپنی چھاتی سے علیحدہ کردیا تو تو نے جلدی سے چہرہ بگاڑ کر رونی صورت بنالی۔ ہرچند تجھے خدا نے گویائی کی طاقت نہیں دی تھی پھر بھی تو نے اس دلسوز اور مہربان بلکہ شفیق ماں کو نگاہوں نگاہوں میں ہی دھمکا کر چھوڑا کہ اگر دودھ نہیں پلاؤ گی تو ابھی غل مچادوں گا۔ دیکھ اے ضعیف اور قبر میں پاؤں لٹکانے والے بوڑھے یہ تیری پہلی گستاخی تھی جو تو نے اپنی ماں سے کی۔ وہ ماستا کی اندھی ماں تیرے اس قصور کو خیال میں بھی نہیں

لائی۔ وہ اپنی تکلیف بھول گئی اور تیری پرورش میں مشغول ہو گئی۔

اسی طرح چار سال تک ناز بردار ماں تیری خدمت کرتی رہی اور پھر ایک دن تجھے تیرے باپ کے دامن عاطفت اور اپنے دم واپسیں کی دعاؤں کے سپرد کر کے تیرے دیدار کی حسرت لیے دنیا سے چل بسی۔ مہربان ماں کے فراق کا غم تجھے کیا ستاتا کیوں کہ تو ابھی عالم سروشستان کا ایک نورانی پیکر تھا۔ تیرا روحانی ہیکل بسم اللہ کے گنبد میں دست برد سے محفوظ تھا۔ تجھے ماں کی وفات اس وقت محسوس ہوئی جب کہ شام کے وقت گرسنگی کے ہم زاد نے تجھ سے اپنا روزینہ طلب کیا۔اس وقت تجھے ماں یاد آئی اور شاید تو تلملا کر رونے ہی لگا تھا کہ باپ کا مہربان ہاتھ تیرے سر کو چھوتا ہوا دکھائی دیا اور اس نے تجھے آغوش میں کھینچ لیا۔ دیکھ تیرا باپ کیسا فیاض تھا کہ اس کی بے انتہا اور پے در پے آنے والی مہربانیوں نے ماں کی یاد کے غم کو تیرے ننھے سے دل میں بھٹکنے نہ دیا۔ اس نے تجھے کبھی ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تیرے نازنین جسم سے پھول کی چھڑی تک نہیں چھوائی۔ آہ اب تو ماں کو بالکل بھول گیا تھا۔ اس کی یاد تجھے کبھی پریشان نہیں کرتی تھی۔ وہ تجھے بھولے سے بھی یاد نہیں آتی تھی۔ دیکھ اے بار گناہ سے خم کمر ہونے والے بوڑھے یہ تیرا گناہ ہے جس کی تلافی کا خیال ابھی تک ستر سال کے بعد بھی تجھے محسوس نہیں ہوا۔ تیری حسرت نصیب ماں کی روح اب تک اس امید میں ہر رات تیرے سرہانے آکر کھڑی ہوتی ہے کہ کبھی تو خواب میں بھی اپنی گم گشتہ بدنصیب ماں کا خیال کرے جس سے اس کو آسمانی مسرت حاصل ہو۔ مگر نہیں وہ ہر صبح تیرے پاس سے مایوس جاتی ہوئی نظر آتی رہی ہے۔

اے مجسم عبرت بوڑھے! پھر تو مکتب میں بستہ لے جاتا دکھائی دیا۔ معلم تجھے سبق پڑھا کر ہدایت کر دیا کرتا تھا کہ یاد کرے مگر تو سبق یاد کرنے کے بجائے جور استاد سے جو مہرپدر سے بدرجہا افضل ہے تنگ آ آ کر اس کی موت کی دعائیں خدا کی جناب میں مانگا کرتا تھا:

حضرت حق میں اٹھا کر ہاتھ ہر صبح و مسا
چپکے چپکے مانگتا مرگ معلم کی دعا

اگرچہ تیری یہ دعا قیامت تک قبول نہیں ہوئی کیوں کہ جب ایک معلم مر گیا تو دوسرا جو بے رحمی کے فن میں پہلے سے زیادہ مشاق تھا' تیری دعاؤں کو بے اثر ثابت کرنے کے واسطے ایک سبز عصا ہاتھ میں لیے مکتب میں تیرا منتظر ہوتا تھا' اس طرح تو نے اگرچہ کئی بدخو استادوں کے خون اپنی معصوم دعاؤں کی گردن پر لیے لیکن جب باپ نے تیری ان بے جا شکایتوں کی جو ہر روز استاد کے حق میں کی جاتی تھیں کوئی داد نہ دی اور تجھے اپنی رہائی دشوار نظر آئی تو تو نے مکتب سے بھاگنا شروع کردیا اور اب کئی کئی روز تک گھر میں اور مکتب میں تیری صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ماں کی فریفتہ روح خدا جانے کن کن سنسان جنگلوں میں تیری خاطر بھٹکتی پھرتی تھی مگر تجھے کچھ خیال نہیں تھا۔ ضعیف باپ کے تھک جانے والے پاؤں سینکڑوں گز زمین چار پہر میں الٹ ڈالا کرتے تھے لیکن تیرا پتہ نہیں لگتا تھا۔ تجھے بھوکا مرنا قبول' سنسان جنگل قبول اور اس کی دہشت ناک کالی کالی راتیں قبول لیکن باپ کا پیار اور استاد کی مار منظور نہیں تھی۔ تو بارہا دیکھا گیا ہے کہ کبھی گھنے جنگلوں میں گھس گیا ہے اور کبھی پہاڑوں کی غاروں میں جاچھپا ہے۔ اگرچہ تو دلسوز باپ کو ہر وقت ناخوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ (بہشت نصیب جس کی موت پر اس وقت برسوں کے متعدد عشرے گزر چکے ہیں) تیری صورت دیکھتے ہی تیری لغزشوں سے درگزر کردیا کرتا تھا اور تیری خطاکاری کے باوجود تجھے یہی کہنے لگتا کہ تو ابھی بہشتی گلاب کی کلی ہے۔ تو باغ حیات کا نورسیدہ شگوفہ ہے جس کو معصیت کی گرد نے ناپاک نہیں کیا۔ تو خدا کی رحمت ہے جو گناہ کے دھبے سے بالکل پاک ہے اور تو پاک فرشتہ ہے اور تیرے کان برائیوں کی آواز سے ناآشنا ہیں۔

اے خدا کے گنہگار بندے تو اس شام کو یاد کر جب مہربان باپ کی دردناک آواز تجھے یوں کہتی ہوئی سنائی دی۔ اے ماں کے لخت جگر! اے باپ کے نوربصر! اور اے مرنے والی کی آخری یادگار! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تیرا دل اسی طرح ہمیشہ غموں سے دور

اور خوشیوں سے معمور رہے گا۔ کیا تیرا باپ سدا کے لیے تیری پرورش کا کفیل ہو کر زندہ رہے گا۔ کیا موت کا زبردست ہاتھ بہت جلد اس کے سائے کو تیرے سر سے نہیں اٹھالے گا۔ اے نادان اور بھولے لڑکے! تو اس وقت کو بہت قریب آیا جان جو تیرے خیر طلب باپ کو مرنے والی ماں کی طرح ہمیشہ کے واسطے تجھ سے جدا کردے گا۔ اے مردہ ماں کی غم ناک نشانی اور زندہ باپ سے عنقریب بچھڑ جانے والے بچے وہ سال بڑی تیزی سے آرہا ہے جس کی فصل خزاں میں تو بے باپ کا کہلاوے گا اور جس کے آفتاب کی روشنی میں تو یتیم بنادیا جائے گا۔ اے میرے قابل رحم بیٹے تو دنیا کے میدان میں اکیلا رہ جائے گا۔ تیرے ہمدرد اور غمخوار دنیا سے اٹھ چکے ہوں گے اور تو تنہا زمانے میں اپنی حالت پر آنسو بہانے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔ کوئی رحم کا ہاتھ تیرے رخسار کی بے رونقی بڑھانے والے اشکوں کو پاک کرنے کے لیے موجود نہیں ہوگا اور کوئی ہمدرد آواز تسلی آمیز جملے تیرے حق میں استعمال کرتے ہوئے نہیں سنائی دے گی۔ ہاں تو دنیا میں تنہا ہوگا اور تیرے پیار کرنے والے مرچکے ہوں گے۔ تیری حالت پر آنسو بہانے والے خاک میں دفن ہوں گے۔ اے دنیا کے چھوٹے مسافر! کوشش کر کہ تو اس وقت کسی کا محتاج نہ ہو۔ اے خام عقل طفل! ہمت کر کہ تنہا اس وقت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل ہوجاوے۔ اے بے سمجھ لڑکے! ذرا غیرت کو کام میں لا کہ تو اپنی محبت کرنے والے اسلاف کی شرمناک یادگار نہ بنے۔

اے جھرجھری آواز والے بوڑھے! یہ نصیحت تھی جو تیرے باپ نے اپنی موت کے سال سے کئی برس پیشتر کی تھی لیکن تجھ جیسے سنگ دل پر ان جگر خراش الفاظ نے کوئی اثر نہیں کیا۔ تو نے ان سچی باتوں کو باپ کے بڑھاپے کا خبط خیال کیا اور ان کی صداقت پر اصلاء اعتنا نہیں کی۔ یہ کیسا ناقابل معافی اور سخت گناہ تھا کہ قابل پرستش باپ کی نافرمانی میں تو ہمیشہ ثابت قدم نظر آیا۔ اوہ تو کیسا بدنصیب تھا کہ باپ تجھ سے کبھی راضی نہیں ہوا۔ اوہ تو کیسا دیوانہ تھا کہ اس کا بوڑھا دل دکھانے میں ہمیشہ مستقل رہا۔

اس وقت تو اپنی عمر کا دوسرا عشرہ طے کر رہا تھا اور تیری سالگرہ کا چودھواں سال تھا کہ تیرے باپ کی پیشین گوئی پوری ہونے کا وقت آگیا۔ یہ وہ ناگزیر وقت تھا کہ فانی انسان کی زندگی کا سب سے زیادہ تلخ اور ناخوش گوار حصہ ہے۔ یہ وہی وقت تھا جس سے تیرا باپ تجھے بارہا خبردار کرچکا تھا۔ آخر اس کی موت کے دن کا آفتاب طلوع ہوا اور پلک مارنے میں اتنا بلند ہوگیا کہ اس کی روشنی کے ذرے چھت کے روزن میں سے چھن چھن کر چھت کے سائے میں سونے والے بوڑھے باپ کے مردنی چھائے ہوئے چہرے پر گر رہے تھے اور اس کے تغیر و تبدل کو صاف دکھا رہے تھے۔ تو اس روشنی میں اس ناگزیر اور ضرور ہونے والے سانحے کو دیکھ کر تو اپنی روحانی آنکھوں سے موت کے فرشتے کو دروازے میں گھستا ہوا دیکھ سکتا تھا اور تو اس کے یکایک آجانے کی سرسراہٹ کو تاڑ جاتا اور تیرے باپ کے اعضاء کا تشنج اور چہرے کی سفیدی اس کی گواہی دیتی مگر تو اس عالم میں نہیں تھا۔ ایسی دور تو پہنچا ہوا تھا جہاں تجھے خود اپنی خبر نہیں تھی۔

آخر وہ دن ختم ہوا۔ رات آئی اور اس کا بھی زیادہ حصہ گزر گیا۔ اب پانچ بج چکے تھے۔ اس سنسان اور خاموش کمرے میں' جہاں تیرا باپ دم توڑ رہا تھا' ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا اور تیرے باپ کے ناگزیر وقت میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ اس کی بوڑھی زبان پر زور سے تیرا نام آیا اور تو فوراً ہی گھبرا کر اس کے پاس گیا اور اس کو ایسی حالت میں دیکھا جو تیری نگاہوں میں بالکل اجنبی تھی اور جسے دنیا والے نزع کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس وقت اس کی نبض بہت سست چل رہی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے جسم میں خون نہیں رہا تھا۔ اس کے اعضاء میں برف کی سی خنکی سرایت کرتی چلی گئی۔ آخر اس نے اپنی اکھڑی سانس کو سنبھال کر اور سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ اے میرے بچے میں وہاں جاتا ہوں جہاں سے کوئی نہیں پھرا۔ مجھے وہ سفر در پیش ہے جہاں سے واپس آنا معلوم۔ اے لڑکے مجھے معلوم نہیں کہ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا تجھ سے کس طرح سلوک کرے گی اور مجھے خبر نہیں

کہ زمانہ تیرے موافق رہے گا یا مخالف۔ اے بدنصیب فرزند! میں نے ہر چند چاہا کہ تو کسی لائق ہو جائے اور وہ زندگی بسر نہ کرے جس پر غیرت موت کو ترجیح دے مگر میری زندگی میں یہ امید بر نہ آئی۔ جو شدنی تھا وہی ہوا اور وہی ہوگا۔ اے بیٹے اب تیرا باپ مرتا ہے اور تجھے ہمیشہ کے لیے الوداع کہتا ہے۔ اب تو قیامت تک اس کی صورت نہیں دیکھ سکے گا۔ مگر اس دم توڑنے والے باپ کی تجھ سے التجا ہے کہ تو دنیا میں خواہ کیسی مبتذل اور ذلیل حالت میں کیوں نہ رہے مگر نیکی اور ایمان کو ہاتھ سے نہ دینا۔ ہاں ذرا ان مرنے والوں اور پیار کرنے والوں کی شرم رکھ لینا جن کو آسمانی تقدیر نے زبردستی تجھ سے جدا کر دیا ہے۔ اے ناشاد باپ کے نامراد بیٹے! آہ تو تنہا ہے اور تجھے دنیا میں تنہا زندگی بسر کرنا ہوگی مگر تو اس تنہائی سے اپنے دل کو ملامت کرنا' تیری ماں کی غمگین روح تیرے لیے بے چین ہوگی' تیرے باپ کی سوگوار روح تیری مصیبت میں شریک ہوگی' تیرا دنیا میں کوئی مددگار نہیں' اس رنج سے تو کبھی غمگین مت ہونا۔ ہم مرنے والوں کی دم نزع کی دعائیں زندگی میں تیری مددگار ہوں گی اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تو دنیا میں سدا خوشحال رہے اور نیک راستے پر چلے۔ اے خدا تو جو آسمان پر ہے میں اس انجان اور بھولی روح کو تیرے رحم کے سپرد کرتا ہوں۔ تو اس کا سب سے زبردست نگہبان ہے اور بے شک تجھ کو اپنے پیدا کیے ہوئے کی لاج ہے۔

اس جملے کو ختم کرتے کرتے تیرے باپ نے چند ہچکیاں لیں اور اس کی آواز پھر تجھے نہیں سنائی دی۔ اس عرصے میں قابض ارواح نہایت سنجیدگی سے اپنا کام کرتا رہا۔ اتنے میں گھر کے گھنٹے نے چھ بجائے اور چراغ جھلملا جھلملا کر خاموش ہو گیا اور ادھر تیرے باپ کا ستارہ حیات اندھیرے کے گہرے دلدل میں غائب ہو گیا۔ تو یہ تمام تماشا خاموشی سے دیکھتا رہا اور پھر پیکر تصویر بن گیا۔ گویا تو ایک سنگ مرمر تھا جس کو سنگ تراش نے انسانی جامے میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس وقت تجھ میں اور اس بوڑھی لاش میں' جو تیرے سامنے پڑی تھی' کوئی فرق نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد تو ہوش میں آیا۔ تیرے حواس نے اس واقعے کو معلوم کیا اور تیری عمر میں یہ سب سے پہلا موقعہ تھا کہ تو بے

انتہا مضطرب اور غمگین ہوا۔ تو نے زور سے ایک چیخ ماری اور باپ کی لاش سے پٹ گیا۔ وہ سنسان مکان جس کی چار دیواری میں تیرے باپ نے جان دی تھی اب تیری متواتر چیخوں سے گونج رہا تھا۔ تیری آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور تو اس بے جان لاش سے کہہ رہا تھا اے باپ! اے پیارے باپ! اے مہربان باپ! تو مجھ سے کیوں خفا ہوگیا۔ اے باپ تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اے باپ! ایک دفعہ (وہ) مبارک آواز میرے سوگوار کانوں کو پھر سنادے۔ اے باپ! ایک بار شفقت کا ہاتھ میرے سر پر اور پھیر۔

تو نے اپنے باپ کا ماتم کیا اور پھر اسے اندھیری قبر میں چھوڑ آیا۔ جس پر پتھر کی وزنی سلیں لگادی گئیں اور منوں مٹی ڈال دی گئی۔ تو نے اس کے ماتم کے لباس کو بہت ہی کم دن اپنے بدن پر رکھا اور اس کو بھول جانے کے لیے عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا۔ وہ تنکا جو شہتیر بن کر تیری آنکھ میں کھٹک رہا تھا اب نکل چکا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں تو نے بال و پر نکالے اور اس راستے پر چلنے لگا جہاں گناہ کے بے شمار بھوت دلچسپی کا لباس پہنے کھڑے تھے۔ تو ان کی ظاہری آراستگی پر فریفتہ ہوگیا۔ حسن ایک حسین پری کی صورت میں تیرے سامنے نمودار ہوا اور تو نے آنکھیں بند کر کے اسے اپنا دل دے دیا۔ افسوس تو اس دام میں پھنس گیا جس سے اب تک' حالانکہ چراغ سحری ہو رہا ہے' تجھے رہائی نصیب نہیں ہوئی۔ عشق کے شیطان نے تجھ سے آنکھیں لڑائیں اور تو نے اپنی زندگی اس کے ہاتھ بیچ دی۔ جہاں کوئی حسین صورت دیکھی تیرے منہ میں پانی بھر آیا۔ جہاں کوئی اچھی شکل نظر آئی تو مچل گیا۔ تیرا دل سوز باپ' جو اب جنت میں رہتا ہے' تیرے لیے اتنا اندوختہ چھوڑ مرا تھا کہ تلاش معاش کی فکر نے ایک منٹ بھی تیرے عیش طلب دل میں خلجان پیدا نہیں کیا۔ افسوس تو اس کی اس نصیحت کو جو نزع کے وقت کی تھی بھول چکا تھا۔ اگر دنیا میں کوئی غم تجھے ستا سکتا تھا تو وہ غم معشوق تھا' اگر تیرا کوئی دشمن تھا تو وہ رقیب روسیہ تھا اور اگر کوئی ستم تجھ پر بلائیں توڑتا تھا تو وہ فراق یار تھا۔ زمان فراق میں تجھے اکثر موت آجایا کرتی تھی لیکن پھر جی اٹھتا تھا۔ ادھر فراق یار (خدا نہ کرے اب نصیب ہو) برسات کی گھٹاؤں کی

طرح' تیرے سر پر چھاگیا اور ادھر تو نے قبر کا کونا بسایا۔ یہ شمار کرنا مشکل ہے کہ تو کے دفعہ مرا اور کے دفعہ زندہ ہوا مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہزاروں مرتبہ ملک عدم کی سیر کی' سینکڑوں بار صحرائے فنا کو چھان مارا۔ گویا موت ایک جامہ تھا جس کو جب چاہا اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا اور جب جی چاہا پہن لیا۔ یا وہ ایک فانوس تھا کہ جب ضرورت ہوئی روشن کرلیا اور جب دل میں آیا گل کردیا۔

اے ناموس برباد کن اسلاف! تو نے ہوس میں وہ کمال پیدا کیا کہ قیس و فرہاد کا فسانہ تیرے نزدیک بچوں کا کھیل تھا۔ آبادی چھوڑ کر ویرانہ پسند کیا اور سر پر مشت غبار ڈال کر گریبان کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔ کبھی اس جنگل کی خاک چھانی اور کبھی اس بیابان میں اپنی آبلہ پائی کو خار مغیلاں سے روشناس کیا۔ آج اس صحرا کے گل خود رو کی بہاریں لوٹیں اور کل اس مرغزار میں غزالان ناکردہ رام سے رشتہ موانست قائم کیا۔ کبھی جنگلوں میں تنکے چنتے نظر آتا تھا اور کبھی کسی گلزار میں ایک سوکھی شاخ پر آشیانہ بنا رہا تھا۔ کبھی تو دام صیاد میں پھڑک رہا تھا اور کبھی کنج قفس میں اپنے ہم صفیروں کو یاد کرکے ان کی آزادی پر رشک کر رہا تھا۔ کبھی فصل خزاں میں بہار کے موسم کی یاد میں دیوار چمن پر نوحہ خوانی کرتا نظر آتا تھا۔ میں حیران (ہوں) کہ تو کون تھا اور تیرے خیالات کیا تھے۔ تجھے خدا نے جامہ انسانیت عطا کرکے اشرف المخلوقات کا قابل فخر خطاب مرحمت فرمایا تھا لیکن تو ایک مشت پر کی زندگی پسند کرتا تھا۔ فراق کی تاریک راتیں جب تیری نیند کی خوگرفتہ آنکھوں کو خواب سے باز رکھتی تھیں' تو اس کا بدلہ اپنے ہمسایوں سے لیا کرتا تھا اور نالہ نیم شبی سے محلہ بھر سر پر اٹھالیا کرتا تھا۔ آسمان تیرے نزدیک ایک نیلوفری سائبان تھا جو آہ سحری کے گولہ باروت کے آگے ایک لحظہ بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ کبھی تو دعا سے لڑتا تھا اور کبھی اثر سے جھگڑتا تھا۔ دنیا تجھ سے تنگ تھی اور تو دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور دل یار کے گیسوئے پر شکن میں اسیر تھا اور وہ باد صبا کے ظلم سے مجموعہ پریشانی بنا ہوا تھا۔ مگر اس مظلوم گروہ کی داد رسی نوشیرواں جیسے عادل نے بھی نہیں کی۔ تیرا دل بھی خدا جانے کیا عجوبہ تھا کہ کبھی وہ

شیشہ بن جاتا تھا اور کبھی آئینہ' کبھی وہ قطرہ خوں کی صورت میں جلوہ گر ہوتا تھا اور کبھی اسیر فرنگ بن کر زلف بتاں کا سلسلہ جنباں تھا۔ کبھی خیال یار کا جولانگاہ تھا اور کبھی وہ ایسی شے بن جایا کرتا تھا کہ تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے یار لوگوں کی نذر کیا کرتا تھا۔ تو وہ بیمار تھا جس کے علاج سے طبیبوں نے ہاتھ اٹھالیا تھا۔ عیسیٰ آسمان سے اتر آئے مگر انہیں بھی تیری شفا کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ الغرض تو نے یہ تمام مراتب طے کئے اور جب ان منزلوں سے گزر گیا تو پاک شہدوں کے ٹولے میں داخل ہوگیا۔ پھر وہ کون سے ناکردنی کام تھے جو تو نے نہیں کیے۔ محلے والوں کے لیے تو ایک مہیب دیو تھا کہ صورت دیکھتے ہی دم فنا ہوجاتا تھا۔ ایک خبیث روح تیرے جسم میں حلول کر آئی تھی جس کا زہریلا اثر تمام بدن کی رگوں میں خون کی گردش کے ساتھ ساتھ دوڑ گیا تھا۔

اب تیرا دل ایسا سیاہ ہوگیا کہ تیری شب فراق کی تاریکی بھی اس سے چھپتی تھی۔ یہ وہی دل تھا جو کبھی ایسے چراغ کے مشابہ تھا جس کی روشنی خنک اور ٹھنڈی ہو اور یہ وہی دل تھا جو اس مبارک زمین کی طرح تھا جس پر برکتوں کا نور ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح ہر وقت برستا ہو۔ اور اب وہی جھیل برائیوں کا سمندر بن گئی تھی جس میں ایک طرف گناہوں کا دلدل تھا اور دوسری طرف ناپاکی کی موجیں طوفان برپا کر رہی تھیں۔ اب وہی چراغ آگ کے بڑے ڈھیر کی صورت میں تبدیل ہوگیا تھا جس کے بے پناہ شعلے آسمان تک کی خبر لاتے تھے اور اب وہی زمین ایسا خشک قطعہ بن گئی تھی جس کے ذروں سے پلیدی کے پودے پھوٹ کر بلند درخت بن گئے تھے اور جن میں نامبارکی اور بدفالی کے پھول بکثرت کھل رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تیرے سیمابی زنخدان پر سیاہی اپنا رنگ جما چکی تھی۔ تیری یہ مونچھیں' جو ان دنوں بالکل سفید ہورہی ہیں' اس وقت بنگالی کوے کے پروں کی طرح سیاہ تھیں۔ اب تو تیرے رخساروں پر جھریاں پڑ گئی ہیں لیکن وہ اس وقت بالکل سرخ و سفید تھے اور تیرے دانت جو اب پرانی دیوار کے بوسیدہ کنگروں کی طرح ایک ایک کرکے گر گئے ہیں اس

وقت ان میں موتیوں کی سی سفیدی تھی اور تیرے مسوڑوں میں اس طرح پیوست تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ یا گوشت میں ناخن۔ تیرا قد جو اس وقت بار گناہ سے میوہ دار شاخ کی طرح زمین پر جھک گیا ہے ان دنوں بالکل ایک سیدھے اور لمبے شہتیر کے مشابہ تھا۔ تیرے سر کے بال جن پر اب اوس پڑ گئی ہے اور برف کے مانند سفید ہو گئے ہیں اس وقت بالکل کالا بھونرا تھے۔ دیکھ اے فنا کی دلیل! یہ فرق تھا تیری جوانی کے مرقع اور بڑھاپے کی تصویر میں۔ اب تو کمزور بوڑھے کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے' ان دنوں مضبوط جوان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اے غافل شخص آ ذرا تیرے بڑھاپے اور بچپن کی تصویر کا بھی فرق دکھادوں۔ یہی تیری صورت' جس پر اب مایوسی اور اداسی برس رہی ہے' اس وقت اس سے بھولی ادائیں آشکار تھیں۔ یہ تیرا چہرہ' جس پر اب بے شمار کافور کے درخت کھڑے ہیں' تب بالکل ارغوان زار تھا۔ تیری آواز' جس سے ضعف مگر عیاری ٹپک رہی ہے' اس وقت بالکل سریلی تھی۔ تیری صورت سے فریفتگی اور بھولا پن ظاہر تھا اور تیری آنکھیں' جو اب جوانی کے غم میں بے نور اور خلوت نشین بن گئی ہیں' تب بالکل صاف اور چمکیلی تھیں۔ اب تو پیر سالخوردہ ہے تب طفل نوخیز تھا۔ اب ایک ایسا کانٹا ہے جس کا زہر نیش عقرب ہے' اس وقت ایسا پھول تھا جس کی مہک باغ میں اڑ رہی تھی۔ اب تو باپ بن گیا ہے' اس وقت بیٹا کہلاتا تھا۔ وہ صبح زندگانی تھی یہ شام حیات ہے' وہ اقبال تھا یہ زوال ہے' وہ آغاز تھا اور یہ انجام ہے۔ اس وقت تو ایک مرغزار تھا جس کے سدابہار پھولوں کی خوشبو سے جنگل مہک اٹھتا تھا اور اب ایسی زمین ہے جس کے لمبے لمبے گھاس میں بے شمار زہریلے افعی رینگ رہے ہیں اور پھن کھولے کھڑے ہیں۔ کیوں اے نامراد شخص اب بھی تجھے کچھ فرق معلوم ہوا۔ ہاں ذرا اب تو ان کرتوتوں کو سن جن کا تو زمانہ شباب میں مرتکب ہوا۔ تجھے خدا نے آنکھیں دی تھیں کہ ان سے اس کے مناظر قدرت کو دیکھے اور اس کی صفت کی داد دے لیکن تو ہمیشہ اس غایت کے برخلاف ان سے کام لیتا رہا۔ تجھے کان دیئے گئے تھے کہ نیک باتیں سنے مگر بجائے اس کے "این گوش پر از زمزمہ چنگ و

ربابست" کا مضمون تھا۔ تجھے ہاتھ دیئے گئے تھے مگر وہ خون ریزی کے مشاق ہوگئے تھے۔ تیری تلوار' جس کا نام تو نے مرگ دشمن رکھا تھا ہمیشہ خون سے رنگین نظر آتی تھی اور تیرے دامن و آستین پر اکثر خون کے چھینٹے نظر آتے تھے جو ہر ایک بجائے خود ایک خون ناحق کی داستان کی سرخی تھا۔ تو نے عورتوں کی عصمت دری کی' ان کے پردۂ ناموس میں رخنے ڈالے' انہیں بے آبرو کیا۔ بچوں کو یتیم کیا' خاندانوں کو برباد کیا' دوستوں پر تہمتیں تراشیں' بیسیوں روحوں کو خانماں آوارہ کیا۔ بہت سے سر تو نے کندھوں سے اتار دیئے' لوگوں پر جھوٹے الزام قائم کیے' امانتوں میں خیانت کی' دوسروں کے حصوں کو ہضم کرگیا اور ڈکار تک نہ لی۔ تو ہمیشہ اپنی مطلب برآری کے لیے کمینے وسائل استعمال کرتا تھا۔ فریب تو نے کیے' دغا تو نے کی' شاہی قانون تیرا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ انصاف کے رو سے تو ہمیشہ پہلو بچاتا رہا اور جب کبھی قابو میں آیا تو زر پرست قانون دان جن کی علت غائی انصاف کا خون کرنا ہے' تجھے اس کے عقوبت سے نجات دیتے رہے۔ یہ تیرے وہ مظالم ہیں جو تو نے اپنا ابنائے نوع کے ساتھ کیے۔ خدا کے ساتھ بھی تیرا برتاؤ اسی طرح کا تھا۔ دین میں تو نے رخنے ڈالے' مذہب کو تو نے خراب کیا' نبیوں کے وجود سے انکاری ہوا' کتب سماوی اور ان کی تنزیل میں تجھے کلام تھا اور پھر تیری آزادی یہاں تک پہنچی کہ خدا کی ذات سے بھی منکر ہوگیا۔ تف ہے تیری اس زندگی پر' لعنت ہے تیری اس حیات پر۔ تیرے کاتب اعمال تیرا سیاہ نامہ لکھتے تھک گئے مگر تو گناہوں کے ارتکاب سے ہرگز ہرگز نہیں تھکا:

تھک گئے نامہ اعمال کو لکھتے لکھتے
کیا فرشتوں کا برا حال بشر کرتے ہیں

اب تیرا شباب گزر چکا تھا اور تو نے طوعاً" و کرہاً" زمان پیری کو آہ سرد کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ اس ناخوش آیند مہمان کے وقت میں تو کچھ اور ہوگیا۔ تیری حرارت برودت سے بدل گئی' تیرے بال سفید ہوگئے' پھر دانتوں نے رفاقت چھوڑی' چہرے پر جھریاں پڑگئیں' بدن میں خون نہیں رہا' کمر خم ہوگئی' اعضا سست ہوگئے اور جسم میں

لرزہ آگیا۔ ان خوبیوں نے تیری صورت میں سنجیدگی پیدا کردی اور تیرا چہرہ نورانی معلوم دینے لگا:

شیخے ز قبیلہ معزز ریشے چو گل سفید یک گز

اور کون شخص تھا جو ایسی مرتاض اور پرہیز گاز شکل والے شخص کے دھوکے میں نہ آتا جس کی لمبی گز بھر داڑھی ہو اور ایک مقدس زاہد عابد کا لباس پہنتا ہو اور زبان پر ہر وقت دنیا کی بے ثباتی کا مضمون رکھتا ہو۔ لیکن تو اور تیرا دل خوب جانتے ہیں جیسا تو تھا۔ تیرے بالوں سے سیاہی چلی گئی تھی لیکن قلب اسی طرح سیاہ تھا:

ہوس از سرت یک سر مو نرفت سیاہی ز مو رفت و از رو نرفت

ارے او آقا کے سرکش غلام جس کی فرماں برادری سے تو نے سرتابی کی' جس کی حلقہ بگوشی سے تجھے ہمیشہ انکار رہا اور جس کی اطاعت کے لیے تو نے کبھی اپنے مغرور سر کو نہیں جھکایا' ذرا اپنی حالت کو دیکھ اور اس پر غور کر۔ گنہگاری تیری طبیعت ثانیہ بن گئی ہے' تیرا جسم خطاکاری کا پیکر بن گیا ہے اور تو جرائم کی زندہ مثال ہے۔ تو اللہ کے گھر سے بالکل پاک اور معصوم آیا تھا اور اب اس کی خدمت میں مظالم اور معصیت کی پوٹ لے کر جائے گا۔ سوچ! او ظالم سوچ! تو کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ تو نے تمام عمر گناہوں میں بسر کی اور اب بھی اسی راستے پر چل رہا ہے۔ ہائے تو بوڑھا ہوگیا مگر نیکی کا کبھی تجھے خیال تک نہیں آیا۔ اب تو مرنے والا ہے۔ لیکن انجام کا کچھ اندیشہ نہیں:

تن میں رعشہ پڑ گیا پیری سے گردن جھک گئی

اب تو جھک سجدے میں او سرکش خدا کے سامنے

اے ظالم! اے سیاہ کار! اپنی حالت زار پر رو' ایام رفتہ پر ہاتھ مل' گزشتہ عمر پر' جو برباد ہوگئی ہے اور نہیں لوٹنے کی' افسوس کر۔ مگر اے نادان اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ دن گزر گئے ہیں اور کبھی نہیں آئیں گے' وہ بہاریں اب تجھے خواب میں بھی نصیب نہ ہوں گی' وہ چاندنی راتیں واپس نہیں آئیں گی۔ آہ تو کیا یہ امید کر رہا ہے کہ تیرا وہ زمانہ لوٹ آئے گا جہاں تیرے مرنے والے باپ نے تجھے کھڑا کیا تھا۔ اوہ یہ

ناممکن ہے۔ تو رات دن ان لوگوں کو' جنہوں نے زندگی کے دروازے میں تیرے ساتھ یا تیرے بعد قدم رکھا تھا' اس جہان سے کوچ کرتا ہوا دیکھتا ہے مگر ان میں کوئی بھی ایسا بدقسمت نظر نہیں آتا جیسا تو ہے۔ ان میں ایک بھی ایسی مایوس اور غمگین صورت نہیں جو تیرا ہم مشرب بن سکے۔ تو ایام طفلی کو یاد کر رہا ہے اور رو رہا ہے لیکن وہ وقت چلا گیا جب تجھے رونا چاہیے تھا۔ اب تیری حسرت بے سود ہے' تیری ندامت بے فائدہ ہے۔ وہ سہانی چاندنی راتیں چلی گئی ہیں اور وہ بہار کی فصلیں گزر گئیں۔

اے حسرت نصیب غم اندوز شخص! اب تیرا وہ آخری دن ہے جس کے بعد تو دنیا کے روشن آفتاب کو قیامت تک نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کے مرغان سحر کی دل فریب زمزمہ پیرائی پھر نہیں سن سکے گا۔ اور تو اپنے اہل و عیال کو اسی طرح چھوڑ جائے گا جس طرح تجھے تیرا باپ تنہا چھوڑ گیا تھا۔ اے خدا کے گنہگار بندے اس وقت ہزاروں آفتیں ہیں جو تیرے مجروح دل کو ستا رہی ہیں۔ کبھی اس بھولی ہوئی اور مدت سے بچھڑی ہوئی ماں کی دھندلی تصویر تیری نگاہوں میں کھڑی ہوجاتی ہے' جس کے مرجھائے ہوئے چہرے سے سرزنش کے آثار ظاہر ہیں' جو تجھے ملامت کرنے کے لیے لب کھولنا چاہتی ہے۔ ادھر بوڑھے باپ کا خیال آتا ہے جس کے پاس تو آسمان پر جارہا ہے۔ آج تجھے اس کی فراموش شدہ نصیحتیں یاد آرہی ہیں' جن پر تو نے عمل نہیں کیا اور جب تو اس سے ملے گا تو وہ غصے کے ساتھ تیری طرف سے منہ پھیر لے گا۔ اس کی وہ نگاہیں جو تیرے چہرے پر پڑیں گی' غضب آلودہ ہوں گی۔ وہاں برسوں کی بچھڑی ہوئی ماں بھی ملے گی لیکن افسردہ خاطری کے ساتھ تیرا استقبال کرے گی۔ ہائے تو اس وقت کیسا پشیمان ہے' ان نیکیوں کے نہ کرنے سے جو تیرے امکان میں تھیں۔ اب تجھے وہ خطائیں یاد آرہی ہیں' جو تو نے اپنی عمر کے حصے میں کیں' وہ ناقابل معافی جرائم یاد آرہے ہیں' جن کا تو راہ حیات میں مرتکب ہوا۔ اے گمراہ شخص اب تو بستر مرگ پر پڑا ہے اور تجھ پر جان کندنی کی حالت طاری ہوگئی ہے' پیغام اجل آپہنچا ہے اور ملک الموت نے تیرا سر آغوش میں لے لیا ہے۔ اور یہ تیرا آخری منٹ ہے' جس میں

تو چند سانس لے سکتا ہے۔ ہائے اس وقت تو کس قدر بے تاب ہے اور کتنا بے چین ہے اور افسوس کہ اس حسرت و غم میں وہ سانس بھی ضائع ہو گئے۔ اب ایک سانس باقی ہے اور صرف ایک سانس۔ اے قابل رحم غافل بوڑھے ابھی تیرے لیے وقت ہے' ابھی امید ہے۔ اٹھ اور اس پاک خدا کی درگاہ میں گردن نیاز جھکادے' اٹھ اور اس بے نیاز سے معافی مانگ۔ دو آنسو اپنی شرمسار آنکھوں سے نکال اور اپنے گناہوں کے دفتر کو دھو ڈال۔ اے شرمسار بندے تجھے مبارک ہو کہ تو بچ گیا ہے' عذاب کے فرشتوں اور دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ سے بہت دور نکل گیا ہے۔ تجھے خوش خبری ہو کہ تو معاف کردیا گیا ہے اور تجھے بشارت ہو کہ تو آزاد ہے' بہشت اور اس کی حوریں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔ اب تو آرام سے جان دے اور یہ شعر پڑھتا ہوا چلا جا:

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہست می رود بہ بہشت

حواشی

(۱) "مخزن" میں اس مقام پر "جھریاں" درج ہے۔ (مرتب)

□□□

چند لمحے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں

انگلستان میں ہندوستان کی غریب الوطن یادگاریں اور ان کی سرگزشت

(از ماہنامہ "مخزن" لاہور بابت جنوری ۱۹۰۶ء)

لنڈن کا وکٹوریہ البرٹ میوزیم بارہ ایکڑ زمین پر واقع ہے۔ یہ عمارت اولاً سنہ ۱۸۵۰ء کی نمائش کے لیے تیار ہوئی تھی، جس پر دولت برطانیہ نے ساٹھ ہزار پونڈ یعنی نو لاکھ روپے صرف کیے۔ سنہ ۱۸۵۵ء میں اس پر ایک اور چوبی و آہنی عمارت مستزاد ہوئی۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں اس کا نام ساؤتھ کینزنگٹن میوزیم رکھا گیا۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں اس عمارت میں اور اصلاح ہوئی اور اس اصلاح شدہ عمارت کا نام تاج دار بیوی اور بے تاج شوہر کی یادگار میں وکٹوریہ البرٹ میوزیم رکھا گیا۔

اس عمارت میں قدیم و جدید فنون و علوم کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جو دنیا کی ممتاز قوموں کے تمدن اور تمدن کی ترقی کی تاریخ ظاہر کر رہا ہے۔ مشرقی اقوام کا تمدن ایک علیحدہ عمارت میں دکھایا گیا ہے۔ جہاں ہندی، ایرانی، شامی، عربی، چینی اور جاپانی صنائع کے علیحدہ علیحدہ کمرے موجود ہیں۔ اس عمارت کے قریباً تیس کمرے ہندوستان کی صنعت و حرفت سے پر ہیں۔ باقی کمرے ممالک متذکرہ بالا کی مصنوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اس وقت میوزیم کے دوسرے حصوں سے بحث نہیں کرتا۔ صرف اسی حصہ عمارت کی بابت گفتگو کرتا ہوں جس سے ہندوستان کو تعلق ہے۔

میوزیم کے اس حصے کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی سے علاقہ رکھتی ہے۔ کمپنی کی وفات

پر اس کا ورثہ انڈیا آفس کو پہنچا جس میں انڈین میوزیم بھی شامل تھا۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں یہ میوزیم ساؤتھ کینسنگٹن میوزیم میں ملحق کردیا گیا۔ اس عمارت کے دروازے پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے "انڈین سیکشن"۔ غیر قوم اس سے متاثر ہو یا نہ ہو لیکن ایک ہندوستانی کو یہ الفاظ مغموم یا مغرور ضرور کریں گے۔ دروازے پر ایک گورا کالی وردی میں ٹہلتا ہوا نظر آئے گا۔ اگر آپ پگڑی باندھے ہوئے ہیں تو "انڈین پرنس" سمجھ کر سلامی دے گا اور آپ کے لیے راستہ چھوڑ دے گا۔ دروازے میں گھستے ہی جے پور کے ہوا محل نظر آئیں گے جن کی نقل پیتل کی ہے۔ اب آپ ایک چوبی چھت دیکھیں گے جو کوچین کے کسی مندر کی ہے اور راجہ رام چندر جی کی شادی کا مرقع پیش کر رہی ہے۔

آگے چل کر ایک چوبیں برآمدہ ہے جس میں دو دروازے جھانکتے ہیں۔ دروازوں کے دو جھروکے ہیں۔ لکڑی پر کام بھدا ہے۔ یہ حصہ عمارت شاہ سام بہادر کا محل ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ تین صدی پیشتر سے متعلق ہے۔ اس برآمدے کی خرید میں دو سو پونڈ صرف ہوئے۔ پاس ہی خان دوران خان کی قبر کی جالی دار دیوار ہے جو گوالیار سے لی گئی ہے۔ پھر سید مراد شاہ کے مزار واقع ملتان کا نمونہ ہے جس پر مرحوم کی تاریخ بھی کندہ ہے۔

پھر سانچی ٹوپ واقع ․ بھیلن بھوپال (ممالک متوسط) کی نقل ہے۔ یہ عمارت ہندوستان میں بدھ مت کے عروج کے زمانے کی یادگار ہے اور اس کو ہندوستان کی نہایت ہی قدیم عمارت کہا جاسکتا ہے۔ عمارت کی صورت ایک بڑے گنبد کے مشابہہ ہے جس کے گرد احاطہ کھنچا ہوا ہے۔ احاطے میں چار دروازے ہیں۔ ان میں ایک دروازہ بجنسہٖ میوزیم کے بالائی حصے میں رکھا ہوا ہے۔ گنبد کی تاریخ تعمیر پانسو سال قبل مسیح ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کے بانی کا نام نامعلوم ہے۔ دو سو ساٹھ برس قبل مسیح راجہ اشوکا نے اس کو سنگ سرخ سے تعمیر کیا اور سینتیس برس قبل مسیح سری سنگارنی (ماگدھ دیس) نے اس کے دروازے تعمیر کیے۔

دو خانوں میں بدھ کی ثابت اور شکستہ مجلسیں ہیں۔ بعض میں بدھ جی شاگردوں میں مشغول ہیں اور تعلیم دے رہے ہیں۔ بعض میں یاد الٰہی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ بعض میں قوال سے' جس کے ہاتھ میں ساز بھی ہے' وجدانی بھجن اور گیت سن رہے ہیں۔ یہ مجلس حال ہی میں ملک یوسف زئی سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان کی تاریخ نامعلوم ہے۔ قیاساً" کہا جاتا ہے کہ یہ سمت بکرمی سے بھی نہایت قدیم ہیں۔ یہیں اجمیر کے قدیم بدھ مندر کے شکستہ بت اور ستون موجود ہیں جن کی تاریخ دوسری اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔ یہاں قطبی عمارات (قطب الدین ایبک) کے بھی چند ستون نظر آتے ہیں۔ قریب ہی شمسی عمارات (شمس الدین التمش) کے کچھ باقیات ہیں جن پر کلام مجید کی آیات کندہ ہیں۔ گوڑ واقع بنگال سے شیرشاہی عمارات کے بقیے ہیں جو پندرھویں صدی عیسوی کا نمونہ ہیں۔ فتح پور سیکری سے تخت اکبری بجنسہ یہاں رکھا ہوا ہے۔ اکبر کی قبر واقع سکندرہ کے نمونے اور آرام بانو کے مزار کی نقل بھی موجود ہے۔ تاج گنج کی کئی نقلیں ہیں۔ امرتسر کے سنہری مندر کی نقل بھی یہاں نظر آتی ہے۔ دو کمرے یہاں ختم ہوتے ہیں۔

تیسرے کمرے میں ہندوستان کے پیشہ ور' صنعت پیشہ اور تجارت پیشہ' دکھائے ہیں ان کی اوقات زندگی' مختلف رسمیں' ہولی' درگا پوجا اور محرم وغیرہ وغیرہ دکھائے ہیں۔ قدیم و جدید سواریوں کے نمونے' پیشہ وروں کے اوزار اور موسیقی کے ساز قدیم و جدید جمع ہیں۔

چوتھے کمرے میں ہندوستان کی ساخت کا کپڑا نظر آتا ہے۔ چھینٹیں' بیلے' مندیل' زردوزی' گوٹا اور سوئی کے کام کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ یہیں ہندوستان کی قوموں کا لباس رکھا گیا ہے۔

پانچویں کمرے میں لیس کا کام' لکڑی کا کام' ہاتھی دانت پر کام' سینگ کا کام' چمڑے کا کام غرض سب صنعتوں کے نمونے رکھے ہیں۔ میز' کرسی' پلنگ' صندوق' زین' پالان وغیرہ وغیرہ سب مشہور مقامات کا سامان موجود ہے۔ یہیں چند خانوں میں

ہندوستان کے مختلف اضلاع کی پگڑیاں اور ٹوپیاں رکھی ہوئی ہیں۔

صحن عمارت یہاں ختم ہوتا ہے۔ زینے کا راستہ لیجئے اور دیواروں پر لٹکتی ہوئی تصویروں پر بھی نظر ڈالتے چلیے جو ہندوستان کے مختلف مقامات کے مناظر پیش کر رہی ہیں۔ زینے کے ایک حصے میں دو الماریاں دیوار کے برابر کھڑی ہیں جن میں ہتھیار بند ہیں۔ ایک تلوار پر جو سلاح خانہ الور سے تعلق رکھتی ہے، یہ شعر آبِ زر سے لکھا ہوا ہے:

روزی کہ ہیچ کس نبود داد رس مرا
یا مرتضیٰ علی توئی فریاد رس مرا

پہلے کمرے میں تانبے، پیتل، کانسی کے برتن دکھائے ہیں اور دیواروں پر ایرانی، افغانی، ترکستانی اور ہندوستانی قالین لٹک رہے ہیں۔ دوسرے کمرے میں ہندوستان کا مروجہ حال و قدیم زیور طلائی و نقرئی دکھایا گیا ہے۔ دو تین خانوں میں شاہ برما کے خزانے کی جڑاؤ چیزیں رکھی ہیں جو انگریزوں نے سنہ ۱۸۸۵ء میں مانڈلے کے محل سے لی تھیں جن میں کچھ نقرئی اور طلائی برتن بھی ہیں۔

تیسرے کمرے میں ہندوستان کے مختلف اضلاع اور قوموں کے ہتھیار دکھائے ہیں۔ پہلے خانے میں آسام کے ہتھیار ہیں جو زیادہ بھدے اور ناتراشیدہ ہیں۔ پھر نیپال کے ہتھیار ہیں جو ان سے بہتر ہیں۔ مرہٹوں کے ہتھیار ہیں، راجپوتوں کے، سندھ کے، پنجاب کے اور پٹھانوں کے۔ بناوٹ کے لحاظ سے یہ ہتھیار سب ایک ہیں کیونکہ کسی خاص ہتھیار سے ہندوستان میں کسی خاص قوم کو علاقہ نہیں۔ مرہٹوں کا بچھوا اور پٹھانوں کا چھرا مشہور ہے لیکن اور قوموں نے بھی اس کو استعمال کیا ہے۔ انگریزوں نے ان ہتھیاروں کی تقسیم جداگانہ یوں کی کہ جس قوم سے جو ہتھیار ان کے ہاتھ لگے وہ ہتھیار اسی قوم کے خانے میں دکھا دیئے۔ اسی خانے میں دو تین توپیں پڑی ہوئی ہیں اور خود و زرہ بکتر رکھے ہوئے ہیں۔

چوتھے کمرے میں مٹی کے برتن پیالے اور صراحیاں ہیں۔ دو خانوں میں کانچ کے

برتن ہیں۔ دو تین خانوں میں حال کی مہم تبت کی چند یادگاریں ہیں۔

ایک خانے میں قدیم نگینے رکھے ہوئے ہیں۔ ان نگینوں کا رواج زیادہ تر ایران، یونان، شام اور بابل میں تھا۔ یہ مجموعہ جو ہندوستان سے برآمد ہوا ہے اس میں ایرانیوں کے نگینے بھی ہیں اور یونانیوں اور رومیوں کے بھی اور چند ہندوستانیوں کے بھی۔ ان نگینوں کی عجیب عجیب طرح کی شکلیں ہیں۔ بعض پر پرند کھدے ہیں، بعض پر چوپائے کندہ ہیں اور بعض پر انسانی شکلیں ہیں۔ ان کی تاریخ نگینوں کی طرح خاموش ہے اور ہم نہیں جانتے کہ کس کس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں:

خزاں سے کون یہ پوچھے کہ کیا ہوئے آخر
وہ پھول لائی تھی اگلے برس جو فصل بہار

ہمارے ملکی ناموروں کی یہاں بہت سی یادگاریں ہیں، جن کی بابت میرے ہم وطنوں نے بہت کم سنا ہوگا۔ یوں تو یہ میوزیم اور اس کی ہر ایک چیز بجائے خود ایک داستان اور از یاد رفتہ اسلاف کی یادگار ہے۔ لیکن یہ نہایت مشکل ہے کہ ہم ان کے موجدوں اور بانیوں کی تاریخ معلوم کر سکیں۔ البتہ چند چیزیں ہیں جو اپنے بانیوں کے نام روشن کر رہی ہیں اور ان کو ان اوراق پر ہم درج کرنا چاہتے ہیں۔ علمی یادگاروں میں تو صرف اکبر نامے کے چند باتصویر اوراق ہیں جو ابوالفضل کا نام زندہ کر رہے ہیں، جن میں زیادہ تر نقاشی سے کام لیا گیا ہے۔ ان اوراق کے مصور اکثر ہندو ہیں۔ بعض مقام پر مسلمان نام بھی پائے جاتے ہیں لیکن مصوری میں ان کی بدشوقی تو ان کی دینی تعلیم اور قومی شناخت ہے۔ صنعت و حرفت میں جو ہمارے ملک میں سربرآوردہ گزرے ہیں ان کی شہرت ان کے مٹنے پر غائب ہوگئی یا یہ کہئے کہ ان کی مصنوعات موجود ہیں لیکن وہ نام، جنھوں نے یہ پیاری اور خوشنما چیزیں ایجاد کیں، غائب ہیں۔ اب رہے وہ نامور، جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں کارہائے نمایاں کیے اور اپنے اپنے زمانے میں شاہی اور خدائی اختیارات پائے، ان مرحوموں کی تمام تو نہیں پر چند نشانیاں باقی ہیں۔ انگریز اٹھائی گیرے تو پرلے درجے کے ہیں اور اصل بھی یہ ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے

گھر مندروں کی طرح آراستہ بجائے خود ایک عجائب خانے ہیں۔ کوئی بدنصیب گھر ہوگا جس میں ہندوستان کی ایک آدھ چیز نئی پرانی نظر نہ آئے۔ جس زمانے سے ان کو ہندوستان سے تعلق ہوا جب سے آج تک انہوں نے کیا کچھ نہ لیا ہوگا۔ اس کا حساب تو وہ جانیں اور ان کا خدا لیکن عام تفرج گاہوں میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ بہت ہی کم ہے۔ کچھ چیزیں ونڈسر کاسل میں ہیں، کچھ قصر بکنگھم میں، کچھ برٹش میوزیم میں، کچھ ٹاور میں، کچھ انڈیا آفس میں اور چند یہاں ہیں۔ ٹاور میں ہمارے غریب الوطن کوہ نور کی نقل رکھی ہوئی ہے اور یہیں سیوا جی مرہٹہ کا وہ جاں ستاں بچھوا رکھا ہے جس نے افضل خاں کی جان لی تھی۔ اس میوزیم میں جو چیزیں تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے ایک کرسی سنگ مرمر کی ہے۔ یہ کرسی سراج الدین محمد بہادر شاہ نے جنرل سرجارج بروک کو بخشی تھی۔ ایک مقام پر اسی بدنصیب بادشاہ کے دو فرمان لٹک رہے ہیں جو زر افشاں کاغذ پر ہیں۔ اگر ایک فرمان کی نقل بھی درج کردی جائے تو خالی از لطف نہیں:

"درین وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ بہ مقتضای دفور مراحم خاقانی و تفضیلات خسروانی کہ نمونہ افضال یزدانی است فدوی خاص لائق عنایت والاحسان سیمن فریزر را بہ خطاب امین الدولہ بہادر دلیر جنگ بین الاعیان والارکان و فی الامثال والاقتران سرفراز و ممتاز فرمودیم۔ باید کہ فرزندان نامدار کامگار والاتبار و وزرای ذوالاقتدار و امرای عالی مقدار و حکام ممالک فدوی خاص معزالیہ را از جانب فیض مآب پادشاهی بہ شمول این خطاب برگزیدہ و القاب پسندیدہ معزز و مباهی دانستہ انظار عنایت مابدولت را باحوال فرخندہ مآل بہادر معزالیہ یوما" فیوما" متزاید و بی نہایت دانند تاریخ بست و پنجم ربیع الثانی سال سی ام از جلوس ابد مانوس معلیٰ زیب تحریر یافت۔"

اس فرمان پر شاہ موصوف کی مہر ہے۔ مہر کے حاشیے پر گزشتہ سلاطین مغلیہ کے

نام تحریر ہیں۔ برابر ہی خط طغرا میں "ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی" لکھا ہوا ہے۔

یہاں ایک مسند پوش بھی ہے۔ اس کی ولادت اگرچہ ترکستان ہے لیکن انقلاب زمانہ اسے ہندوستان اور ہندوستان سے یہاں لایا۔ یہ مسند پوش امیر بخارا نے امیر شیر علی خان امیر افغانستان کو "تحفتہ" بھیجا تھا۔ ان سے انگریزوں کے ہاتھ لگا۔ سرخ بانات پر زر دوزی کا کام ہے۔

سابق مہاراجہ بڑودہ کا کوٹ' پتلون اور ہیٹ بھی یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ پتلون سیاہ کشمیرے کی ہے جس پر دوہری روپہلی لیس ٹکی ہوئی ہے۔ الپاکا کا سیاہ کوٹ ہے۔ کالر' کفوں' کندھوں اور حاشیے پر سنہرا روپہلا کام ہوا ہے۔ ہیٹ تمام زر نگار ہے۔ چندوے پر سرخ و سفید پر پھیلے ہوئے ہیں۔

پگڑیوں اور ٹوپیوں کی قطار میں ایک سر پیچ مرصع ہے جس پر کلغی اور مالا پڑی ہوئی ہے۔ اس سر پیچ کا علاقہ مہاراجہ مان سنگھ مہاراجہ جودھ پور سے ہے۔ اسی موقع پر ایک ٹوپی بھی قابل ذکر ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اس کا علاقہ وزیر شاہ اودھ سے ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ اپنی طرز میں اکیلی ہے۔ حضرات لکھنؤ تراش خراش اور ایجاد میں تو فرد ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک ایجاد ہے اور بالکل عجیب ہے۔ پہلے ایک بل دار پگڑی کا تصور کیجئے۔ پگڑی کی چھت پر ایک چوگوشہ تاج نما ٹوپی مستزاد کیجئے۔ ایسی پگڑی یا ٹوپی کے لیے سر بھی خاص قسم کا تلاش کرنا ہوگا کیونکہ ما و شما کے سروں پر تو وہ بہت ہی بڑی ہے لیکن وزیر شاہ اودھ تھے۔ شاید سر بھی "شملہ .بمقدار علم" معمولی سروں سے بڑا ہو مگر افسوس ہے کہ اس ایجاد کو فروغ کا تاج نہیں ملا۔

مہاراجہ ہلکر کی تلوار بھی قابل تحریر ہے۔ یہ تلوار مہد پور کے واقعے کی یادگار ہے جس میں انگریز فتح یاب رہے اور مہاراجہ ہلکر کو شکست ہوئی۔ جنگ کے خاتمے پر مغلوب ہونے کی علامت میں یہ تلوار مہاراجہ موصوف نے انگریزی سپہ سالار کو دی۔ گورنمنٹ نے سرجان ملکم کو "تحفتہ" دی۔ ان کے متعلقین سے ایک سو پچاس پونڈ

میں میوزیم کے لیے خریدی گئی۔ قبضے پر معمولی سنہری کام ہے اور لعل و زمرد جڑے ہوئے ہیں۔ میان قرمزی مخمل کا ہے۔

رنجیت سنگھ کی ایک آرام کرسی ہے۔ تمام کرسی پر سونے کا پانی پھرا ہوا ہے۔ اندر کی طرف گلابی مخمل کے تکیے بچھے ہوئے ہیں۔ امیر افغانستان کی بھی ایک کرسی یہاں رکھی ہوئی ہے۔ یہ کرسی اکتوبر سنہ ۱۸۷۹ء میں امیر کے محل واقع بالاحصار سے انگریزوں کے ہاتھ لگی۔ کرنل ٹی-ڈی-بیکر نے شاہ ایڈورڈ کو ان کے ولی عہد ہونے کے زمانے میں نذر کی۔ شاہ موصوف نے میوزیم میں مستعار بھیج دی۔ کرسی پر بادامی ہلکا رنگ ہے۔ دونوں بازوؤں پر دو شیر تراشے ہوئے ہیں۔ نشست پر ہلکے سرخ رنگ کا کپڑا منڈھا ہوا ہے۔

شاہ شجاع کے آہنی دستانے بھی ہتھیاروں کے کمرے میں نظر آتے ہیں۔ دستانوں پر چاندی چڑھی ہوئی ہے اور چاندی پر سونے کے پانی سے عربی میں اسمائے الٰہی اور عربی جملے تحریر ہیں۔ پونچے کی طرف بسم اللہ تحریر ہے۔ کلائی پر یا مظہرالعجائب اور کہنی کے قریب لافتیٰ الاعلی لا سیف الا ذوالفقار مرقوم ہے۔ حاشیے پر پوری آیۃ الکرسی لکھی ہوئی ہے۔

نواب آصف الدولہ بہادر کی توپ بھی یہاں رکھی ہے۔ یہ توپ غالباً عذر لکھنؤ میں انگریزوں کے ہاتھ لگی ہوگی۔ اس توپ پر یہ جملہ تحریر ہے:

"سرکار آصف الدولہ بہادر وزیر الممالک رستم ہند۔"

امیر ایوب خاں سابق والی افغانستان کا ایک جھنڈا بھی یہاں لٹک رہا ہے۔ پرچم کے وسط میں پوری بسم اللہ خط طغرا میں تحریر ہے۔ یہ جھنڈا انگریزوں نے قندھار کے مقام پر لیا تھا۔

زنانہ پوشاکوں میں ایک پوشاک لکھنؤ کی آخری بیگم کی نظر آتی ہے۔ جس میں غرارہ دار زنانہ پاجامہ، دوپٹہ اور محرم شامل ہے۔ دوپٹہ سبز ریشمی ململ کا ہے جس پر گوٹے ٹپے سے بیل بوٹے کاڑھے گئے ہیں۔ کوریں لیس دار ہیں۔ گو کھرو ٹکے ہیں۔

پاجامہ سرخ اطلس کا گھیر دار ہے۔ علیٰ ہذا محرم ہے۔ پوشاک کا اصلی رنگ مرجھا چکا ہے۔ قیاساً" کہا جاسکتا ہے کہ وہ استعمال شدہ ہے۔ انقلاب زمانہ دیکھئے' بیگم لکھنؤ کی پوشاک اور لندن میں۔

برہما کی رانی کی خواب گاہ کا پلنگ بھی قابل لحاظ ہے۔ یہ پلنگ انگریزی کوچ سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ پائے ایک بالشت اونچے ہیں۔ پایوں کا وہ حصہ جو زمین کو چھوتا ہے پرند کے پنجوں کے مشابہ ہے۔ پٹیوں اور پایوں پر سرخ و سفید اور سبز شیشے بڑی صفائی سے جڑے ہوئے ہیں۔ سونے کے پانی میں یہ ٹکڑے بھی عجیب بہار دیتے ہیں۔ یہ وہ پلنگ ہے جس پر شاہ برہما کی رانی سوتی تھی۔

سلطان ٹیپو کی یہاں کئی یادگاریں ہیں۔ کوئی چیز اس قدر عبرت انگیز نہیں ہوگی جس قدر یہ چیزیں اور جب ہم اس کے مقصد زندگی کا خیال بھی ذہن میں لاتے ہیں تو یہ چیزیں اور بھی دل کو گداز کرتی ہیں۔ یوں تو اس کا مزار ہندوستان میں ہے لیکن یہ چیزیں بھی مزار سے کچھ کم نہیں۔ یا یہ کہیے وہاں ایک مزار ہے اور یہاں کئی مزار ہیں۔ اس مزار میں اس کا جسم دفن ہے اور ان مزاروں میں وہ چیزیں دفن ہیں جو زندگی میں اس کے جزو بدن رہ چکی ہیں۔ اصلی مزار اس قدر پائیدار نہ ہوگا جس قدر یہ مزار پائیدار ہیں:

رہے گا کوئی تو تیغ ستم کی یادگاروں میں
مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

ایک صندوق میں اس کی شمشیر ہے۔ میان گم ہے۔ یہ تلوار ایرانی ساخت کی ہے۔ بالکل ہلالی وضع ہے۔ قبضے پر سونا چڑھا ہوا ہے' جس پر دمشقی کام ہے' جو ہندی ساخت کی تلواروں میں بہت نایاب ہے۔ قبضہ اور تلوار دونوں پرانے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ قبضے کا سونا اور بیل بوٹے دونوں مٹ چلے ہیں۔ قیاساً" کہا جاسکتا ہے کہ یہ تلوار ٹیپو کے زمانے سے بھی پرانی ہے۔ تلوار پر سنہری حروف میں لکھا ہے "ٹیپو سلطان" یہ کام نیا ہے اور قبضے کے کام سے بعد کا۔ یہ وہ تلوار ہے جس کے زور سے

سلطان ٹیپو ہندوستان کے وہ مردہ قویٰ زندہ کرنا چاہتا تھا جن کو حکمرانی کہا جاسکتا ہے اور کیا عجب ہے یہی تلوار اس وقت اس کے ہاتھ میں ہو جب کہ وہ سرنگا پٹم کے دروازے پر زخموں سے چور نقش بے جان ہو کر گرا۔ میان کا گم ہونا ہمارے خیال کی تائید کر رہا ہے اور یہ نفی بھی ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اس کے سلاح خانے سے انگریزوں کے ہاتھ نہیں لگی۔

ایک صندوق میں ٹیپو کا آہنی خود ہے' جس کے کناروں پر سونے کی بیل پھری ہے۔ لوہے کا بینی پناہ ہے جس کو کنڈے کے ذریعے اتارا چڑھایا جاسکتا ہے۔ بینی پناہ کے دونوں بازوؤں میں دو نلیاں ہیں جن میں دو زرتار طرے اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ خود کے وسط میں ایک شاخ نکلی ہے۔ دامن پر لوہے کی چادر جھالر کی طرح لٹک رہی ہے' جس کو کڑیوں کے ذریعے سے خود کے ساتھ پیوست کیا ہے۔ یہ چادر چہرے کی طرف چار انگلی چوڑی ہے لیکن پشت اور بازوؤں پر اس قدر چوڑی ہے کہ گردن اور کندھوں کی حفاظت بخوبی ہوسکے۔ یہ خود ایرانی خودوں کی قطع سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ کام اس پر اس قدر عمدہ اور خوش نما نہیں کہ اسلامی خودوں میں بہتر کہلایا جاسکے۔ اسی میوزیم میں اس سے اچھے اچھے خود ہیں لیکن ان کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ برٹش میوزیم میں شاہ عباس صفوی کا ایک خود ہے جو تمام خودوں سے بہتر اور اعلیٰ ہے۔

ایک مقام پر ٹیپو کا ٹوپ ہے۔ چمڑے کے آستر پر ایک ایک انچ موٹی روئی کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ جس پر چھینٹ کا آستر ہے۔ اس پر سبز اطلس منڈھی ہے۔ سبز مخمل کی آدھ آدھ انگل چوڑی گوٹ ہے۔ پہننے پر یہ ٹوپ آدھی پیشانی ڈھانپ لیتا ہے۔ گردن اور کندھوں کی طرف سے اس قدر نیچا ہے کہ گردن اور کندھوں کا بچاؤ ہوسکے۔ ٹوپ کے اندر فارسی میں کچھ تحریر ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ انگریزی میں اس قدر بیان کیا ہے کہ یہ چیز زمزم کے مقدس پانی سے دھوئی گئی ہے اس لیے کوئی حربہ اثر نہیں کرے گا۔ اس عقیدے پر آج کی دنیا ہنسے گی لیکن یہ یاد رہے کہ ٹیپو کا زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ مسلمان مذہب کی روشنی میں آنکھ کھولتے تھے اور اسی

روشنی میں آنکھ بند کرتے تھے۔

ایک خانے میں ٹیپو کے دستانے ہیں۔ کہنی سے لے کر کلائی کے قریب تک یک طرفی حفاظت کا کام دیتے ہیں۔ کلائی پر کفوں کی طرح دوہرے ہیں' دو طرفہ حفاظت مقصود ہے' جو کڑیوں کے ذریعے سے کھولے اور بند کیے جاسکتے ہیں۔ اندر کی طرف تسمے اور گھنڈیاں ہیں جن کو پہننے پر کس دیا جاتا تھا۔ ان دستانوں پر سونے کا کام ہوا ہے اور دمشقی بیل بوٹے ہیں۔

اسی خانے میں ٹیپو کا سینہ بند ہے جس سے سینے اور پشت کی حفاظت مقصود ہے۔ سینے کی طرف سے کھلا ہوا ہے اور بٹنوں کی بجائے کڑیاں لگی ہوئی ہیں جو ریشمی تسمے کے ذریعے کس دی جاتی ہوں گی۔ یہ سینہ بند بھی ٹوپ کی طرح ایک انچ موٹا ہے۔ اندر شاید چمڑا ہو باہر کا استر سبز اطلس کا ہے جو پرزے پرزے ہو رہا ہے۔

ٹیپو کا زین پوش: یہ زین پوش قرمزی مخمل کا ہے۔ چار فٹ آٹھ انچ لمبا اور چار فٹ ساڑھے آٹھ انچ چوڑا ہے۔ مخمل پر نہایت اعلیٰ درجے کا زری کا کام ہوا ہے۔ یہ کام کسی استاد کے ہاتھ کا ہے۔ تمام میوزیم میں اس قدر صفائی کا نمونہ نہیں ملتا۔ بیل بوٹے اپنی وضع میں اعلیٰ درجے کے ہیں اور جو نزاکت اور ستھرا پن کاریگر نے اس کام میں دکھایا ہے وہ لاجواب ہے۔ میوزیم نے چالیس پونڈ میں اس زین پوش کو خریدا ہے۔

ایک چھوٹی سی پیتل کی توپ ہے جو ڈیڑھ گز لمبی ہے۔ توپ کے منہ پر گینڈے کی شکل بنی ہوئی ہے۔ یہ توپ سرنگا پٹم سے انگریزوں کے ہاتھ لگی یہ توپ بھی سلطان ممدوح کی یادگار ہے۔

یہاں عجیب قسم کا ایک ساز ہے جو اپنی وضع میں اکیلا ہے۔ اس ارگن کی یہ شکل ہے کہ لکڑی کے ڈیڑھ گز لمبے اور پون گز چوڑے تختے پر ایک انگریز چت لیٹا ہے جس پر ایک شیر سوار ہے۔ شیر کی دونوں داڑھیں انگریز کی گردن میں گڑی ہوئی ہیں۔ اگلے پنجے سینے میں پیوست ہیں اور پچھلے پنجے زانوؤں میں۔ شیر کا جسم اندر سے خالی ہے۔ اس خالی مقام میں ایک کل رکھی ہوئی ہے۔ اس کل میں ہارمونیم کی طرح سے برابر

قطار میں اٹھارہ پردے ہیں۔ پردوں پر تین تین انگل اونچی انگل انگل موٹی اٹھارہ نلیاں دوہری قطار میں ہیں جن پر تانبے کا دو انچ چوڑا تار پردوں کے متوازی لگایا گیا ہے۔ پردوں کے اختتام پر ایک دندانے دار چکر ہے جس کا تعلق ایک آہنی تار کے ذریعے باہر کے دستے سے ہے۔ دستہ شیر کے بازو پر باہر کی طرف بنا ہوا ہے۔ دستے کو گردش دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر کا چکر حرکت میں آتا ہے اور اس کا اثر نلیوں اور پردوں پر پہنچتا ہے۔ شیر کی دم پر دو مروڑیاں ہیں جن کے مروڑنے سے اندر کا تار گھٹتا بڑھتا ہے۔ شیر کا جسم تختیوں کے ذریعے سے ڈھکا ہوا ہے۔ تختیاں اس قسم کی ہیں کہ ان کو کھولا اور بند کیا جاسکتا ہے۔ یہ ساز سلطان ٹیپو کی تفریح طبع کے لیے ایجاد کیا گیا تھا۔ عیار موجد نے یہ کمال دکھایا ہے کہ اپنی اختراع کے ساتھ سلطان کی ادا شناسی اور مزاج دانی کو بھی نباہ دیا ہے۔ یہ آلہ ہم کہہ سکتے ہیں' کسی ہندوستانی دماغ کا نتیجہ تھا۔ اس کو یورپین مصنوعات سے کوئی مشابہت نہیں۔ پردوں کا ڈھنگ ممکن ہے کہ ہارمونیم کے پردوں سے اڑایا گیا ہو' اگر یہ ممکن ہے کہ اس وقت ہارمونیم ہندوستان میں رواج پاگیا تھا۔ ہارمونیم کے پردے طویل مربع ہوتے ہیں لیکن یہ پردے بالکل مدور ہیں۔ پھر اٹھارہ پردوں کا ہونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سوال ہم ماہران فن موسیقی کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایرانی موسیقی کا دوازدہ پردہ اور شش آہنگ کا مجموعہ ہو۔ سلطان ٹیپو کی ایرانی تمدن سے محبت اس کے ہر مذاق سے پائی جاتی ہے۔

اب ہم یہاں ایک تصویر کا ذکر کرتے ہیں جو اسی میوزیم کے کسی مقام پر لٹک رہی ہے۔ یہ تصویر ایک پرانے فیشن دار بزرگوار کی ہے۔ نئی نسلیں سراپائے مقدس دیکھ کر ہنسیں گی لیکن یہ ان کی زیادتی ہوگی۔ بزرگ ہر حال میں واجب التعظیم ہیں۔ ایک زرتار مسند پر ایک پرانے بانکے بیٹھے ہیں۔ نشست کی قطع دوزانو ہے جو مغلیہ دربار کی خصوصیات سے ہے۔ سر پر تاج نما دندانہ دار ٹوپی ہے اس پر ہلکا سا پٹہ لپٹا ہوا ہے' جس پر موتیوں کی مالا بہار دکھا رہی ہے۔ پیشانی پر زرتار طرہ اڑیسا ہوا ہے۔ پیشانی چوڑی' قد درمیانہ' رنگ گورا' ناک ستواں' ڈاڑھی شرعی' سر سے گردن تک لمبے بال

ہیں، جیسا سندھ میں رواج ہے۔ گلے میں ایک چھوڑ تین ہار اور چوتھی ہیکل جواہرات کے پڑے ہیں۔ بازو پر بازو بند کہیے یا تعویذ۔ آج کل دنیا اس قدر تعویذ پرست نہیں لیکن وہ زمانہ اللہ والوں کا تھا۔ بہشتی بندے بستے تھے، تعویذ گنڈوں پر تو جان قربان تھی، حرز و ہیکل سے زندگی کا سہارا تھا۔ کلائی پر سونے کی زنجیر بندھی ہوئی ہے۔ سیدھے ہاتھ کی چوتھی اور پانچویں انگلی میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی ہیں۔ الٹے ہاتھ کی مٹھی قریباً بند ہے لیکن پانچویں انگلی مٹھی سے باہر نکلی ہوئی ہے جیسے کوئی دکھائے کہ اس میں بھی انگوٹھی ہے۔ کمر میں پٹکا بندھا ہے۔ اس پر ڈھال کسی ہے اور تلوار بندھی ہے۔ زانو کے قریب ہی ایک توڑے دار بندوق پڑی ہوئی ہے۔ پشت پر میاں محمد بخش خدمتؐ گار ہیں کہ بت بنے کھڑے ہیں۔ ایک ہاتھ میں مورچھل ہے۔ کمر کسی ہے اور ڈھال تلوار بندھی ہوئی ہے۔ قاضی جی کے چوہے بھی سیانے، یہ بھی اپنے آقا کی طرح سپاہ گری کا دم بھرتے ہیں۔ خدمت گار ہیں تو کیا ہوا۔

زمانہ گذشتہ کے طرز بود و باش کے اس نمونے پر ہم اس عجائب خانے کی سیر کو ختم کرتے ہیں۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے اس کی دلچسپیوں کا اندازہ ہوسکتا ہے اور ناظرین یہ خیال کرسکتے ہیں کہ کتنی دفعہ جاکر گھنٹوں وہاں رہنے کے لیے سامان موجود ہے۔ ایک ایک چیز لامتناہی سلسلہ خیالات چھیڑتی ہے اور ایک ایک خیال گھڑیوں بے چین رکھتا ہے۔ دل میں قوت احساس اور نگاہ میں شوق مشاہدہ درکار ہے۔

❑❑❑

پنجاب کے بعض غیر معروف اردو شاعر

قدیم اردو

(از ماہنامہ "سات رنگ" کراچی بابت نومبر ۱۹۶۱ء)

"سات رنگ" کراچی میں یہ مضمون "قدیم اردو" کے نام سے چھپا تھا۔ رسالے کے مدیر اطہر صدیقی نے اس مضمون کے تعارف میں یہ سطور لکھی تھیں:

"پنجاب میں اردو" حافظ محمود شیرانی کی مشہور کتاب ہے جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ زیر نظر مضمون کو اسی کا تتمہ خیال کرنا چاہیے۔ یہ مضمون شیرانی مرحوم نے ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا۔ جب کہ انجمن ترقی اردو نے "جائزہ زبان اردو" کے سلسلے میں ان کو پنجاب میں اردو تصنیف و تالیف اور قدیم شعرا کے بارے میں ایک رپورٹ مرتب کرنے کی دعوت دی تھی۔ یہ مضمون ہمیں جناب عبدالوحید صاحب سے ملا ہے جو اس زمانے میں انجمن ترقی اردو (پنجاب) کے سیکرٹری تھے۔ اس کے لیے ہم موصوف کے شکرگزار ہیں۔"

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ زیر نظر مضمون ۱۹۳۱ء میں نہیں لکھا جاسکتا کیونکہ جائزہ زبان اردو کا کام بقول مولوی عبدالحق ۱۹۳۵ء سے

شروع ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

"۱۹۳۵ء میں میں نے جائزہ زبان اردو کی ایک تجویز انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک مجلس منعقدہ علی گڑھ میں پیش کی تھی۔" (دیکھئے "جائزہ زبان اردو" حصہ اول' مقدمہ' دہلی' ۱۹۴۰ء)۔ پنجاب میں جائزہ زبان اردو کا عملی کام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو تفویض ہوا تھا۔ البتہ شیرانی صاحب کا یہ مضمون اسی موقع پر لکھا گیا تھا۔ مولوی صاحب کا بیان ہے :

"صوبہ پنجاب کے کام کے لیے میں نے (ڈاکٹر) عبداللہ چغتائی صاحب کی خدمات حاصل کیں اور انھوں نے بہت سرگرمی سے اس کام کو انجام دیا۔ اس رپورٹ کے ساتھ پنجاب میں اردو کے متعلق پروفیسر شیرانی صاحب نے اپنی عنایت سے ایک نہایت محققانہ مضمون لکھ کر دیا۔" (مقدمہ محولہ بالا)۔

مضمون ایک خاص موضوع کا احاطہ کرتا ہے اس لیے اس کا عنوان "قدیم اردو" جو غالباً "سات رنگ" میں اشاعت کے وقت اس کو دیا گیا تھا' موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں نے اسے نیا عنوان دے دیا ہے۔

عبدالوحید صاحب سے مراد لاہور کے معروف علمی خاندان کے ممتاز فرد خواجہ عبدالوحید (۱۹۰۱ء و ۱۹۷۹ء) ہیں جو موجودہ دور کے اہم محقق جناب مشفق خواجہ کے والد تھے مشفق خواجہ صاحب اس ضمن میں اپنے ایک مکتوب (نوشتہ ۲۰ جولائی ۱۹۸۰ء) بنام خورشید احمد خاں میں لکھتے ہیں :

"حافظ صاحب انجمن ترقی اردو پنجاب کے نائب صدر اور میرے والد سیکرٹری تھے۔ یہ انتخاب مجلس عامہ انجمن ترقی اردو پنجاب کے اجلاس منعقدہ ۱۹ مئی ۱۹۳۴ء کو عمل میں آیا تھا۔ جلسہ سر عبدالقادر مرحوم کے مکان پر ہوا تھا۔ دیگر عہدیدار حسب ذیل تھے :

شمس العلماء میر ممتاز علی　　　　صدر
پروفیسر احمد شاہ بخاری　　　　نائب صدر
مولوی ظفر اقبال　　　　خزانچی

صوفی تبسم' ڈاکٹر سید عبداللہ' حفیظ جالندھری' منوہر سہائے انور' عبداللہ چغتائی اور مولانا غلام رسول مہر اراکین مجلس منتظمہ تھے۔

اسی اجلاس میں جائزہ زبان اردو کے مختلف سوالوں سے متعلق کمیٹی بنائی گئی تھی۔ متفرق امور سے متعلق کمیٹی کے کنوینر حافظ صاحب تھے اور یٰسین خان نیازی' فیض احمد فیض' منوہر سہائے انور' سردار عبدالحمید اس کے اراکین تھے۔ حافظ صاحب نے مذکورہ مضمون سنہ ۱۹۳۵ء کے آغاز میں لکھا تھا۔"

اس سے گمان ہوتا ہے کہ پنجاب میں جائزہ زبان اردو کا کام مولوی عبدالحق کے علی گڑھ کے اجلاس میں تجویز پیش کرنے سے قبل شروع ہوچکا تھا۔ (مرتب)

پنجاب کے ساتھ اردو کے تعلقات' جہاں تک کہ آثار و قرائن سے پایا جاتا ہے' قدیم زمانے سے قائم معلوم ہوتے ہیں۔ جب دسویں صدی ہجری میں دیسی زبانوں میں ادبی تحریک شروع ہوتی ہے' اہل پنجاب بھی اپنی مقامی زبان یعنی پنجابی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں مگر ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان میں بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اس خیال کی تقویت دو باتوں سے ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ پنجاب میں اردو مصنفین کی تصنیفات ہر عہد میں دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کی گئی ہیں۔ اردو کی تصنیفات میں سب سے قدیم وہی ہیں جو گجرات و دکن میں دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں شائع ہوتی ہیں۔ ان تصنیفات کے قلمی نسخے آج بھی پنجاب میں نظر آجاتے ہیں۔ مثلاً شاہ علی جیوگام دھنی کا دیوان "جواہر اسرار اللہ" شیخ خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" احمد دکنی قطب شاہی کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" سید بلاقی کا "مولود شریف"

امین گجراتی کی "یوسف زلیخا" ولی اورنگ آبادی کا دیوان وغیرہ وغیرہ۔ ان میں احمد دکنی کی لیلیٰ مجنوں ایسی تالیف ہے جس کا دکن میں بھی کوئی نسخہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا اور سید بلاقی کا مولود شریف تو پنجاب میں بے حد مقبول عام معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کئی نسخے نوشتہ پنجاب میری نظر سے گزر چکے ہیں اور مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر یہ تالیف مجالس میلاد میں پڑھی جاتی رہی ہو۔ حال ہی قاضی عین القضات ہمدانی کی تالیف "زبدۃ الحقائق" کا دکنی ترجمہ از میراں جی حسن خدانما' ضلع ہزارہ سے میرے پاس آیا ہے۔ وہ نسخہ اگرچہ ناقص الطرفین ہے لیکن انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے آخری عہد میں اس کی کتابت ہوئی ہے۔ اسی طرح ہریانی زبان کی تالیفات مثلاً شیخ عبداللہ انصاری کی "فقہ ہندی" محمد افضل پانی پتی کا "بارہ ماسہ" اکرم رہتکی کا "تیرہ ماسہ" شیخ محبوب عالم کی مختلف تالیفات' بسمل تھانیسری اور شاہ عبدالحکیم ممی کی مصنفات کے مخطوطے برابر ملتے رہتے ہیں۔ جب محمد شاہ کے عہد میں دہلی کا دبستان بہ تقلید دکن قائم ہوتا ہے' اہل پنجاب اس دبستان کی طرف بھی موالات کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ چنانچہ آبرو' شاہ حاتم' فغاں' میر درد' میر تقی میر اور سودا کے دواوین کثرت کے ساتھ مطالعہ کیے جاتے ہیں' ان کی غزلیں بیاضوں میں نقل کی جاتی ہیں اور ان کی تقلید میں غزلیں لکھی جاتی ہیں اور آج بھی ایسی بیاضیں سینکڑوں کی تعداد میں مل سکتی ہیں جن میں شعرائے اردو کا کلام نقل ہوا ہے۔ میر حسن دہلوی کی مثنوی سحرالبیان تو نہایت مقبول رہی ہے۔ اس مثنوی کے ایسے متعدد نسخے میرے دیکھنے میں آئے ہیں جو پنجاب میں نقل ہوئے ہیں۔

دوسری وجہ اس عقیدے کی تائید میں یہ ہے کہ جہاں اس صوبے میں پنجابی زبان کو بچوں کے واسطے ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا وہاں اردو زبان کو بھی اہل پنجاب نے یہی حیثیت دے دی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے بچوں کی تعلیم میں پنجابی اور اردو دونوں قسم کے نصاب شامل کرلیے گئے مثلاً پنجابی کے نصابوں "واحد باری" اور "رازق باری" کے ساتھ شاید اردو کے نصاب "خالق باری" اور "صمد باری" بھی درس میں داخل

تھے۔ خالق باری پنجاب کے مکتبوں میں بکثرت پڑھائی گئی ہے۔ بلکہ پنجاب کے نصابی لٹریچر پر اس کا بے حد اثر ہے۔ اس تالیف کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت وارث شاہ نے اپنے عشقیے ہیر و رانجھا (تالیف ۱۱۸۰ھ) میں رائج الوقت مکتبوں کی کتب نصاب کا جہاں ذکر کیا ہے' اس فہرست میں خالق باری کا نام بھی شامل ہے۔[1]

خالق باری کے بعد میر عبدالواسع ہانسوی کی تالیف "صمد باری" یا "نصاب سہ زبان" جس کو بعض اوقات "جان پہچان" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے' بہت مقبول رہی ہے۔ آج بھی اس کے بیسیوں مخطوطے مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب کے مشہور مجموعہ نصاب "فارسی نامہ" ' "واحد باری" اور "اللہ باری" کے ساتھ بیسیوں مرتبہ چھپ چکی ہے۔

پنجاب نے ان دو نصابوں پر' جو ہندوستان کی پیداوار ہیں' قناعت نہیں کی ہے بلکہ خود بھی اردو کے ایسے نصاب تیار کیے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم مولوی اسحق لاہوری کا نصاب "فرح الصبیان" ہے' جو ۱۰۵۷ھ کے قریب بہ عہد شاہجہاں بادشاہ تیار ہوتا ہے۔[2] ذوق الصبیان[3] ایک اور نصاب ہے' جو ۱۲۰۷ھ میں لکھا جاتا ہے۔ الغرض یہ وجوہ ہیں جن کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ صوبہ پنجاب قدیم زمانے سے اردو میں دلچسپی لے رہا ہے۔

جب اس صوبے میں اردو نصاب تیار کیے جارہے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہاں اردو کے لیے کافی ضرورت محسوس کی جارہی ہوگی۔ چنانچہ اس کی شہادت ہمیں قدیم تصنیفات کی شکل میں' کافی سے زیادہ ملتی ہے۔ میری تلاش و تفتیش سے (اور ظاہر ہے کہ ایک پردیسی کی تلاش چنداں بار آور نہیں مانی جاسکتی) ایک درجن کے قریب ایسی مولفات کا سراغ ملا ہے جن کے مصنف پنجابی ہیں۔ اگر خود اہل پنجاب اس تلاش کو جاری رکھیں تو مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی اور تالیفات کا پتہ چل سکتا ہے جو خاص پنجاب کی پیداوار ہیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ مولفات پنجاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے

سال ۱۸۴۶ء سے قبل کی یادگار ہیں:۔

(ا) **مثنوی گلزار فقر:** از غلام محی الدین (ابن) قطب عالم شیخ محمد یوسف ساکن میرپور۔ میرپور فی زمانا گزشتہ صدی کے سیاسی خلفشار کے باعث داخل کشمیر ہے لیکن مغلیہ عہد میں داخل پنجاب تھا۔ مثنوی ہذا ۱۱۳۱ھ میں لکھی جاتی ہے۔ ہم مصنف کے حالات زندگی سے بالکل تاریکی میں ہیں۔ انکے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صادق العقیدہ صوفی تھے' چنانچہ تصوف کے موضوع پر یہ مثنوی انہوں نے لکھی ہے۔ اس کی ابتدا ہے:

سنو سادھو (اک) من کی بات
جس میں پائی ذات صفات
کہے فقیر غلام محی الدین
دین دار کوں چاہیے دین
دین دار کوں دین پیارا
واری دین پر عالم سارا
دین دار کا اوچا پایا
چوداں طبق میں اس کی چھایا
حافظ محی الدین ایک فقیر
جس کا حضرت آپ ہے پیر
قطب عالم تھا میرا باپ
جس نے دیا اپنا آپ
حق کی راہ میں سبھ کچھ دیا
سبھ کچھ دے کر حق کوں لیا
شیخ اجل اور عارف کامل
قطب دین مکمل اکمل

شیخ محمد یوسف نام
ہر کامل میں ہے[۴] تمام (کذا)
خاندان بڈا ہے کھکر
اصل نجیب اور نیکو گوہر
سب سلطان دیوان اور خان
متشرع ہوویں با ایمان
ان کے شہر میں رہن ہمارا
تولد مسکن (ایزو؟) کھارا[۵]
میر پور شہر ہے بیچ پنجاب
حق راکھے دائم آن کی (آب؟[۶])
یہ نسخہ جب بھیا تمام
گلزار فقر کا کیا نام
تخمینا" یہ نیک کلام
چہار پہر میں بھیا تمام
ایک تیس برس ایک یاراں سو
ہجرت سیں ہوئے تھے نو
پیغمبر اور آل کرام
لاکھ درود اور لاکھ سلام

"گلزار فقر" اسی سال لکھی جاتی ہے جس سال دہلی میں' بہ تتبع ولی دکنی تغزل کی بنیاد پڑتی ہے۔ کتاب پر سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پنجاب میں اپنی طرز کی پہلی چیز نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی ایسی تالیفات وجود میں آچکی ہیں۔

(۲) مثنوی رمزالعشق : از شاہ غلام قادر ابن شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی۔ میں اس مثنوی کے متعلق "پنجاب میں اردو" میں کافی لکھ چکا ہوں۔[۷] یہاں اس بیان کو

دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس قدر کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "رمز العشق" چونکہ حضرت محمد فاضل بٹالوی کی زندگی میں لکھی جاتی ہے اس لیے ہمیں اسے سنہ ۱۱۵۱ھ سے قبل کی تصنیف ماننا ہوگا' جو ان کی وفات کا سال ہے۔ پنجاب میں بالخصوص صوفی حلقوں میں مثنوی رمز العشق ایک بلند پایہ تصنیف مانی جاتی ہے اور مثنوی گلشن راز کی طرح' جس کے ساتھ بہ لحاظ مضمون اس کو اشتراک بھی حاصل ہے' نہایت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کی چھ سات شرحیں' عربی' فارسی اور اردو زبانوں میں لکھی جاچکی ہیں۔[۸]

بٹالہ اب داخل ضلع گورداس پور ہے لیکن قدیم زمانے میں یہ خود ضلع تھا اور پنجاب کے مردم خیز شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ سبحان رائے مصنف خلاصۃ التواریخ اور میرزا نورالعین واقف اس شہر کی طرف منسوب ہیں۔ بٹالہ میں اردو کی تحریک حضرت مصنف کے والد محمد فاضل شاہ کے زمانے سے جاری ہے۔ خود شیخ موصوف اور ان کے بعض معاونین جن میں شیخ محمد نور' شاہ مراد اور نصیرالحق و محمد جان قابل ذکر ہیں' اس تحریک میں حصہ لیتے ہیں اور بعض مناجاتیں اپنی اپنی یادگار چھوڑتے ہیں۔ لیکن شاہ غلام قادر کا نام اردو کے حامیوں کی فہرست میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کی مثنوی نہ صرف ایک دیرپا اثر اور قدر و قیمت کی حامل ہے بلکہ اس کی تقلید میں اور مثنویاں بھی وجود میں آئی ہیں۔

(۳) مثنوی گنج شہیداں: اردو کی تحریک جو درگاہ فاضلیہ سے اٹھی اگرچہ ہم اس کی تاریخ سے ناواقف ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ نہایت مقبول ہوئی۔ رمز العشق کے بعد مجھے ایک اور مثنوی گنج شہیداں کا ذکر کرنا چاہیے جو غلام غوث بٹالوی کی تصنیف ہے۔ غلام غوث بٹالوی کا ذکر "پنجاب میں اردو" میں آتا ہے جو بٹالہ میں جے سنگھ کے فرزند گوربخش سنگھ کی فوجداری میں ملازم تھا اور جس نے سنہ ۱۱۹۸ھ میں گوربخش سنگھ کا مرثیہ لکھا۔[۹]

"گنج شہیداں" ایک ضخیم تصنیف ہے جس میں بقول مصنف تیرہ ہزار اور آٹھ سو ابیات ہیں۔ یہ کتاب ماہ ربیع الاول میں شروع ہوئی اور دوسری ذی قعدہ کو سات مہینے اور گیارہ دن میں ختم ہوگئی۔ بدقسمتی سے مصنف نے سال تصنیف نہیں دیا ہے۔ اس تالیف کا مضمون وہی ہے جو "دہ مجلس" کا ہے اور فارسی ماخذ پر مبنی ہے چنانچہ مصنف کہتا ہے:

کتاب فارسی سے دیکھ مذکور
کیا ہندی میں اس قصہ کوں مشہور

غلام غوث غالباً شیعہ جماعت سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ:

حسینی مذہبم حیدر پرستم
غلام قنبرم ہرجا کہ ہستم
غلام غوث کوں ان کی غلامی
ہوئی حاصل بزرگی سے مدامی

خاتمے کے اشعار:

یہ قصہ پرغم و پرسوز و پرساز
کیا تھا ربیع الاول میں آغاز
بتاریخ دوم در ماہ ذی قعدہ
کیا آخر ختم یہ قصہ سعد
ہزاروں سیزدہ اور ہشت صد ہے
یہ سب نسخے کی بیتوں کا عدد ہے
کئی میں نے جگر خواری شب و روز
پس از رنج و مشقت محنت و سوز
مہینے سات ہیں اور روز یاراں
کہا جانو تم اس قصے کو یاراں

گنج شہیداں میں فارسی اثر بہت نمایاں ہے۔ فارسی شعر اور مصرعے جگہ جگہ کثرت سے ملتے ہیں۔ ایک حیران کن امر یہ ہے کہ اس کتاب پر ایک مہر ہے جس پر "سری صاحب سہائے اور ۱۱۱۸ و ۵۱" مرقوم ہے جس سے ظاہر ہے کہ ۵۱ جلوس عالمگیری مراد ہے۔ لیکن میں اس مُہر سے یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کتاب عالمگیر کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مہر بعد میں کسی نے چسپاں کردی ہے۔

(۴) قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال :

بٹالے کا ایک اور مصنف عاجز بٹالوی ہے جو سیف الملوک و بدیع الجمال کے قصے کو فارسی سے اردو میں نظم کرتا ہے۔ اس مثنوی کی زبان صاف نہیں ہے اور ہمیں اس کو عاجز کا شعر خام کہنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف پنجاب سے باہر نہیں گیا ہے اور نہ اردو پر اسے پوری دستگاہ حاصل ہے۔ اس کے ہاں پنجابی اثر بھی بعض موقعوں پر دیکھا جاتا ہے تاہم ہمیں عاجز کی اس کوشش کو بہ نظر تحسین دیکھنا چاہیے۔ اگرچہ اس مثنوی کا سال تالیف معلوم نہیں مگر بارھویں صدی ہجری کے نصف دوم میں اس کو جگہ دی جاسکتی ہے۔ مثنوی کی ابتدا ہے :

کروں یاد میں حق کوں شام و پگاہ
محمد نبی ہے ہمارا گواہ

سبب تالیف میں عاجز کا بیان ہے کہ میرے دوست مجھ سے متدعی ہوئے کہ قصہ سیف الملوک جو فارسی زبان میں ہے اس کو مہربانی کرکے ہندی زبان میں لکھ دوں۔ آج کل فارسی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ بٹالہ میں تم ہی شعر و شاعری میں مشہور ہو اور ہمارے لیے خاقانی اور انوری ہو۔ تمہارے سوا کوئی اور شخص نظر نہیں آتا جو اس کام کو سرانجام دے سکے :

حقیقت سنو میری منظور کر
سناتا ہوں میں سب کوں مذکور کر

مرے دوست دار اور مشفق رفیق
مجوز ہوئے مجھ سیں اور ہر طریق

ہماری لگے کہنے کچھ عرض ہے
قبول اس کا کرنا تمہیں فرض ہے

کہ یہ قصہ عشق سیف الملوک
بنا ہندوی میں لکھو کر سلوک

اگر فارسی میں یہ مذکور ہے
ہر اک کی سمجھ سے ولے دور ہے

اگر ہندوی میں کرو تم اسے
جو سمجھن میں ہر اک کی آوے بسے

تمہارے بغیر اب نہ کو اور ہے
بٹالہ میں تیرا تو اب دور ہے

کہ مانند خاقانی و انوری
تو مشہور ہے در سخن پروری

توقع ہے ہم کوں تری ذات پر
جو قصہ کہیں گا تو اس بات پر

غرض کہنا یاروں کا بھاری لگا
جگرموں سخن ہو کٹاری لگا

لیا مان کہنا رفیقوں کا میں
نہ مکھ موڑا ان سب شفیقوں کا میں

اسی وقت لے کر قلم کوں بدست
کیا عشق نامہ کا میں بندوبست

گر اس میں کوئی سہو ہو یا خطا
اسے تھاکیو تم بذیل عطا

مرے عیب پر ہوجیو عیب پوش
برا بولنے سے رہو تم خموش

میرے پاس اس مثنوی کا جو نسخہ ہے وہ ۱۲۶۰ھ میں لاہور میں لکھا گیا تھا جس سے ظاہر ہے کہ کمپنی کی آمد سے قبل اس مثنوی کو پنجاب میں مقبولیت حاصل تھی۔ عاجز کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان یہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہے:

اگر ہندوی میں کرو تم اوسے
جو سمجھن میں ہر اک کی آوے بسے

گنج شہیداں اور عاجز کی مثنوی کی زبان اوروزن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے عہد کی یادگار ہیں جب پنجاب میں دبستان دہلی کے ساتھ تعلقات قائم ہوچکے ہیں۔ ان مثنویوں کا وزن فارسی ہے اور زبان میں بھی شہریت نمایاں ہے۔

(۵) اللہ باری یا ذوق الصبیان:

اب میں اردو کے ایک اور حامی مولوی احسن اللہ احسن تخلص کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ مولانا کا آبائی پیشہ مہرکنی ہے۔ اس کے ساتھ کتابت اور معلمی کی خدمات بھی انہوں نے اضافہ کرلی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی تصانیف کے مالک ہیں سنہ ۱۱۹۸ھ میں وہ "مفتاح الافواہ" ایک ضخیم لغت' جو سترہ اٹھارہ ہزار اشعار پر شامل ہے' ختم کرتے ہیں۔ اس لغت میں عربی فارسی الفاظ کے علاوہ اردو الفاظ بھی بعض موقعوں پر دیئے گئے ہیں۔

۱۲۰۷ھ میں وہ ایک اردو نصاب تیار کرتے ہیں جس کا نام اللہ باری یا ذوق الصبیان ہے۔ اس نصاب کی زبان نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ ملا صاحب اردو کے متعلق کہتے ہیں کہ بچے اس آسان زبان کو بڑے شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں:

یہ آسان اور ہندی بولی
لڑکوں کو اک کھیل ہے کھولی
خوشی خوشی پڑھتے ہیں اس کو
چشم وسر اوپر دھرتے ہیں اس کو

چونکہ اس نصاب کے متعلق میں رسالہ "کاروان" میں لکھ چکا ہوں[۱۰]۔ اس

لیے یہاں اس کی تکرار نہیں کرنا چاہتا اور اس سے اعراض کرکے ملا صاحب کی ایک اور تصنیف کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

(۶) بخشش نامہ:

سنہ ۱۲۱۳ھ میں ملا احسن اللہ عقائد و تصوف پر ایک تالیف بہ زبان اردو لکھتے ہیں۔ "دوبخشالیش" اس کا سال تصنیف ہے۔ اور "بخشش نامہ" نام ہے:

جو ہے ذکر بخشش میں یہ قیل و قال
تو "بخشالیش" اس کا ہے تاریخ سال

ہے بخشش نامہ رکھنا اس کا نام
کہ ہم عاصیوں کو ہے بخشش سے کام

بخشش نامہ کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ملا صاحب جو کبھی پنجاب سے باہر نہیں گئے اور اردو زبان انہوں نے لاہور میں بیٹھ کر سیکھی ہے، اپنے اسلوب بیان سے ان کی کتاب آج بھی ہمارے لیے دلچسپی کے سامان رکھتی ہے۔ ملا صاحب کہتے ہیں کہ اگرچہ مجھ کو ہندی زبان میں شعور نہیں ہے اور نہ میں کبھی ہندوستان گیا ہوں، میں نے ایک دوست کی فرمائش سے یہ کتاب لکھ دی ہے۔ فقہ و تصوف پر اور زبانوں میں کافی کتابیں ملتی ہیں لیکن اردو کے باغ میں یہ نہال نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اس غرض سے یہ کتاب لکھی گئی ہے:

نہ تھا گرچہ ہندی میں مجھ کو شعور
کہ لاہوری بدھو ہوں سدھ بدھ سے دور

نہ ہندوستاں میں میں پہنچا کبھو
نہ اس بوستاں کی لئی میں نے بو

پر اک دوست کا مان حکم و رضا
جو دیکھا سنا بارے جیوں تیوں کہا

ہندوستانی شعرا کی طرف ایما کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

جو پہنچا ہے اس باغ سے کوئی پھول
تو گئیں بلبلیں اپنی بولی کو بھول
کہاں بلبلوں کی ہزاراں صدا
کہاں قمریوں کی صدا خوش ادا
کہاں عندلیبان شیریں سخن
کہاں بذلہ گویان نمکیں دہن
کہاں شاعراں (ہیں) وہ صاحب شعور
ہر ایک بیت ان کا سرائے سرور
ہر اک بذلہ ان کا سراسر نکات
ہر اک بات ان کی چو قند و نبات
بھلا اب کہاں یہ بیچارہ حقیر
سوا خیر حاضر نہ جانے فقیر
ہے ہرچند پرگو یہ لاہوری غول
مغل دیکھے پر فارسی جائے بھول
نہ کچھ شعر کا ہے شعور و شعار
سو اشعار اپنے سے ہے بلکہ عار

اور اپنے موضوع کے ذکر میں کہتے ہیں :

جو دیکھا یہ گل ہے جہاں اور کہاں
بعرب و عجم کیا وہاں کیا یہاں

بہ ترکی و کشمیری و فارسی
نہ عاری ہے اس روسے کوئی آرسی[11]
بہر خاک یہ پھول و پھل ہے لگا
یہاں تک جو پنجاب میں بھی اگا
یوہیں دل میں آیا کہ یہ کیا ہے بات
نہ اس گل کا ہو یاں کوئی پھول پات
جو یہ بات آئی مرے دل میں بس
تو ان باغوں کی کرکے ریس اور ہوس
بنایا میں یہ باغ لاہور میں
اوسی طرز میں اور اوسی طور میں
لگایا ولے اس میں در ہر محل
گل فقہ اور فقر کا پھول پھل

(۷) منظومات مراد شاہ:

حضرت مراد شاہ لاہوری کئی تصانیف کے مالک ہیں۔ دیوان کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ ہندوستان میں متواتر چھ سال رہنے کی بنا پر ان کی زبان بالکل شستہ اور ہموار ہوگئی ہے۔ سنہ ۱۱۹۶ھ میں ایک منظوم خط یاران وطن کو لکھتے ہیں جو "نامہ مراد" کے نام سے موسوم ہے۔ اس خط میں اردو کی عام مقبولیت کے سلسلے میں کہتے ہیں:

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھ سے میں ہندی زباں میں
کروں، شہرت ہوتا سارے جہاں میں

کہ اب وسعت میں اس کی سب سخن داں
سمند طبع کو کرتے ہیں جولاں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں
کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرہ اب ہوجائے سب تک
یہاں سے تا بہ ایراں بل عرب تک
خصوصاً شعر اب شاعر یہاں کے
نہیں کہتے بجز ہندی زباں کے
غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے
کہ شعر فرس مطعون زماں ہے
یہ شہرت ہے اب اس مضمون تر کی
نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی

(۸) سنہ ۱۲۱۴ھ میں شاہ مراد اپنے شاگرد حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر قصہ چہار درویش کی نظم میں مصروف تھے بلکہ کچھ حصہ نظم بھی کرلیا تھا کہ پیغام اجل آپہنچا اور عین عالم شباب میں ۱۲۱۵ھ میں وفات کی۔

(۹) مثنوی سرکنون :

مثنوی سرکنون بہ تقلید "رمز العشق" سنہ ۱۲۰۴ھ میں لکھی جاتی ہے۔ اس کا مصنف فقیر اللہ' خانوادہ نوشاہیہ سے بیعت ہے اور شاہ امانت کا مرید ہے۔ سرکنون میں ایک ہزار سے زائد اشعار ہیں اور سرخی کی جگہ دوہرے لائے گئے ہیں۔ اس کا موضوع تصوف ہے۔ خاتمہ :۔

فقیر اللہ کہیں (یہ) بات
سرکنوں ہے شاہ کی ذات

سرمکنوں کے سن کوں جان
یعنے عدد "چراغ" پہچان
شاہ ہمارا شاہ ہمارا
کل عالم کا سرجن ہارا

(۱۰) مثنوی گل ریز[۱۲]

از حافظ مرتضیٰ ولد محمد خاں شہاب الدین زئی خویشگی قصوری۔ مصنف نے ضیا نخشبی[۱۳] کی کتاب گل ریز کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے۔ آغاز:۔

؎ خدایا خدائی ہے لائق تجھے

خاتمہ: یہ مثنوی سنہ ۱۲۰۶ھ میں ختم ہوئی ہے۔

(۱۱) قصہ شیریں و فرہاد:

رحمت، شیریں و فرہاد کے قصے کا ناظم ہے، جو ہندی بحر میں لکھا گیا ہے۔ نو دس شعروں کے بعد بند کے طور پر تمیز کے لیے ایک دوہرا لایا گیا ہے۔ اس کی زبان پنجابی، اردو اور برج ملی جلی ہے۔ رحمت اپنا وطن پوری بتاتا ہے جہاں جگدیو کا استھان ہے۔

(۱۲) مثنوی فتح الرمز:

پنجاب کے مشہور صوفی حضرت شیخ نور محمد کی، جو شاہ سلیمان تونسوی کے پیر ہیں، تالیف ہے اور سنہ ۱۲۵۰ھ میں ختم ہوتی ہے۔ اس کی زبان اردو اور پنجابی آمیز ہے۔

(۱۳) واردات:

تحسین ایک شاعر ہے جو رنجیت سنگھ کے مہرسے تعلق رکھتا ہے۔ علاوہ اور متفرق نظموں اور غزلوں کے وہ ایک نظم موسوم بہ "واردات" کا مالک ہے جس میں کل ایک سو چھتیس ابیات ہیں اور بہ طرز مربع لکھی گئی ہیں۔ اس نظم کی ابتدا ہے:

ایک صاحب زادۂ دیواں کے تھے استاد ہم

پر نہ دیکھا مدت العمروں میں کچھ امداد ہم

پہونچے جا خدمت میں حق تربیت کر یاد ہم

لیک دیکھا کچھ نہ غیر از خاطر ناشاد ہم

"واردات" میں تحسین کے سفر میرپور کا بیان ہے جو اس نے اپنے کسی شاگرد کی دعوت پر جو دیوان زادوں میں سے ہے' اختیار کیا ہے اور راہ کی مشقت' میزبان کی بے مروتی اور سواری کے گھوڑے کی مذمت پر شامل ہے۔ یہ نظم ۱۲۳۶ھ میں لکھی جاتی ہے۔

(۱۴) دیوان عشق بیچہ:

رنجیت سنگھ اور کمپنی کے دور کا ایک سیالکوٹی شاعر ہے جس کا تخلص "عشق بیچہ" یا "بیچہ" ہے۔ اس کا دیوان میرے پاس موجود ہے جس میں غزلیات کے علاوہ ایک واسوخت چند مناقب مخمس اور رباعیاں ہیں[۱۴]۔ عشق بیچہ مذہباً" شیعہ ہے۔ اس کے زمانے کا پتہ ان بعض تاریخوں سے چلتا ہے جو آخر دیوان میں درج ہیں مثلاً راجہ رحم اللہ رجوی والا کی تاریخ وفات سنہ ۱۲۶۳ھ اور تاریخ تولد فرزند مہرو طوائف سنہ ۱۲۶۵ھ[۱۵]

ایک دو موقعوں پر شاعر نے اپنے استاد فرید کا نام بھی لیا ہے۔ عشق بیچہ کے ہاں اگرچہ کوئی جدت اور بلند خیالی نظر نہیں آتی اور زبان کے عیب بھی پائے جاتے ہیں تاہم وہ اس دبستان کا جو دہلی و لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے ایک کامیاب مقلد ہے اور پنجاب میں اردو کا غالباً" پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ میں بہ خوف طوالت نمونہ کلام دینے سے احتراز کر کے صرف دو شعروں پر قناعت کرتا ہوں:

پلٹن میں ہے تیر انگنوں کی

مژگاں بھی تو ایک کمپنی ہے

خط سمجھو نہ گورے منہ پہ اس کے
کالے لوگوں کی چھاؤنی ہے

یہ فہرست سنہ ۱۱۳۱ھ سے لے کر ۱۲۶۵ھ تک کے پنجابی مصنفین و تصنیفات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں صرف انہی لوگوں کو شامل کیا ہے جو صاحب تصنیف کہلائے جانے کے مستحق ہیں اور جن کی مصنفات میرے پاس موجود ہیں۔ اس فہرست میں ان لوگوں کو نہیں لیا گیا ہے جنہوں نے تفریحاً" اردو میں گاہے گاہے سخن سرائی کی ہے اور جن کا کلام اس عہد کی بیاضوں میں ملتا ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو شامل کرلیا جاتا تو فہرست نہایت دراز[۱۶] ہوجاتی۔ ان اردو گویوں میں ہم پنجابی کے بعض محترم اشخاص کا نام بھی دیکھتے ہیں۔ مثلاً غنیمت کنجاہی، دلشاد پسروری، حضرت وارث شاہ مصنف ہیر و رانجھا، شیخ موسیٰ جن کا کلام نہایت پر تاثیر ہے، فقیر نورالدین و فقیر عزیز الدین جو رنجیت سنگھ کے عہد میں مدار المہام تھے۔

ایسی بیاضیں کثرت سے ملتی ہیں جن میں ان اردو سراؤں کا کلام ملتا ہے۔ اگر تمام کا جائزہ لیا جائے تو ایک علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔

اس مضمون کے متعلق ہمارے پاس صرف دو ذریعہ معلومات ہیں۔ پہلا "پنجاب میں اردو" جس میں ایک پورا باب اسی اطلاع کا حامل ہے۔ دوسرا ایک سیر حاصل مضمون جو قاضی فضل حق، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے فروری ۱۹۳۳ء کے اورینٹل کالج میگزین میں سپرد قلم کیا ہے۔ لیکن یہ موضوع ابھی تک بہت تشنہ ہے اور اس سلسلے میں تحقیقات کی کافی گنجائش ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سنہ ۱۸۴۶ء میں، جو ۱۲۶۲ھ کے مطابق ہے، پنجاب پر قابض ہوجاتی ہے۔ اس عہد میں پنجاب میں اردو کو سرکاری حیثیت مل جاتی ہے۔

لیکن یہاں ایک اور امر جو نہایت ضروری گزارش طلب ہے، یہ ہے کہ موجودہ صوبائی تقسیم کی رُو سے، جس پر کمپنی کے زمانے سے عمل درآمد ہے، ہمیں پنجاب میں درحقیقت اردو کے دو دبستان ماننے پڑیں گے۔ ان میں ایک دبستان کا ذکر آچکا ہے۔

دوسرا دبستان ہریانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ فی زمانا ہریانہ کا اطلاق ایک محدود خطہ زمین پر ہوتا ہے لیکن میں نے اپنی سہولت کی غرض سے ان مقامات کو بھی ہریانہ میں شامل کرلیا ہے جو قدیم زمانے میں تقریباً" سرکار دہلی میں داخل تھے۔

ہریانہ میں، گیارھویں صدی ہجری سے دیسی زبان میں ہم ایک نئی تحریک دیکھتے ہیں، جس کے آثار عالمگیر کے عہد سے ہمیں ملتے ہیں۔ میں اس تحریک کے متعلق کوئی تفصیلی اطلاع تو نہیں دینا چاہتا، اس لیے کہ یہ کام دراصل جائزہ اردو کی دہلی شاخ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس خیال سے کہ چونکہ سرکاری و دیگر لسانی رپورٹیں ہریانی میں عام طور پر کسی قسم کے لٹریچر کے وجود سے لاعلمی ظاہر کرتی ہیں، میں سطور ذیل کا اضافہ مناسب خیال کرتا ہوں۔

ہریانی زبان کو جٹو، بانگڑو وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زبان کی سب سے قدیم تالیف جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں شیخ عبداللہ انصاری پانی پتی کی "فقہ ہندی" ہے جو سنہ ۱۰۷۳ھ میں بہ عہد عالمگیر لکھی جاتی ہے:

فقہ ہندی کو مومناں آنو زباں پر یاد

مسلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد

سن ہزار چوہتر بیچ (ماہ) رمضان تمام

اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا نظام

یہ کتاب ہندوستان و پنجاب و گجرات میں کافی مقبول رہی ہے اور بمبئی میں "رسالہ عبدو" کے نام سے چھپ بھی چکی ہے۔

میر عبدالواسع ہانسوی اسی عہد میں اپنا نصاب سہ زبان جو "صمد باری" اور "جانت پہچان" کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے، تالیف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہریانی زبان کی ایک لغت، جو اردو کی قدیم لغت مانی جاسکتی ہے، تصنیف کرتے ہیں۔ اس لغت کا نام "غرائب اللغات" ہے۔ خان آرزو اپنی اصلاحات کے ساتھ اسی لغت کی ایک جدید اشاعت تیار کرتے ہیں۔

اس زمانے میں ہم محمد افضل کی بکٹ کہانی یا بارہ ماسہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ افضل کو مختلف لوگوں نے مختلف نسبتوں سے یاد کیا ہے۔ کوئی اس کو جھنجانوی' کوئی پانی پتی اور کوئی نارنولوی بیان کرتا ہے۔ افضل کا بارہ ماسہ پنجاب و ہندوستان میں نہایت مقبول و معروف ہوا۔ میر حسن اپنے تذکرے میں اس کی قبولیت کا ذکر کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں میر جعفر زٹلی کا نام لینا چاہیے جن کا کلیات اپنی گنگا جمنی اردو اور فارسی کے لیے مشہور ہے۔

اکرم رہتکی اپنا تیرہ ماسہ سنہ ۱۱۴۳ھ میں ختم کرتا ہے۔ محبوب عالم ساکن جھجر متعدد تصنیفات کے مالک ہیں۔ ان میں سے "محشر نامہ" اور "مسائل ہندی" ہندی وزن میں ہیں۔ "نور نامہ" اور "درد نامہ" فارسی وزن میں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان دوہرہ جات ہندی میں بھی ان کی یادگار ہے۔

شیخ عبدالحکیم (متوفی ۱۱۸۷ھ) "دہیز نامہ بی بی فاطمہ" اور "خواب نامہ پیغمبر" کے مصنف ہیں۔ بسمل تھانیسری کئی منظوم مذہبی رسالے لکھتے ہیں۔ ان کے بعد ہریانہ دبستان میں سب سے زیادہ مشہور مصنف شیخ محمد رمضان ہی ہیں جن کی "آخرکت" اور "بلبل باغ محمد" نظم میں اور "عقائد عظیم" نثر میں ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور چھوٹے چھوٹے رسالے ان کے قلم سے نکلتے ہیں مثلاً "نصیحت نامہ" اور "رنگیلی" وغیرہ۔

شاہ غلام جیلانی رہتکی' متوفی ۱۲۳۵ھ "چوپائیوں" کے مالک ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ چوپائیاں ایک نہایت بلند پایہ شاعری کی حامل ہیں۔

نواب فیض محمد خاں والی جھجر (۱۸۱۴ - ۱۸۳۵ء) کی سرکار میں ایک شاعر شیخ غلام نبی نارنولوی تھے جن کی تصنیفات سے ایک راگ مالا مشہور ہے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ غلام حسین چشتی بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک راگ مالا ان کی طرف بھی منسوب ہے۔

اس مضمون پر مفصل اطلاع کے لیے اورینٹل کالج میگزین کے نمبر ۲۷ اور ۲۸

ملاحظہ کیجئے جو نومبر ۱۹۳۱ء اور فروری ۱۹۳۲ء کو شائع ہوئے ہیں۔(۱۷)

حواشی

(۱) ملاحظہ ہو شعر:

ملک نظم دے درس ہر کرن پڑھدے نام حق تے خالق باریاں نے
گلستاں بوستاں نال بہار دانش طوطی نامہ تے رازق باریاں نے

(ہیر وارث شاہ' پنجابی ادبی اکادمی' لاہور' ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۸) مرتب۔

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ "کاروان" سنہ ۱۹۳۴ء' صفحہ ۲۸۹ ۔ ۲۸۸ (حاشیہ مصنف)

"پنجاب میں اردو کی سرگزشت کا ایک فراموش شدہ ورق" کے عنوان سے بعد میں یہ مضمون "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد دوم (صفحہ ۱۱۷ تا ۱۲۹) میں شامل کرلیا گیا تھا۔ (مرتب)

(۳) ایضاً"۔

(۴) خورشید احمد خاں یوسفی نے اس لفظ کو "بھلے" پڑھا ہے۔ دیکھیے "پنجاب کے قدیم اردو شعرا" صفحہ ۲۹' مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' ۱۹۹۲ء (مرتب)

(۵) تولد مسکن اور پسارا

("پنجاب کے قدیم اردو شعرا") مرتب۔

(۶) اس کی آب (ایضاً") مرتب۔

(۷) "پنجاب میں اردو" طبع اول' صفحہ ۲۵۰۔ (حاشیۂ مصنف)

(۸) ان شرحوں میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

(۱) شرح بہ زبان عربی از حضرت محمد شاہ قادری بٹالوی (۲) بہ زبان فارسی از مصنف صدر (۳) اسرار العشق بہ زبان فارسی از سید حسن شاہ بٹالوی۔ اس کے علاوہ اس مصنف نے دو اور شرحیں لکھی ہیں جن کی تفصیل مجھے معلوم نہیں ہوئی۔ (۴) شرح اردو از حافظ انور علی رہتکی جو نمبر (۲) کا ترجمہ ہے۔ (۵) شرح اردو از خلیفہ محمد بخش (۶) اسرار العشق مسمی بہ کنز العشق بہ زبان اردو از شمس الدین فاضل بٹالوی طبع امرتسر ۱۳۴۱ھ۔ یہ شرح سید حسن شاہ کی تینوں شرحوں پر مبنی ہے۔ (حاشیہ مصنف)

(۹) لیکن "پنجاب میں اردو" (طبع اول، صفحہ ۲۷۳ ـ ۲۷۷) میں شاعر کا نام محمد غوث (بجائے غلام غوث) دیا گیا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ "پنجاب میں اردو" میں محمد غوث کی جو اردو غزل درج کی گئی ہے اس کا مقطع ہے:

ہو رہاں میں غلام غوث اس کا
جو کوئی یار کوں بلا لیاوے

تاہم یہاں لفظ "غلام" شاعر کے نام کا جزو نہیں ٹھہرتا۔ صورت حال مشکوک ہونے کے باعث خورشید احمد خاں یوسفی کا خیال ہے کہ ۱۱۹۸ھ میں گوربخش سنگھ کا مرثیہ لکھنے والا محمد غوث اور غلام غوث مصنف گنج شہیداں دو مختلف شخص ہیں۔ موخرالذکر کی دو اور تالیفات یعنی "قصہ ملک زادہ" اور "ہفتہ منظوم" کا تذکرہ بھی خورشید صاحب نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: پنجاب کے قدیم اردو شعرا، صفحہ ۸۷ تا ۹۷) ـ مرتب ـ

(۱۰) ملاحظہ ہو مضمون "پنجاب میں اردو کی سرگزشت کا ایک فراموش شدہ ورق" مشمولہ "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد دوم، صفحہ ۱۱۷ تا ۱۲۹ (مرتب)۔

(۱۱) کذا: نہ اس رو سے عاری کوئی آرسی (؟) ـ مرتب۔

(۱۲) یہ مثنوی میں نے بچشم خود نہیں دیکھی ہے۔ اس کے لیے میری اطلاع کا ماخذ پروفیسر محمد شفیع کا ایک نوٹ ہے۔ (حاشیہ مصنف)۔

(۱۳) ضیاالدین نخشبی بداؤنی (متوفی ۷۵۰ـ۵۱ھ) مصنف ملک السلوک، طوطی نامہ، عشرہ مبشرہ، گل ریز و لذت النساء۔ (مرتب)

(۱۴) دیوان کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں عشق بیچہ کی ایک بیاض بھی ہے جس میں ان کے اپنے کلام کے علاوہ ان کے استاد فرید لاہوری اور پنجاب کے بعض دیگر شعرا کا اردو کلام موجود ہے۔ (دیکھئے "پنجاب کے قدیم اردو شعرا" حاشیہ صفحہ ۲۶۸)۔ مرتب

(۱۵) خورشید احمد خاں یوسفی نے "سراج الاخبار" جہلم کی اشاعت ۳ جون ۱۸۹۵ء کے حوالے سے عشق بیچہ کی تاریخ وفات ۲۴ مئی ۱۸۹۵ء (۲۸ ـ ذی قعدہ ۱۳۱۲ھ) درج کی ہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۲۶۸ محولہ بالا)۔ مرتب۔

(۱۶) چنانچہ خورشید احمد خاں صاحب نے اپنی تالیف "پنجاب کے قدیم اردو شعرا" میں چندر بھان برہمن سے عشق بیچہ تک پنجاب کے نانوے اردو شعرا کا تعارف شامل کیا ہے۔ (مرتب)

(۱۷) دو قسطوں میں شائع ہونے والا یہ مضمون "اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات" کے عنوان سے "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد دوم میں (صفحہ ۳۵۱ ـ ۴۱۸) شامل ہے۔ (مرتب)

پنجاب میں اردو کی بعض قدیم تصنیفات

(از اورینٹل کالج میگزین' شیرانی نمبر' ۱۹۸۰ء)

"یہ مضمون گزشتہ مضمون کا نقش ثانی ہے۔ گویا جائزہ زبان اردو کے سلسلے میں شیرانی صاحب کے تحریر کردہ مضمون کی نسبتاً" مفصل صورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ دونوں مضامین میں پارے کے پارے یکساں نظر آتے ہیں لیکن جستہ جستہ مقامات پر کچھ اضافے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ نقش اول تو انجمن ترقی اردو پنجاب کے سیکرٹری خواجہ عبدالوحید صاحب کے پاس رہا جو انہوں نے بعد میں رسالہ "سات رنگ" کراچی میں چھپوایا اور مولوی عبدالحق کو روانہ کرتے وقت شیرانی صاحب نے اس پر نظرثانی کی ہے۔ یہ نظر ثانی شدہ مسودہ مجھے شیرانی صاحب کے کاغذات میں ملا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی صد سالہ تقریب ولادت کے موقع پر اورینٹل کالج میگزین میں شائع کرادیا۔ (مرتب)

پنجاب کے ساتھ اردو کے تعلقات کی کہانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے شروع نہیں ہوتی ہے' جب کمپنی سیاسی اغراض کی بنا پر اپنے مقبوضات میں اردو کی ترویج و اشاعت کی موید تھی بلکہ اس عہد سے بہت قدیم ہے۔ حضرت امیر خسرو اور ان سے متقدم محمد عوفی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے مشہور شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان (متوفی ۵۱۵ھ) عربی و فارسی کے علاوہ ہندی[1] زبان میں بھی صاحب دیوان تھے۔ ایک روایت ہے' جس کے معتبر ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش

نہیں، واضح ہوتا ہے کہ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (متوفی ۶۶۴ھ) ہندی زبان میں جو اردو کا قدیم نام ہے، دوہرے لکھتے تھے۔ شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ) نے اپنی تالیف "خزینہ رحمت" میں آپ کا ایک دوہرہ نقل کیا ہے جو یہ ہے:

سائیں سیوت گھل گئی ماس نرہیا دیہ
تب لگ سائیں سیو ساں جب لگ ہوسوں کیہ

انہیں گنج شکر کے اعقاب میں ایک اور بزرگ ہیں جو آپ کے ساتھ ہم نامی کے شرف کی بنا پر فرید ثانی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے دوہروں کا ایک مجموعہ سکھوں کے گرنتھ میں محفوظ ہے۔ فرید ثانی کے گورونانک کے ساتھ دوہروں میں سوال و جواب بھی ہوئے ہیں۔

پنجاب میں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو بطرز ریختہ لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے شیخ عثمان، شیخ جنید اور منشی ولی رام کے ریختے میری نظر سے گزرے ہیں۔ شیخ عثمان اور شیخ جنید عہد جہانگیری میں ہوئے ہیں اور منشی ولی رام شاہ جہاں کے عہد کے ایک صوفی منش بزرگ ہیں جو ۱۰۷۷ھ میں وفات پاتے ہیں۔ ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے دیوان و مثنویات فارسی کے علاوہ ایک دیوان ریختہ بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

پنجابی کے بعد اردو بھی اس صوبے میں نصابی اور تعلیمی زبان رہی ہے۔ چنانچہ اردو کا مشہور نصاب "خالق باری" بھی باقاعدہ درس میں داخل تھا۔ وارث شاہ علیہ الرحمتہ اپنی تالیف ہیر رانجھا میں، جو ۱۱۸۰ھ کی تصنیف ہے، اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح "صمد باری" بھی دیر تک یہاں کے مکتبوں میں رائج رہی ہے، جو اردو کا ایک اور نصاب ہے۔ بلکہ اردو نصابوں کی تقلید میں اس صوبے میں بھی اردو نصاب تیار کیے گئے ہیں۔ ان نصابوں میں سب سے مقدم "فرح الصبیان" ہے جسے لاہور کے شیخ اسحق لاہوری نے بہ عہد شاہ جہاں، ۱۰۵۷ھ کے قریب تالیف کیا ہے۔ اس نصاب کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو نصابوں میں بہ لحاظ قدامت خالق باری کے بعد اس کا نمبر آتا ہے۔ لیکن فرح الصبیان سے زیادہ اہم اور دلچسپ وہ نصاب ہے جو ۱۲۰۷ھ

میں لکھا جاتا ہے۔ اس کا نام "اللہ باری" یا "ذوق الصبیان" ہے اور مولوی احسن اللہ لاہوری اس کے مصنف ہیں لیکن اس کا ذکر آئندہ۔

جب اس صوبے میں اردو نصاب تیار کیے جارہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اردو کی یہاں کافی ضرورت محسوس کی جاتی ہوگی۔ چنانچہ اس کے آثار قدیم تصنیفات کی شکل میں بھی ملتے ہیں۔ میری تلاش اور تفتیش سے اور ظاہر ہے کہ ایک پردیسی کی تلاش چنداں باآور نہیں ہوسکتی' ایک درجن کے قریب ایسی اردو تالیفات کا سراغ ملا ہے جن کے مصنف پنجابی ہیں۔ اگر خود اہل پنجاب اس تلاش کو جاری رکھیں تو مجھے یقین ہے کہ ایسی اور بیسیوں کتابوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے جو پنجاب کی پیداوار مانی جاسکتی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے قبل لکھی گئی ہیں۔ میں ذیل میں ان کا ذکر کرتا ہوں:

۱۔ **مثنوی گلزار فقیر:** از غلام محی الدین بن شیخ محمد یوسف: میرپور فی زمانہ گذشتہ صدی کے سیاسی خلفشار و انتشار کے باعث داخل کشمیر ہے لیکن مغلیہ عہد میں داخل پنجاب اور سرکار گجرات میں شامل تھا۔ مثنوی ہذا ۱۱۳۱ھ میں لکھی جاتی ہے۔ اس مثنوی کا موضوع' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے' فقر و تصوف ہے۔ ہم مصنف کے حالات زندگی سے بالکل ناواقف ہیں۔ ان کے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ صوفی اور صوفی زادہ ہیں۔ مثنوی ان اشعار سے شروع ہوتی ہے:

سنو سادھو اک من کی بات ۔۔۔ جس سیں پائی ذات صفات
کہے فقیر غلام محی الدین ۔۔۔ دین دار کوں چاہیے دین
دین دار کوں دین پیارا ۔۔۔ داری دین پر عالم سارا
دین دار کا اوچا پایا ۔۔۔ چوداں طبق میں اس نے چھایا
توں کیا جانے دین کیا ہو(ے) ۔۔۔ نس دن خواب غفلت میں سو(ئے)
جس دن تس سبھ کچ پایا ۔۔۔ دھرتی انبر اور سبھ مایا
جو کچ ہے سو دین ہے دین ۔۔۔ کیا دنیا جھوٹی چرکین

دنیا لے کر دین نہ دیہ موتیں دے کر کیہ نہ لیہ
دیکھ عالم کیا بہتا جاتا توں دنیا سیں راتا ماتا
کہاں پیغمبر کہاں وہ پیر کہاں وہ خان اور کہاں امیر
یہ عالم تم سوں بیگانا جس سیں آخر تم کوں جانا
عقبیٰ سیں ہے کام تمہارا جہاں ابد لگ رہتے پسارا
دنیا چھوڑ عقبیٰ سیں لاگ نیند چھوڑ کر نس دن جاگ

کتاب میں اخلاق و تصوف کے بعض مسائل بڑے اختصار کے ساتھ چھیڑے گئے ہیں۔ مثلاً صفائے قلب، علم و عمل، طہارت و نجاست، اطاعت پیر، نور محمدی، غوث اعظم، فرائض صوفی اور توحید وغیرہ وغیرہ۔ زبان نہایت سادہ اور صاف ہے۔ مثنوی پر تبصرے کا یہ موقع نہیں ہے اس لیے میں اس سے دست کش ہوکر خاتمے کے اشعار نقل کرتا ہوں جو مصنف کے وطن و ولدیت اور تاریخ تصنیف پر روشنی ڈالتے ہیں:

غلام محی الدین ایک فقیر جس کا حضرت آپ ہے پیر
قطب عالم تھا میرا باپ جس نیں دیا اپنا آپ
حق کی راہ میں سب کچھ دیا سب کچھ دے کر حق کوں لیا
شیخ اجل اور عارف کامل قطب دین مکمل اکمل
شیخ محمد یوسف نام ہر کامل میں بہے تمام
خاندان بدا ہے گکھر اصل نجیب اور نیکو گوہر
سب سلطان دیوان اور خاں متشرع ہویں با ایمان
ان کے شہروں میں رہن ہمارا تولد مسکن انرو کہارا (کذا)
میر پور شہر ہے بیچ پنجاب حق راکھے دائم اس کی (آب)
یہ نسخہ جب بھیا تمام گلزار فقر کا کیا نام
تخمیناً" یہ نیک کلام چار پہر میں بھی تمام

ایک تیس برس ایک یاراں سو ہجرت سیں ہوئے تھے نو
پیغمبر اور آل اکرام لاکھ درود اور لاکھ سلام

"گلزار فقر" اسی سال لکھی جاتی ہے جس سال دہلی میں یہ تتبع ولی دکنی ریختہ گوئی کی بنیاد پڑتی ہے۔ شاہ حاتم کے دیوان میں سب سے قدیم غزل کی جو تاریخ ہے وہ اسی سنہ سے تعلق رکھتی ہے۔

۲۔ **مثنوی رمز العشق : از شاہ غلام قادر ابن شیخ محمد فاضل شاہ بٹالوی :** میں اس مثنوی کے متعلق "پنجاب میں اردو" میں کسی قدر تذکرہ کرچکا ہوں۔ اس بیان کو یہاں دہرانا نامناسب ہے، ہاں اس قدر عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "رمز العشق" چونکہ حضرت فاضل شاہ بٹالوی کی زندگی میں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں اسے ۱۱۵۱ھ سے قبل کی تصنیف ماننا ہوگا، جو ان کی وفات کا سال ہے۔ پنجاب میں اس مثنوی کو نہایت اہمیت حاصل ہے اور مثنوی گلشن راز کی طرح، جس کے ساتھ بہ لحاظ مطالب و مضامین اس مثنوی کو اشتراک بھی ہے، بہت کچھ وقعت دی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی سات آٹھ مختلف شرحیں عربی، فارسی اور اردو میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض کے ناموں کے ذکر پر قناعت کرتا ہوں:

(الف) شرح از شیخ ابواحمد محمد شاہ متوفی ۱۲۲۴ھ۔ یہ مصنف مثنوی کے پوتے ہیں اور اپنی شرح فارسی زبان میں لکھتے ہیں۔

(ب) بہ زبان عربی از مصنف صدر۔

(ج) اسرار العشق بہ زبان فارسی از سید حسین شاہ بٹالوی۔ اس کے علاوہ اس مصنف نے دو اور شرحیں لکھی ہیں۔ جن کی تفصیل مجھے معلوم نہیں ہوئی۔

(د) شرح اردو از حافظ انور علی رہتکی جو "الف" کا ترجمہ ہے۔

(ہ) شرح اردو از خلیفہ محمد بخش۔

(و) اسرار العشق مسمی بہ کنز العشق، بہ زبان اردو از شمس الدین فاضلی بٹالوی، طبع

امرتسر' ۱۳۴۱ھ - یہ شرح سید حسن شاہ کی تینوں شرحوں پر مبنی ہے۔

بٹالہ اب داخل گورداسپور ہے لیکن قدیم زمانے میں وہ خود ضلع تھا اور پنجاب کے مردم خیز شہروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ سبحان رائے مصنف "خلاصۃ التواریخ" اور شاعر مشہور مرزا نورالعین واقف اسی شہر کے متوطن ہیں۔ شاہ غلام قادر کا نام اردو کے حامیوں کی فہرست میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کی وجہ سے بارھویں صدی ہجری کے وسط میں شہر بٹالہ میں اردو کا دبستان قائم ہوتا ہے جس میں متعدد اصحاب یعنی شیخ نصیرالحق' شاہ مراد اور محمد جان وغیرہ حصہ لیتے ہیں اور اردو میں نظمیں لکھتے ہیں بلکہ مصنف مثنوی کے والد حضرت محمد فاضل الدین' جو بانیِ سلسلہ فاضلیہ ہیں' خود اسی تحریک کے حامیوں میں سے ہیں۔

۳۔ اردو کی تحریک جو درگاہ فاضلیہ سے اٹھی اور پروان چڑھی' نتائج کے لحاظ سے خاصی کامیاب معلوم ہوتی ہے۔ "رمزالعشق" کے بعد ہم ایک اور مثنوی سے دوچار ہوتے ہیں جو عاجز بٹالوی کی یادگار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب نے اس عہد میں دلی و دکن سے اپنے ادبی تعلقات قائم کرلیے ہیں۔ اس عہد کے مخطوطات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے لوگ سید بلاقی' ولی اورنگ آبادی' سراج دکنی' شاہ آبرو' فغاں و اشرف وغیرہ کے دواوین و تالیفات کا بڑے ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ جس طرح نظامی' سعدی' خسرو اور حافظ کا مطالعہ جاری ہے اسی طرح "فقہ ہندی" جو ۱۰۷۴ھ کی تالیف ہے اور سید بلاقی کا مولود نبی تصنیف ۱۰۶۷ھ اور محمد افضل کے بارہ ماسے کو یہاں کمال ذوق کے ساتھ پڑھا جارہا ہے۔ ان تالیفات کے متعدد نسخے نوشتہ پنجاب میری نظر سے گزر چکے ہیں۔

عاجز بٹالوی سیف الملوک اور بدیع الجمال کے قصے کو نظم کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ میں عاجز کے زمانے سے ناواقف ہوں مگر بارھویں صدی ہجری کے اواخر یا نصف دوم میں اس کو جگہ دی جاسکتی ہے۔ اس مثنوی کی زبان صاف نہیں ہے اور ہمیں اس کو عاجز کا ثمر خام کہنا چاہیے۔ اس میں پنجابی اثر کافی نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاجز

پنجاب سے باہر نہیں نکلا اور نہ اردو پر اسے پوری قدرت حاصل ہے تاہم ہمیں اس کی کوشش کو بہ نظرِ تحسین دیکھنا چاہیے۔ مثنوی کی ابتدا ہے:

کروں یاد میں حق کوں شام و پگاہ
محمد نبی ہے ہمارا گواہ

اس کی زبان اور وزن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے عہد کی یادگار ہے جب پنجاب میں دبستان دہلی پورا پورا اثر انداز ہوچکا ہے۔ پہلی دونوں مثنویاں ہندی وزن میں تھیں۔ ان کی زبان پر بھی قدامت غالب ہے عاجز کی مثنوی کا فارسی وزن ہے اور زبان غرابت سے خالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ہندوستان کی تالیفات موجود ہیں۔

سبب تالیف میں عاجز کا بیان ہے کہ میرے دوست مجھ سے مستدعی ہوئے کہ قصہ سیف الملوک کو ہندوی زبان میں لکھ دو۔ اگرچہ یہ قصہ فارسی زبان میں موجود ہے مگر فارسی ہر شخص نہیں جانتا۔ تم اگر ہندوی زبان میں کردو تو ہر شخص سمجھ سکے گا۔ بٹالہ میں اب تو تم ہی شعر و شاعری میں مشہور ہو اور ہمارے لیے تو خاقانی و انوری ہو۔ نہ تمہارے سوائے کوئی اور شخص نظر آتا جو اس کام کو سرانجام دے سکے، اس لیے ہم تم سے التجا کرتے ہیں۔ الغرض میں نے اپنے دوستوں کا التماس قبول کیا اور قصہ کی نظم میں مصروف ہوگیا۔ میں اس بیان کے صرف ضروری اشعار درج کرتا ہوں:

حقیقت سنو میری منظور کر
سناتا ہوں میں سب کوں مذکور کر
عجائب ہے یہ عشق کی واردات
نہ ہوگی سنی آگے اس طور بات
مرے دوست دار اور مشفق رفیق
مجوز ہوئے مجھ سیں اور ہر طریق
ہماری لگے کہنے کچھ عرض ہے
قبول اس کا کرنا تمہیں فرض ہے

که یہ قصہ عشق سیف الملوک
نیا ہندوی میں لکھو کر سلوک
اگر فارسی میں یہ مذکور ہے
ہر اک کی سمجھ سے ولے دور ہے
اگر ہندوی میں کرو تم اوسے
جو سمجھن میں ہر اک کی آوے بسے
تمہارے بغیر اب نکو اور ہے
بتالہ میں تیرا تو اب دور ہے
کہ مانند خاقانی و انوری
تو مشہور ہے در سخن پروری
توقع ہے ہم کوں تیری ذات پر
جو قصہ کہیں گا تو اس بات پر
غرض کہنا یاروں کا بھاری لگا
جگر موں سخن ہو کٹاری لگا
لیا مان کہنا رفیقوں کا میں
نہ کھ موڑا ان سب شفیقوں کا میں
اسی وقت لے کر قلم کوں بدست
کیا عشق نامہ کا میں بندوبست
گر اس میں کوئی سہو ہو یا خطا
اسے تھاکیو تم بذیل عطا
مرے عیب پر ہوجیو عیب پوش
برا بولنے سیں رہو تم خموش

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ ۱۲۶۰ھ میں لاہور میں لکھا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ

کمپنی کی آمد سے پہلے پنجاب میں یہ قصہ مقبول رہا ہے۔ مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو زبان، جسے وہ ہندوی کے نام سے یاد کرتا ہے، پنجاب میں عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

اگر ہندوی میں کرو تم اسے
جو سمجھن موں ہر اک کی آوے بسے

۴۔ اس موقع پر مجھے ایک کتاب "گنج شہیداں" کا ذکر کرنا چاہیے جو غلام غوث بٹالوی کی تصنیف ہے۔ ایک[۲] غوث بٹالوی کا ذکر "پنجاب میں اردو" میں آتا ہے جو بٹالہ میں جے سنگھ کے فرزند گوربخش سنگھ کی فوجداری میں ملازم تھا اور جس نے سنہ ۱۱۹۸ھ (م ۱۷۸۳ء) میں گوربخش سنگھ کا مرثیہ بہ زبان اردو لکھا ہے (صفحہ ۲۷۳۔ ۲۷۷، پنجاب میں اردو، بار اول)۔

گنج شہیداں کا یہ نسخہ پروفیسر فیض الحسن بٹالوی، پروفیسر فارسی، فیروزپور کالج کی مہربانی سے مجھ تک پہنچا ہے، جس کے لیے میں پروفیسر ممدوح کا تہ دل سے احسان مند ہوں۔ بقول مصنف اس نسخے میں تیرہ ہزار اور آٹھ سو ابیات ہیں۔ کتاب ماہ ربیع الاول میں شروع ہوئی اور دوسری ذی قعدہ کو سات مہینے اور گیارہ دن میں ختم ہوئی۔ بد قسمتی سے مصنف نے سال تصنیف نہیں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

یہ قصہ پرغم و پرسوز و پرساز
کیا تھا ربیع الاول میں یہ آغاز (کذا)
کئی میں نے جگر خواری شب و روز
پس از رنج و مشقت محنت و سوز
بتاریخ دوم در ماہ ذی قعدہ
کیا آخر ختم یہ قصہ سعد

مہینے سات ہیں اور روز یاراں
کہا جانو (تم) اس قصہ کوں یاراں
ہزاراں سیزدہ اور ہشت صد ہے
یہ سب نسخہ کی بیتوں کا عدد ہے
کیا حق نے مرا مقصود حاصل
ہوا بابخت اس نعمت سے واصل
خرد اپنی سے بر قول سعیداں
رکھا نام اس کا میں گنج شہیداں
نہ تھی طاقت اگر مجکوں سخن کی
ہوئی لاکن مدد یہ پنج تن کی

اگرچہ مصنف کے پرگو ہونے میں کوئی شک نہیں مگر اس نے اپنے حالات کے متعلق اس تالیف میں سکوت سے کام لیا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام غلام غوث ہے اور نام کی رعایت سے تخلص غوث ہے۔ وہ اپنے آپ کو حسینی اور حیدر پرست کہتا ہے:

حسینی مذہبم حیدر پرستم
غلام قنبرم ھرجا کہ ہستم
غلام غوث کوں ان کی غلامی
ہوئی حاصل بزرگی سے مدامی

یہ تالیف یقیناً فارسی ماخذ پر مبنی ہے چنانچہ مصنف خود کہتا ہے:

کتاب فارسی سے دیکھ مذکور
کیا ہندی میں اس قصہ کوں مشہور

ایک حیران کن امر یہ ہے کہ اس کتاب پر ایک مہر ہے جس پر "سری صاحب سہائے ۱۱۱۸" اور "۵۱" مرقوم ہے۔ یہ ۵۱ جلوس عالم گیری ہے جو ۱۱۱۸ھ کے مطابق ہے

مگر میں اس مہر سے یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ یہ نسخہ عہد عالمگیری کی تالیف ہے۔ میرا خیال ہے کہ مہر بعد میں کسی نے کتاب پر چسپاں کردی ہے۔

۵۔ اب میں بٹالہ کے مصنفین سے فارغ ہوکر اردو کے ایک اور حامی حافظ احسن اللہ لاہوری احسن تخلص کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یہ ہدایت اللہ ابن عنایت اللہ مہرکن کے فرزند ہیں۔ آبائی پیشہ مہرکنی کے ساتھ انہوں نے کتابت اور معلمی کو بھی ملالیا ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ۱۱۹۶ھ میں وہ ایک ضخیم لغت "مفتاح الافواہ" جو سترہ اٹھارہ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، ختم کرتے ہیں۔ ۱۲۰۷ھ میں وہ ایک اور اردو نصاب تیار کرتے ہیں جس کا نام "اللہ باری" یا "ذوق الصبیان" ہے۔ اس نصاب کی زبان گذشتہ تصنیفات کے مقابلے میں نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ ملاصاحب اردو کے متعلق فرماتے ہیں کہ بچے اس آسان زبان کو شوق کے ساتھ خوشی خوشی پڑھتے ہیں:

یہ آساں اور ہندی بولی
لڑکوں کو اک کھیل ہے کھولی
خوشی خوشی پڑھتے ہیں اوس کو
چشم و سر اوپر دھرتے ہیں اوس کو
ذوق الصبیان نام رکھا ہے
سال اوس (کا) "درباغ" کہا ہے

اصل نصاب سے ایک اقتباس ذیل عرض ہے:

سجن دوست ہے یار خلیل
تھوڑا اندک کم و قلیل
بہتا بیش، بس و بسیار
افزوں زیادہ وافر دار

فیل اور پیل اور مکنا ہاتھی
ہمدم ہمرہ بیلی ساتھی
سنگ و سنگت قافلہ کارواں
سوداگر تاجر بازرگاں
پتھر سنگ رتن ہے جوہر
مروارید موتی در و گوہر
مربع چورس گرد ہے گول
نرخ بہا اور قیمت مول
اجر و اجرت مزد و مزدوری
روغن گھیو ملیدہ چوری

ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ جب پنجاب میں اہل پنجاب اردو کے نصاب از خود تیار کررہے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہاں کے لوگوں کو اردو کے ساتھ بہت کچھ ارتباط ہوگا۔

۲۔ ۱۲۱۳ھ میں ملا احسن اللہ' عقائدو فرائض اسلام پر ایک تالیف بہ زبان اردو لکھتے ہیں۔ "بخشایش" اس تالیف کا سال تاریخ ہے اور "بخشش نامہ" نام ہے:

جو ہے ذکر بخشش میں یہ قیل و قال
تو "بخشایش" اس کا ہے تاریخ سال
ہے بخشش نامہ رکھا اوس کا نام
کہ ہم عاصیوں کو ہے بخشش سے کام

"بخشش نامہ" کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ملا صاحب' جو کبھی پنجاب سے باہر نہیں گئے اور اردو زبان انہوں نے پنجاب میں بیٹھ کر سیکھی ہے' اپنے شگفتہ اسلوب بیان سے' ان کی کتاب آج بھی ہمارے لیے دلچسپی کے سامان رکھتی ہے۔ ملا صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہندی زبان میں مجھ کو شعور نہیں ہے اور نہ میں کبھی ہندوستان گیا ہوں' ایک دوست کی فرمایش سے میں نے یہ کتاب لکھ

دی ہے۔ فقر و تصوف پر اور زبانوں میں کافی تالیفات دستیاب ہوتی ہیں لیکن اردو زبان اس سے خالی ہے۔ اس خیال سے میں نے اس زبان کے باغ میں یہ پودا لگایا:

نہ تھا گرچہ ہندی میں مجھ کو شعور
کہ لاہوری بدھو ہوں سدھ بدھ سے دور
نہ ہندوستان میں (میں) پہونچا کبھو
نہ اوس بوستاں کی لئی میں نے بو
پر ایک دوست کا مان حکم و رضا
جو دیکھا سنا بارے جیوں تیوں کہا

ہندوستان کے شعرا کی طرف ایما کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جو پہونچا ہے اوس باغ سے کوئی پھول
تو گئیں بلبلیں اپنی بولی کو بھول
کہاں بلبلوں کی ہزاراں صدا
کہاں قمریوں کی صدا خوش ادا
کہاں عندلیبان شیریں سخن
کہاں بذلہ گویان نمکیں دہن
کہاں شاعراں (ہیں) وہ صاحب شعور
ہر اک بیت ان کا سرائے سرور
ہر اک بذلہ ان کا عجائب نکات
ہر اک بات ان کی چو قند و نبات
بھلا اب کہاں یہ بیچارہ حقیر
سوا خیر حاضر نہ جانے فقیر
ہے ہرچند پرگو یہ لاہوری غول
مغل دیکھے پر فارسی جائے بھول

نہ کچھ شعر کا ہے شعور و شعار
سو اشعار اپنے سے ہے بلکہ عار

اگرچہ وہاں پھول ہیں رنگ رنگ
گل فقر سے پر ہیں وہ باغ تنگ

جو دیکھا یہ گل ہے جہاں اور کہاں
عرب و عجم کیا یہاں کیا وہاں

بہ ترکی و کشمیری و فارسی
نہ عاری ہے اس رو سے کوئی آرسی (کذا)

بہرحاک یہ پھول و پھل ہے لگا
یہاں تک جو پنجاب میں بھی اوگا

یوہیں دل میں آیا کہ یہ کیا ہے بات
نہ اس گل کا ہو وہاں[۳] کوئی پھول پات

جو یہ بات آئی مرے دل میں بس
تو ان باغوں کی کرکے ریس اور ہوس

بنایا میں یہ باغ لاہور میں
اوسی طرز میں اور اوسی طور میں

لگایا ولے اس میں در ہر محل
گل فقہ اور فقر کا پھول پھل

۷۔ حضرت مراد شاہ کئی تصنیفات کے مالک ہیں۔ دیوان کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ ہندوستان میں کئی سال رہنے کی بنا پر ان کی زبان بالکل صاف ہوگئی ہے۔ ۱۱۹۶ھ میں ایک منظوم خط یاران وطن کو لکھتے ہیں جو "نامہ مراد" کے نام سے موسوم ہے اور نامی[۴] صاحب کی کوشش سے چھپ بھی گیا ہے۔ اس خط میں اردو کی مقبولیت کے سلسلے میں مراد شاہ فرماتے ہیں:

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھ سے میں ہندی زباں میں
کروں، شہرت ہو تا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت میں اس کی سب سخن داں
سمند طبع کو کرتے ہیں جولاں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں
کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرہ اب ہوجائے سب تک
یہاں سے تا بہ ایراں بل عرب تک
خصوصاً" شعر اب شاعر یہاں کے
نہیں کہتے بجز ہندی زباں کے
غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے
کہ شعر فرس مطعون زماں ہے
یہ شہرت ہے اب اس مضمون تر کی
نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی

سنہ ۱۲۱۴ھ میں شاہ مراد اپنے شاگرد حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر قصہ چہار درویش کی نظم پر مصروف تھے بلکہ ایک حصہ نظم بھی کرچکے تھے کہ پیام اجل آپہنچا اور عین عالم شباب میں ۱۲۱۵ھ میں اس جہان فانی سے رحلت کی۔

۸۔ سنہ ۱۲۰۴ھ میں مثنوی سرمکنون غالباً" بہ تقلید "رمز العشق" لکھی جاتی ہے۔ اس میں ایک ہزار سے زائد ابیات ہیں اور سرخیوں کی جگہ دوہرے لائے گئے ہیں۔ فقیر اللہ اس کے مصنف ہیں۔ خاتمہ سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

فقیراللہ کیا کی بات
سرکنوں ہے شاہ کی ذات
شاہ ہمارا شاہ ہمارا
کل عالم کا سرجن ہارا
سرکنوں کے سن کوں جان
یعنی عدد "چراغ" پچھان
سرکنوں کوں کیا تمام
شاہ جیلانی کا لے کر نام
علی ولی کا ہے وہ پوت
جس کی منزل ہے لاہوت
ہے وہ سید عبدالقادر
ظاہر باطن اول آخر

۹۔ مثنوی گل ریز از حافظ مرتضیٰ ولد محمد خاں شہاب الدین زئی خویشگی قصوری۔ مصنف نے اس مثنوی میں جو ۱۲۰۶ھ میں ختم ہوتی ہے، ضیاء نخشبی کے فارسی افسانہ گل ریز کا خلاصہ اردو نظم میں کیا ہے:

ابتداء: خدایا خدائی ہے لایق تجھے

خاتمہ: یہ ہے مرتضیٰ دل سوں تیرا غلام
لطف راکھ اپنا تو نس دن مدام

یہ مثنوی میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

۱۰۔ مثنوی چمن سیر عرف قصہ مرغ زریں از احمد سرہندی: میرے پاس جو نسخہ ہے، ابتداء سے ناقص ہے۔ خاتمہ میں ناظم قصہ کتاب کا نام اور تاریخ تصنیف بدیں الفاظ بیان کرتا ہے:

ہوئی تیار جب اتمام بالخیر
رکھا میں نام اس کا اب چمن سیر
ششم تاریخ تھی کیا نیک دن ہاں
مبارک تھا مہینہ ماہ رمضان
کوئی پوچھے کہ سن ہجری پیغمبر
جو باراں سو سے تھے وہ تیں اوپر
ہوا شاعر مجھے جو دل پسندی
مصنف اوس کا ہے احمد سرہندی
پڑھے کوئی سنے لایو نہ تم دیر
دعا کیجو میرے حق میں بھی باخیر

"چمن سیر" کی زبان جدید ہے اور اجنبی و نامانوس الفاظ سے پاک ہے۔ لیکن اس میں کافی خامیاں نظر آتی ہیں۔ ناظم کو اردو پر قدرت نہیں ہے۔ نمونے کے واسطے میں چند شعر یہاں درج کرتا ہوں جو شہزادہ حسین کی کنویں سے رہائی کے بیان میں آتے ہیں:

مجھے دے ساقیا یک جام برلب
نکلتا کنوئیں سے اب ماہ نخشب
روایت لاتے ہیں پیران کامل
خبر دیتے ہیں شہزادہ کے ناقل
کہ جب سے بھایوں نے کوے میں ڈالا
کیا وں پر ستم جگ سے نرالا
ہوئے چالیس دن کوئے کے اندر
نہ تھا محرم کوئی بجز ذات اکبر

جو کچھ تدبیر ہوتی ہے بشر کی
جو کچھ تھا آذقہ وس پر گزر کی
ہوا جب آذقہ مصروف آخر
رہا وہ سات دن بھوکا سراسر
جو کن ساتوں میں کچھ کھانا نہ پایا
وہ آخر کو تو جاں کندن میں آیا
نہ ہی تھی وس میں کچھ جینے کی باقی
ولے تھی ایک رمق وس میں حیاتی
جو پہنچی آن اس کی نیک ساعت
ہوئی رب کی خلاصی پر ارادت
جیسے پھرتے تھے سب دیواں یکایک
وہ آگے آگیا کواں اچانک

۱۱۔ "واردات" تحسین کی ایک نظم ہے جس میں ایک سو چھتیس اشعار ہیں۔ یہ اشعار چار چار ہم قافیہ مصرعوں کے بندوں میں منقسم ہے اور بخط مصنف نوشتہ ذی قعدہ ۱۲۳۶ھ میرے پاس ہے۔ نظم میں شاعر نے اپنے ایک سفر کا ذکر کیا ہے جو اس نے میرپور میں اپنے ایک دیوان زادہ شاگرد سے ملنے کے لیے' جس سے اس کو ملازمت ملنے کی امید تھی' اختیار کیا ہے۔ وہ اپنے وطن سے پیادہ پا چل کر تکلیفیں جھیلتا ہوا تیسرے دن چاشت کے وقت میرپور پہنچتا ہے اور سیدھا اپنے شاگرد کے ہاں' جو ایک بااختیار رئیس ہے' جاتا ہے۔ لالہ صرف زبانی خاطرمدارت اور آؤ بھگت سے کام لیتے ہیں۔ چاشت سے عصر کا وقت آجاتا ہے لیکن اس نے جھوٹ موٹ کو بھی کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔ رات بغیر کھائے بسر ہوتی ہے۔ دوسرے دن وہ اپنے ایک ملاقاتی عبدالودود نامی سے ملتا ہے جو شاعر کو اپنے گھر لے جاکر کھانا کھلاتا ہے۔ میرپور میں اس وقت میر بھلون(۵) نامی ایک مشہور اولیاء اللہ ہیں۔ تحسین زیارت کے لیے ان کی

خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ وہ آنے کی تقریب پوچھتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں۔ شیخ مسکرا کر
حافظ کا شعر پڑھتے ہیں کہ :

گفتہ بودی کہ شوم مست و دو بوست بدھم
وعدہ از حد بشد و ما نہ دو دیدیم و نہ یک

مقصد یہ تھا کہ دیوان زادہ کی طرف سے کسی قسم کی توقع رکھنا بڑی غلطی ہے۔
ایک دن شاعر پھر دیوان زادہ کے ہاں جانکلتا ہے۔ لالہ زبانی سلام و احترام تو بہت بجالاتا
ہے لیکن آب و طعام کا آج بھی ذکر نہیں کرتا۔ آخر لالہ کہتے ہیں کہ مجھے کسی غرض
سے آپ کے وطن کی طرف جانا ہے۔ اگر آپ چلنے کو آمادہ ہیں تو آپ کی سواری کے
لیے گھوڑا تیار ہے۔ تحسین تفصیل کے ساتھ اس گھوڑے کی مذمت کرتا ہے اور بدل نا
نخواستہ اس پر سوار ہوتا ہے۔ شام تک لکرائی پہنچتا ہے اور دق آکر گھوڑے کو چھوڑ دیتا
ہے۔ دوسرے دن سفر میں گزار کر تیسرے دن ہمارا شاعر بخیریت اپنے وطن پہنچ جاتا
ہے۔ یہ واقعات ہیں جن کو تحسین واردات میں بیان کرتا ہے۔ اس نظم کی ابتدا ہے :

ایک صاحب زادۂ دیواں کے تھے استاد ہم

نمونے کی غرض سے میں چند اشعار اس نظم کے یہاں درج کرتا ہوں :

میر بھاون شاہ کا مدت سے تھا شوق جمال
تھے وہ اپنے عہد کے کامل ولی اہل کمال

ایک مسجد میں ہوا بالاتفاق ان کا وصال
مہرباں ہوکر کیا اپنے کرم سے قیل و قال

پھر کہا آنے کا اپنے اب کرو موجب عیاں
عرض کی میں نے کہ ہے کب بر دل روشن نہاں

ڈالے ہے گردش جہاں پر سفلہ پرور آسماں
ہنس کے یوں کہنے لگے خامش ہوا مطلب عیاں

حاکم اس جاگا کے پاس آئے ہو جو قسمت سولو
شعر حافظ کا پڑھا یہ کہہ کے شاہ نیک خو

تم کہا تھا دوں گا دو بوسہ و لیکن مست ہو
وعدہ آخر ہوچکا ہم نے نہ اک دیکھا نہ دو

دل میں بے شک اس کے سننے سے ہوا مجھ کو یقیں
شاخ آہو پر برات عاشقاں واصل نہیں

یہ سفر قسمت میں تھا اور دیکھنی تھی یہ زمیں
اب قضائے آسمانی سے نہ کیجے دل غمیں

بیٹھ کر دو ساعتیں خدمت میں با حکم ادب
دست بوس شاہ کر تب میں ہو یا رخصت طلب

قصہ کوتہ مخلص اپنے آگے در ہنگام شب
کردیا ظاہر یکایک روز کا احوال سب

۱۲۔ رحمت شیریں و فرہاد کے قصے کا ناظم ہے، جو ہندی بحر میں لکھا گیا ہے۔ نو دس شعروں کے بعد بند کے طور پر تمیز کے لیے ایک دوہرہ لایا گیا ہے۔ اس کی زبان پنجابی، اردو اور برج ملی جلی ہے۔ رحمت اپنا وطن "پوری" بتاتا ہے، جہاں جگدیو کا استھان ہے۔

۱۳۔ مثنوی فتح الرمز جو غالباً" پنجاب کے مشہور صوفی حضرت شیخ نور محمد کی، جو شاہ سلیمان تونسوی کے پیر ہیں، تالیف ہے اور سنہ ۱۲۵۰ھ میں ختم ہوتی ہے۔ اس کی زبان اردو اور پنجابی آمیز ہے۔

۱۴۔ رنجیت سنگھ اور کمپنی کے دور کا ایک سیالکوٹی شاعر ہے جس کا تخلص "عشق مچہ" یا "مچہ" ہے۔ اس کا دیوان میرے پاس موجود ہے، جس میں غزلیات کے علاوہ ایک واسوخت، چند مناقب، مخمس اور رباعیاں ہیں۔ اس کے زمانے کا پتہ ان بعض تاریخوں سے چلتا ہے جو آخر دیوان میں درج ہیں۔ مثلاً راجہ رحم اللہ رجوی والا کی تاریخ وفات سنہ ۱۲۶۳ھ اور تاریخ تولد فرزند مہر و طوائف سنہ ۱۲۶۵ھ۔ ایک و

موقعوں پر شاعر نے اپنے استاد فرید کا نام بھی لیا ہے۔ عشق ہیچ کے ہاں اگرچہ کوئی جدت اور بلند خیالی نظر نہیں آتی اور زبان کے عیب بھی پائے جاتے ہیں تاہم وہ اس دبستان کا جو دہلی اور لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے، ایک کامیاب مقلد ہے اور غالباً پنجاب میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے، جس سے ہم واقف ہیں۔ میں بخوف طوالت نمونہ کلام دینے سے احتراز کرکے صرف دو شعروں پر قناعت کرتا ہوں:

پلٹن میں ہے تیرا انگلوں کی
مژگاں بھی تو ایک کمپنی ہے
خط سمجھو نہ گورے منہ پہ اس کے
کالے لوگوں کی چھاؤنی ہے

یہ فہرست سنہ ۱۱۳۱ھ سے لے کر ۱۲۶۵ھ تک کے پنجابی مصنفین و تصنیفات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں صرف انہی لوگوں کو شامل کیا ہے جو صاحب تصنیف کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اس فہرست میں ان لوگوں کو نہیں لیا گیا ہے جنہوں نے تفریحاً اردو میں گاہے گاہے سخن سرائی کی ہے اور جن کا کلام اس عہد کی بیاضوں میں ملتا ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو شامل کرلیا جاتا تو فہرست نہایت دراز ہوجاتی۔ ان اردو گویوں میں ہم پنجاب کے بعض محترم اشخاص کا نام بھی دیکھتے ہیں مثلاً غنیمت کنجاہی، دلشاد پسروری، حضرت وارث شاہ مصنف ہیر و رانجھا، شیخ موسیٰ جن کا کلام نہایت پرتاثیر ہے۔ فقیر نورالدین و فقیر عزیزالدین جو رنجیت سنگھ کے عہد میں مدارالمہام تھے۔ ایسی بیاضیں کثرت سے ملتی ہیں جن میں ان اردو سرایوں کا کلام ملتا ہے۔ اگر تمام کا جائزہ لیا جائے تو ایک علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس مضمون کے متعلق ہمارے پاس صرف دو ذریعہ معلومات ہیں۔ پہلا "پنجاب میں اردو" جس میں ایک پورا باب اسی اطلاع کا حامل ہے۔ دوسرا ایک سیر حاصل مضمون جو قاضی فضل حق، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے فروری ۱۹۳۳ء کے اورینٹل کالج میگزین میں سپرد قلم کیا ہے لیکن یہ مضمون ابھی تک بہت تشنہ ہے اور اس سلسلے میں تحقیقات کی کافی گنجائش ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سنہ ۱۸۴۶ء میں جو ۱۲۶۳ھ کے مطابق ہے، پنجاب پر قابض ہوجاتی ہے۔ اس عہد میں اردو کو پنجاب میں سرکاری حیثیت مل جاتی ہے۔ لیکن یہاں ایک اور امر، جو نہایت ضروری گزارش طلب ہے، یہ ہے کہ موجودہ صوبائی تقسیم کی رو سے، جس پر کمپنی کے زمانے سے عملدرآمد ہے، ہمیں پنجاب میں درحقیقت اردو کے دو دبستان ماننے پڑیں گے۔ ان میں ایک دبستان کا ذکر آچکا ہے۔ دوسرا دبستان ہریانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ فی زمانہ ہریانہ کا اطلاق ایک محدود خطہ زمین پر ہوتا ہے لیکن میں نے اپنی سہولت کی غرض سے ان مقامات کو بھی ہریانہ میں شامل کرلیا ہے جو قدیم زمانے میں تقریباً سرکار دہلی میں داخل تھے۔ ہریانہ میں گیارھویں صدی ہجری سے دیسی زبان میں ہم ایک نئی تحریک دیکھتے ہیں جس کے آثار عالمگیر کے عہد سے ہمیں ملتے ہیں۔ میں اس تحریک کے متعلق کوئی تفصیلی اطلاع تو نہیں دینا چاہتا اس لیے کہ یہ کام دراصل جائزہ اردو کی دہلی شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ چونکہ سرکاری و دیگر لسانی رپورٹیں ہریانی میں عام طور پر کسی قسم کے لٹریچر کے وجود سے لاعلمی ظاہر کرتی ہیں، میں سطور ذیل کا اضافہ مناسب خیال کرتا ہوں۔

ہریانی زبان کو جٹو، بانگڑو وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زبان کی سب سے قدیم تالیف، جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں، شیخ عبداللہ انصاری پانی پتی کی "فقہ ہندی" ہے جو سنہ ۱۰۷۴ھ میں بہ عہد عالم گیر لکھی جاتی ہے:

فقہ ہندی کو مومناں آنو زباں پر یاد
مسئلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد

سنہ ہزار چوہتر بیچ (ماہ) رمضان تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا نظام

یہ کتاب ہندوستان و پنجاب و گجرات میں کافی مقبول رہی ہے اور بمبئی میں "رسالہ عبدو" کے نام سے چھپ بھی چکی ہے۔

میر عبدالواسع ہانسوی اسی عہد میں اپنا نصاب سہ زبان جو "صمد باری" و "جان

پہچان" کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے' تالیف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہریانی زبان کی ایک لغت' جو اردو کی قدیم لغت مانی جاسکتی ہے' تصنیف کرتے ہیں۔ اس لغت کا نام "غرائب اللغات" ہے۔ خان آرزو اپنی اصلاحات کے ساتھ اس لغت کی ایک جدید اشاعت تیار کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں ہم محمد افضل کی "بکٹ کہانی" یا بارہ ماسہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ افضل کو مختلف لوگوں نے مختلف نسبتوں سے یاد کیا ہے۔ کوئی اس کو 'جھنجھانوی' کوئی پانی پتی اور کوئی نارنولوی بیان کرتا ہے۔ افضل کا بارہ ماسہ پنجاب و ہندوستان میں نہایت مقبول و معروف ہوا۔ میر حسن اپنے تذکرے میں اس کی قبولیت کا ذکر کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں جعفر زٹلی کا نام لینا چاہیے جن کا کلیات اپنی گنگا جمنی اردو اور فارسی کے لیے مشہور ہے۔ اکرم رہتکی اپنا تیرہ ماسہ سنہ ۱۱۴۳ھ میں ختم کرتا ہے۔ محبوب عالم ساکن جھجر متعدد تصنیفات کے مالک ہیں۔ ان میں سے "محشر نامہ" اور "مسائل ہندی" ہندی وزن میں ہیں۔ "نور نامہ" اور "درد نامہ" فارسی وزن میں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان دوہرہ جات ہندی بھی ان کی یادگار ہے۔

شیخ عبدالحکیم (متوفی: ۱۱۸۷ھ) "دہیز نامہ بی بی فاطمہ" اور "خواب نامہ پیغمبر" کے مصنف ہیں۔ بسمل تھانیسری کئی منظوم مذہبی رسالے لکھتے ہیں۔ ان کے بعد ہریانہ دبستان میں سب سے زیادہ مشہور مصنف شیخ محمد رمضان مہی ہیں' جن کی "آخر گت" اور "بلبل باغ محمد" نظم میں اور "عقائد عظیم" نثر میں ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور چھوٹے چھوٹے رسالے ان کے قلم سے نکلے ہیں مثلاً "نصیحت نامہ" اور "رنگیلی" وغیرہ۔

شاہ غلام جیلانی رہتکی (متوفی: ۱۲۳۵ھ) "چوپائیوں" کے مالک ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ چوپائیاں ایک نہایت بلند پایہ شاعری کی حامل ہیں۔

نواب فیض محمد والی جھجر (سنہ ۱۸۱۴ء و ۱۸۳۵ء) کی سرکار میں ایک شاعر شیخ غلام نبی نارنولوی تھے جن کی تصنیفات سے ایک راگ مالا مشہور ہے۔ اسی زمانے میں ایک

اور بزرگ غلام حسین چشتی بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک راگ مالا ان کی طرف بھی منسوب ہے۔

اس مضمون پر مفصل اطلاع کے لیے "اورینٹل کالج میگزین" کے نمبر ۲۷ و ۲۸ ملاحظہ کیجیے جو نومبر سنہ ۱۹۳۱ء و فروری سنہ ۱۹۳۲ء کو شائع ہوئے ہیں۔

حواشی

(۱) کیونکہ مسلمان ہر دیسی زبان کو ہندی کہہ دیتے تھے اس لیے یہاں غلط فہمی کا احتمال ہے۔ اس شبہ کے ازالے میں شیرانی صاحب کا یہ بیان ملحوظ خاطر رہنا چاہیے : "خواجہ مسعود سعد سلمان کو ہندی کا پہلا صاحب دیوان مانا جاتا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ اس ہندی سے مراد پنجابی زبان ہے۔" (مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد اول، صفحہ ۹۹) ۔ مرتب ۔

(۲) لفظ "ایک" سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیرانی صاحب ان دونوں اشخاص کے فرد واحد ہونے پر اصرار نہیں کر رہے۔ (مرتب)

(۳) کذا ۔ یاں

(۴) پیر غلام دستگیر نامی (۱۸۸۳ ۔ ۱۹۶۱ء) سجادہ نشین حضرت عبدالجلیل شاہ چوہڑ بندگی سہروردی۔ رتہ پیراں ضلع شیخوپورہ میں وفات پائی۔ (مرتب)۔

(۵) سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ سید عبدالکریم نام تھا۔ مزار میرپور چونگہ میں ہے۔ آپ کے والد سید بلاق شاہ قادری کا مزار میوہسپتال لاہور کے احاطے میں موجود ہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۱۷۵، پنجاب کے قدیم اردو شعرا) ۔ مرتب۔

اردو کا دبستانِ دہلی

(از "ماہ نو" لاہور، بابت ستمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء)

اس غیر مطبوعہ مضمون کا مسودہ بھی حافظ صاحب کے کاغذات میں ملا تھا۔ ممکن ہے مکمل نہ ہونے کے سبب سے یہ شائع نہ ہوسکا ہو۔ بہرحال میں نے اسے محفوظ کرنے کی غرض سے شیرانی صاحب کی صد سالہ تقریبات ولادت کے موقع پر "ماہ نو" میں چھپوا دیا تھا۔

میرے خیال میں یہ تشنہ سا مضمون مولف کی زندگی کے آخری برسوں میں قیام ٹونک کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔ اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ مضمون میں ایک جگہ خان آرزو کی نوادر الالفاظ کے حوالے سے فرماتے ہیں: "گویا اب سے دو صدی قبل برج اور اردو مختلف زبانیں مانی جاتی تھیں۔" اب نووارد الالفاظ کا سال تالیف ۱۱۶۵ھ ہے اور شیرانی صاحب کی وفات اس سے پورے دو سو سال بعد ۱۳۶۵ھ (۱۹۴۶ء) میں ہوتی ہے۔ ادھر ۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے حافظ صاحب کو ہندوستان اکیڈمی، الہ آباد میں لیکچروں کا ایک سلسلہ ایراد کرنے کی دعوت دی تھی (مکاتیب حافظ محمود شیرانی، صفحہ ۱۹۱)۔ اس کے جواب میں لیکچروں کا موضوع تجویز کرتے ہوئے مئی ۱۹۴۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "اگر میں اردو کے مختلف دبستان مثلاً گجری، ہریانی، راجستھانی وغیرہ لوں تو کیسا؟ ایک لیکچر ریختہ پر ہو سکتا ہے.....“

(ایضاً")

اب اردو کے ان نام بردہ دبستانوں پر بلکہ پنجابی دبستان اردو پر بھی (دیکھیے مضمون : "پنجاب میں اردو کی سرگزشت کا ایک فراموش شدہ ورق" مشمولہ مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد دوم) موصوف کے مضامین پہلے ہی موجود تھے۔ البتہ دہلی کے اردو دبستان پر وہ بوجوہ خاطر خواہ توجہ نہ دے پائے تھے۔ لہٰذا اس موضوع پر یہ مضمون نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی مزید تفصیلات سپرد قلم کرنے کی مرحوم کو مہلت نہ مل سکی۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں اردو کے دبستان دہلی سے مراد لسانی اور شعری دونوں دبستان ہیں۔

(مرتب)۔

پیشتر اس کے کہ ہم دبستان دہلی کی سرگزشت شروع کریں، بعض ایسے امور بیان کرتے ہیں جن کا براہ راست دہلی اور اس کی تاریخ و جغرافیائی پہلو سے تعلق ہے۔ شہر دہلی مسلمانی عہد میں ہندوستان کا دارالسلطنت بنتا ہے لیکن وہ ایسا شہر نہیں جس کی قدامت ہمیں ہندوؤں کے اساطیری عہد میں لے جائے۔ مسلمانی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چوتھی صدی ہجری میں آباد ہوتا ہے۔ البیرونی کے عہد میں اس کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اس لیے ہندوستان کے مختصر جغرافیہ میں جو البیرونی نے کتاب الہند میں رقم کیا ہے، اس کا ذکر نہیں آیا۔

اس کے بعد ابوالفرج رونی، شاعر لاہور اس کا نام لیتا ہے۔ چونکہ یہ تلمیح عام طور پر معلوم نہیں ہے اس لیے میں اس کے قصائد سے وہ شعر یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں :

سوز دھلی کہ کار میرت کرد

قصد وایلش بی سروسامان

سنسکرت کے بعض کتبوں میں جو غلاموں اور ان کے مابعد زمانہ سے متعلق ہیں،

دہلی کا ذکر ملتا ہے۔ ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قدیم تلفظ ڈھلی با تشدید ہے یا ڈھلی بغیر تشدید ہے۔ چونکہ مسلمان نووارد اس تلفظ کی ادائیگی سے قاصر تھے اس لیے انہوں نے ڈال ہندی کو دال سے اور ہائے مخلوط کو ہائے مجزوم میں بدل دیا اور دہلی بولنے لگے۔ دلی جو اسی شہر کا دوسرا نام ہے' ایک اور ترمیم ہے جو اگرچہ کتابت میں کم مستعمل ہے لیکن عوام کی زبان پر زیادہ رائج ہے۔

سنہ ۵۸۹ھ میں معزالدین محمد بن سام نے دہلی فتح کی اور بہت جلد بعد یہ شہر مسلمان مفتوحہ علاقے کا دارالسلطنت بن گیا۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ایام میں دہلی کی زبان کیا تھی؟ اس سوال کا تاریخ اور معاصر دستاویزات کی عدم موجودگی میں کوئی قطعی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے ظنی حیثیت رکھتا ہے۔

مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے بعد تمام مفتوحہ علاقے کو مختلف اقطاع اور ولایتوں میں تقسیم کردیا ہے اور پرانی تقسیم کو جو ہندو عہد میں تھی برقرار نہیں رکھا۔ ملک کی یہ تقسیمیں ہر عہد اور زمانے میں اس عہد کی ضروریات و مقتضیات سیاسیات کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ اسلامی عہد میں جس طرح ہانسی' سرستی اور سوالک وغیرہ علیحدہ علیحدہ اقطاع بنادیئے گئے تھے۔ دہلی بھی ایک ضلع بنادیا گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندوانی عہد کی تقسیم کے مطابق دہلی ہریانہ دیس میں شامل تھا۔ غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ و ۶۸۷ھ م ۱۲۶۵ء و ۱۲۸۷ء) کے عہد کے ایک سنسکرت کتبے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ہندو بھی دہلی کو ہریانہ[۱] دیس میں داخل سمجھتے تھے۔ فی زماننا اگرچہ لسانی رو سے دہلی داخل ہریانہ ہے لیکن جغرافیائی اعتبار سے ہریانہ کا اطلاق صرف اس قطعہ زمین پر ہوتا ہے جو اکثر ضلع حصار اور بعض علاقہ رہتک پر شامل ہے جس میں تحصیل فتح آباد اور حصار کا مشرقی حصہ' تمام تحصیل ہانسی' بھوانی تحصیل کے نصف شرقی کا بعض حصہ' ریاست جیند کی نظامت داوری کا شمال مشرقی حصہ' ریاست دوجانہ کا بعض علاقہ اور ضلع رہتک میں شہر رہتک' مہم' جھجر وغیرہ شامل ہیں' جس سے صاف

ظاہر ہے کہ ہمارے عہد کا ہریانہ ایک نہایت مختصر قطعہ زمین ہے[۲]۔ بہ حالے کہ قدیم زمانے میں اس کا رقبہ اس قدر وسیع تھا کہ شہر دہلی بھی اس میں شامل تھا۔

سب سے پیشتر سرسید احمد خاں اپنی کتاب آثار الصنادید میں اس کتبے کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کتبہ موضوع بوہر ضلع رہتک میں موجود ہے' اگرچہ دراصل موضع پالم کے ایک کنویں کا تھا جو دہلی سے بارہ میل پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں یہ کتبہ کہیں غائب ہوگیا لیکن بعد میں بوہر ہی میں مسٹر جے۔جی۔ڈیلمرک کو مل گیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں میجر اے۔ سی۔ مارٹن' ڈپٹی کمشنر' رہتک نے دہلی میوزیم کے اثریات میں داخل کردیا۔

کتبہ ہذا ساون بد ۱۳۳۷ بکرمی کا نوشتہ ہے۔ چونکہ اس میں بلبن کے عہد تک کے تمام سلاطین دہلی کے نام موجود ہیں' اس لیے میں اس کا بعض حصہ انگریزی ترجمے سے یہاں نقل کرتا ہوں۔ اصل کتبہ فہرست دہلی میوزیم اثریات میں صفحہ ۱۸ تا ۲۸ پر اور وہاں سے کتبات مسلمانان ہند میں' بابت سال ۱۴۔ ۱۹۱۳' مرتبہ غلام یزدانی ایم۔ اے' کے صفحات ۳۵ تا ۴۵ پر درج ہے:

س نمبر ۳: ہریانہ دیس میں ابتدا تنوروں کی حکومت تھی پھر چوہانوں کی ہوئی اور اب سک (مسلمان) حکم ران ہیں۔

س نمبر ۴: ابتدا میں ساہب دین (شہاب الدین) (بادشاہ ہوا) اور اس کے بعد شتب بدین (قطب الدین) جہاں پناہ ہوا پھر سمس دین (شمس الدین) (پھر) سروج ساہ (فیروز شاہ رکن الدین)

س نمبر ۵: اب جلال دین۔ پھر شاہ موج دین (معز الدین) پھر مشہور الاؤدین (علاء الدین مسعود) اور پھر نسردین (ناصر الدین محمود) زمین کا مالک ہوا۔

سطور ۶۔۷ میں غیاث الدین بلبن کی مدح ہے۔

سطر ۸ میں اس کا نام ھمیر گیاس دین (امیر غیاث الدین) آتا ہے۔

س ۹۔ ۱۰ و ۱۱ میں بلبن کی اولوالعزمی اور بہادری کا مذکور ہے۔ میں یہاں س نمبر ۱۰

کا ترجمہ درج کرتا ہوں:

س نمبر ۱۰: جب وہ دنیا کی فتح کے لیے روانہ ہوتا ہے گوڈی (بنگالی) اپنی لاف زنی بھول جاتے ہیں' اندھری خوف سے اپنے غاروں میں دبک جاتے ہیں' کرلے اپنی چوکڑی چوک جاتے ہیں' کرناٹے (کرناٹکی) اپنی کچھوؤں میں پناہ لیتے ہیں' مرہٹے غائب ہوجاتے ہیں' گرجروں (گوجروں) کی طاقت سلب ہوجاتی ہے اور لاٹ[۳] کرات بن جاتے ہیں۔

س نمبر ۱۳ میں دلی کا نام آتا ہے جسے ''ڈھلّی''؟ لکھا گیا ہے۔ س نمبر ۱۴ سے ۲۴ تک بانی کتبہ ادھرا کا ذکر آتا ہے۔ اس کے خاندانی حالات دیئے ہیں کہ ادھرا کا باپ اصل میں اچپوری یعنی اچ شریف کا رہنے والا ہے جو پانچوں دریاؤں کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ بعد میں ادھرا کا خاندانی شجرہ باپ اور ماں کی طرف سے دیا گیا ہے۔ پھر اس کی تینوں بیویوں اور ان بیویوں سے اس کی اولاد کی تفصیل ہے۔

س نمبر ۲۵ میں لکھا ہے کہ ادھرا نے مختلف مقامات میں دھرم شالائیں اور خیرات خانے کھولے ہیں' اور اس مقام پر بھی اس فرزانہ نے لوگوں کی پیاس بجھانے کے لیے کنواں بنوایا ہے۔

س نمبر ۲۶: یہ کنواں موضع پالسیا (پالم) کے مشرق اور کسبنہ پورا کے مغرب میں بنا ہے۔

س نمبر ۲۷ و ۲۸ میں کنویں کی تعریف ہے۔

س نمبر ۲۹ میں ادھرا کے حق میں دعا مانگی گئی ہے۔

س نمبر ۳۰ میں کہا گیا ہے کہ یہ نظم پنڈت یوگسورا نے تیار کی ہے۔

آخر میں ایک اور مختصر نظم ہے جو شاردا خط اور دیسی زبان میں ہے۔ اس نظم کے پہلے تین مصرعے ہماری سمجھ میں آتے ہیں' باقی حصہ کتبے کی اچھی حالت نہ ہونے کی بنا پر پڑھا نہیں جاتا۔ میں اس حصہ نظم کو' اس خیال سے کہ یہ مسلمانوں کے ابتدائی زمانے میں دہلی کی زبان پر روشنی ڈال سکتا ہے' بعینہٖ اصل زبان میں لکھتا ہوں۔ اصل

کتبے میں یہ نظم س نمبر۲۱ و ۲۲ پر درج ہے چنانچہ :

کیاشن د-نزہ سری تان رتج ہری آنا ای دیش
(غیاث الدین سلطان راجہ ہریانہ دیس کا ہے)
پنج کوش ڈھلی اہوں پنتھی. پالم پویش
(پانچ کوس دہلی سے راستہ میں پالم پڑتا ہے)

یہ دولت مند اور مخیر ہندو جس کو ٹھکر بھی کہا گیا ہے' اچ کا رہنے والا ہے اور دہلی میں اس کا باپ آبسا ہے۔ اس کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھے ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ مسلمانوں کا پروردہ ہو یا اس کا باپ انہیں کے ساتھ آیا ہو۔ جس طرح سے غیاث الدین کی مدح کی گئی ہے اس سے یہ قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ وہ غیاث الدین کی ملازمت میں ہے ورنہ ہندو لوگ مسلمانوں کی اس طرح تعریف کرتے نہیں دیکھے جاتے۔ دیسی زبان کے لیے جو خط اختیار کیا گیا ہے وہ' جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں' شاردا ہے۔ اس خط کا رواج زیادہ تر پنجاب اور کشمیر میں تھا۔ شاردا ملک کشمیر کی ایک دیوی کا نام ہے[۴]۔ اسی بنا پر یہ ملک شاردا دیش یا شاردا منڈل کہلاتا تھا۔ ہندوستان میں اس خط کو سرسوتی یا سرسوتی لکھ (؟) کہتے تھے جو اسی شاردا کا دوسرا نام ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاح شاردا کشمیر میں رواج پذیر ہوئی اور کوئی تعجب نہیں' اگر یہ کہا جائے کہ خط شاردا ابتدا اسی ملک میں ایجاد ہوا۔ شاردا خط نویں صدی عیسوی سے پیش تر کشمیر' کو ہستانی ریاستوں بلکہ یوں کہیے اکثر کوہستانی علاقوں اور مشرقی علاقہ پنجاب میں رائج تھا بالخصوص اس پہاڑی علاقے میں جو پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے۔[۵] پنجاب کے مغرب میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے یعنی ضلع پشاور' ہزارہ' سوات و بنیر میں اس کے کتبے ملتے ہیں بلکہ ایک کتبہ جلال آباد (افغانستان) سے بھی برآمد ہوا ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ شاردا خط مسلمانی عہد سے قبل ہندو شاہی خاندان کے زمانے میں گندھارا (قندھار : فارسی) میں مروج تھا۔ بعض علامات سے پایا جاتا ہے کہ پنجاب کے میدانی علاقے میں بھی مستعمل تھا۔

مسلمانی عہد میں سنہ ۲۴۳ھ کا ایک کتبہ جس میں کوفی اور شاردا خط استعمال ہوئے ہیں، وادی درہ ٹوچی سے برآمد ہوا ہے اور یہ شاید معلومہ کتبوں میں سب سے قدیم ہے جس میں مسلمانی اور ہندوانی خطوط باہم ملے ہیں۔ یہ کتبہ سنہ ۱۹۰۷ء میں دریافت ہوا اور اب پشاور میوزیم میں محفوظ ہے۔ محمد حمید قریشی نے اپنی گرے فیکا انڈو مسلمیکا میں (بابت سال ۲۶ - ۱۹۲۵ء) اس کا عکس اور ترجمہ شائع کیا ہے۔

بظاہر یہی قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ یہ زبان، جو کتبے میں دیکھی جاتی ہے، دہلی میں ان ایام میں بولی جاتی ہو اور جب دہلی میں بولی جارہی ہے تو ضرور ہے کہ ہریانہ کی بھی یہی زبان ہو اور گویا موجودہ ہریانی اسی زبان کی یادگار ہے۔ یا یہ قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ یہ زبان خط شاردا میں پنجاب کی کوئی بولی ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ جاکر دہلی میں رائج ہوتی ہے اور پنجاب کے باشندے اس کو زیادہ استعمال میں لارہے ہیں۔ اس طرح یہ زبان نیز دہلی کی قدیم زبان مل کر ہماری اردو زبان کی ماں بنتی ہیں۔ بعض محققین نے اس زبان کو راجستھانی ہندی کے نام سے یاد کیا ہے لیکن اس کی تائید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ ڈاکٹر گریرسن کا اعتقاد ہے کہ یہ زبان باگڑی سے قرابت رکھتی ہے۔ باگڑی بہرحال ہریانی کا دوسرا نام ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے، اس زبان کا شاردا خط میں لکھا جانا دلالت کرتا ہے کہ یہ زبان پنجاب سے تعلق رکھتی ہے۔ کتبے کی زبان میں بھی بہ ظاہر پنجابی اثر نمایاں ہے۔ اہو، پچ، پولیش پنجابی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا "رج" اور "ٹھکر" پنجابی لہجے میں واقع ہوئے ہیں۔ دہلی میں کسی پنجابی بولی کا رواج ان ایام میں اور وجوہ سے بھی قیاس میں آتا ہے یعنی فارسی تاریخوں میں بعض ایسے الفاظ ملتے ہیں جو موجودہ پنجابی لہجے سے بہت قریب ہیں مثلاً کھٹ، انب، کھنڈ، ملک چھجو (بلبن کے بھتیجے کا نام)، پگ، دھنڈ وغیرہ۔ یہ الفاظ ضیاء برنی اور شمس عفیف کی تاریخوں میں ملتے ہیں۔ دہلی میں اگر ہریانی رائج ہے تو یہ الفاظ ہریانی زبان کے مسترہ انداز سے، جہاں تک کہ موجودہ زبان کا تعلق ہے، بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً "پولیش" موجودہ پنجابی میں "پوے" یا "پوسی" بن سکتا ہے لیکن ہریانی میں اس کا قائم مقام نظر

نہیں آتا۔ دہلی ایک ایسا خطہ ہے جہاں شاردا خط کا رواج، ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں استعجاب انگیز ضرور معلوم ہوتا ہے۔ یہی ایک ایسا کتبہ ہے جس میں یہ خط پایا جاتا ہے ورنہ اس کے اکثر کتبے انہی علاقوں سے دستیاب ہوئے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

مثنوی نہ سپہر میں امیر خسرو نے دہلی کی زبان کا ذکر تو کیا ہے مگر اس سے ہمیں اس زبان کا پتہ نہیں چلتا البتہ وہ دوہرے اور ہندی اشعار جو روایتاً" امیر خسرو کی طرف منسوب ہیں، اگر واقعتاً" انہی کے ہیں تو ان سے کسی قدر پتہ چل سکتا ہے لیکن ہمیں تعجب اس امر پر آتا ہے کہ وہ ہندوستان کی دیگر زبانوں یعنی گوالیاری اور اودھی کا ذکر کیوں نہیں کرتے حالانکہ یہ زبانیں بھی اپنے اپنے مقامات میں رائج ہوں گی۔ بظاہر ان کے ذکر نہ کیے جانے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان ایام میں ان کو چنداں اہمیت حاصل نہیں تھی۔

زبان دہلی کا سب سے پہلا نمونہ ہمیں شیخ باجن، متوفی ۹۱۲ھ (م ۱۵۰۶ء) کی تصنیف میں ملتا ہے، جو یقیناً پندرھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ باجن گجرات کے باشندے ہیں اور شیخ سراج الدین رحمت(٦) اللہ گجراتی کے مرید ہیں۔ مزار برہان پور میں ہے جہاں ایک لمبے عرصے تک مقیم تھے۔ شیخ باجن جس چیز کو زبان دہلی کہتے ہیں وہ درحقیقت اردو ہے۔ نمونہ ذیل میں عرض ہے:

صفت دنیا بزبان دھلوی گفتہ

یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے

جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

(بین اول)

اول آں چھل بہت چھلائے

آں چھوہری بہتی کھائے

آن رو کر بہت رولائے

یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے
جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

(بین دوم)

آن بہت گھیرے پارے
جسے اس بلکے وے ان چھارے
جے رہے اس تھے تارے
وے نجانے اس تھے پارے
جے اس کارنہ تپنہ ترسنہ
جے پک ملے تو اس سنہ ملنہ
یہ فتنی انہوں تپاوے
پک پاس انہوں نہ آوے
جے اس کدھیں نہ لوریں
جے پک ملے تو بھی اس چھور نہ
جے دیکھ اس تھے بھاگے
یہ نلج ان ستہ لاگے

(تخلص)

دیکھ باجن یہ تو جھوتی
کہ میتھی چت نیتھی
یہ اہے ایسی وصیتی

یہ پھنتی کیا کیسے یہ ملتی ہے
جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

میں اس کا ایک اور نمونہ دیتا ہوں۔ شیخ باجن اصحاب صفہ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ جنگ میں جاتے وقت یہ لوگ لشکر اسلام کے آگے چلتے تھے لیکن لڑائی سے واپسی کے وقت سب سے پیچھے پیچھے آتے تھے۔ باجن فرماتے ہیں:

"مناقب حضرت ایشاں بزبان دهلوی نبشتہ شده است۔ عقده:

جب راوت جھوجھن جاونہ
تب توں آگیں ہووا جائیں
جھوجھ کر باہر نہ (آونہ)
تب تو پیچھیں ہووا آئیں
باجن برد وہی جو خدا فرمایا
محمد کی کافر نہ سوں دند لایا"

شیخ باجن ان نمونوں کو زبان دہلوی کہتے ہیں اور اس زبان کے یہ قدیم ترین نمونے ہیں جن تک ہماری رسائی ہو چکی ہے اس میں شک نہیں کہ یہ زبان نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہے۔

ابوالفضل "آئین اکبری" میں اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کے ذکر میں امیر خسرو کی طرح پھر زبان دہلی کا ذکر کرتا ہے اور وہ بھی برج اور اودھی کا ذکر نہیں کرتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبانیں زبان دہلی کی شاخیں مان لی گئی ہیں۔

زبان اردو، زبان دہلی اور زبان ہندوستان ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ اردو کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ برج بھاشا سے نکلی ہے۔ یہ عقیدہ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور اردو کو برج کی بیٹی کہا جاتا ہے مگر اس کی صحت پر ہمیں یقین نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دونوں مختلف زبانیں ہیں۔ اگرچہ ایک نے دوسری پر اثر ڈالا ہو لیکن ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ جس طرح زبان [illegible]

کے لیے اردو ایک جدید نام ہے اسی طرح برج بھی ایک جدید نام ہے۔ برج کا قدیم نام گوالیاری ہے۔ گوالیاری زبان موسیقی کی بنا پر پندرھویں صدی عیسوی میں بے حد اہمیت اختیاز کرلیتی ہے اور راجہ نان گوالیاری' جو دھرپد کے سلسلے میں شہرت جاوید حاصل کرچکا ہے' موسیقی میں سنسکرت کی جگہ گوالیاری زبان کو داخل کرنے سے اس زبان کی حیثیت کو دیسی زبانوں میں بہت ممتاز کردیتا ہے۔ آئندہ دو صدیوں میں گوالیار کے ماہران موسیقی نے اپنے فن کی بنا پر اس زبان کو دور دور اشاعت دے دی ہے۔ ادھر آگرہ جو لسانی حیثیت سے برج کے علاقے میں داخل ہے' لودھیوں اور مغلوں کا شاہ جہاں کے عہد تک دارالسلطنت رہتا ہے۔ اس لیے اس زبان کو درباری سرپرستی بھی حاصل ہوجاتی ہے اور برج زبان شائستہ زبانوں کی فہرست میں شامل ہوجاتی ہے۔ برج کے بہترین مصنف اس زمانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی نظم اس زمانے میں پایہ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ موسیقی اور برج اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں کہ ایک کی سرگزشت بغیر دوسرے کی تاریخ کے ناممکن ہے۔ اس لیے یہ حصہ ہم یہاں حذف کرتے ہیں اور آئندہ مضمون موسیقی کے وقت تک اٹھا رکھتے ہیں۔[۷] یہاں اسی بیان پر اکتفا کرتے ہیں کہ اردو اور برج علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں اور جہاں کہیں اتفاق سے قدما نے اس کا ذکر کیا ہے' دونوں کو علیحدہ زبانوں کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

اس بحث پر خان آرزو کے بیانات کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے نزدیک زبان دہلی یعنی اردو اور زبان گوالیاری یعنی برج دو مختلف زبانیں ہیں۔ وہ ایک کو زبان گوالیار اور دوسری کو زبان دہلی کہتے ہیں۔ میر عبدالواسع ہانسوی نے ایک کتاب غرائب اللغات تیار کی تھی جو ایسے ہندی لغات کی فرہنگ ہے جن کی فارسی عام طور پر معلوم نہیں۔ خان آرزو اس لغات کی ایک نئی اشاعت بعد[۸] ترمیم و تصحیح تیار کرتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ اردو زبان کو وہ توقیر جو آج حاصل ہے ان ایام میں نصیب نہیں تھی۔ اس وقت وہ صرف عوام کی یا لشکر کی یا دہلی کی زبان تھی۔ ادھر گوالیاری اپنے باعظمت ادبیات اور تاریخ کی بنا پر خان آرزو کی نگاہ میں نہایت شائستہ اور فصیح زبان ہے۔

مثلاً میر عبدالواسع نے ایک لفظ "ایوارہ" کی تشریح میں لکھا تھا: "جائی کہ در صحرا و کوہستان برای چارپایان سازند تا شب در آنجا باشند۔"

خان آرزو اس لفظ کو غیر فصیح مان کر اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "ایوارہ زبان وطن مصنف رسالہ بود۔" اس میں شک نہیں کہ ہریانی اور مارواڑی میں یہ لفظ آج بھی رائج ہے تاہم خان اضافہ کرتے ہیں: "بزبان برج و گوالیاری کہ افصح است آن را کھرک گویند۔"

"اگل" ایک اور لفظ "بمعنی چوبی کہ پیش در افگنند" غرائب اللغات میں آتا ہے۔ خان آرزو کو اس لفظ پر بھی اعتراض ہے۔ فرماتے ہیں: "لیکن اگل زبان وطن مصنف خواھد بود۔" اور کہتے ہیں: "بزبان گوالیاری کہ افصح زبان ھای ھندی است بینڈا گویند۔"

"جیلی" ایک اور لفظ ہے جو خان کی نگاہ میں قابل اعتراض ہے۔ جیلی[۸] آخر سے شاخ دار ہوتی ہے اور کھلیان میں اس سے بالیوں کو پھیلایا اور سمیٹا جاتا ہے۔ خان کہتے ہیں: "اما در ھندی متعارف گوالیار کہ افصح السنہ ھندی است پچانگرا گویند۔"

ان ارشادات سے صاف ظاہر ہے کہ خان صاحب کے نزدیک گوالیاری نہایت فصیح اور معتبر زبان ہے اور اردو سے علیحدہ چیز ہے۔

اب میں وہ ارشادات لیتا ہوں جن میں وہ اردو کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خان صاحب پہلے شخص ہیں جو اس زبان کو زبان اردو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اسے اصطلاح شاہجہان آباد بھی کہتے ہیں اور اردوئے معلیٰ بھی کہتے ہیں۔ غرائب اللغات میں ایک لفظ رجواڑہ بمعنی قحبہ خانہ ملتا ہے۔ خان بیان کرتے ہیں: "رجواڑہ بدین معنی اصطلاح شاہجہاں آباد است بلکہ اھل اردو است کہ این قسم اماکن اکثر در لشکر راجھا می باشند و الا دراصل راجواڑہ جای بودن راجھاست۔"

خان آرزو اپنی تالیف "چراغ ھدایت" میں "کوچہ نو" کے بیان میں لکھتے ہیں: "محلہ از صفاھان کہ زنان فاحشہ و لولیان وکلولیان در آن جا باشند مثل راجوارہ حضرت

شاہ جہان آباد دھلی۔" (صفحہ ۴۳۹)

"گزک" کے واسطے خان فرماتے ہیں: "لیکن گزک باصطلاح اھل اردو نوعی است از شیرینی کہ از کنجد و شکر سازند۔" اور "نکتورہ" کے واسطے، جس کے معنی سوراخ بینی دیئے ہیں، مصنف نے لکھا ہے: "نکتورہ، در عرف اردو وغیرہ بمعنی حرف ناز و غرور است۔" اور "ہڑپنا" کی تشریح میں کہا ہے: "لیکن ہڑپنا بزبان اردو اھل شہرھانیست شاید زبان قریات و مواضع باشد و بدین معنی "نگلنا" شہرت دارد۔"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ خان کے نزدیک برج اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں۔ گویا اب سے دو صدی[۹] قبل برج اور اردو مختلف زبانیں مانی جاتی تھیں۔

اب ہم ایک دکنی مصنف مولانا وجہی کی تالیف "سب رس" کو لیتے ہیں جو ایک نثری تالیف ہے اور ۱۰۴۵ھ میں بفرمائش عبداللہ قطب شاہ، دکن میں لکھی جاتی ہے۔ اس تالیف میں دوسری زبانوں کے اشعار، ضرب الامثال موقع بموقع لائے گئے ہیں جن میں فارسی، گوالیاری، مرہٹی، دکنی اور ہندوستانی قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانی سے مراد یہی اردو ہے۔ ذیل میں سب سے پیشتر وہ مقامات لیے جاتے ہیں جن میں گوالیاری کا ذکر ہے:

(۱) """ہور گوالیر کے چاتراں گن کے گراں اونوں بی بات کوں کھولے ہیں یوں بولے ہیں:

پوتھی سب تو تھی پھٹی پنڈت بھیا نکوی   ایکھی انچھر پیم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے۔"

(۲) "ہور گوالیار کے فہیم اونوں بی یوں کتے ہیں:

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہ کوثر بہشت کو ڑسوں "شت۔"

میں ان کو چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اردو کے واسطے اس نے دو تین جگہ "قول اھل ہند" استعمال کیا ہے۔ مثلاً "بقول اہل ہند..... کہ چکنے گھڑے پر پانی ڈھلتا" یا "بقول اہل ہند پیاسا کیا منگتا پانی" ورنہ مثلہ لکھ دیتا ہے مثلاً: "معلوم ہوا آج، خالی گھر بھوتوں کا راج" یا "مثلہ ہے مشہور جدھر ہانڈی ڈوئی ادھر سب کوئی" یا "دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے۔"

اس سے بہرحال اس قدر واضح ہے کہ مولانا وجہی کے نزدیک گوالیاری اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں اور آج سے تین سو سال پیش تر علیحدہ علیحدہ مانی جارہی ہیں۔

ہم دیکھ آئے ہیں کہ ابوالفضل، شیخ باجن اور امیر خسرو اردو کو زبان دہلی لکھ رہے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اردو برج سے بالکل مختلف شے ہے۔ اب تمام مسلمانی تاریخ میں ہمیں ایسا وقت نہیں ملتا جس میں ان زبانوں کے متعلق التباس یا غلط فہمی ہو۔ آخر وہ وقت بھی تو ملنا چاہیے جب ہم اردو کو برج سے مستخرج ہوتے دیکھتے یا یہ کہ اردو موجود نہ ہوتی اور برج موجود ہوتی۔ اس لیے ہم یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو اور برج مختلف زبانیں ہیں اور ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں کا ہے۔

دہلی میں شاعری کا آغاز گویا بارھویں صدی ہجری میں شروع ہوجاتا ہے اور شاہ حاتم کے دیوان میں پہلی غزل سنہ ۱۱۳۱ھ کی نوشتہ ملتی ہے، جس سے قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ دہلی میں شاعری اس عہد سے کسی قدر قبل شروع ہوچکی ہے۔ اگر اس واقعے کو ہم بارھویں صدی کی ابتدا سے شروع کریں تو زیادہ غلط نہیں ہوگا۔

شمالی ہندوستان میں اردو میں شعرگوئی اس عہد سے قبل نامعلوم نہیں تھی۔ ہمیں بعض بزرگوں کے نام معلوم ہیں جو گیارھویں صدی میں بھی اسی زبان میں لکھ رہے ہیں مثلاً محمد افضل مصنف بارہ ماسہ یا شیخ عبداللہ انصاری اور شیخ محبوب عالم لیکن یہ لوگ خاص شہر دہلی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ مضافات دہلی سے۔ دوسرے ان لوگوں کا اثر دہلی کے دبستان پر مطلق نہیں ہوا ہے بلکہ دکن کا بالخصوص سید محمد ولی اورنگ آبادی کا۔ کہتے ہیں کہ ولی اورنگ آبادی دہلی میں بہ عہد عالم گیر اور بقول بعض محمد شاہی عہد میں آئے تھے اور دہلی میں ان کے دیوان کی اشاعت نے لوگوں میں شعر گوئی کا بطرز دکن شوق پیدا کردیا مگر اس ذوق کے پیدا کرنے میں صرف ولی اور ان کا دیوان ذمہ دار نہیں مانے جاسکتے بلکہ اور موثرات بھی کام کر رہے ہیں۔ سب سے اہم ان میں عالم گیر بادشاہ کی مہم دکن ہے جس میں تقریباً بائیس پچیس سال اس بادشاہ

کے صرف ہوئے ہیں حتیٰ کہ عالم گیر کا انتقال بھی دکن میں ہی ہوا اور وہیں دفن ہوا۔ اس دور میں شاہی لشکر کے لوگ دکنیوں سے ربط و ضبط پیدا کرنے لگے اور تمام دکن کی فتح کے بعد ہندوستانی دکنیوں کے ساتھ میل جول رکھنے لگے اور یہ شاہی اردو کے ہندوستانی ہیں جو دکنی شاعری سے براہ راست تعلق میں آتے ہیں اور دکنی کلام کے نمونے اپنی بیاضوں میں لکھ لکھ کر ہندوستان لاتے ہیں اور یہاں اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ لیکن بعض قرائن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ (اردو) نظم عالم گیر کے عہد سے قبل اور دکنی اثرات سے معرا ان اطراف میں موجود تھی اگرچہ اس کو چنداں فروغ نہیں معلوم ہوتا لیکن موجود ضرور ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم شہزادہ داراشکوہ کی ''حسنات العارفین'' سے دو تین شعر یہاں نقل کرتے ہیں' جو یقیناً اردو زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''حسنات العارفین'' داراشکوہ نے ۱۰۶۰ھ میں' جب اس کی عمر ۳۸ سال کی تھی' تالیف کی ہے۔ اس میں زیادہ تر پرانے اور خود مصنف کے ہم عصر مشائخ و کاملین کے جستہ جستہ حالات و مقولات ہیں۔ اس تالیف میں ہمیں دو تین موقعوں پر اردو شعر ملتے ہیں:

(۱) سب سے پہلے ہمیں عبداللہ ضبحی کے قول کے تحت میں ایک ہندی مصرع ملتا ہے' جو عبارت ذیل کے بعد ہے:

''و در توحید شاھد و مشھود یکی است
چنانچہ گفتہ ھر کہ عابد شد بمعبود رسید:
عابد بنا تو کون ہے معبود کون ہے۔''
(صفحہ ۱۷/ الف)

(۲) دوسرے موقع پر لکھا ہے:

''تصوف آنست کہ ھمہ وقت صرف در یار او شود چنانچہ درھندی گفتہ اند:
مجھے تو لے چلو اوس میرے یار کے پاس
(تم مجھے لے تو چلو اوس میرے دلدار کے پاس)

زندگی کا بھی مزا جو یار ہوے یار کے پاس
(زندگی کا ہے مزا یار جو ہو یار کے پاس)

چیست ازین خوب تر در ہمہ آفاق کار
دوست بنزدیک دوست یار بنزدیک یار"

(۳) تیسرے مقام پر آتا ہے:

"وقتی کہ در عشق خود کامل شود منزل قاب قوسین براو کشاید پس خود را مثل دریا در آب می بیند و از بیضہ ...... پرواز کند و می گوید اناالحق چنانکہ در ھندی گفتہ اند:

بھی جب منصور پر آئی (کذا)
دیکھی چاروں طرف ذات الٰہی
سراسر عقل گھبرا کر گواہی
لگا دینے اناالحق کی دہائی"

(۴) ایک اور موقع پر آتا ہے:

"وھم منصور حلاج می گوید و در تفسیر شاھد و مشھود می فرماید: و کون و مکوّن یکی است۔" اس کے بعد کچھ جگہ چھوٹی ہوئی ہے اور حاشیہ پر سطر کے برابر یہ شعر درج ہے:

عابد بنا تو کون ہے معبود کون ہے
عابد تو تو ہوا (تو پھر) معبود کون ہے
(صفحہ ۱۳ / ب)

(۵) اس کے بعد ایک اور مقام پر لکھا ہے:

"وھم شبلی گفت می خواھم کہ بہشت و دوزخ را یک لقمہ ساختہ فرو برم تا مردم بی سبب اورا پرستند:

حور و قصور کے لیے کوچہ یارسیں گیا

شیخ سے کہیو قاصدا پیٹے منہ اس شعور کا

(صفحہ ۱۴ / الف ۔ ب)

بظاہر ان اردو اشعار کے متعلق کوئی وجہ اشتباہ ہمیں معلوم نہیں۔ اگر داراشکوہ کی تصنیف میں بعد میں کسی نے ان کو اضافہ کردیا ہے تو خیر ورنہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اردو نظم دہلی میں دکنی اثرات کی آمد سے بھی قبل موجود ہے۔

حواشی

(۱) "دلی کے قریب ایک مقام پالم ہے۔ وہاں ایک باؤلی ہے جس میں ایک ایسا کتبہ نصب ہے جو غیاث الدین بلبن کے عہد (۱۲۷۶ء) میں لکھا گیا تھا۔ کتبے پر شہر کا نام "دھلی" کندہ ہے اور جس ملک میں یہ شہر تھا اس کا نام ہریانکا (موجودہ ہریانہ) بتایا گیا ہے۔" ("آثار الصنادید" مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، جلد اول، صفحہ ۱۲۴، دہلی ۱۹۹۲ء۔ بحوالہ "جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" ۱۸۷۴ء) ۔ مرتب۔

(۲) آج کل ہریانہ ایک علیحدہ ریاست (صوبہ) کی حیثیت رکھتا ہے اور گیارہ اضلاع ذیل پر مشتمل ہے:

انبالہ، بھوانی، جیند، حصار، روہتک، سرسہ، سونی پت، کرنال، کروکشیترا، گوڑگاؤں، مہندر گڑھ (نارنول)۔ لسانی اعتبار سے اس میں راجستھان اور پنجابی بولیوں کے بعض علاقے بھی شامل ہیں مثلاً ضلع گوڑ گاؤں راجستھان کی میواتی شاخ کا علاقہ ہے۔ (مرتب)

(۳) لاٹ اور کراٹ دونوں بنیوں کی قوموں کے نام ہیں۔ اصل میں مترجم نے یوں ہی لکھا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ لاٹ کسی بہادر قوم کا نام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لاٹوں کی بہادر قوم بنیوں کی طرح بزدل بن جاتی ہے۔ (حاشیہ مصنف)

(۴) کشمیر میں دریائے نیلم (کشن گنگا) کے کنارے ایک مشہور مقام شاردا یا شاردی ہے۔ بدھ مذہب کے عروج کے زمانے میں یہاں ایک نہایت اہم درس گاہ تھی۔ جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ (مرتب)۔

(۵) "شاردا خط پنجاب کے اکثر حصے اور کشمیر میں کتبوں اور خیراتی تانبا پتروں، سکوں اور مخطوطات میں پایا جاتا ہے۔ یہ خط کُٹل خط سے نکلا ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں راجہ میرو ورما کے کتبوں میں ملتا ہے۔ شاردا خط کا سب سے قدیم کتبہ سراہاں کا ہے جو دسویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا یہ شاردا خط کے رواج کا زمانہ ہے۔ فوجل نے "انٹی کویٹز آف چمبہ سٹیٹ" (۱۹۱۱ء) میں شاردا خط کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔"

مندرجہ بالا سطور شیرانی صاحب کے قلم سے ایک کاغذ پر بعض دوسری یادداشتوں کے ساتھ مرقوم ہیں۔ فوجل سے مراد مشہور ماہر آثار قدیمہ J.P. Vogel ہے جس کی "کیٹلاگ آف دی دہلی میوزیم آف آرکیالوجی" سنہ ۱۹۰۸ء میں اور "ٹائل موزا ئکس آف دی لاہور فورٹ" (سرجان مارشل کی ترتیب کے ساتھ) سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھیں۔ (مرتب)

(۶) متوفی ۸۹۷ھ ۔ شیخ عزیز اللہ متوکل کے صاحب زادے تھے۔ (مرتب)

(۷) ملاحظہ ہو مضمون : "مسلمانوں میں ہندی موسیقی کا رواج" (مرتب)

۸) پنجابی میں "ترنگلی" (مرتب)۔

(۹) مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد نہم کی تدوین کے وقت اڑھائی صدی (مرتب)۔

□□□

مسلمانوں میں ہندی موسیقی کا رواج

(از ماہنامہ ''قومی زبان'' شیرانی نمبر' بابت اکتوبر ۱۹۸۰ء)

''یہ مضمون پہلی بار شیرانی صاحب کے کاغذات میں مجھے دستیاب ہوا تو میں اس کا عنوان دیکھ کر چونک پڑا کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے شیرانی صاحب کو موسیقی سے کوئی عملی دلچسپی نہ تھی۔ ادھر اردو زبان سے ان کا شغف بلکہ عشق بھی محتاج بیان نہیں۔ اب اردو زبان کی تاریخ اور اس کے لسانیاتی مطالعے میں برج بھاشا سے مفر نہیں اور برج کو قبول عام کی سند شاعری اور موسیقی کی وساطت سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ شیرانی صاحب اپنے مضمون ''اردو کا دبستان دہلی'' میں جو اسی جلد میں شامل ہے ایک جگہ کہتے ہیں:

''موسیقی اور برج اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں کہ ایک کی سرگزشت بغیر دوسرے کی تاریخ کے ناکمل ہے۔ اس لیے یہ حصہ ہم یہاں حذف کرتے ہیں اور آئندہ مضمون مو-ستی کے وقت تک اٹھا رکھتے ہیں۔''

اب ظاہر ہے کہ یہاں زیر نظر مضمون ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مضمون مولف کی زندگی کے آخری حصے میں لکھا جارہا تھا اور ان کی وفات کے باعث مکمل نہ ہوسکا۔

مضمون نامکمل بھی ہے اور نظر ثانی کا محتاج بھی۔ اسی بنا پر یہ کہیں

شائع نہیں ہوا تھا۔ فاضل مولف کا کہنا ہے کہ : "مسلمانوں میں ہندی موسیقی کے رواج کے دو زبردست محرک ہیں۔ پہلے مشائخ کی خانقاہیں، دوسرے سلاطین کے دربار" اس مضمون میں زیادہ تر سلاطین کا تذکرہ ملتا ہے جو بذات خود نامکمل ہے۔ مشائخ کی بابت ان صفحات کی ابتدا میں مختصر سے ذکر کے علاوہ جو متفرق نوٹ تھے وہ میں نے مضمون کے پہلے حصے کے اختتام پر درج کردیئے ہیں۔ یہ عبارات جوں کی توں ہیں اور میں نے ان میں کوئی حک و اضافہ نہیں کیا۔

مضمون کے آخر میں مختلف کتاب خانوں میں موسیقی پر تالیفات کی فہرست پراگندہ یادداشتوں کی شکل میں تھی جسے میں نے مربوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ (مرتب)

ہندی موسیقی اگرچہ بظاہر ہمارے مضمون سے تعلق نہیں رکھتی لیکن مسلمانوں میں اس کے رواج نیز اس بنا پر کہ بعض زبانیں مثلاً گوالیاری، جسے فی زمانا برج بھاشا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، بربنائے موسیقی رواج عام میں آتی ہے اور ہمیں اردو کی تاریخ کی تلاش میں برج اور اردو کے تعلقات پر روشنی ڈالنا مقصود ہے، اس لیے ضروری ہوا کہ مسلمانوں میں موسیقی کی اشاعت پر بھی ایک طائرانہ نظرڈال لی جائے کیونکہ موسیقی مسلمانوں میں ہندی زبانوں کے ساتھ وابستگی پیدا کرنے والے اسباب میں سے ایک زبردست محرک ہے۔ اس سلسلے میں جو مواد ہمارے پیش نظر ہے، نہایت قلیل مقدار میں ہے لیکن جو کچھ ہے وہی میں مختلف مآخذ سے لے کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

غزنوی دور میں، جب کہ مسلمان لاہور و ملتان وغیرہ میں آباد ہیں، ہمیں ہندی موسیقی کے ساتھ ان کی دلچسپی کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ خواجہ مسعود سعد سلمان نے اپنی مثنوی داخل کلیات میں جہاں شہزادہ عضدالدولہ شیرزاد بن مسعود والئی لاہور کے دربار کے موسیقی دانوں کا ذکر کیا ہے ان میں ہندی عنصر مطلق غیر حاضر ہے۔ اس زمرہ

میں سب سے پہلے ایک نے نواز محمد کا نام ملتا ہے۔ اس کا نام شعر ذیل میں آتا ہے:

لحن‌ہای محمد نائی ارغنونی بود بہ تنہائی

زاں بعد عثمان خوانندہ ہے:

باز عثمان عندلیب آواز کردہ از قول جادوئی آغاز

تیسرا نام علی نائی ہے:

از دگر سو علی بنغمہ نای دل برانگیزد ای شگفت زجای

اب اسفندیار چنگی ہے:

چنگ اسفندیار چنگی باز با دل و جان ز عیش گوید راز

پھر کودک جعبہ زن ہے:

جعبہ کودک خوش دلکش راہ اشکر می سراید خوش

اب بہرور ربابی کا نام ہے:

بہرور(۲) خوش خط ار برنگ رباب راندہٴ جمع مطربان ہمہ آب

بانوی قوال کا نام بھی ملتا ہے جو یقیناً" عورت ہے:

بانو آن نادر جہان بسرود حملہ آورد بر بریشم رود

رقاصوں میں ماہوی رقاص کا نام دیا ہے:

ماہوی(۳) درمیان چو در گردد مجلس از خرمی دگر گردد

اس پر ارباب نشاط کی فہرست تمام ہوجاتی ہے۔ ناموں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ سب ایرانی ہیں ایک بھی ہندوستانی نہیں۔

اس سلسلے میں سب سے قدیم روایت دہلی سے تعلق رکھتی ہے جس میں شیخ احمد نہروانی کا نام لیا جاتا ہے۔ شیخ احمد کوئی پیشہ ور موسیقی دان تو تھے نہیں لیکن خوش الحان تھے اس لیے ہندی گیت اور اشعار بہت گایا کرتے تھے۔ یہ ذات کے جولاہے اپنے ہم مشرب وہم پیشہ شاہ کبیر سے دو صدی اقدم ہیں۔ "اخبار الاخیار" میں ان کو قاضی حمیدالدین ناگوری کا مرید بتایا گیا ہے اور یہ قصہ درج ہے کہ ایک روز قاضی حمید الدین

ناگوری شیخ احمد کے مکان پر آئے دیکھا کہ شیخ احمد کپڑا بننے میں مصروف ہیں۔ قاضی نے ملامت کے لہجے میں کہا "احمد! کب تک اس پیشے کے پیچھے پڑے رہو گے۔" قاضی یہ فقرہ کہہ کر چلتے ہیں۔ ادھر شیخ احمد ایک کھونٹی کے ٹھوکنے کے لیے' جو ڈھیلی ہو گئی تھی' اٹھے۔ اتفاق سے پاؤں پھسلا اور گر گئے۔ کھونٹی پر ہاتھ پڑا اور ٹوٹ گیا۔ شیخ احمد نے اس وقت ہندی زبان میں کچھ الفاظ کہے جن کا مطلب یہ تھا کہ اس بوڑھے نے میرا ہاتھ توڑ ڈالا۔ "شیخ احمد بزبان ہندی گفت این پیر یعنی قاضی حمید الدین دست من شکست" (صفحہ ۵۶۔۵۷' اخبار الاخیار)۔

لیکن ایک قدیم روایت سے' جو "فوائد الفوائد" میں درج ہے' معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۶۳۳ھ) کے معاصر خورد ہیں اور اس مجلس سماع میں شریک تھے جس میں شیخ قطب الدین کا بحالت سماع انتقال ہوا ہے۔ یہ امر محقق نہیں کہ وہ کس کے مرید ہیں البتہ نعمت فقران کو شیخ مادھو امام جامع مسجد اجمیر سے ملی تھی۔ شیخ احمد جوانی کے زمانے میں بڑے خوش آواز تھے اور ہندی سرود خوانی کا ان کو بڑا چسکا تھا۔ ایک روز فقیر مادھو نے انہیں ہندوی گاتے سن لیا۔ کہنے لگے افسوس ہے کہ ایسی اچھی آواز کو ہندوی نغمات میں برباد کرتے ہو' قرآن کیوں نہیں حفظ کرتے۔ شیخ احمد نے اس کے بعد قرآن یاد کرلیا۔ "فوائد الفوائد" کی اصل عبارت حسب ذیل ہے:

"چنین گویند کہ او نعمت از فقیر مادھو یافتہ بود و این فقیر مادھو امام جامع مسجد اجمیر بود۔ روزی شیخ احمد نہروانی هندوی می گفت۔ در اوان جوانی آواز خوب داشتی و هندویہا خوش گفتی۔ چون فقیر مادھو شنید گفت چنین آوازی کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود هندوی خرج کنی۔ فقیر مادھو گفت کہ قرآن یاد کن۔ شیخ احمد قرآن یاد گرفت۔"

مسلمانوں میں ہندی موسیقی کے رواج کے دو زبردست محرک ہیں۔ پہلا مشائخ کی خانقاہیں' دوسرا سلاطین کے دربار۔ مسلم سلاطین ایرانی اثرات میں ابتدا ہی سے ساسانی

درباروں کی روایات کے متبع بن گئے تھے۔ خلفائے بنو عباس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ باربد خسرو پرویز کے دربار کا مشہور مغنی تھا۔ سرکش اور سرکب بھی ایرانی مطربوں کے نام ہیں:

شاعرانت چو رودکی و شہید مطربانت چو سرکش و سرکب

مسلم ایران میں اکثر قدیم روایات جاری رہی ہیں۔ ان میں موسیقی کا بھی شمار ہونا چاہئے۔ سلاطین ہند' بنو سامان و آل غزنہ کے مقلد تھے اور ان کے دربار موسیقی سے بھی خالی نہ تھے۔ شعرا اپنے قصائد خود نہیں سناتے تھے بلکہ ان کے راوی' جن کے لیے خوش الحان ہونا لازمی وصف تھا۔ مطرب سرود خسروانی وغیرہ کے علاوہ ایسی نظمیں یا غزلیں گاتے جو خود ان سلاطین یا ان کے اقارب و دیگر منظور نظر امرا کی مدح میں ہوتی تھیں۔ بعض ایسی نظمیں ہمیں خواجہ مسعود سعد سلمان کے کلیات میں نظر آتی ہیں۔ سرود اس وقت زیادہ رغبت سے سنا جاتا تھا جب مجلس شراب ترتیب دی جاتی تھی۔

ضیا برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم ذیل جو بلبن کے بھتیجے ملک علاء الدین کشلی خان کی مدح میں تھی' خود سلطان بلبن (سنہ ۶۶۴ھ و ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۶۵ء و ۱۲۸۷ء) کے دربار میں پڑھی گئی تھی:

شہ علاء الدین الغ قتلغ معظم باربک

پور کشلی خان معظم خسرو روی زمین

خواجہ شمس معین نے یہ نظم لکھی تھی۔ اس کے لیے ضیا برنی کہتے ہیں:

"خواجہ شمس معین ندیم خاص ملک قطب الدین حسن غوری... بر صدر حیات بوده نظمی در مدح ملک علاء الدین مذکور بگفت و غزلی از سرود دران نظم یار کرد و بہ مطربان درگاه بلبنی داد و ایشان را آن نظم و آن غزل بیاموخت و مطربان را شکرانہ پذیرفت و برراه کرد تا آن غزل ساختہ خواجہ شمس معین را در روز جشن نوروز بوقت آن کہ خدمتیان' خانان و ملوک می گزرد و بنام ھرکی فصلی می خوانند در صفہ بار پیش سلطان بلبن بگویند و مطربان سلطانی این نظم را با غزل

پیش سلطان ادا کردند" (صفحہ ۱۱۳)۔

اس وقت تک' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں ایرانی سرود ہی مقبول تھا لیکن بلبن کے جانشین معزالدین کیقباد (۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء) کے عہد میں ایرانی موسیقی کے ساتھ ہندی موسیقی کا ذکر بھی تاریخ میں ملتا ہے۔ کیقباد سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھتا ہے۔ شہزادگی کے زمانے میں اس کی پرورش قیدیوں کی طرح سے ہوئی تھی۔ سخت مزاج اتالیق اس پر متعین تھے جو اس کے چال چلن کی نگرانی کرتے تھے۔ لیکن تقدیر نے بلبن کی وفات پر اور باپ کے زندہ ہونے کے باوجود اسے تخت ہندوستان پر بٹھا دیا۔ بادشاہ ہوتے ہی آزادی ملی اور کھل کھیلا۔ کچھ نوعمری کا تقاضا اور کچھ طبیعت کی افتاد' ایک دم سے عیش و عشرت کی طرف جھک گیا اور وہی دربار جس میں چند روز قبل بہادر امیروں' سفید ریش خانوں اور دانش مند ملکوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا' نئے دور میں مطربوں' بھانڈوں' نقالوں اور مسخروں کا اکھاڑا بن گیا۔ سپہ سالار برطرف ہوئے اور ان کی جگہ بھانڈ اور بھڑوے بھر گئے۔ پہلوانوں کے زرہ اور بکتر کی جگہ حسین عورتوں اور ساقیوں کے زرق برق لباس نے لے لی۔ دور دور سے گویے آگئے' کلالوں کو عزت ہوگئی' ہتھیار سستے اور شراب مہنگی ہوگئی۔ ضیا برنی لکھتے ہیں:

"از اطراف بلاد ممالک مطربان و خوش گویان و خوب رویان و خوش الحانان و مزاحان و مسخرہ گان و بھنڈان بدرگاہ رسیدند" (صفحہ ۱۳۰)۔

بادشاہ کی عیش دوستی کے چرچے سن کر لوگ حسین لڑکیوں اور کنیزوں کو گانے بجانے' غزل خوانی' لطیفہ گوئی' نرد و شطرنج کی تعلیم دینے کے علاوہ اسپ تازی' نیزہ بازی' چوگان بازی وغیرہ فنون میں بھی ان کو ماہر کرکے لاتے تھے۔ وہ فارسی زبان اور موسیقی سے واقف ہوتی تھیں اور دربار کے طور و طریق اور بات چیت کے ڈھنگ سے بخوبی واقف ہوتی تھیں۔ لڑکوں کو بھی اس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کو ایرانی اور ہندی نغمات' جن میں سلطان کی مدح و ستائش ہوتی تھی' سکھائے جاتے تھے۔ ہمارا مورخ لکھتا ہے:

"گدا غازیان نامدار و زالان بدکار برنیت پیشکشی و خدمتی سلطان دختران خوب رو با تنگ و شنگ و ناز و کرشمہ و شوخ و زہ دیدہ و کان نمک را سرود گفتن و رباب زدن و غزل خواندن و آمدہ لطیفہ گفتن و نرد و شطرنج باختن آموختہ بودند و ہرمہ پارہ را کہ آفت شہری و آشوب عالمی بودند بپرورشہای گوناگون پروردہ و پیش ازانکہ شگوفہ پستان دربستان جوانی سر برآرد اسب تاختن و گوی باختن و نیزہ گردانیدن باصد ہزار چستی و چالاکی آموختہ و انواع ہنرہای دل فریب جان نواز کہ زاہدان را زنار بندانند و عابدان را سوی خمار کشانند آن فتنہ کاران را تعلیم کردہ و جلب کشان ہندوستان غلام بچگان سرو قامت و کنیزک بچگان ماہ پیکر پارسی و سرود آموختہ و بزر و زیور و جامہا زردوزی و زربفت آراستہ آن لعبتان جان نواز را آداب و داب خدمت و طریق و طرائق بندگی درگاہ تعلیم کردہ و غلامان امرد بی بدل را درہا درگوش انداختہ و کنیزک بچگان بی نظیر را مثل عروسان جلوہ گاہ آراستہ و مطربان استاد و پرکاران ماہر سرود پارسی و ہندی در پردہ ساختہ و مدائح سلطانی در قول و غزل و حب و کیلانی در آوردہ" (صفحہ ۱۵۶-۱۵۷)۔

برنی کی اس عبارت اور دوسرے موقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص خاص لوگ اپنے اپنے طائفے بنا کر اور لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم دے کر لاتے تھے' جس سے ظاہر ہے کہ یہ طائفے ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے اور دربار میں بغیر فارسی کے رسائی مشکل تھی۔

جب کیقباد اپنے باپ بغراخان والی بنگال سے مل کر لوٹتا ہے اور اس کی نصائح کے زیر اثر شراب و موسیقی سے توبہ کرلیتا ہے اور اودھ سے دہلی کی طرف سفر کر رہا ہے' ایسے مختلف طائفے سلطان کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لیے شاہی لشکر کے برابر برابر رواں ہیں۔ ایک دن اثنائے سواری میں ایک حسین لڑکا قبائے زرنگار پہنے' زرین ترکش کمر میں لگائے اور شاہانہ کلاہ سر پر دھرے' شکاریوں کا بھیس بنائے' گھوڑا پھڑکاتا

فوج خاص میں سے نکلتا ہوا کوکبہ شاہی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ دیکھنے والے خیال کرتے ہیں کہ شاید کوئی شاہزادہ ہے جو شکار کو نکلا ہے۔ حتیٰ کہ وہ گھوڑا کداتا چتر سلطانی کے قریب آجاتا ہے۔ کڑکیت اور گرز بردار اس کو روکتے نہیں۔ لڑکا شاہی گھوڑے کے قریب آکر گھوڑے سے اتر کر زمین پر لوٹ کر سعدی کا یہ شعر اپنی رسیلی آواز میں سناتا ہے:

گر قدم برچشم ما خواهی نهاد دیده بر ره می نهم تا می روی

اور کیقباد کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ اس غزل کا مطلع نہایت ہی مناسب موقع ہے۔ اگر بادشاہ سلامت اجازت دیں تو عرض کروں۔ بادشاہ کی اجازت پر پڑھتا ہے:

سرو سیمینا بصحرا می روی نیک بد عهدی که بی ما می روی

(صفحہ ۱۵۹)

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ ان ایام میں اگرچہ ہندی سرود دربار میں رائج تھا مگر فارسی نغمات بالعموم رائج ہیں۔

دہلی میں کیقباد کی آمد کی خوشی میں رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ تمام شہر آراستہ کیا جاتا ہے اور قبے یا گنبد بنائے جاتے ہیں جن پر گل بندی کی جاتی ہے۔ ان قبوں میں مجالس رقص و سرود قائم ہوتی ہیں اور لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ان کے سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ مورخ مذکور لکھتا ہے:

"در دهلی از شادی رسیدن سلطان قبها بستند و گلها آراستند و سرود گویان خوبرو و پاکوبان صاحب جمال از قدیم و جدید از سرود گفتن و پاکوفتن در قبها بالای بر آوردند و خلق شهر بر جمال ایشان عاشق تر و دیوانه تر گشته" (صفحہ ۱۶۴)۔

خود کیقباد ان قبوں کو دیکھنے شہر میں آتا ہے۔ قبے بنانے کی رسم پرانی معلوم ہوتی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا رواج ہندوستان میں آیا ہے۔ نویں صدی ہجری میں قبہ بندی کا ذکر عبدالرزاق نے اپنی تاریخ "مطلع السعدین" میں بالتفصیل کیا ہے، جب وہ شاہرخ کا سفیر بن کر بیجا نگر آتا ہے۔ جلال الدین خلجی (سنہ ۶۸۹ و ۶۹۵ھ م

۱۲۹۰ و ۱۲۹۵ء) اپنی مجالس میں امیر خسرو کی غزلوں کو بے حد پسند کرتا تھا۔ برنی :

"و غزل خوانان مجلس سلطان امیر خاصہ و حمید راجہ بودند و هر روز امیر خسرو دران مجلس غزلهای نو آوردی و سلطان شیفتۂ غزلهای امیر خسرو شدہ بود۔"

فیرز شاہ کے مطربوں اور رقاصوں کے یہ نام ہم تک پہنچے ہیں :

"محمد سنہ چنگی جو چنگ بجاتا تھا۔ فتوحا اور دختر فقائی اور نصرت خاتون سرود سرا تھے۔ دختر خاصہ نصرت بی بی اور مہرافروز رقاص تھیں۔ ضیا برنی لکھتے ہیں :

"و از مطربان مجلس سلطان محمد سنہ چنگی چنگ زدی و فتوحا و دختر فقائی و نصرت خاتون سرود گفتندی کہ از آواز سادہ و فادۂ ایشان مرغ از هوا فرود آمدی و هوش از سامعان رفتی دلها طپیدی و جانها در مراحز شدی و دختر خاصہ نصرت بی بی و مہرافروز کہ از نہایت حسن و غایت تنگ شنگ درهر جانبی کہ می دیدند و هرکرشمہ کہ می کردند و هر غمزہ کہ می زوند کان نمک می ریختند و در مجلس سلطان پاکوفتندی و هرکہ پاکوفتن و کرشمہ و ناز کردن ایشان بدیدی خواستی کہ جان خود را بر سر ایشان نثار کند و تا زید چشم از زیر پای ایشان برندارد۔"

علاء الدین خلجی (سنہ ۶۹۵ و ۷۱۶ھ م ۱۲۹۵ و ۱۳۱۶ء) کے دربار میں خوانندے اور قوال موجود تھے۔ ان میں سے پہلے گروہ کو ضیاء برنی مقریوں کے نام سے یاد کرتا ہے لیکن یہ مقری قاری نہیں ہیں بلکہ خوانندے اگرچہ ہمارا مورخ مولانا کا محترم لفظ ان کے نام سے قبل لا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے :

"و در دہ سال اول علائی مقریان آن عصر مولانا حمید الدین و مولانا لطیف پسران مولانا مسعود مقری بودند و در دہ سال آخر پسران مولانا لطیف' الطف و محمد شدند و هرچہار مقری مذکور ازانہا کہ جانہا از آواز خوش ایشان خواستی کہ از قالب بیرون آید و هیچ صاحب دلی طاقت خواندن ایشان نیاوردی و در هر مجلسی کہ مقریان مذکور سرود کردندی آرائش آن مجلس یکی بہ صدی شدی و بعد از ایشان نہ آن چنان خوش آوازان و نہ آن چنان خوب رویان و نہ آن چنان مجلس آرایان و نہ

آنچنان سرود گویان و نہ آن چنان لطیفہ گویان چشم روزگار دید" (صفحہ ۳۶۴)۔

اس کے بعد وہ غزل خوانوں کا ذکر کرتا ہے جن میں محمود بن سکہ اور عیسو نشیان اور محمد مقری اور ایسا خدادی مزماری کے نام ملتے ہیں۔ عبارت یہ ہے:

"و غزل خوانان عصر علائی ہمہ از اعجوبہ روزگار بودند و چنین دانم کہ درگلوی محمود بن سکہ و عیسو نشیان و محمد مقری و ایسا خدادی مزماری از مزامیر آل داؤدی سرشتہ بودند و دانم آنان کہ خواندن غزل ایشان شنیدہ بودند دانند کہ آن چنان غزل خوانان نہ پیش ازیشان بودہ باشند و نہ بعد از ایشان پیدا آیند و خطاطان و کاتبان و محقق نویسان و یا شطرنج بازان و قوالان و مطربان و چنگیان و ربابیان و کماپخیان و نوبتیان کہ در عصر علائی بودند در ہیچ عہدی آن چنان نبودہ اند۔" (صفحہ ۳۶۴ و ۳۶۵)۔

جب سلطان فیروز شاہ تغلق (سنہ ۷۵۲ و ۷۹۰ھ) محمد تغلق کی وفات کے بعد سندھ میں تاج پوشی کرکے دہلی پہنچتا ہے، تمام شہر میں آئین بندی ہوئی اور جشن کی تیاریاں کی گئیں اور جگہ جگہ قبے بنائے گئے۔ ان میں چھ قبے خاص اہتمام سے بنائے گئے تھے اور برابر اکیس روز تک جشن رچایا۔ ہر قبے پر ایک ایک لاکھ تنکہ صرف ہوا۔ ہر شخص کو کھانا، شربت اور پان ملتا تھا اور مخلوق ان قبوں کو دیکھنے کے لیے دور دور سے ٹوٹ پڑی تھی۔ برابر اکیس روز تک شاہی حکم سے جو شخص جس قسم کا کھانا مانگتا اس کو دیا جاتا۔ قبے لکڑی کے بنائے گئے تھے جو نہایت بلند تھے۔ بے شمار لکڑیاں لگائی گئی تھیں۔ لکڑیوں پر کپڑا لپیٹا گیا تھا جس پر چھینٹ کا کام ہو رہا تھا۔ ہر قبے میں ناچ اور گانا جاری تھا چنانچہ شمس سراج عفیف کا بیان ہے:

"راویان اکمل روایت کردہ اند کہ شش قبہ در شہر دھلی بستہ بودند ... در زیر ھر قبہ مدت بیست و یک روز جشن بود۔ در ھر یک قبہ یک لک تنکہ خرج شدہ بود۔ از طعام و شربت و تنبول چندان کہ بہ تقریر و تحریر نیاید ھیچ کس را منع نبود۔ خلائق برای دیدن قبہ ھا از اطراف و اکناف عالم می آمدند و درین بست و یک

روز بفرمان شاہ فیروز ہرکہ برای تماشا آمدی ہرچہ خواستی از الوان نعمت خوش خوردی و آن قبہا از چوبینہ بود بلند چہار پوشش از چوبہای بی شمار۔ در قبہا جامہای زرمینہ پیچیدہ نقش ہا لون بلون کردہ۔ در زیر ہرقبہ مطربان سرود می گفتند۔ پاکوبان پای می کوفتند مدت بیست و یک روز بہ دولت حضرت شاہ فیروز شادی عام میان خلائق خاص و عام مدام بود۔ ابیات:

در شہر بستہ قبہ ہر سو ۔ بنشستہ دران ہزار مہ رو
ہریک بطریق و طرز دیگر پوشیدہ دگر لباس و گوہر
بازار ز جامہ گشتہ زیبا ہر سو علمی بگشتہ برپا

(صفحہ ۸۸-۸۹)

عید کے روز فیروز شاہ کے جلوس سواری میں مطربوں اور مغنیہ عورتوں کی جماعت بھی ہوتی تھی۔ مطربوں کا لباس زرد جامہ اور سرخ پگڑی تھی اور عورتیں بیش بہا اور مکلّل لباس میں ہوتی تھیں اور چالیس چالیس ہزار روپیہ کا زیور پہنے ہوتی تھیں۔ نماز کے بعد دربار لگتا تھا اور دربار کے ختم ہونے پر مطربوں کی جماعت کو انعام ملتا تھا۔ ہمارا مورخ لکھتا ہے:

"بعدہ طائفہ و مطربان و اہل طرب می بروند۔ تمام مطربان جامہای معصفر در بر و دستار ہای لعل بر سر و طائفہ اہل طرب با پیراہن ہای مرصع و مکلّل و لباس ہای بیش بہا۔ ہریک نفر چہل گان ہزار تنگہ را پیرایہ پوشیدہ" (صفحہ ۳۶۳)۔

"مع ہذا چون بانگ پاس آمدی غیر محل شدی ترتیب آرائش جشن بازگشتی۔ تمام طائفہ قوال و اہل طرب دران روز انعام می یافتند" (صفحہ ۳۶۵، فیروز شاہی از شمس سراج عفیف)۔

نماز جمعہ کے بعد بھی فیروزشاہ کی خدمت میں ہر ہفتے تین جماعتیں باری باری آتی تھیں یعنی مطربۂ پہلوان اور قصہ خوان۔ وہ ان کے کمال سے محظوظ ہوتا اور انعام دے کر رخصت کرتا۔ ان سب کی تعداد دو تین ہزار کے قریب

ہوتی تھی اور کم سے کم انعام ایک روپیہ تھا۔ مطرب لوگ لالچ میں آکر اپنے بچوں کو ساتھ لے آتے تھے۔ اہل دفتر نے ان میں تفریق کرنی چاہی لیکن بادشاہ نے ان کو روک دیا چنانچہ اس انعام میں بچے بھی شام کر لیے گئے۔

سلطان محمد شاہ بہمنی (سنہ ۷۵۹ و ۷۷۶ھ م ۱۳۵۸ و ۱۳۷۵ء) (کے) حالات میں مورخ فرشتہ نے ایک حکایت' جو ملا داؤد بیدری مصنف کتاب "تحفتہ السلاطین" سے منقول ہے' یوں لکھی ہے:

جس سال محمد شاہ بہمنی نے تخت پیروزہ پر جلوس کیا ہے اور چالیس روز تک جشن منایا ہے ان ایام میں دہلی کے استادان موسیقی کی ایک جماعت جو عمل و صوت امیر خسرو و امیر حسن دہلوی سے واقف تھی بلکہ بعض ان میں سے بے واسطہ ان بزرگوں سے فیض حاصل کیے ہوئے (تھے) مع تین سو قوالوں کے دربار میں آئے۔ سلطان نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ جشن کے آخر روز ایک مجلس خاص ترتیب دی گئی۔ ان قوالوں کی ایک جماعت نے امیر خسرو کے دو شعر' جو مدح سلاطین و تعریف حسن میں تھے' بڑی استادی کے ساتھ گائے۔ سلطان بے حد محظوظ ہوا۔ چونکہ شراب کے اثر میں تھا ملک سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ دہلی سے جو تین سو قوال آئے ہیں ان کے وظیفے کی چٹھی خزانہ رائے بیجانگر پر لکھ دو۔ ملک نائب سیف الدین غوری سمجھ گئے کہ سلطان نشے میں ہے لیکن حسب مصلحت وقت جو حکم کہہ کر خاموش ہوگئے۔ دوسرے دن جب بادشاہ ہوش میں آیا ملک نائب سے دریافت کیا کہ قوالوں کے وظیفے کی چٹھی رائے کے خزانے پر لکھی ہے یا نہیں؟ ملک نائب نے عرض کی کہ ابھی لکھی جاتی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ میں نے یہ بات شراب کے نشے میں نہیں کہی بلکہ عین ہوشیاری میں۔ تم چٹھی لکھ دو۔ یہ وظیفہ رائے کے خزانے سے دلوانا میرا کام ہے۔ ملک نائب نے حسب الارشاد چٹھی لکھ دی اور وہ چٹھی ایک قاصد کی معرفت رائے کے پاس بھیج دی گئی۔ رائے بیجانگر دکن کے تمام ہندو

راجاؤں میں نہایت مقتدر اور زبردست تھا اس کے ساتھ ہی بے حد مغرور اور بہادر تھا جب یہ چٹھی اس کی نظر سے گزری بہت بر افروختہ ہوا۔ چٹھی لانے والے کو گدھے پر سوار کر کے تمام بیجانگر میں پھروایا اور شہر سے اخراج کردیا۔ اس کے بعد تیس ہزار سوار، نو لاکھ پیادے اور تین ہزار ہاتھی لے کر مسلمانی سرحد کے قریب آدھمکا۔ قلعہ اودنی میں پڑاؤ کیا اور مسلمانی علاقے کی تاخت و تاراج شروع کردی۔ عین برسات میں قلعہ مدکل کو محصور کر کے فتح کرایا۔ محصورین کی کل تعدد نو سو عورت و مرد کے قریب تھی۔ سب کو شہید کردیا۔ ایک آدمی اتفاق سے بچ نکلا جس نے گلبرگہ پہنچ کر یہ خبر محمد شاہ کے گوش گزار کی۔ سنہ ۷۶۷ھ میں محمد شاہ نے نو ہزار سوار کے ساتھ عین برسات میں چڑھائی کی اور دریائے کرشنا کو عبور کر کے غنیم کے مقابل جا ڈٹا۔ اس کے بعد لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جس میں بیجانگریوں کو بار بار شکستیں ملتی ہیں اور ان کے بڑے بڑے افسر مارے جاتے ہیں۔ بالاخر کشن رائے والی بیجانگر تنگ آکر صلح کی درخواست کرتا ہے۔ سلطان محمد اصل مقدمے کی طرف رجوع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب تک دہلی کے قوالوں کا وظیفہ ادا نہیں ہوگا اس وقت (تک) ہمارے تمہارے درمیان صلح ناممکن ہے۔ بالاخر کشن رائے قوالوں کا وظیفہ اپنے خزانے سے ادا کرتا ہے اور یہ خونی جنگ، جس میں ہزاروں لاکھوں جانیں تباہ ہوئیں، ختم ہوجاتی ہے۔ (تاریخ فرشتہ، صفحہ ۲۸۸ - ۲۹۲، نول کشور)

تاریخ فرشتہ میں فیروز شاہ بہمنی (سنہ ۸۰۰ و ۸۲۵ھ م ۱۳۹۷ و ۱۴۲۱ء) کے ذکر میں اس کا یہ قول درج ہے جو نغمہ اور شراب سے متعلق ہے:

"اما چون نغمہ مرا بذکر حق مشغول می سازد و آن دیگر در نفس من انگیز فتنہ نمی نماید از درگاہ غفار ستار امیدوارم کہ مرا بدین دو امر مواخذ و معاتب نگرداند"

(تاریخ فرشتہ، صفحہ ۳۰۷)۔

قاضی سراج، فیروز شاہ بہمنی کے امرا میں شامل تھے۔ بادشاہ نے دیو رائے پر چڑھائی کی تھی۔ برسات کا موسم تھا اور دریائے کرشنا چڑھا ہوا تھا دوسرے ساحل پر غنیم کی ٹڈی دل فوجیں پڑی تھیں۔ بادشاہ نے ہرچند دریا کے عبور کی تدبیریں سوچیں لیکن کوئی بن نہ پڑی۔ سرداران فوج سے مشورہ کیا مگر وہ بھی کوئی معقول تجویز نہ بتا سکے۔ بادشاہ خالی بیٹھنے اور انتظار کرنے سے گھبرا گیا تھا۔ اس موقع پر قاضی سراج نے آ کر اپنے آپ کو فدائی کے طور پر پیش کیا اور گزارش کی کہ میں اپنے بھروسے کے چند آدمی لے کر دریا پار غنیم کے لشکر میں جاتا ہوں اور موقع پا کر دیو رائے یا اس کے فرزند پر حملہ کرتا ہوں۔ جب بیجا نگریوں میں شور مچے شاہی فوج تیار رہے اور دریا عبور کر کے دشمن پر ہلا بول دے۔ یہ کہہ کر قاضی سات آدمی اپنے ساتھ لے کر اور قلندروں کا بھیس کر کے دریا پار اتر گیا۔ دیو رائے کی فوج میں پہنچ کر اس نے خرابات خانہ یعنی اس حصے میں جہاں رنڈیاں رہتی تھیں ٹھکانہ بنا لیا اور لشکر کی ایک پاتر کے ساتھ عشق بازی شروع کر دی۔ شام کے وقت پاتر کو دیو رائے کے لڑکے کے ہاں گانے کے لیے بلایا گیا۔ پاتر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ قاضی سراج مچل گئے بولے: جان من! مجھے تمہاری جدائی کی تاب نہیں ہے۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ پاتر نے کہا: رائے زادہ کے ہاں صرف اہل نغمہ جا سکتے ہیں غیروں کو اجازت نہیں۔ قاضی نے کہا: تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ میں بھی اسی معزز جماعت سے تعلق رکھتا ہوں اور رائے زادہ کے سامنے دیکھو تو کیسا کمال دکھاتا ہوں۔ پاتر نے طنزاً کہا: معلوم ہوتا ہے تمہارے بڑے بوڑھے یہی پیشہ کرتے آئے ہیں۔ اور قاضی کی طرف اپنی منڈل بڑھا کر (بولی): ذرا اس پر تو دو ہاتھ مارو، میں بھی تو دیکھوں تم کتنے پانی میں ہو۔ قاضی نے ساز اٹھا لیا اور گانا بجانا شروع کیا۔ پاتر قاضی کا کمال دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ بولی: استاد تمہیں ساتھ لے جانا میرے لیے باعث عزت ہے، شوق سے چلو۔ قاضی نے دربار میں پہنچ کر نیا رنگ بدلا۔ خود نے اور ان کے ایک ہمراہی نے زنانہ لباس پہن لیا۔ منڈل بجا کر تانیں اڑا کر اور اپنے فن کا کمال دکھا کر سب اہل دربار کو مسخر کر لیا۔ اس کے بعد، جیسا کہ دکن

میں رواج ہے' دونوں نے ننگی کٹاریاں اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور کرتب دکھانا شروع کیے۔ ناچتے ناچتے موقع پا کر دونوں نے اچانک اپنی اپنی کٹاریں رائے زادہ کے پیٹ میں گھونپ دیں اور پھر دوسرے لوگوں پر حملہ کردیا۔ قاضی کے پانچ ہمراہی جو باہر موقع کے منتظر تھے قناتیں چیر کر اندر گھس آئے اور درباریوں کے قتل میں مشغول ہوگئے۔ درباری بھونچکے سے رہ گئے اور ایک ہلڑ مچ گیا۔ حملہ آوروں نے چراغ گل کردیئے۔ شمعیں بجھادیں اور خاصہ خون ریزی کرکے اندھیرے میں نکل گئے۔ ادھر دیو رائے کے لشکر میں کہرام مچ گیا۔ بعض بولے کہ مسلمانی فوجیں آپہنچی ہیں اور شب خون مار رہی ہیں۔ بعض بولے کہ صرف ان کے پیادے دریا عبور کرکے آگئے ہیں۔ رات اندھیری تھی۔ ہندو سرداروں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی اپنی جگہ ہوشیار کھڑے رہیں۔ الغرض شاہی فوجوں کو موقع ملا۔ دریا عبور کرکے اتر آئیں۔ دیو رائے کے پیادے' جو گھاٹ کی نگرانی پر مقرر تھے' مسلمانی فوجوں کو آتا دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ صبح ہوتے سلطان فیروزشاہ بھی باقی لشکر سمیت اس پار پہنچ گیا اور آتے ہی ہندو فوج سے بھڑ گیا۔ ہندو فوجیں پہلے ہی بددل تھیں اور متفرق ہو رہی تھیں۔ ادھر دیو رائے کے ہوش و حواس بیٹے کے مارے جانے سے ٹھکانے نہیں تھے۔ وہ بیٹے کی لاش لے کر صبح ہونے سے پہلے ہی میدان سے چل دیا۔ (صفحہ ۳۱۰' تاریخ فرشتہ)

فرشتہ نے لکھا ہے کہ ایک سال ملک ابو سعید (سنہ ۸۵۵ - ۸۷۲ھ) نے سلطان محمود خلجی والی مالوہ کے پاس خواجہ جمال الدین کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اس سال جب راجہ گوالیار کو معلوم ہوا کہ سلطان ابو سعید کو موسیقی اور سنگیت سے رغبت ہے' راجہ نے اس فن کی دو تین معتبر کتابیں اس فن کے عالموں کے ہمراہ روانہ کیں۔ اس راجہ کے بعد اس کے فرزند راجہ کوپ نے بھی اس سلسلہ اتحاد کو قائم رکھا۔ اکثر ہندوستان کے تحفے اور سوغات بھیجتا رہا:

"در همان سال راجه گوالیار چون شنید که میرزا سلطان ابو سعید را بعلم موسیقی و سنگیت میل تمام است دوسه کتب معتبر آن فن را همراه مردم عالم و کتاب خوان

ارسال نمود و پرسش راجہ کوپ نیز اخلاص موروثی رابرپای داشتہ پیوستہ تحف و ھدایا می فرستاد"(صفحہ ۲۵۴' مقالہ پنجم' جلد دوم)۔

سنہ ۹۴۱ھ میں جب ہمایوں نے گجرات پر حملہ کیا ہے اور بہادر شاہ گجراتی قلعہ مانڈو میں محصور ہو کر گجرات کی طرف فرار کرگیا ہے۔ ہمایونی فوجیں قلعے کو فتح کرلیتی ہیں۔ ہمایوں سرخ کپڑے بہ آئین مغل پہن کر بیٹھ جاتا ہے اور شہر میں قتل عام کا حکم دیتا ہے۔ شاہ گجرات کے ملازم ہر طرف چھپتے پھرتے ہیں۔ بہادر شاہ کا مشہور کلاونت منجھو' جو اس کے مقربوں میں تھا' فرار کی کوشش میں ایک مغل کے ہاتھ گرفتار ہوجاتا ہے۔ مغل نے اسے قتل کرنا چاہا۔ منجھو نے کہا: اے مغل! میرے قتل سے تمہیں یہ فائدہ ہوگا' مجھے زندہ رکھو' میں بہادر شاہ کا مصاحب ہوں' روپے کی کمی نہیں' تمہیں اپنے وزن کے برابر سونا تول دوں گا۔ مغل نے منجھو کے دونوں ہاتھ باندھ دیئے اور منتظر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک راجہ ہمایوں سے ملنے آیا۔ اس نے منجھو کو پہچان لیا۔ راجہ نے چاہا کہ منجھو کو اپنے ساتھ دربار میں لے جائے۔ مغل نے کہا: دیکھتے نہیں قتل عام کا حکم ہے اور یہ میرا قیدی ہے۔ میں اسے زندہ کب چھوڑتا ہوں۔ راجا کے آدمی زیادہ تھے۔ انہوں نے ہلڑ کر کے منجھو کو بچا لیا۔ لیکن ضدی مغل نے پھر بھی پیچھا نہیں چھوڑا اور جھگڑتا ہو راجہ کے ساتھ ساتھ دربار شاہی میں پہنچ گیا۔ ہمایوں طیش کی حالت میں تھا۔ قتل کے سوا اس کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا تھا۔ مغل نے چلا کر اور منجھو کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میرا قیدی ہے اور اس ہندو نے زبردستی مجھ سے چھین لیا ہے۔ خوش حال بیگ قورچی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ منجھو کی شخصیت اور اس کے کمال سے خوب واقف تھا۔ اس نے عرض کی: یہ منجھو کلاونت ہے جو مغنیوں کا سرتاج ہے۔ پادشاہ نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پھر کہا: پادشاہ سلامت! آج ہندوستان میں اس کی ٹکر کا کوئی اور گویا نہیں ہے۔ پادشاہ کا غصہ کم ہوا۔ حکم دیا کہ کچھ سنائے۔ منجھو فارسی نغمات میں بھی بے نظیر تھا۔ اس نے فوراً ایک فارسی چیز چھیڑ دی۔ پادشاہ اس کا کمال دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس قدر محظوظ

ہوا کہ فوراً لباس سرخ تبدیل کر کے لباس سبز پہن لیا جس سے مقصد تھا کہ قتل عام بند کردیا جائے۔ منجھو کو خلعت دیا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا رعایت مانگتے ہو۔ اس نے دست بستہ عرض کی: میرے بہت سے رشتہ دار گرفتار ہیں' میں ان کی رہائی چاہتا ہوں۔ پادشاہ نے اپنا ترکش خاصہ اور اسپ خاصہ منجھو کو عنایت کردیا اور کچھ مقرب اس کے ساتھ کردیئے' اس حکم کے ساتھ کہ جس جس کو منجھو چھڑانا چاہے اسے فوراً رہا کردیا جائے۔ میاں منجھو گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہوئے اور جہاں انہیں ان کے ملاقاتی اور جاننے والے نظر آئے کہتے گئے کہ یہ سب میرے رشتہ دار ہیں اور چھڑاتے گئے۔ لوگوں نے جا کر عرض کی کہ منجھو خویش بیگانہ میں کوئی تمیز نہیں کرتا' وہ سب کو چھڑا رہا ہے۔ پادشاہ مسکرائے اور بولے: کیا مضائقہ ہے' اسے مت روکو' چھڑانے دو۔ اس کی یہ درخواست تو بالکل معمولی (ہے) اگر وہ سلطنت بھی مانگتا تو میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ قصہ مختصر منجھو ہمایوں کے مصاحبوں میں داخل ہوگیا اور جب تک ہمایوں کے پاس رہا جو انعام اسے ملتا اس مغل کے حوالے کرتا اور کہتا' یہ تمہارا حق ہے۔ تم نے میری جان بخشی کی ہے۔ بھلا اس کا معاوضہ میں کیونکر ادا کرسکتا ہوں۔ آخر ایک روز موقع پا کر میاں منجھو ہمایوں کے پاس سے چل دیئے اور سیدھے اپنے آقا بہادر شاہ کے پاس پہنچ گئے۔ بہادر شاہ نے جب سنا کہ منجھو آگیا ہے بے حد خوش ہوا اور بولا کہ میں نے اب تک جو کچھ کھویا تھا میں سمجھتا ہوں کہ منجھو کے آ جانے سے مجھے سب کچھ مل گیا۔ ہمایوں نے جو منجھو کے فرار کی خبر سنی بولے: بڑا بدنصیب تھا۔ اگر میرے پاس رہتا میں اتنا دیتا کہ بہادر شاہ کو بھول جاتا۔ (صفحہ ۲۵۰' مرآت سکندری)۔

سلطان مظفر شاہ (سنہ ۹۱۷ و ۹۳۲ھ م ۱۵۱۱ و ۱۵۲۵ء) فن موسیقی میں دست گاہ کامل رکھتا تھا اور ساتھ ہی خوش گلو بھی تھا اور ہر قسم کے ساز بجاتا تھا۔ بڑے بڑے گویے اس فن میں اس کے شاگرد تھے۔ صاحب مرآت سکندری لکھتے ہیں کہ:

"سلطان در علم موسیقی مو می شگافت و بغایت خوش آواز بود۔ ہر سازی کہ بدست می گرفت می نواخت چہ رباب و چہ چتری و چہ چتر و اوچھ و سرمندل و غیر

آن۔ استادان این فن بہ شاگردی سلطان افتخار می کردند۔ سلطان خود صاحب فن بود در جمیع فنون موسیقی چہ در سورانبہ و مہیار و چہ درنالدبہاو چہ در براکیت و چہ در سواردہ و چہ در چھند و دھرو و دوھرہ" (صفحہ ۱۷۹' مرآت سکندری)۔

اس کے بعد اسی مورخ نے حکایت ذیل اسی سلطان کی دی ہے:

جب سلطان جوان تھا ایک جشن کے موقع پر اس نے موسیقی کے استادوں سے دریافت کیا کہ اس عہد میں کوئی ایسی پاتر بھی ہے جو سرستی کا سوانگ بھر سکے اور اس کی جتنی شرطیں ہیں ان کو پورا کرسکے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں درج ہے کہ اعلیٰ شاعر اور گویا اور سازندہ اور رقاص سرستی کی سرپرستی میں پرورش پاتا ہے اس لیے سرستی کا سوانگ وہی شخص بھر سکتا ہے جو صفات بالا میں کامل ہو اور ساتھ ہی حسین و جمیل بھی ہو۔ سب نے عرض کی کہ ایسے مجموعہ صفات کا فی زمانا پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ پھر سب نے یہ رائے دی کہ صرف بائی چھاؤ پاتر سلطانی' جو ان خوبیوں میں بے مثل ہے' اس منصب کی اہل ہے۔ سلطان نے اس رائے میں ان کے ساتھ اتفاق کیا اور حکم دیا کہ اس کام کے لیے جس جس سامان کی ضرورت ہو مہیا کیا جائے۔ تمام چیزیں موجود ہوگئیں لیکن ہنس' جو سرستی کی سواری ہے' موجود نہیں تھا۔ سلطان نے شہر کے سناروں کو بلوایا اور جس قدر زر و جواہر ہنس کے لیے ضروری تھا' ان کے حوالے کردیا۔ انہوں نے چھ مہینے میں ہنس تیار کردیا۔ پادشاہ نے جشن کیا اور بائی چھاؤ سرستی کی صورت بنا کر ہنس پر بیٹھی اور پھر اس نے اپنا کمال دکھانا شروع کیا۔ پہلے شعروں میں بدیہہ گوئی کی جس کا ہر دوسرا مصرع پہلے سے ممتاز تھا۔ پھر ساز ہاتھ میں لیا اور ایسا بجایا کہ موسیقی دان دنگ رہ گئے اور پھر نغمہ سرائی شروع (کی) لوگ اس کے کمال سے مست و مبہوت رہ گئے۔ پھر رقاصی شروع کی اور اہل مجلس کو تصویر حیرت بنا دیا۔ (ایضاً" صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰)۔

جب بہادر شاہ گجراتی (سنہ ۹۳۲ و ۹۴۳ھ م ۱۵۲۵ و ۱۵۳۶ء) شہزادگی کے ایام (میں) اپنے باپ سے خفا ہو کر گجرات سے نکل گیا تھا' اس آوارگی کے ایام میں کچھ

دنوں وہ چتوڑ بھی رانا چتوڑ کا مہمان رہا ہے۔ انہی دنوں میں ایک دن رانا کے بھتیجے نے شہزادے کی دعوت کی۔ بہادر خان اس کی دعوت میں گیا۔ ضیافت کے (بعد) جیسا کہ امرائے عہد کا دستور تھا' مجلس رقص و سرود گرم ہوئی اور پاتریں باری باری آ کر اپنا ہنر دکھانے لگیں۔ اس اثنا میں ایک پاتر آئی جو حسین ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کی رقاص تھی۔ شہزادہ بہادر خان نے خاص توجہ سے اس کی طرف دیکھا۔ رانا کا بھتیجا تاڑ گیا۔ خدا جانے شہزادے کو جلانے کے لیے یا بھولے پن سے پوچھ بیٹھا کہ آپ شاید اس پاتر (کے) وطن اور حسب نسب کے واقف نہیں۔ شہزادے نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اس پر اس نے کہنا شروع کیا کہ جب رانا نے شہر احمد نگر کو لوٹا تھا اور مسلمانوں کو قتل کیا تھا اس وقت یہ لڑکی بچہ سی تھی۔ رانا اسے لے آیا۔ یہ لڑکی احمد نگر کے شرفا کی اولاد ہے اور اس کے باپ کا فلاں نام تھا۔ ادھر رانا کے بھتیجے نے اس مسلمان شریف کا نام لیا اور شہزادہ بہادر خاں کو اس قدر غیرت آئی کہ طیش میں آ کر تلوار سونت کر اس نے رانا کے برادر زادے کے ایسا ہاتھ مارا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور مر گیا۔ مجلس میں کہرام مچ گیا۔ راجپوت شہزادے پر دوڑ پڑے اور چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔ یہ خبر رانا کی ماں کو پہنچی۔ وہ فوراً ایک خنجر لیے محل سے نکل آئی۔ راجپوتوں کو للکارا اور بولی : خبردار ! اگر کسی نے شہزادے پر ہاتھ اٹھایا' میں یہ خنجر اپنے پیٹ میں مار لوں گی۔ رانا تک خبر پہنچی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو روکا اور کہا کہ اس جواں مرگ نے شہزادہ گجرات کے سامنے کیوں ایسی اشتعال دلانے والی (بات) کی۔ اگر اس نے ایسا کیا اپنی سزا بھگتی مگر تم کیوں اس کے درپے ہوتے ہو۔ قصہ مختصر شہزادہ اس ہنگامے سے نکل کر اور چتوڑ چھوڑ کر ہندوستان کی طرف چل دیا۔ (مرآت سکندری' صفحہ ۱۹۳)۔

اس تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس گرامی (کذا) دریا خاں وزیر سلطان محمود گجراتی (سنہ ۹۴۴ و ۹۶۱ھ م ۱۵۳۷ و ۱۵۵۳ء) اہل نغمہ و موسیقی کا بڑا زبردست سرپرست تھا۔ اس کے زمانے میں احمد آباد اندر کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ گھر گھر سے نغمہ اور

ساز کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور جشن منائے جاتے تھے۔ دریا خاں کے ہاں بڑے بڑے کلاونت جمع تھے مثلاً نایک ابھو' نایک حسینی پسر نایک بخشو اور رنگ خاں اور ملی جو نایک چیز کے بیٹے تھے اور کھیم برمن۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن (میں) بے مثال تھا۔ ان کے علاوہ اور بیسیوں نایک تھے جو اس کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور پاتروں اور اہل جشن میں موہن راؤ اور رنگ راؤ اور دلسی راؤ اور کھنمور جو رقاصی میں بے مثل مانے گئے ہیں۔ بائی چھاؤ کا' جس کا ذکر اوپر آچکا ہے' بیان ہے کہ دریا خاں ایک روز میرے سلام کے لیے آیا اور مجھے اپنی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔ جب میں اس کی مجلس میں پہنچی کیا دیکھتی ہوں کہ مجلس نہایت تکلفات سے سجائی گئی (ہے)۔ عطریات کی لپٹوں سے میں چکرا گئی اور فروش کی رنگینی' مکان کی نقاشی و طلا کاری دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اگرچہ میں سلطان مظفر کی حرموں میں داخل تھی اور خود سلطان اپنی مجلس کی آراستگی میں بے حد تکلف سے کام لیتا تھا تاہم میں نے ایسی شان دار مجلس کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارا مورخ لکھتا ہے:

"می گویند کہ در ایام حکومت دریا خاں از ہر خانہ و منزل بلکہ از ہر کوچہ و بازار آواز سرود و ساز و نغمہ و غلغلہ جشن بگوش مردم می رسید۔ از قوم کلاونت مثل نایک ابھو کہ عظم رمیم نایک گوپال را نغمہ روح افزای او صلای جان می داد و دیگر نایک حسینی پسر نایک بخشو و رنگ خان و ملی پسران نایک چیز و کھیم برمن کہ ھریک بافسون گوینده کہ زھرہ را از رفعت آسمانی در قید ھبوط بندگی می آورد و ورای ایشان کلاونت بسیار کہ ھریک در فن خود بی نظیر بودند در خدمت خان مداومت می نمودند و از پاتر و اھل جشن مثل موھن راؤ و رنگ راؤ و دیسی راؤ و کھنمور کہ ھنگام چرخ ایشان چرخ گردش خود را فراموش می کرد و از فروغ جشن ایشان ماہ دست بہ نرمہ گوش می برد۔ سید محمود بخاری نقل می کردند کہ من از پدر خود یاد دارم کہ ایشان از بائی چھاؤ نام حرم سلطان مظفر مرحوم کہ ذکر او بالا گزشت نقل می کردند کہ روزی خان بسلام من آمدہ بود و مرا تکلیف

تماشای جشن خود نمود چون قدم در جشن گاہ وی نہادم روائح عطریات و فوائح خوشبوی تن برآمد و مرا مدھوش کرد و مشاہدہ تلون فراش و تنقش و تذہیب شفاف محلات او مرا متحیر ساخت باوجودی کہ من حرم محترم سلطان مظفر (بودم) و سلطان نیز درین امر مموس و مکلف بود اما من چنین مجلس یاد ندارم" (صفحہ ۲۶۹ - ۲۶۸، مرآت سکندری)۔

اسلام شاہ کی وفات کے بعد جب ہمایوں دوبارہ ہندوستان پر قابض ہو گیا، حاجی خان، اس کا ایک سردار، دہلی ترک (کر) کے گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ اس سفر میں حاجی خان کے ساتھ پانچ ہزار سوار اور ڈیڑھ سو ہاتھی تھے۔ جب اس کا گزر رانا چتوڑ کے علاقے میں ہوا، رانا چالیس ہزار سوار لے کر اس کا سدِ راہ بن گیا۔ حاجی خان نے رانا کے پاس کہلا بھیجا کہ ہم مسافر ہیں آپ ہمیں گزرنے دیں اور نہ روکیں۔ رانا نے کہا: میں اس شرط پر راستہ دوں گا کہ چالیس من سونا اور تمہارا بہترین ہاتھی بہتہ نامی اور رنگ رای تمہاری پاتر میرے حوالے کردو۔ حاجی خان نے پہلی دو شرطیں مان لیں اور کہا کہ میں سونا اور ہاتھی آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں لیکن پاتر کا ذکر آپ زبان پر نہ لائیں۔ وہ میرے حرموں میں داخل ہے۔ رانا نے حاجی خان کا عذر نہ مانا آخر جنگ ٹھن گئی۔ حاجی خان اور اس کے ہمراہی اگرچہ مقدار میں بہت تھوڑے تھے لیکن جان توڑ کر لڑے اور نتیجہ یہ نکلا کہ رانا نے شکست فاش کھائی اور حاجی خان مظفر و منصور گجرات پہنچ گیا۔ (مرآت سکندری، صفحہ ۳۴۷)۔

کہتے ہیں کہ اس کے بعد رانا ہمیشہ یہی دعا مانگتا تھا کہ الٰہی! حاجی خان کو، جس کے ہاتھ سے تو نے مجھے شکست دلائی ہے، دوسرے کے ہاتھ سے شکست نہ دلانا ورنہ میری بڑی رسوائی ہوگی۔ (صفحہ ۳۴۸، ایضاً")

مشائخ اور موسیقی

حسنات العارفین میں ایک مقام پر درج ہے:

"شیخ المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین دھلوی قدس اللہ سرہ العزیز گفت یاد دارم از روز میثاق کہ حق تعالیٰ از من عہد کردہ بود در نغمہ پوربی بود و شیخ این نغمہ را برای ھمین دوست می داشتند" (ورق ۲۴۔ الف)

"شیخ الاسلام قطب الدین قدس سرہ العزیز را چہار شبانروز تحیر بود در وقت نقل و آن چنان بود کہ در خانقاہ شیخ علی سکزی رحمتہ اللہ علیہ سماع بود۔ شیخ قطب الدین نور اللہ مرقدہ در آن جمع حاضر بودند۔ قوال این قصیدہ می خواند:

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جان دیگر است

شیخ قطب الدین القدس اللہ سرہ العزیز این بیت در گرفت از آن مقام بخانہ آمد مدھوش بودند و می فرمودند کہ ھمین بیت بگویند ھمین می گفتند و او ھم چنان در تحیر بود الا آن کہ چون وقت نماز درمی آمد نماز می گزاروند و باز ھمین بیت می گویانید و ھمین می گفتند و او ھم چنان در تحیر بود و حالی و حیرتی پیدا می شد۔ چہار شبانہ روز ھمین حال بود۔ شب پنجم رحلت فرمود۔"

موسیقی پر تالیفات

اگرچہ شرعی احکام موسیقی کے خلاف صاف و صریح موجود ہیں لیکن مسلمان اس فن کی مزاولت میں ہندوستان کی کسی قوم سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ شاہی درباروں اور مشائخ کی درگاہوں میں اس کے رواج نے مسلمانوں کی اس فن کی طرف سے قومی نفرت کو ایک بڑی حد تک کمزور کردیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس فن کی ترقی میں ہر قسم کے لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ موسیقی کے پرستاروں میں ادنیٰ عوام الناس سے لے کر قوم کے پیشوا و امراء و سلاطین تک کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ بلکہ بعض وقت تو شیوخ درکنار خود شرع مقدس کے ترجمان یعنی قاضیوں نے بھی اس کے اکتساب میں دریغ

نہیں کیا ہے۔ موسیقی کے میدان میں اگرچہ مسلمانی تالیفات کی تعداد کم ملتی ہے تاہم یہ تعداد چنداں مایوسی بخش نہیں ہے۔

ابتدائی تالیفات اکثر تراجم ہیں جو سنسکرت و دیگر ہندی زبانوں سے ہوئے ہیں۔ سب سے قدیم کتاب "غنیۃ المنیہ" ہے جو ہندی مآخذ پر مبنی ہے اور سلطان فیروز شاہ تغلق (سنہ ۷۵۲ - ۷۹۰ھ) کے عہد میں حاکم گجرات کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ کتاب "بحرالفضائل" بھی اتفاق سے گجرات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب سنہ ۸۳۷ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ اس میں ایک فصل ہندی موسیقی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے بعد ہمیں اکبری عہد تک کسی تالیف کا پتہ نہیں ملتا۔ "تشریح الموسیقی" از محمد اکبر المعروف بہ محمد ارزانی بن محمد مقیم اکبری عہد میں تالیف ہوئی ہے۔ درحقیقت یہ تان سین کی تالیف "بدھ پرکاش" کا فارسی ترجمہ ہے جو اکبر کے حکم سے کیا جاتا ہے(۴)۔ اسی عہد میں ایک اور تالیف "تحفۃ الادوار" از عنایت اللہ بن میر حاج الہروی' اکبر کے نام پر لکھی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم کتاب "نورس" ہے' جو ابراہیم عادل شاہ بادشاہ بیجاپور کا کارنامہ ہے۔ "نورس" ہندی زبان میں ہے اور سہ نثر ظہوری' فارسی کی مشہور درسی کتاب(۵) اسی نورس کا دیباچہ ہے۔ شاہ جہاں کے عہد کا بڑا کارنامہ بخشو نایک کے ایک ہزار دھرپد کی تدوین ہے۔ یہ مجموعہ خود شاہ جہاں پادشاہ کے حکم سے تیار ہوا ہے۔ بخشو کے دھرپد چونکہ دیگر اساتذہ کے مقابلے میں زیادہ شیریں اور رسیلے ہوتے تھے اور دوسرے لوگوں نے اس کے رنگ میں لکھنا شروع کردیا تھا اس لیے شاہجہاں پادشاہ نے حکم دیا کہ بخشو کے اصل کلام کو جمع کیا جائے۔ دو سال کے عرصے میں دو ہزار دھرپد' جو بخشو کی طرف منسوب تھے' جمع کیے۔ پھر ان پر نقادانہ تبصرہ کیا گیا۔ جو دھرپد اصلی اور صحیح نظر آیا اس کو رکھ لیا اور باقی کو خارج کردیا۔ اس طرح یہ مجموعہ' جو ایک ہزار دھرپد' پر شامل ہے' تیار ہوا۔

عالم گیر کے زمانے کو عام طور پر ہر قسم کے فنون کے انحطاط کا دور مانا جاتا ہے اور یہ رائے ایک حد تک صحیح ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب متشرع بادشاہ نے دربار

شاہی سے موسیقی کا اخراج کردیا' موسیقی پیشہ جماعت نے موسیقی کا جنازہ نکالا تھا۔ جب یہ جنازہ بادشاہ کی نظر پڑا' پوچھا کس کا جنازہ ہے۔ لوگوں نے عرض کی : موسیقی کا جنازہ ہے۔ اسے دفن کرنے لے جاتے ہیں۔ اس پر بادشاہ مسکرائے اور بولے : ہاں ضرور دفن کرو اور ایسا گہرا دفن کرو کہ پھر نہ نکل سکے۔ یہ سب کچھ درست لیکن واقعات اس کے برخلاف ہیں۔ جو ترقی موسیقی کی ادبیات کو عالم گیر کے عہد میں ملی ہے' کسی اور زمانے میں نصیب نہیں ہوئی۔ جس قدر اس فن پر تالیفات اس عہد میں ہوئی ہیں کسی عہد میں نہیں بتائی جاسکتیں۔ موسیقی کی ضخیم اور اہم تالیفات اسی عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ "معرفۃ النغمہ" سنہ ۱۰۷۱ھ میں بنی۔ "مصباح السرور" سنہ ۱۰۷۴ھ میں۔ روشن ضمیر نے "پارجاتک" کا ترجمہ اسی عہد میں کیا ہے۔ "راگ درپن" سنہ ۱۰۷۶ھ میں تالیف ہوتی ہے۔ اب "شمس الاصوات" کا نمبر ہے جو سنہ ۱۱۰۹ھ میں نمودار ہوتی ہے۔ "راگ درپن" کا مصنف فقیر اللہ کشمیر کا صوبہ دار تھا۔ اسی عہد میں دیانت خاں اور اس کا فرزند معتمد خاں گزرے ہیں۔ مقدم الذکر نے متعدد رسالے اور کتابیں نقل و تالیف کرائی ہیں۔ دیانت خاں کے لیے "مقاصد الالحان" و "تحفۃ الادوار" سنہ ۱۰۷۷ھ میں' ہزار دھرپد نایک بخشو سنہ ۱۰۷۸ھ میں نقل کیے جاتے ہیں۔ رسالہ کامل خانی کی جدول سنہ ۱۰۷۸ھ میں خود دیانت خاں تیار کرتا ہے۔ اس کے فرزند معتمد خاں کے لیے راگ درپن اور رسالہ اسامی سر سنہ ۱۰۷۹ھ میں کتابت ہوتے ہیں۔

فہرستِ کتبِ موسیقی از فہرستِ مخطوطاتِ بودلی از ایتھے (آکسفورد' سنہ ۱۸۸۹ء)

نمبر ۱۸۴۵ ک ۱۰۶۳ : "تحفۃ الادوار" : رسالہ مختصر در موسیقی از عنایت اللہ بن میر حاج الہروی۔ کتاب جلال الدین اکبر بادشاہ کے نام پر معنون ہے جس کا متن میں دو مرتبہ نام لیا گیا ہے۔ نظم اور نثر دونوں میں لکھی گئی ہے۔ تاریخ کتابت سنہ ۱۰۷۷ھ محرم ۲۴ = سنہ ۱۶۶۶ء جولائی ۲۷۔ کاتب محمد امیر در اکبر آباد برائے شاہ قباد بن عبدالجلیل الحارثی البدخشی (مخاطب بہ) دیانت خان۔

اسی دیانت خاں کے لیے نمبر ۱۸۴۴: "مقاصد الالحان" از عبدالقادر بن غیبی الحافظ المراغی اکبر آباد میں نقل کی جاتی ہے جس کا خاتمہ یہ ہے:

"تمام شد کتاب مقاصد الالحان بعنایت رب المنان در علم موسیقی از برای شاہ قباد بن عبدالجلیل الحارثی البدخشی بتاریخ سیوم محرم سنہ ۱۰۷۷ھ روز سہ شنبہ در بلدۂ اکبر آباد در ایامی کہ منصب گزاشتہ بودند بطریق استکتاب بخط اعزہ"۔

نمبر ۱۸۴۶ ک ۱۰۴۶: ہزار دھرپد نایک بخشو۔ یہ بخشو نایک کے مصنفہ ہزار دھرپد کا مجموعہ ہے جو شاہ جہاں بادشاہ کے حکم سے تیار ہوا ہے۔ اس کے پہلے صفحے پر ہے:

"کتاب ہزار دھرپد نایک بخشو کہ بحکم شاہ جہان پادشاہ جمع کردہ اند۔"

چونکہ بخشو کی تصانیف دیگر مصنفین کے مقابلے میں افضل و اعلیٰ تھیں اس لیے بادشاہ نے حکم دیا کہ ہر چیز جو بخشو کی طرف منسوب ہے اس کا امتحان کیا جائے اور جو ان میں اصلی ہوں ان کی تدوین کردی جائے۔ دو سال کے عرصے میں دو ہزار دھرپد جمع ہوگئے۔ ان میں سے ایک ہزار انتخاب کر لیے گئے جو چار راگ اور چھیالیس راگنیوں پر حاوی ہیں اور اس مجموعے میں محفوظ ہیں۔ چونکہ بخشو کے اکثر معاصر اس کی طرز میں لکھنے کے عادی تھے اس لیے ان نغموں کے انتخاب و امتحان میں بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔

دیباچے میں ہندی موسیقی پر ایک بیان ملتا ہے اور بخشو کے حالات و فن پر ایک انتقادی نظر ڈالی گئی ہے۔ گوالیر میں اس کی ولادت ہوئی اور راجہ مان گوالیری کے دربار سے اس کا تعلق پیدا ہوگیا (راجہ سنہ ۹۲۴ھ م ۱۵۱۸ء میں انتقال کرتا ہے)۔ چونکہ گوالیر میں موسیقی قدیم سے رائج تھی اور اکثر مشاہیر موسیقی اس علاقے میں پیدا ہوئے، مان سنگھ بھی اس فن میں صاحب کمال بن گیا۔ راجہ مان سنگھ کی وفات کے بعد گوالیار پر سکندر لودھی کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ راجہ کا فرزند بکماجیت اس کے امرا میں داخل ہوگیا اور شمس آباد اس کو جاگیر میں مل گیا۔ سکندر کی وفات پر بکماجیت ابراہیم کے ساتھ رہا اور پانی پت کی جنگ میں ابراہیم کے ساتھ مارا گیا۔ بخشو راجہ کیرت کے پاس کالنجر چلا

گیا۔ اس کے بعد بہادر شاہ گجراتی (سنہ ۹۳۲ و ۹۴۳ھ م ۱۵۲۶ و ۱۵۳۷ء) نے اسے اپنے پاس بلا لیا جس کے دربار میں اس کی باقی عمر بسر ہوئی۔ دیباچے کے خاتمے پر لکھا ہے:

"و از آنجا کہ درین عشرت نامہ از تصانیف نایک بخشو مرار دھرپد نگارش یافتہ و بہندی مرار را سنسری گویند ولذت را رس می نامند و این مجموعہ بہجت افزای لذت انگیز مشتمل بود بر ھردو معنی بسنسر رس موسوم گردید مرار دھرپد چہار راگ و چہل و شش راگنی۔"

مورخہ ۱۰۷۸، صفر ۱۵ (۱۶۶۷ء، اگست ٦)۔

گزشتہ دو نسخوں کی طرح سے شاہ قباد بن عبدالجلیل الحارثی البدخشی دیانت خاں کے واسطے محمد امین اکبر آبادی نے شاہ جہاں آباد میں کتابت کی۔

نمبر ۱۸۴۷ ک ۱۰۶۵: راگ درپن . . .

نمبر ۱۸۴۸ ک ۱۰۶۶: رسالہ در عمل بین و ٹھاٹھ راگ ھای ھندی از عوض محمد کامل خانی۔

مصنف کا بیان ہے کہ بعض دوستوں کی فرمائش سے میں اس تحقیقات میں مصروف ہوا کہ ہندی موسیقی کی رو سے بعض راگ مخصوص اوقات کے ساتھ منسوب ہیں۔ اس بارے میں موسیقی شناس کماحقہ درست اطلاع نہیں دے سکتے تھے اور نہ کتاب سنگیت سے۔ (کچھ پتہ چلتا تھا)۔ اس لیے مصنف نے موسیقی اور اس کے عملی پہلو کا مطالعہ شروع کیا۔ مصنف اس رسالے میں اپنے فلسفیانہ خیالات کی روشنی میں ریاضی و تنجیم کی تحقیقات کے ساتھ ساتھ فن موسیقی و تنجیم کے متعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کتاب میں ایک مقدمہ اور انیس فصلیں ہیں۔ مملوکہ مرزا محمد معتمد خاں خلف دیانت خاں مذکور۔ کتابت سنہ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء) سے تعلق رکھتی ہے۔

نمبر ۱۸۴۹ ک ۱۰۶۶: رسالہ کامل خانی (یعنی عوض محمد کامل خانی مذکورۂ بالا)

در بیان ٹھاٹھ یعنی نواختن سازھا و کوک کردن تا از پردہ بدر نیفتد۔ خاتمہ میں

جدول تقسیمات برائے تعین مخارج نغمات ہے جو مرزا ابوالخیر پسر کامل خاں کے نوشتہ سے منقول ہے۔ اس قسم کا ایک اور جدول دیانت خان مذکور نے اضافہ کیا ہے:

"و بندۂ درگاہ ایزدی قباد بن عبدالجلیل حارثی این جدول را وضع نمود اعداد این ابعاد را موافق ضابطہ کتب موسیقی استخراج نمودہ درین جدول نوشت۔" مرقومہ ۸ ۱۰۷ھ جمادی الآخر (۱۶۶۷ء)۔

اسی کے ساتھ (۲) رسالہ اسامی سر ہے جس میں تین جدولیں ہیں۔ مرقومہ ۲۲ صفر ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء)۔ یہ رسالہ بھی مرزا محمد رستم معتمد خاں بن قباد امانت خاں کی ملک ہے (اضافہ: مرزا محمد معتمد خاں بن قباد امانت خاں تاریخ محمدی تالیف ۱۱۹۰ھ م ۱۷۷۶ء کا مصنف ہے)۔

نمبر ۱۸۵۰ ک ۱۰۶۷: معرفتہ النغمہ از ابو الحسن المتخلص بہ قیصر۔ (قیصر کا دیوان' جس میں ۱۰۷۱ھ کی ایک تاریخ ملتی ہے' انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے)۔

دیباچے میں مصنف کہتا ہے کہ میں نے ۱۰۸۷ھ میں فارسی اور ہندی موسیقی کی بہت سی کتابیں مطالعہ کیں جن پر یہ کتاب مبنی ہے۔ کتاب ایک مقدمہ منقسم بہ دو قسم' دو مقالوں اور ایک خاتمے پر شامل ہے۔ تاریخ ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء)۔

نمبر ۱۸۵۱ ک ۱۰۸۶: نغموں کا مجموعہ جن کی ادائیگی نوٹوں کی بجائے حروف میں ہندوستانی طریق پر ہوئی ہے۔

ڈبلیو آوزلی اورینٹل کلیکشنز'۱ صفحہ ۷۶:

نمبر ۱۸۵۲ ک ۱۰۶۹: رسالہ علم موسیقی: سر گور آوزلی کا خیال ہے کہ یہ رسالہ مشہور سنسکرت کتاب سنگیت درپن کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے نہ کتاب اور نہ اس کے مترجم کا نام دیا ہے (تعداد صفحات ۹۶' ۱۵ سطر فی صفحہ)۔

نمبر ۱۸۵۳ ک ۱۰۶۹: خلاصتہ العیش عالم شاہی: شاہ عالم کے چالیسویں سال جلوس ۱۲۱۳ھ میں سنگیت درپن اور دیگر مآخذ سے تیار ہوئی ہے۔ یہ غالباً" اصل نسخہ (ہے) جو

۱۶؍ ربیع الاول ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں لکھنؤ میں ختم ہوا۔ اسی نام کی ایک اور کتاب ہے جو بلحاظ مضمون اس کتاب سے بالکل مختلف ہے۔

نمبر ۱۷۶۳ اک ۱۰۲۲: تحفۃ الہند از مرزا محمد بن فخرالدین محمد۔

فہرست انڈیا آفس از ایتے:

نمبر ۲۰۰۸ ک ۱۱۱۶: غنیۃ المنیہ: نام مصنف نامعلوم۔ یہ کتاب، جس کے صفحات ۹۲ (۱۳ سطری صفحہ) ہیں، فیروزشاہ تغلق (سنہ ۷۵۲ و ۷۹۰ھ) کے عہد میں امیر شمس الدولہ و الدین ابراہیم حسن ابو رجا حاکم گجرات کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ اس سے پیش تر ایک عربی تالیف "فرید الزمان فی معرفۃ الالحان" کا، جو ایرانی موسیقی پر کتاب ہے، اسی والی کے ارشاد سے فارسی ترجمہ ہوا تھا۔ کتاب ہذا ہندی موسیقی سے تعلق رکھتی ہے اور ہندی موسیقی پر مبنی دو قسم، چار باب اور اٹھارہ فصلوں پر مشتمل ہے:

قسم اول، باب اول: در معرفت سرود، ۴ فصل۔

قسم اول، باب دوم: در معرفت مزامیر، ۲ فصل۔

قسم دوم، باب اول: در بیان رقص، ۴ فصل۔

قسم دوم، باب دوم: در شرائط و آداب مجلس سرود، ۸ فصل۔

نمبر ۲۰۰۹: ترجمہ پارجاتک: سنسکرت کی کتاب پارجاتک کا فارسی ترجمہ از مرزا روشن ضمیر، ضمیر تخلص۔ عہد عالمگیر کا بڑا موسیقی دان تھا (دیکھیے "مخزن الغرائب")۔ تعداد صفحات ۱۸۹ (۱۲ سطری صفحہ)۔

نمبر ۲۰۱۱: تحفۃ الہند از مرزا محمد ابن فخرالدین محمد بفرمائش کوکلتاش خاں برائے شہزادہ معزالدین جہاندار شاہ۔ مقدمہ در حروف تہجیہ ہندیہ و علم خط مشتمل بر چہار فصل۔

باب اول در علم پنگل: سہ فصل۔

باب دوم در قوانی اھل ہند یعنی "تک": دو فصل۔

باب سوم در علم النکار یعنی علم بدیع و بیان: دو فصل۔

باب چہارم در علم سنگار رس یعنی عاشق و معشوق: دو فصل۔
باب پنجم در علم سنگیت یعنی موسیقی اہل ہند: دہ فصل۔
باب ششم در علم کوک یعنی معرفت اقسام زن و مرد: پنج فصل۔
باب ہفتم در علم سامدرک یعنی علم قیافہ: دو فصل۔
باب ہشتم در ذکر لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند۔

نمبر ۲۰۱۷: راگ درپن یعنی رسالہ ترجمہ پوتھی راگ درپن از فقیر اللہ: اصل کتاب سنسکرت کا نام مانکتوہل تھا جو راجہ مان سنگھ گوالیاری کی فرمائش پر لکھی گئی۔ سنہ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ - ۱۶۶۳ء) میں یہ کتاب فقیر اللہ کی نظر سے گزری اور اس نے ترجمے کی ٹھان لی۔ یہ ترجمہ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ - ۱۶۶۶ء) تک ختم نہیں ہوا کیونکہ دسویں یا آخری باب میں وہ کہتا ہے:

"تاحال کہ سنہ ۱۰۷۶"۔ کتاب دس ابواب میں منقسم ہے:

(۱) در سبب تالیف۔ (۲) در دانستن راگ ھا۔ (۳) در تعین ھر موسم کہ در آن موسم کدام راگ و راگنی خوانند۔ (۴) در دانستن سرھا و تصانیفاتی کہ در نغمہ می بندند۔ (۵) در دانستن سازھا و نایک و نایکہ و سکھی۔ (۶) در دانستن عیوب گویندہ۔ (۷) در شناختن آوازھا و رویت حنجرھا۔ (۸) در دانستن اوستاد کامل۔ (۹) در دانستن برندہ و فائدہ برندہ نمودن۔ (۱۰) در باب گویندھا و سازندھا کہ در زمان ما بوند و ھستند۔

نمبر ۲۰۱۸: رسالہ راگ مالا جو راگ و راگنی پر ہے از ٹھاکر داس۔ تصنیف ماہ محرم ۱۱۸۸ھ = ۱۱۸۱ بنگالی = ۱۷۷۴ء۔ صفحات ۱۴ (فی صفحہ ۱۶ - ۱۷ سطریں)۔

نمبر ۲۰۲۱: کنزالموسیقی جو راگ و راگنی اور دوہروں کا مجموعہ ہے جس میں موقع بموقع فارسی ابیات بھی ہیں۔ ابتدا میں ایک فارسی دیباچہ ہے۔ صفحات ۱۳۰ فی صفحہ ۱۳ سطریں۔

نمبر ۲۰۲۲: شمس الاصوات جس کا مادۂ تاریخ "جای نغمہ" = ۱۱۰۹ھ (۱۶۹۷-۱۶۹۸ء) ہے۔ یہ عہد عالم گیر لکھی گئی ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) در کیفیت تفاصل سر که در اصطلاح هند آن را سرادهیائے گویند : ۱۴ فصل۔
(۲) در ذکر راگہای که در اصطلاح هند آن را راگ دهیائے (راگ ادهیائے) گویند : ۔ فصل۔
(۳) در شرح الاپ یعنی برداشتن سروگردانیدن سر در راگ و ذکر ارکان آن که آن را پرکرن (؟) ادهیائے گویند : ۷ فصل۔
(۴) (غلطی سے ۹ لکھا ہے) اقسام گیت که در اصطلاح هند آن را پربندهیائے (پربند ادهیائے) گویند۔
(۵) (فصل لکھا ہے) در شرح قوانین دستک زدن که آن را تار ادهیائے گویند۔

نمبر ۲۰۲۳ : اصول النغمات : مسٹر رچرڈ جانسن کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہیں۔ فہرست مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب پانچ اصول پر شامل ہے :

(۱) در بیان سرادهیا۔
(۲) در بیان راگ ادهیا۔
(۳) در بیان پرکیرن (پرکرنک) ادهیا۔
(۴) در بیان تار ادهیا۔
(۵) در بیان ناد ادهیا۔

نمبر ۲۰۲۴ : مفرح القلوب' میسور کی موسیقی پر ایک تالیف ہے جو ٹیپو سلطان (سنہ ۱۱۹۷ و ۱۲۱۳ھ م ۱۷۸۳ و ۱۷۹۹ء) کے حکم سے حسن علی دکنی المتخلص بہ عزت نے ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) میں تالیف کی۔ اس میں فارسی و ریختہ اشعار کی مثالیں دی گئی ہیں۔ کتاب ایک مقدمہ چھ ابواب اور ایک خاتمہ پر حاوی ہے :

مقدمہ در ذکر صدای مردنگ و آواز گردش زنگولہ و آواز زنگولہ و صدای کدکر الخ۔

(۱) باب اول در بیان نغمہ ابیض و اصولها و ضرب ها و غنا ها و طرزهای شش گانہ۔

(۲) باب دوم در بیان نغمہ اصفر و وقت سرائیدن آن و اصول ھای پنج گانہ آن۔
(۳) باب سوم در بیان نغمہ احمر و اصول ھا و ضرب ھا الخ۔
(۴) باب چہارم در بیان نغمہ زبرجد و اصول ھا و ضرب ھا الخ۔
(۵) باب پنجم در بیان نغمہ ورد و طرز ھای شش گانہ۔
(۶) باب ششم در بیان نغمہ عباسی و اصول ھا الخ۔
خاتمہ در بیان دو غزل فارسی و چندین ریختہ ھندی خارج از وزن شش گانہ۔

نمبر ۲۰۳۲ : ٹیپو سلطان کے بینڈ باجے کے لیے ریختہ غزلیات کا ایک مجموعہ جو صریحاً" مفرح القلوب مذکورۂ بالا سے ماخوذ ہیں۔ اس میں بھی مفرح القلوب کی طرح چھ فصول ہیں اور چھبیس نغموں سے متعلق ہیں۔ ہر فصل میں سولہ ریختہ کی غزلیں اور ایک مقدمہ ہے جس میں ان کے راگ بیان ہوئے ہیں۔

نمبر ۲۰۳۳ : (۱) الہام الطرب' رسالہ در موسیقی (۲) منفعت الطالبین'.در چہار باب :
(الف) در شش راگ (ب) در بیان راگ و راگنی ھا کہ مخصوصند علی الترتیب (ج) در تفصیل راگ و راگنی ھا (د) در بیان اختلاط راگ و راگنی ھا۔

نمبر ۲۹۷۵ : اصل الاصول در موسیقی از محمد نصیر محمدی المتخلص برنج نبیرۂ خواجہ میر درد قریب ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء)۔ مصنف کے والد صاحب میر محمدی' عالم تخلص ہیں جو میر درد کے فرزند ہیں۔ بعض اہل تذکرہ نے برادر زادہ لکھا ہے۔ یہ رسالہ مصنف کے سرپرست میاں ہمت خان برادر خورد میاں نور خاں المتخلص بہ نورنگ و فرزند میاں لعل خاں المتخلص بہ پرب لعل جو بڑا بھائی تھا میاں فیروز خان المتخلص بہ ادا رنگ کا اور فرزند ہے میاں بھوپت خاں برادر میاں نعمت خاں تخلص سدا رنگ کا۔ کتاب دو فن پر منقسم ہے۔ فن اول در حقیقت تل جس میں دو مقدمے دو باب اور ایک خاتمہ ہے۔
فن دوم در بیان لے اس نسخے میں موجود نہیں ہے۔

فہرست بوہار لائبریری (جلد اول' سنہ ۱۹۲۱ء)

نمبر ۲۳۵ : اصول النغمات آصفی : ہندوستانی موسیقی پر، از غلام رضا بن محمد پناہ برای وزیر کہ لقب آصف داشت :

بہ آصف لقب آن سلیمان سریر
بمعنی شاہ و بصورت وزیر

کتاب چھ اصول پر، جو بجائے خود فصلوں میں منقسم ہیں، تقسیم (ہے)۔

نمبر ۲۳۶ : اصول غناء، جو مختلف راگ اور راگنیوں پر شامل ہے۔ ۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) میں رائے چند احمد آبادی نے رائے ڈالچند کے لیے تصنیف کی۔ اسی ذیل میں ایک اور رسالہ موسوم بہ اصوات النغمات ہے۔

از کتاب خانہ راقم

تشریح الموسیقی : از محمد اکبر المعروف بہ محمد ارزانی بن محمد مقیم۔ یہ غالباً "طب ہندی" کا مصنف ہے۔ "طب ہندی" کے مصنف کا نام محمد اکبر بن حاجی میر مقیم لکھا ہے (فہرست آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۹۶۰ نمبر ۳۵۳)۔ "طب اکبر" بھی اسی کی تالیف ہے۔ اس میں نام محمد اکبر عرف حکیم ارزانی دیا ہے۔ "تشریح الموسیقی" تان سین کے رسالے "بدھ پرکاس" کا فارسی ترجمہ ہے، جو محمد ارزانی نے اکبر بادشاہ کے حکم سے کیا ہے[۵]۔ اس میں آٹھ باب ہیں :

(۱) در بیان منشا و مبداء علم و تسمیہ موسیقی۔

(۲) در بیان انواع سماع۔

(۳) در بیان لوازمات و موانعات مغنی۔

(۴) تعداد اصول و فروع و اثمار شجرہ علم موصوف۔

(۵) در بیان تقسیم بعض اصول و فروع و آثار شجرۂ مذکورہ۔

(۶) در بیان اوقات سرائیدن۔

(۷) در بیان آمیزہا یعنی ملونیماء حریک۔

(۸) ساز ھا و تال ھا۔

صفحات ۱۱۰، فی صفحہ ۱۱ سطریں۔

فہرست تصنیفات : طب اکبر، میزان الطب، مجربات اکبری، مفرح القلوب، طب النجا(؟)(۶)، تعاریف الامراض، قرابا دین قادری تالیف ۱۱۳۰ھ ۔

اصول النغمات : از صابر شاہ جو چھ اصل پر شامل ہے :

(۱) سرادھیا، ۱۸ فصل۔ (۲) راگ ادھیا، ۴ فصل (۳) پرکیرن ادھیا، ۶ فصل۔ (۴) اقسام گیت پربند ادھیا۔ (۵) تال ادھیا۔ (۶) ناو ادھیا یعنی فن سازھا و این را است ادھیا نیز گویند۔

قطعہ تاریخ تصنیف از خاتمہ :

نمادم خوش بہ تعمیر مقامات رضای نغمہ پیرا نیک بنیاد
چو تاریخش بجستم گفت ھاتف "اصول آصفی نیک بنیاد"

مصرع آخر مادہ تاریخ ہے جس سے بلحاظ اعداد ملفوظی ۱۰۷۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ایتے کے ہاں اس نام کا ایک نسخہ ہے جس میں پانچ اصول بتائے گئے ہیں۔ پہلے تین وہی ہیں۔ چوتھا اس میں "تار ادھیا" جب کہ ہمارے نسخے میں "پربند ادھیا"۔ پانچواں "تال ادھیا" غائب ہے۔ فہرست نگار کا بیان ہے کہ یہ کتاب رچرڈ جانسن کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس سے شاید یہ مطلب ہو کہ نقل کی گئی ہے۔ بوہار لائبریری کی فہرست جلد اول میں یہی نسخہ ہے، جو اس نسخے کی طرح چھ اصول کا حامل ہے لیکن وہاں مصنف کا نام غلام رضا بن محمد پناہ بتایا ہے۔ میرے نسخے میں قطعہ تاریخ میں "رضای نغمہ پیرا" آتا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ رضائے نغمہ پیرا اور غلام رضا ایک ہی شخص ہے۔ غلام رضا بہرحال مصنف نہیں ہے بلکہ اس کا مرتب معلوم ہوتا ہے کیونکہ دیباچے میں آتا ہے :

"نسخہ ایست مسمی باصول النغمات از مصنفات عالم محقق در علم موسیقی متعارف بہ صابر شاہ کہ مرتب ساختہ است آن را بر شش اصول۔"

لیکن خاتمے کے قطعہ سے پیش تر یہ عبارت آتی ہے:

"تاریخ اتمام این نسخہ بقول مصنف"

"جس سے ظاہر ہے کہ قطعہ کا قائل صابر شاہ ہے حالانکہ قطعہ میں رضا کا نام موجود ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

فہرست ایشیاٹک سوسائٹی بنگال: (۱۹۲۴ء)

نمبر ۱۶۲۹: مصباح السرور: رسالہ در موسیقی ھند۔ تالیف ۱۰۷۴ھ (۱۶۶۳ء) در عہد اورنگ زیب عالم گیر از حسن بن خواجہ طاہر بن محمد قاضی انتور دولت آباد (قلعہ انتور متصل سرحد خاندیس است: منتخب اللباب، صفحہ ۱۴۵، جلد ۳)۔

تحفۃ الہند از میرزا خان (محمد) بن فخرالدین محمد بفرمائش کوکلتاش خاں برائے تعلیم جہاندار شاہ۔

فہرست ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (۱۹۲۶ء):

نمبر ۶۳۹، صفحہ ۴۳۳: راگ درپن تالیف ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) از فقیر اللہ (یا فقیر)، جو مان سنگھ گوالیاری کی کسی ہندی تالیف پر مبنی ہے، جس کا نام مانکتوھل (مان کتوہل) ہے۔

نمبر ۶۴۰، صفحہ ایضاً" تحفۃ الہند۔ تالیف قریب ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۵ء)۔

ریو، جلد دوم، صفحہ ۴۸۹:

ایجرٹن ۷۹۳: رسالہ در موسیقی از "اہوبل" ترجمہ کردہ روشن ضمیر۔ کتاب کا اصل نام صاف نہیں۔ کبھی اس کو "پارجاتک" لکھا ہے، کبھی "تارجتک" اور کبھی "مارجاتک"۔ نہ یہ معلوم ہے کہ کتاب سنسکرت میں ہے یا ہندی میں۔ اصطلاحات اکثر سنسکرت ہیں لیکن اس میں ہندی دوہرے بھی موجود ہیں۔ اس رسالے کے تین حصے

ہیں :

(۱) گیت کانڈ (۲) واد کانڈ (یا باد کانڈ) (۳) نرت کانڈ۔

ریو، جلد سوم، صفحہ ۱۰۸۸ :

رسالہ در موسیقی از میرزا روشن ضمیر المتخلص بہ ضمیر، جس نے کتاب "سنگیت پارجاتک" ترجمہ کی ہے۔ سورت کا بخشی اور وقائع نگار تھا۔ سنہ ۱۰۸۰ھ میں فوت ہوا ("مرآت جہاں" ورق ۴۸۶ اور "تاریخ محمدی" ورق ۲۱۹)۔ شیر خاں لودھی، جس کا باپ ضمیر کا گہرا دوست تھا، اس کو ایک زبردست شاعر اور موسیقی شناس بیان کر رہا ہے۔ اور تاریخ وفات ۱۰۷۷ھ بتاتا ہے۔ اصل کتاب کا نام بہ زبان سنسکرت "پارجاتکا" ہے جو بہشت کے کسی درخت کا نام ہے۔

حواشی

(۱) دیوان مسعود مرتبہ آقای رشید یاسمی میں "ھای" کی جگہ "نای" درج ہے۔ ملاحظہ ہو دیوان مسعود سعد سلمان مطبوعہ تہران، تیرماہ ۱۳۱۸ ہجری شمسی، صفحہ ۵۷۱۔ (مرتب)

(۲) مرتبہ یاسمی میں بجائے "بہرہ ور" "پری" اور حاشیے میں "بہروز"؟ ملاحظہ ہو صفحہ ۵۷۶۔ (مرتب)

(۳) مرتبہ یاسمی میں "ناموک"۔ صفحہ ۵۷۸۔ (مرتب)

(۴) "تشریح الموسیقی" کا جو مخطوطہ شیرانی صاحب کے مجموعہ کتب میں تھا اور اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری (نمبر ۱۵۲۰/۴۵۷۰) میں محفوظ ہے اس کے آغاز میں مترجم کا بیان ہے :

"رسالہ موصوف معروفہ بتسمیہ بدہ پرکاس درین تصنیف لطیف . . . زبدہ کونین میر تان سین قدس سرہ در پیش عاشق صادق نزاکت سمع ظل الٰہی و قدام محب صادق لطافت طبع بادشاہی دام ظلالہ و اجلالہ بجز ترقیم ترجمہ فرخندہ آمال خلاصۃ المآل بتصور نمی رسید لہذا لاچار این سراپا انکسار در ھنگام سعادت التیام از بتہ مہارت تمام و نحارت تام اندرین فن بتحریر و تسطیر ترجمہ موصوفہ ماموز امر اقتضا قدر گردید پس من بعد کتابتش مشتمل ساخت

برهشت باب و بتسمیہ اش بتشریح الموسیقی پرداخت . . . "

اس عبارت سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مترجم (اکبر) بادشاہ کے حکم سے ترجمہ کر رہا ہے۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ محمد اکبر ارزانی کی تالیف "قرابادین قادری" کا سنہ تالیف ۱۱۳۰ھ بتایا جاتا ہے اور اکبر ۱۰۱۴ھ میں وفات پاتا ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر محمد بشیر حسین مرحوم نے لکھا تھا کہ محمد ارزانی "معاصر اورنگ زیب عالم گیر بوده و تا سال ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) بقید حیات بود (فہرست مخطوطات شیرانی" جلد دوم صفحہ ۳۰۱)۔

ریو نے فہرست برٹش میوزیم کے اشاریہ میں محمد اکبر ارزانی کی تاریخ وفات ۱۱۳۴ھ بتائی ہے۔ ملا واحدی نے جو ارزانی کے اخلاف میں تھے حکیم صاحب موصوف کی تاریخ وفات ۱۷ ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۴ھ (مطابق جنوری ۱۷۲۲ء بہ عہد محمد شاہ) بتائی ہے جو درست معلوم ہوتی ہے (ملاحظہ ہو "میرے زمانے کی دلی" نقش ثانی' کراچی)

حکیم سید محمود احمد برکاتی اپنے غیر مطبوعہ مضمون "حکیم محمد اکبر ارزانی" میں فرماتے ہیں کہ مولف نے "قرابادین قادری" کے دیباچے میں اپنی کتابوں کی جو فہرست درج کی ہے اس میں "تشریح الموسیقی" کا نام شامل نہیں۔ گویا یہ ترجمہ انہوں نے اپنی عمر کے آخری برسوں یعنی ۱۱۳۰ سے ۱۱۳۴ھ کے درمیان کیا ہے۔ چنانچہ "در ھنگام سعادت التیام" کا اشارہ فرخ سیر کے آخری ایام یا پھر عہد محمد شاہی کی طرف ہے۔ ممکن ہے اکبر کے عہد میں کوئی ترجمہ "بدھ پرکاش" کا فارسی میں ہوا ہو اور بعد میں یہ ضائع ہوچکا ہو۔ "تشریح الموسیقی" کا ایک نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانے میں بھی ہے جو میری نظر سے نہیں گزرا۔ ممکن ہے اس کے آغاز کی عبارت سے زیر نظر مسئلے پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ (مرتب)

(۵) جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے' یہ امر محل نظر ہے۔ (مرتب)

(٦) یہ غالباً وہی تالیف ہے جسے فہرست آصفیہ میں "طب ہندی" اور فہرست برٹش میوزیم میں "طب النبی" لکھا ہے۔ (مرتب)

عباس صفوی کا شکار

(از ماہنامہ "رومان" لاہور بابت جنوری ۱۹۳۶ء)

"واقعاتِ شکار" کے عنوان سے مضامین کا آغاز اختر شیرانی مرحوم نے اپنے رسالے "بہارستان" کے پہلے شمارے (بابت مئی ۱۹۲۶ء) سے کیا تھا۔ جون ۲۶ء کے پرچے میں بھی اس مضمون کی ایک قسط شائع ہوئی۔ پھر اکتوبر ۲۶ء کے "بہارستان" مین "جہانگیر کا آخری شکار" کے نام سے موصوف کا ایک مضمون نظر آتا ہے۔

اس کے ایک عشرے بعد جب رسالہ "رومان" جاری ہوا تو اس کے جنوری ۳۶ء کے پرچے میں حافظ صاحب کا زیرِ نظر مضمون شائع ہوا۔ اس کا عنوان گو "عباس صفوی کا شکار" ہے لیکن اس کے ساتھ قوسین میں "واقعات شکار کا ایک باب" کے الفاظ بھی درج تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی پرانے سلسلے کی صدائے بازگشت ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ "آلات آتش بازی" کے عنوان سے اسی جلد میں شائع ہونے والے حافظ صاحب کے مضمون کی ابتدائی سطور سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ بھی فن شکار کی تاریخ پر کوئی تالیف سپرد قلم کرنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ مختصر مضمون اسی تالیف کا ایک جزو ہو۔ (مرتب)

تعجب ہے کہ سلاطین اسلام میں سے اکثر اولوالعزم بادشاہ شکار کے شیفتہ اور دل

داوہ تھے اور اگر ہم یہ کلیہ قائم کردیں کہ تمام جلیل القدر سلاطین شکار دوست ہوئے ہیں تو ہم غلطی پر نہیں کہے جاسکتے۔

شاہ عباس ثانی صفوی (۱۰۵۲ھ و ۱۰۷۷ھ) علاوہ زبردست قادر انداز ہونے کے شکار کا بڑا دلدادہ تھا۔ سفر میں جہاں کہیں اس کو شکار کھیلنے کا موقع ملتا وہ ہرگز اس کو خالی نہ جانے دیتا۔ جب وہ اپنے جلوس کے ابتدا میں کاشان پہنچا ہے ہر روز شکار کے لیے عصر کے قریب سوار ہوتا۔ اس کا مورخ طاہر وحید ہم سے کہتا ہے کہ عباس ثانی شکار کو روباہ صفت دشمنوں پر غلبہ پانے کا سرمشق جانتا تھا۔ تیر اندازی میں اس کو اس درجہ مشق حاصل تھی کہ اڑتے پرندوں کو مار لینا اس کے نزدیک کوئی بڑا کام نہیں تھا:

بنوعی گرم و سوزان می رود از دل بہ رگ تیرش
کہ از بوی کباب افتد بہ فکر زخم نخچیرش

دس دس اخروٹ لال پیلے رنگوا کر ان کو جفت و طاق کی ترکیب سے آماج گاہ پر دائرے کی شکل میں رکھوا دیتا۔ پھر بیس قدم کے فاصلے سے دس تیروں میں لال اخروٹ اور دس تیروں میں پیلے اخروٹ اڑا دیتا اور ان بیس نشانوں میں سے اس کا ایک نشانہ بھی خالی نہ جاتا۔ عباس کو شکار قال کا' جس کو ایرانی مورخ قمال کہتا ہے' بے حد شوق تھا۔

۱۰۵۶ء میں شاہ جہاں بادشاہ نے جاں نثار خاں کو' جس کا منصب سہ ہزاری تھا' بہ رسم رسالت شاہ عباس کے دربار میں بھیجا۔ ایرانی بادشاہ نے اس کی بڑی خاطر کی۔ مختلف موقعوں پر عباس نے سفیر پر اپنا دبدبہ قائم کرنے کی غرض سے اسے مختلف کمالات مثلاً اسپ دوانی' شمشیر زنی اور تیر اندازی وغیرہ وغیرہ دکھائے۔ جاں نثار خاں کو وہ شکار میں بھی غالباً" اسی مقصد سے ساتھ لے گیا۔ عباس نے دو جانور' جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھے' ایک گولی میں گرا دیے۔ جاں نثار خاں' جو پاس ہی کھڑا تھا' بہت تعریف کرنے لگا۔ عباس نے وہی بندوق اس کو عنایت کردی۔

ایرانیوں میں جال سے شکار کھیلنے کا بھی دستور تھا۔ وزلون کے قرب و جوار میں

اس نے یہ جالیں نصب کرائے۔ اس کا امیر شکار باشی اللہ ویردی بیگ تھا‘ جس کا معاون قلندر سلطان تفنگچی اقاسی تھا۔ تیس فرسنگ یا پچھتر کوس کے فاصلے سے جرگہ آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا ایک فرسخ کے طول و عرض میں لایا گیا۔ اس کے چاروں طرف جال لگا دیا گیا تھا اور بادشاہ نے آکر شکار کھیلنا شروع کیا۔ جاں نثار خاں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ بادشاہ نے دعویٰ کر کے کئی جانوروں کی آنکھوں پر تیر لگایا اور اپنا دعویٰ سچ کردیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے خواص اور امرا کی تیراندازی کا امتحان شروع کیا۔ جاں نثار خاں نے بھی اس امتحان میں حصہ لینا چاہا لیکن کمان اس کے پاس نہیں تھی بادشاہ نے اسی وقت اپنی خاص کمانوں میں سے ایک کمان‘ جو بالکل جاں نثار کے بازو کی تھی‘ منگوا دی۔ جاں نثار خاں کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ اس شکار میں ایلچی ہندوستان کے کپڑے شکار کے خون میں بھر گئے تھے۔ بادشاہ نے فوراً اس کو خلعت فاخرہ عطا فرمادیا۔ اس دن چھ ہزار جانور شکار کیے گئے تھے۔ ان میں وہ جانور داخل نہیں ہیں جو زخمی ہو کر جرگہ کے لوگوں کے ہاتھ لگ گئے۔

اپنے جلوس کے آخری سال جب عباس قندھار کی تسخیر کے ارادے سے ایران سے روانہ ہو کر ہرات پہنچا ہے تو اس کا قیام پل مالاں پر ہوا۔ ہرات رود کے جنگل میں جنگلی سوروں کے شکار کی خاطر تین روز پڑا رہا۔ یہ شکار ہمارے ہاکا سے زیادہ مشابہ ہے۔ آدمی جنگلوں میں شور مچاتے ہوئے چلتے جاتے‘ سور نکلتے اور مارے جاتے۔ اگر ایسے مقام پر ہیں جہاں آدمی نہیں پہنچ سکتا تو انہیں آگ جلا کر نکالا جاتا ہے۔

طاہر وحید‘ شاہ عباس کا مورخ مدعی ہے کہ سلاطین سابق میں سے کسی نے شیر کو یوز کی طرح شکار کھیلنے کی تعلیم نہیں دی ہے اور نہ کسی نے اس کا خیال ہی کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ شاہ عباس نے اپنے زمان سلطنت میں سب سے پہلے اس امر پر کامیابی کے ساتھ توجہ کی۔ اس بدعت کی ترویج کا سلسلہ یوں ہوا کہ والی عربستان نے شیر کے کئی بچے تحفے کے طور پر عباس کے پاس بھیجے۔ ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا اور بند ہی رہتے تھے۔ البتہ جشن اور دربار کے موقعوں پر شاہی شان و شوکت افزوں

کرنے کے لیے' جیسا کہ سلاطین کا دستور ہے' انہیں درگاہ میں باندھ دیا جاتا تھا۔

ایک دن شاہ عباس کو خیال ہوا کہ کیا وجہ ہے کہ شیر چیتے کی طرح نہ سدھایا جائے اور اس سے شکار نہ کھیلا جائے۔ بادشاہ نے اپنا خیال اکثر تجربہ کار شکاریوں پر ظاہر کیا لیکن سب نے یہی کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ لیکن بادشاہ اپنی رائے میں مضبوط رہا۔ آخر اس نے اللہ ویردی خاں کو' جو ان دنوں بیگلربیگی کوہ کیلویہ مقرر ہو چکا تھا' حکم بھیجا کہ جس طرح ممکن ہو شیر کو نخچیر پکڑنے کی غرض سے تعلیم دینا چاہئے اور حتی الوسع بہت جلد ایک یا دو جانور اس ارادہ سے تیار ہو جانے چاہئیں۔ عباس ان دنوں مازندان کے پہاڑوں اور جنگلوں میں عنقریب شکار کھیلنے جانے والا تھا اور اس کا منشا تھا کہ شیر سے بھی شکار کھیلے۔ اللہ ویردی خاں اپنے فن میں پورا ماہر تھا۔ کام اگرچہ مشکل تھا لیکن اس نے محض اپنی محنت اور استقلال سے اس میں غیر مترقبہ کامیابی حاصل کی۔ جب بادشاہ کا مازندران کا سفر قریب آگیا' وہ شیر درگاہ میں بھیج دیئے گئے۔ یہ ابھی بچے ہی تھے۔ اگرچہ شکار کر سکتے تھے لیکن پورے قد کے نہیں ہوئے تھے۔ سفر میں چیتوں کی طرح ان کی سواری کے لیے خاص محفے تیار کرائے جن میں شیر کو بٹھا دیا جاتا تھا۔ یہ محفے گاڑیوں پر لدے ہوئے تھے۔ جب راستے میں کیچڑ زیادہ ہوتا' محفوں کو ہاتھیوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ شیر سے شکار کھیلنا نہ کبھی سنا ہے اور نہ بڑے بوڑھے اسے قدامت کا دستور بتاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت مشکل امر ہے۔ سدھانے والے کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ ہے۔ اسے نہایت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ جانور کے دانت یا پنجے مارنے کے وقت اسے صرف نرمی سے کام لینا پڑتا ہے۔ شیر جب شکار پر جھپٹتا ہے تو نہایت تیزی سے جاتا ہے جیسے بجلی کوند گئی۔ معلم کو اس کا ساتھ دینا ناممکن ہے۔ اور جب وہ شکار پکڑ لیتا ہے پھر کس کی مجال ہے کہ اس کے پنجوں سے چھڑوا لے۔ قصہ مختصر وہ وقت آیا جب شیر کو شکار کے لیے چھوڑ اگیا۔ یہ شیر جس کو سدھایا گیا تھا بالکل نو عمر تھا اور اسے شکار پکڑنے کا تجربہ نہ تھا۔ چونکہ یہ پہلا تجربہ تھا اس لیے اللہ ویردی خاں نے یہ ہدایت کی تھی کہ مبتدی کو آزمائشاً" مادہ گراز پر چھوڑا جائے'

جس کی درانتی نہ ہو۔ اگر پہلی مرتبہ اسے جنگلی سور پر چھوڑا گیا تو ممکن ہے کہ اس کی درانتی سے اسے زخم پہنچے اور یہ نو تعلیم ڈر کر آئندہ شکار کھیلنے سے بالکل انکار کردے۔ الغرض دور سے ایک گراز بھاگتا ہوا نظر آیا۔ فاصلہ اس قدر تھا کہ یہ تمیز ہونا مشکل تھا کہ وہ نر ہے یا مادہ لیکن سب کا گمان یہی تھا کہ وہ مادہ ہے۔ شکاری شیر نو آموز کو اس پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ نو مشق زنجیر سے چھوٹتے ہی بجلی کی طرح کوند گیا اور چند منٹ میں سور سے آویزش کر رہا تھا۔ نئے کھلاڑی کے دانت اور پنجوں نے تھوڑی دیر میں حریف کو بالکل مغلوب کرلیا۔ جب شیربان موقع پر پہنچے اور سور کی درانتی پر ان کی نظر پڑی تو بیچارے یہ خیال کر کے کہ انہوں نے دھوکے سے شیر کو مادہ گراز کے بجائے جنگلی سور پر چھوڑ دیا تھا' بادشاہی غضب سے خوف کے مارے کانپنے لگے۔ لیکن جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ سور کے دانت نہیں تھے بلکہ ایسے درخت کے "ریشہ" تھے' جو سور کو بہت مرغوب ہے اور شیر نے اس ریشہ کو سور کے منہ پر نہایت استادی اور چالاکی سے' اس خیال سے کہ وہ اسے لڑائی کے وقت زخم نہ پہنچا سکے' لپیٹ دیا تھا۔ لوگوں کو اس پر اور بھی تعجب ہوا۔

عباس نے امتحاناً" ان شیروں سے کئی مرتبہ شکار کھلوایا اور وہ ان کی کارگزاری سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے ان کے لیے جڑاؤ پٹے اور طلائی زنجیر بنوادی اور ان کے مخفوں کو طلائی اور لاجوردی کام سے مزین کرایا۔ علاوہ بریں زر بفت کی جھولیں ان کو عنایت ہوئیں۔ عباس نے بعد میں ان شیروں سے گورخر اور گوزن کا بھی شکار کھیلا ہے۔

عباس ایک مرتبہ قزوین کے جنگل میں کلنگ کا شکار کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گر پڑا۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس کے کچھ چوٹ نہیں آئی۔ اس موقع پر ہمیں وہ کہانی یاد آتی ہے جو نہایت مشہور ہے کہ بادشاہ عباس ایک مرتبہ علی الصباح شکار کی غرض سے نکلا۔ سب سے پہلے اس کی نظر ایک نہایت کریہہ منظر آدمی پر پڑی۔ اس کا گھوڑا اس آدمی کو دیکھ کر چمکا۔ بادشاہ گھوڑے کے یکایک چمکنے سے سنبھل نہ سکا اور گر پڑا۔ غصے

میں اس نے حکم دیا کہ اس منحوس آدمی کو، جس کی آج ہم نے اٹھ کر سب سے پہلے صورت دیکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہم گھوڑے سے گرے ہیں، سولی پر چڑھا دیا جائے۔ لوگ اسے پکڑ کے سولی دینے لے چلے۔ اس نے راستے میں لوگوں سے کہا کہ میری ایک آرزو ہے جو میں چاہتا ہوں تم مرنے سے پہلے پوری کردو۔ لوگوں نے استفسار کیا۔ اس نے کہا کہ ایک دفعہ مجھے بادشاہ کے پاس پھر لے چلو۔ آدمی رحم دل تھے، مان گئے اور واپس شاہ کے پاس قیدی کو لائے۔ قیدی نے پاس سے عرض کی حضور میں اس قدر منحوس ہوں کہ جب حضور نے آج سب سے پہلے مجھ پر نگاہ ڈالی تو حضور کا گھوڑا چمکا اور حضور گر پڑے لیکن جان بچ گئی۔ لیکن میں بادشاہ کی نحوست کے واسطے کیا کہہ سکتا ہوں کہ آج سب سے پہلے میں نے شاہ کی صورت دیکھی اور مجھے آج ہی سولی مل رہی ہے۔ بادشاہ خود انصاف فرمائیں کہ ہم دونوں میں زیادہ منحوس کون ہے۔ عباس کو قیدی کی منطق نے بند کردیا۔ شرمندہ ہو کر اس کو فوراً آزاد کردیا اور انعام دے کر رخصت کیا لیکن اس سے یہ عہد لیا کہ کہ آئندہ علی الصباح گھر سے نہ نکلا کرے بلکہ ذرا دن چڑھے تاکہ لوگ اس کی صورت صبح کے وقت پہلے پہل دیکھنے سے بچ جائیں۔

شاہ عباس ایک دفعہ باغ کوم میں طیور کے شکار کے لیے گیا اور سیر ہو کر وہاں سے باغ وحش کی طرف چلا گیا۔ یہاں جنگلی جانور کثرت سے تھے۔ اس دفعہ گرجستان کے چند رئیس اس کے ساتھ تھے۔ جب بارہ سنگھے، ہرن اور سور احاطے میں آگئے، پہلے بادشاہ نے گرجستانی امرا کے دکھانے کے لیے شیروں سے شکار کھیلا اور چند جانور شیروں سے پکڑے۔ اس کے بعد اس نے اپنی تیراندازی دکھائی۔ اس کے سامنے سے گورخروں کا گلہ بھاگتا ہوا نکل رہا تھا۔ بادشاہ نے اس زور سے ایک تیر مارا کہ دو گورخروں کے جسم کے پار نکل گیا۔ حاضرین عش عش کرنے لگے۔ طاہر وحید مورخ وہیں موجود تھا۔ اس نے فی البدیہہ عرض کیا:

می جهد پران بدان سان ناوک شاه از دو صید
کز دو عینک بگذرد صاف آنچنان نور نگاه

آلاتِ آتش بازی

(از سہ ماہی "اردو" شیرانی نمبر سنہ ۱۹۸۰ء)

حافظ محمود شیرانی مرحوم کے اس (غیر مطبوعہ) مضمون کا مسودہ مجھے ان کے کاغذات میں ملا تھا۔ مضمون کے ابتدائی فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف، جنہیں شکار کا بے حد شوق تھا، دراصل فن شکار کی تاریخ پر کوئی طویل مقالہ یا کتاب لکھ رہے تھے۔ اسی ضمن میں آتشیں آلات کے موضوع پر یہ سطور قلم بند کرنے لگے جو بذاتِ خود ایک دلچسپ مضمون کی صورت اختیار کرگئیں۔ ہمارے ہاں آتش بازی کی ترکیب "فائر ورک" کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن یہاں آلاتِ آتش بازی سے مراد "فائر آرمز" ہیں۔

مضمون اس زمانے میں لکھا گیا ہے جب لاہور میں ملازمت کے آغاز سے قبل وہ اپنے وطن ٹونک میں مقیم تھے۔ اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ مضمون کے ایک فقرے میں جنگ عالم گیر اول کے لیے "موجودہ جنگ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ گویا یہ تحریر سنہ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۸ء کے درمیانی عرصے میں قلمی ہوئی ہے۔

پہلی بار جب میں نے ان صفحات پر نظر ڈالی تو سمجھا کہ یہ اس مضمون کا مسودہ ہے جو مرحوم نے آتشیں اسلحہ کے موضوع پر "تنقید پرتھی راج راسا" کے سلسلے میں لکھا تھا لیکن تفصیلی مطالعہ و مقابلہ

سے معلوم ہوا کہ یہ اس سے مختلف مضمون ہے گو چند باتیں دونوں میں مشترک ہیں۔ غالباً" راسا والا مضمون (جو اس مضمون سے دو عشرے بعد منصہ شہور پر آتا ہے) لکھتے وقت انھوں نے اس پرانے مضمون سے بھی مدد لی ہوگی۔

زیر نظر مضمون حنائی کاغذ کی ایک بیاض ۱۰۱/۲"X ۸۱/۲" کے آغاز میں ۲۱ صفحات پر مشتمل ہے اور یقیناً" تکمیل کا محتاج ہے۔ اس کے بعد فاضل مولف کا مشہور مقالہ "مثنوی یوسف زلیخائے فردوسی" بھی اسی بیاض میں مندرج ہے جو رسالہ "اردو" (اورنگ آباد" کے اکتوبر ۱۹۲۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ بیاض کے باقی صفحات خالی ہیں۔ کاغذ خستہ ہوچکا ہے اور اکثر اوراق کے کنارے گھس گئے ہیں۔ خصوصاً" بیسواں صفحہ جو بیاض کی جزو بندی سے نکلا ہوا ہے اس کا کنارہ جگہ جگہ سے پھٹ چکا ہے جس کی وجہ سے مضمون کے آخری حصے میں ہر سطر کے آخر سے چند الفاظ غائب ہیں۔ ان جگہوں پر میں نے قوسین میں مناسب الفاظ کے اندراج سے عبارات کا ربط قائم کیا ہے۔ دو ایک جگہ جہاں کسی اصطلاح یا پیمائش کی ضرورت تھی میں نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔

مضمون کیونکہ نقش اول ہے اور شکستہ خط میں لکھا گیا ہے اس لیے پڑھنے میں دشواری پیش آئی۔ بہت سے الفاظ پرانے انداز سے تحریر ہوئے ہیں یعنی پتھر کو پتھر' مٹی کو مٹی' دیکھیں گے کو دیکھینگے' یہ کہ یہہ' مجھ کو کو مجکو' نہ ہوا کو نہوا اور پاؤں کو پانو لکھا گیا ہے۔

اس مضمون کو محفوظ کرنے کی غرض سے' شیرانی صاحب کی صد سالہ تقریب ولادت کے موقع پر' سہ ماہی "اردو" (کراچی) کے شیرانی نمبر (سنہ ۱۹۸۰ء) میں شائع کروا دیا گیا تھا۔ (مرتب)۔

شکار کی تاریخ کے دوران میں آلات آتش بازی کی تاریخ پر خامہ فرسائی کرنا، بادی النظر میں غیر موسمی مضمون پر ہاتھ ڈالنا ہے لیکن وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس بیگانہ موضوع کا شکار کے افسانے سے نہایت اہم اور قدیم تعلق ہے اور کون انکار کرسکتا ہے کہ جس طرح ان آلات محرقہ کی اختراع اور اشاعت نے میدان جنگ کے کارناموں میں انقلاب عظیم پیدا کرکے دنیا کی آئندہ تاریخ بدل دی، اسی طرح شکار کے میدان میں ان کا رواج تغیرات عظیم کا بانی نہیں ہوا لیکن ان آلات کی اصل تاریخ مشاہدہ کرنے سے پیش تر سرسری طور پر ہمیں ان آلات کا ذکر کرنا چاہئے جو آتشیں اسلحہ کی اختراع سے پہلے انسان نے مدافعانہ اور جارحانہ اغراض سے وضع کیے تھے۔

اسلحہ آتشی کی ایجاد کے زمانے سے رجعت قہقری کرتے ہوئے اگر ہم ان زمانوں میں پہنچ جائیں جو "قرون الاحجار" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، جب انسان کا آلہ حرب ایک نوک دار گھڑا ہوا پتھر ہوتا تھا جس کو مٹھی میں مضبوط پکڑ کر وہ اپنے دشمن کے خلاف نہایت پھرتی اور طاقت سے استعمال کرتا تھا اور وہاں سے لوٹ کر منزل بہ منزل ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے اپنے زمانے تک آجاویں تو "قرون الحدید" میں لوہے کی دریافت کے وقت سے لے کر اب تک ہر وقت، ہر ملک اور ہر قوم میں ہم بے شمار مصنوعات کا سلسلہ جاری دیکھیں گے جو حملے اور حفاظت کی غرض سے بنی آدم نے ایجاد کی ہیں۔ ان کی پوری تاریخ اور تفصیل میں ایک نیا مجلد تیار ہوسکتا ہے، جس کا اندراج یہاں ہمارے مقصد کے منافی ہے۔ ذیل میں صرف ان ہتھیاروں کے نام دیئے جاتے ہیں جو ایران اور ہندوستان میں رائج تھے :

گوپال	گرز	تیغ	سپر
ورقہ	خنجر	ژوپیں	ناوک
خشت	تیر	خدنگ	کمند
سنان	نیزہ	شمشیر	پرتاب

تبرزین	چرخ	دبوس	قارورہ
شراع	عرادہ	کھانڈہ	گپتی
جمدھر	دوی	جمیہ	کٹار
کمٹھی	برچھی	سانگ	سیلرہ
گوپھن	جم کھاک	بانک	کتارہ
نرسنگھ موتھ	سبز	ساری	زاخول
نرنگانہ	خارماہی	کھیوہ	بھدی
اڑانہ	ابلغہ	گھوگھی	گھوگھوں

ان حربوں میں نیزے کی تاریخ دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت سادہ مگر مضبوط آلہ ہے جو اور حربوں کی نسبت نہایت قدیم ہے۔ چوب دستی اور سنان کی ترکیب سے نیزے کی ولادت ہوئی۔ نیزہ عربوں کا قدیم قومی اسلحہ ہے۔ عرب اور ان کی تقلید میں مسلمان فن نیزہ بازی میں نہایت ممتاز رہے ہیں۔ عربی فتوحات کا سیلاب جو ممالک مشرق و مغرب پر یکایک پھیل گیا اور جس کی سرعت رفتار اب تک مورخین کے لیے سرمایۂ حیرت ہے، اس راز کی عقدہ کشائی صرف عربی نیزہ بازی کے اوراق تاریخ کے مطالعے سے ہوسکتی ہے۔ وہ اس فن میں اپنے زمانے میں فرد تھے۔

اسی اصول پر تیر کی ایجاد ہوتی ہے۔ تیر کی شکل کہہ رہی ہے کہ میں نیزے کا بچہ ہوں۔ تیر اور کمان کے وصل نے تیر انداز کو اپنے حریفوں پر بہت کچھ برتری بخشی ہے۔ اس کا کام پنے دشمنوں کو دور ہی سے چھید دینا ہے۔ فن تیر میں مغل تیر انداز بہت مشہور ہیں اور اس فن کو انہوں نے بہت ترقی دی ہے۔

تلوار، نیزہ اور تیر سے بہت بعد کی اختراع ہے۔ شمشیر صفاہانی اور تیغ ہندی قریب قریب ضرب المثل ہوگئی ہیں۔ جب دشمن دو بدو آتا ہے، تیرانداز اور نیزہ باز سے شمشیر باز اچھا مقابلہ نہیں کرسکتا کیونکہ فاصلے کے دشمن پر چوٹ نہیں کرسکتا

لیکن جنگ مغلوبہ میں اس سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں۔ قدیم زمانوں میں یہ تین ہتھیار شکار اور جنگ کے وقت نہایت ضروری تھے۔

مسلمان اپنے زمانہ میں ان تینوں ہتھیاروں کے استعمال میں یگانہ تھے اور اسی یکتائی نے انہیں اپنے دشمنوں پر بھاری کردیا تھا لیکن نئے زمانے جلد جلد آرہے تھے اور نئے زمانوں کے ساتھ نئی ایجادیں بھی آرہی تھیں۔ آخر وہ انقلاب کا دن آیا جس نے ثابت کردیا کہ آئندہ میدان توپ اور بندوق کے ہاتھ رہے گا۔

مصرع : نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی

میدانی جنگوں میں اگرچہ انسان اپنے موجودہ اسلحہ پر قانع معلوم ہوتا تھا اور جب کہ دو لشکر اسی قسم کے حربوں سے آراستہ تھے' اس حالت میں زیادہ تر ذاتی دلاوری' کثرت فوج یا اچھی تدبیر پر فتح کا انحصار ہوتا تھا لیکن جب دشمن قلعہ نشین ہوگیا تو صورت حال بالکل بدل جاتی تھی۔ کم زور دشمن یہاں امن کے گنبد میں بیٹھ کر نہ صرف مہینوں بلکہ برسوں زبردست لشکر کا مقابلہ اور نقصان کرنے پر قادر تھا اور جس حالت میں کہ قلعہ مضبوط ہے اور اس کی جغرافیائی کیفیت اس کی حفاظت کے قدرتی سامان پیش کر رہی ہے تو ان صورتوں میں ایسے قلعوں کا تسخیر کیا جانا قریب قریب ناممکن ہوگیا تھا۔ قلعہ رنتھنبور علاء الدین خلجی نے بہت بڑا نقصان اٹھانے کے بعد تین سال میں فتح کیا تھا۔ اس قلعہ کے گرد' جو کہ بلند پہاڑ پر واقع ہے' چاروں طرف دور دور تک بلند پہاڑ آگئے ہیں جو گویا اس کی قدرتی حفاظت کر رہے ہیں۔ قلعہ چتوڑ اسی بادشاہ نے چند مہینے میں مسخر کرلیا تھا۔

قلعہ دولت آباد یا دیوگیر نہایت مشہور قلعہ تھا۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ تھا' وہ بھی نہایت تنگ۔ اس راستے میں جگہ جگہ لوہے کے کڑھاؤ زمین دوز کر دیئے گئے تھے۔ غنیم کی آمد کے وقت ان کے نیچے آگ جلا دی جاتی تھی۔ یہ کڑھاؤ آگ کی طرح گرم ہوجاتے تھے اور دشمن کے لیے ان کا عبور کرنا ناممکن ہوجاتا تھا۔ کوٹ کانگڑہ کی دیواریں ایک سو چالیس گز بلند

تھیں۔ قلعہ پہاڑ پر واقع تھا جس میں بڑے بڑے تالاب تھے اور زراعت خوب ہوتی تھی۔ جہانگیر نے اس کو بڑی تکلیف کے بعد فتح کیا تھا۔ صوبہ بہار میں قلعہ رہتاس نہایت نامی گرامی قلعہ تھا۔ بارہ کوس کے دور میں پہاڑ پر یہ قلعہ واقع تھا۔ گھوڑے اونٹ اس پر نہیں جاسکتے تھے۔ قلعہ کے اندر جابجا تالاب اور چشمے تھے اور چودہ گاؤں اس کے اندر آباد تھے۔ پہاڑ کی بلندی اس قدر تھی کہ پیدل آدمی مشکل سے دو پہر میں طے کرسکتا تھا۔ وہ ناممکن الفتح تھا لیکن شیرشاہ' فریب سے' لڑے بھڑے بغیر اس پر قابض ہوگیا۔

ان بیانات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ قلعہ گیری قدیم زمانوں میں ایسا معمہ ہوگیا تھا جس کی عقدہ کشائی کے لیے ہزاروں شگرف کار دماغ مشغول تھے۔ نئی کلیں اور نئے مصالحے دریافت ہو رہے تھے۔ روزانہ نئی ایجادیں ہورہی تھیں۔ منجملہ ان کے ساباط' منجنیق' دبابہ' مہتدام' عرادہ' چرخ اور رعد تھے۔ علاوہ ازیں نفت کا استعمال کیا جاتا تھا اور جب طاقت ور آتش گیر مصالحے دریافت ہوگئے تو نقب زنی سے کام لیا جانے لگا۔

آلات قلعہ کشائی میں منجنیق کا استعمال عربوں میں بہت قدیم ہے۔ ابن قتیبہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۲۰۰ قبل مسیح میں حزیمہ بادشاہ حیرہ نے سب سے پہلے اس سے کام لیا ہے۔ عرب اس کی ایجاد نمرود سے منسوب کرتے ہیں۔ سنہ ۹ ہجری میں' جب رسول اللہؐ نے طائف کا محاصرہ کیا ہے' طفیل ابن عمرو دوسی (کو) بت خانہ ذی الکفین کے انہدام کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ چار دن بعد (وہ) اپنے چار سو آدمیوں کے ساتھ واپس آکر مع منجنیق و دبابہ رسول خدا سے ملحق ہوگیا۔

سنہ ۶۴ ہجری میں جب مکہ کا محاصرہ ہوا ہے تو منجنیق کے ذریعہ سے پتھر پھینکے گئے ہیں۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ نفت بھی' مسلمانوں میں پہلی مرتبہ' اسی موقع پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس محاصرے کے متعلق تاریخ طبری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دو منجنیقیں نصب کی گئی تھیں۔ پہلی خانہ کعبہ میں پتھر پھینکتی'

دوسری صفا اور مروہ پر۔ منجنیق انداز ایک حبشی' ملک حبش کا باشندہ اور کافر تھا[۱]۔ علاوہ ازیں شاعر بھی تھا۔ ام فروہ منجنیق کی کنیت ہے۔ جب صفا پر پتھر پھینکتا' یہ شعر پڑھتا:

کیف تریٰ ضیع ام فروہ تاخذ ھم بین الصفاء و المروہ

جب خانہ کعبہ پر پتھر پھینکتا' یوں پڑھتا:

ماتراھا طمنا غبارھا واللّٰہ یرعبون جارھا

ماہ صفر میں تمام مہینے سنگ اندازی جاری رہی۔ ربیع الاول کی تین تاریخ کو آگ لائی گئی جس کو روئی کے گٹھوں میں رکھ دیا گیا۔ اسی میں گندھک بھی رکھ دی گئی۔ اب یہ گٹھے منجنیق کے ذریعے سے کعبے میں پھینک دیئے گئے۔ غلاف کعبہ میں آگ لگ گئی اور غلاف جل گیا۔ دیوار سیاہ ہوگئی اور کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس آگ کو بجھا سکتا[۲]۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ جب روئی کے گٹھے میں آگ لگا کر پھینکنا چاہا' کل بگڑ گئی اور گٹھا منجنیق پر ہی جلنے لگا۔ محاصرین نے بہت کوشش کی کہ آگ بجھا دیں لیکن ممکن نہیں ہوا۔ یہ اسی روز کا واقعہ ہے جس روز کہ یزید کا شام میں انتقال ہوا[۳]۔

بلاذری کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح سندھ کے وقت محمد بن قاسم نے سنہ ۹۳ ہجری میں مجانیق کے ذریعہ سے' جنہیں قدیم مورخ "عروس" کہتے ہیں اور جن سے کام لینے کے لیے پانسو آدمی درکار تھے' بندرگاہ دیبل فتح کی تھی۔ الور کی جنگ میں جو فتح دیبل کے چند روز بعد ہوئی' کہا جاتا ہے کہ راجہ داہر کا ہاتھی ایک نفت بست تیر سے' جو عربوں نے اس پر چھوڑا تھا' ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔

اس واقعے کے تین صدیوں بعد جب سلطان محمود غزنوی' انندپال راجہ لاہور کو سزا دہی کے ارادے سے سنہ ۳۹۹ ہجری میں ہندوستان آتا ہے تو پشاور کے میدان میں ہندو فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اس جنگ میں راجہ کا ہاتھی حقہ نفت سے ڈر کر' جو اس پر پھینکا گیا تھا' بھاگ جاتا ہے۔ اس واقعے سے ہندو فوجیں

ہزیمت پاتی ہیں۔ اس سے دس سال بعد ملتان کے قریب محمود اور کوہ جود (کے) جاٹوں میں بحری جنگ ہوتی ہے۔ محمود کے پاس چودہ سو کشتیاں تھیں۔ ہر ایک کشتی میں بیس تیر انداز اور پانچ نفت انداز بیٹھے تھے۔ جاٹوں کو شکست ملی۔

عنصری قلعہ غرجستان کے متعلق لکھتا ہے:

چنان کلندی زو سنگ منجنیق عدو
کزو شدی دل خور از نہیب او بلعلام[۴]

الپ ارسلان سلجوقی (سنہ ۴۵۵ و ۴۶۵ھ) اور ارمانوس قیصر روم کی جنگ میں، جس میں ارمانوس گرفتار ہوتا ہے، رومیوں کے پاس اتنی بڑی منجنیق تھی جس پر بارہ سو آدمی کام کرتے تھے۔ وہ آٹھ حصوں میں منقسم تھی۔ اس کی باربرداری کے لیے ایک سو جانور درکار تھے۔ اس منجنیق سے ایک من سے زائد وزن کا پتھر پھینکا جاتا تھا۔

مسعود سعد سلمان نے فتح آگرہ پر آتشی آلات کا استعمال یوں بیان کیا ہے:

سپہ چو دائرہ پیچید گرد حصن حصین[۵] نمود حصن ازو ہمچو نقطہ پرکار
زہر[۶] چہار طرف سنگ منجنیق روان برو چنانکہ سوی چرخ دعوت ابرار[۷]
ھر آتشی کہ بینداختند از کنگر چنان نمودی کز چرخ کوکب سیار
ھر آن سواری کاندر میان آتش رفت اگرچہ بوزی[۸] آتش بگرد او انبار
برون شدی چو براہیم از دل آتش[۹] بگردش آتش سوزندہ می شدی زنہار[۱۰]

شہاب الدین غوری اور پرتھی راج کی جنگ میں اگرچہ مسلمان مورخ آتشی آلات کے استعمال کے متعلق خاموش ہیں لیکن راجہ کے بھاٹ چند کوی کی نظم "پرتھی راج راسا" میں ایسے موقعے آتے ہیں، جن میں نہ صرف آتش گیر آلات کا ذکر ہے بلکہ زنبور، توپ اور توپ کے گولوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ گولوں کی آواز دس دس کوس تک جاتی تھی۔ اس سے کامل شبہ ہوتا ہے کہ ایسے اشعار پرتھی راج راسا میں غالباً" بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں۔[۱۱]

چنگیز خان کے زمانہ میں ہم قارورہائے نفت و سنگ منجنیق اور عرادہ کے علاوہ کمان رعد کا بھی ذکر پڑھتے ہیں۔ یہ آلہ کیا تھا؟ ہم نہیں کہہ سکتے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ منجنیق سے کوئی علیحدہ شے ہے۔ اس سے تیر اور پتھر چلائے جاتے تھے۔

ہلاکو نے جب ۶۵۱ھ میں ایران کی طرف پیش قدمی کی ہے تو اس کے لشکر میں ہزار خانہ دار منجنیق ساز اوز نفت اندازوں کے تھے۔ میا فارقین کا جب اس کی فوجوں نے محاصرہ کیا تو کہا جاتا ہے کہ ملک کامل کے پاس ایک ایسا زبردست منجنیقی تھا جس کی نشانہ بازی نے مغلوں کی فوج کا بہت نقصان کیا۔ مجبور ہو کر انہوں نے بدرالدین لولو کے منجنیقی کو، جو اپنے فن میں استاد کامل مانا گیا تھا، بلوایا۔ اس نے قلعہ کی منجنیق کے عین مقابلے میں اپنی منجنیق نصب کردی۔ دونوں استادوں نے ایک ہی وقت میں پتھر چلائے جو راہ میں آکر ایک دوسرے سے ٹکرائے اور ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر گر گئے[۱۲]۔

امیر تیمور نے بعض قلعے نقب زنی کے ذریعہ سے مسخر کیے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور (اور) سلطان محمود تغلق کی جنگ میں ہندوستانی فوج میں ہاتھیوں کی صف کے برابر رعد اندازوں کی صف تھی۔[۱۳] یہ کون لوگ تھے؟ ہم کہہ نہیں سکتے۔ ایرانی تاریخ میں تخش انداز لوگوں کا بھی ذکر آتا ہے (اور رعد اندازوں کا تذکرہ بھی) دیکھا گیا ہے۔ سنگ رعد کے چلتے وقت بڑی آواز ہوتی تھی جو دور دور تک پہنچتی ہوگی اور غالباً" اسی وجہ (سے) اسے کمان رعد کہا جاتا تھا۔ حبیب السیر کا یہ فقرہ جو قلعہ گل خنداں کی تسخیر کے موقع پر، جب کہ شاہ اسمٰعیل کی فوجیں اسے گھیرے پڑی تھیں، قابل لحاظ ہے:

"از ہیبت صدای سنگ رعد ارکان آن کوہ سمت تزلزل گرفت و از شعلہ قارورۂ نفط بنای زندگانی آن گروہ صفت احتراق پذیرفت۔"

کوہ اور گروہ سے مراد قلعہ اور اہالیِ قلعہ ہیں۔ ایک اور موقع پر (صفحہ ۸۶،

جلد ۳) یہ فقرہ آیا ہے:

"غرش کمان رعد صدای مرگ بگوش هوش بهادران رساند۔"

امیر تیمور اور سلطان بایزید یلدرم کی جنگ میں مغلیہ لشکر میں نفط انداز تھے جو ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔ قلعہ ازمیر جب تیمور نے فرنگیوں سے فتح کیا ہے' محاصرے کے دوران میں محاصرین نے قلعے کے نیچے نقب لگا کر عرادہ اور منجنیق نصب کیے۔ محصورین جواب میں تیر چرخ اور قاروز ہائے نفط اور سنگ پھینکتے تھے۔ محاصرین کے نقب چیوں نے بروبارہ کے پتھر نکال کر ان کی جگہ لکڑیاں بھر دیں' جن پر نفط ڈال دی گئی تھی اور پھر آگ لگا دی گئی۔ اس سے قلعہ کی دیوار ڈھے گئی۔ رخنوں میں سے مغل اندر گھس گئے۔ اسی عرصے میں محصورین کی مدد کے لیے کئی جہاز فرنگیوں کے مع فوج و سامان آئے۔ امیر کے حکم سے بعض مقتولین کے سر کمان رعد میں رکھ کر ان کی کشتیوں میں پھینک دیئے گئے۔ جہاز والے اپنی قوم کے مقتولین کے سر دیکھ کر اور ڈر کر واپس چلے گئے(۱۴)۔

'نفط غالباً' ایشیائی قوموں میں نہایت قدیم زمانے سے مستعمل ہے۔ قدیم سریانی اس کے استعمال سے واقف تھے' علی ہذا قدیم ایرانی۔ ان کے ممالک میں نفط کے چشمے اکثر مقامات میں پائے جاتے ہیں۔ نفط کو آج کل پٹرولیم یا مٹی کا تیل کہا جاتا ہے۔ اس کا رواج بحری جنگوں (اور) قلعہ کشائی میں زیادہ رہا ہے۔ یہ چمچوں اور کرچھیوں کے ذریعہ سے محاصرین پر ڈالی جاتی تھی یا تانبے کی نلکیوں سے' جو جہاز کے عرشے میں لگی ہوتی تھیں۔ بعض وقت رسیاں نفط میں بھگو کر ان میں آگ لگا دی جاتی تھی اور پھر تیروں یا نیزوں کے ذریعے سے غنیم پر پھینک دی جاتی تھیں۔ قارورہ اور شیشوں میں بھر کر پھینکی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں بھاری بھاری کلوں سے کثیر مقدار میں پھینک دی جاتی تھی۔ جہاں جہاں نفط گرتی تھی وہاں آگ لگ جاتی تھی۔ پانی ڈالنے سے وہ اور بھڑک اٹھتی تھی۔ زمین پر وہ چنداں خوفناک نہیں تھی جیسی کہ سمندر پر تھی۔

حروب صلیبی کے دوران میں مغربی قوموں نے سب سے پہلے نفط کا استعمال دیکھا۔ اس آتش سیال کی ہیبت ان کے دلوں میں ضرورت سے زیادہ جم گئی تھی۔ قرون اواسط کے مورخین یورپ مبالغہ آمیز الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ژوان ول کا بیان ہے کہ میں نے عمر بھر اس سے زیادہ کوئی مہیب شے نہیں دیکھی۔ اس کے شعلوں کو وہ اڑتے اژدہے سے مثال دیتا ہے۔ جب سینٹ لوئی بادشاہ فرانس کے قریب یہ چشمہ آتش پہنچتا تھا' وہ زمین پر گر پڑتا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر نہایت تضرع کے لہجہ میں کہتا: اے میرے خداوند مسیح! مجھ کو اور میری فوج کو اس بلا سے بچا۔

بعض اسناد کی رائے ہے کہ وہ یورپ میں ساتویں صدی عیسوی میں پہنچ گئی تھی۔ اس کا اشاعت دینے والا ایک شامی معمار کالی نیکس نامی تھا۔ عربوں کے محاصرۂ قسطنطنیہ کے وقت یونانیوں نے نفط سے نہایت کامیابی کے ساتھ کام لیا ہے۔ قیاصرۂ روم جو نسخہ استعمال کرتے تھے وہ گویا ایک قومی راز تھا۔ ایک مصنف کی رائے میں اس کے اجزا یہ تھے: صنوبر کا پسا ہوا گوند' گندھک اور نفط۔ فرائر بیکن اس کے صرف دو اجزا بتاتا ہے: شورہ اور گندھک۔ ایک اور مصنف کہتا ہے: بید کا کوئلہ' نمک' گندھک' رال' لوبان' کافور اور ... کی اون' جن کو ملا کر ابالا جاتا۔

ریناد اور فادے کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مادۂ محرقہ کے یہ اجزا تھے: گندھک' گوند اور چربی۔ نفط یا یونانی آگ کے اجزا خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ عربوں نے یہ نسخہ بہت جلد معلوم کر لیا' ان کے استاد خواہ رومی ہوں یا چینی' اور اس کثرت سے اس کا استعمال ان کے ہاں ہونے لگا کہ بقول ریناد و فادے (یہ) ان کے حربی آلات کا جزو اعظم بن گیا۔ وہ اسے صدہا طرح سے اور مختلف آلات کے ذریعہ سے دشمن پر پھینکتے تھے۔ انہیں نفط کے نسخوں میں سے' جو قرون اواسط میں کثرت کے ساتھ مستعمل تھے' غالباً" بارود ماخوذ ہوتی ہے۔ بعض مغربی محققین کی رائے ہے کہ بارود کی ولادت گاہ مشرق الاقصیٰ ہے۔ چینی

دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بارود وہاں دو ہزار برس سے آتش بازی میں رائج ہے لیکن بارود کے جنگی استعمال سے چینی لوگ واقف نہیں تھے۔ محض اس بنا پر ہم چین کو اس کا مسقط الراس نہیں مان سکتے۔ اس لیے کہ آتش بازی تمام ممالک ایشیا میں قدیم سے ہے اور بارود کے اجزا یعنی شورہ، گندھک اور کوئلے کا استعمال عموماً آتش بازی میں کیا جاتا ہے اور وہ ایشیا میں قریب قریب ہر ایک ملک میں افراط سے ملتے ہیں۔ سیر المتاخرین سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے سنہ ۳۹۹ھ میں قلعہ بھیم نگر کی فتح کی خوشی میں ایک جشن کیا تھا جس میں آتش بازی بھی شامل تھی:

"ونیز استادان نادرۂ کار صنعت شعار انواع آتش بازی حاضر آوردہ ھنگامہ تماشہ گرم کردند۔"

سلطان فیروز شاہ تغلق (جلوس: ۷۵۲ھ) اپنے عہد میں شب برات کے موقع پر رات کے وقت اور بازیوں کے علاوہ، کوشک فیروز آباد میں، بقول شمس عفیف، گل ریز اور عنبر بیز ہوائیاں چھڑوایا کرتا۔

سنہ ۸۲۲ھ میں مرزا شاہ رخ نے شادی خواجہ کو بطور سفیر خان بالیغ دارالسلطنت ختا میں بھیجا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ شروع سفر سے اختتام سفر تک کے روزانہ حالات اور واقعات لکھتا رہے۔ اس روزنامچے سے، جس کا خلاصہ روضۃ الصفا میں درج ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ختا کے ہاں رسم شب چراغ (میں) آتش بازی بھی چھوڑی جاتی تھی۔ سفیر نے جو آتش بازی وہاں دیکھی تھی یوں بیان کرتا ہے کہ لکڑی کا ایک بہت بڑا پہاڑ بنایا گیا۔ اس پر سرو کی شاخیں نصب کردیں، جن سے تمام پہاڑ زمرد پوش معلوم ہونے لگا۔ پھر اس پر ایک لاکھ چراغ رسیوں پر نصب کردیئے۔ نفط کی انہوں نے موشک یعنی چھچھوندر بنائی۔ ایک چراغ جلا دیا۔ چھچھوندر اس سے آگ لے کر رسیوں پر دوڑنے لگی اور جس چراغ کے پاس پہنچی اس کو جلاتی نکل گئی۔ دم بھر میں اس طرح سے سارے پہاڑ کے

چراغ نیچے سے لے کر اوپر تک روشن ہو گئے۔

شہر بیجانگر کے حالات بیان کرتے ہوئے مصنف ''روضۃ الصفا'' جشن مہتاوی کے ذکر میں، جو تین روز تک منایا جاتا تھا، ضمناً'' آتش بازی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ مثالیں اگرچہ قدیم نہیں تاہم یہ دلیل ہیں اس امر کی کہ آتش بازی ایشیا کے ہر ملک میں ہوا کرتی تھی۔

اب آتش بازی سے بارود کا ماخوذ ہونا نہایت قرین قیاس ہے۔ آتش بازی کے نسخوں میں علی العموم شورہ، گندھک اور کوئلے کا استعمال ہوتا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ جس طرح اس کی احتراقی قوت عام طور پر معلوم تھی، ایک دن کسی آتش باز کو اس کی نفوذی طاقت بھی معلوم ہو گئی ہو۔ آتش بازوں کو اکثر ایسے حادثات پیش آئے ہوں گے۔ ہم یہاں آتش بازی کی ایک بیاض سے، جو قلمی ہے، چند نسخوں کے اوزان لکھتے ہیں:

وزن انار تجربہ جان محمد: شورہ (۱۰ درم) گندھک (یک درم) انگشت (دو درم)

وزن ہوائی از مہاکرن: شورہ (۷ درم) گندھک (دو درم) ہتل ہری (درم) ارندھی (دس دانہ)

وزن انار: شورہ (؟) گندھک (۸ درم) کافور (درم) ہتل (۴ درم)

وزن انار کوکنی محمد شاہی: شورہ (۵ تولہ و سہ ماشہ) گوگرد (۲ تولہ) دیگچوں (۳ تولہ) انگشت (دو نیم ماشہ)

وزن موشک خضر خان: شورہ (۴ درم) گندھک (۳ درم) انگشت (نیم درم)

وزن درخت سرو: شورہ (۱۰ درم) گندھک (۳ درم) انگشت (یک درم)

وزن مہتاب شاہ قطبی صاحب: شورہ پختہ (۸ درم) گندھک (۲ درم) ہرتال پوری (۶ ماشہ) ہتل کبری (۸ ماشہ) کافور (سہ ماشہ) سفیدۂ کاشغری (ماشہ) سوائے شورہ و گندھک اول ہمہ را بسائید بعد ازاں ہمہ را آمیختہ بسائید۔

شورہ پختہ بکار برند۔ اول شورہ راسوزند اگر شعلہ سفید برآید بکار برند و نم کردہ پر کنند۔

وزن ترنج دل بادل : شورہ (۷ درم) انگشت (۲۱ درم) گندھک (۷ درم) آمتن (حصہ دو)

لقمہ اول سخت پر کنند، لقمہ دوم نرم، لقمہ سوم نرم تر دارد۔

گلہای سوسنی : سنگ رائخ (۲ تولہ) شورہ قلمی (۳ پاؤ) نوسادر گندھک (پاؤ سیر) انگشت چیدہ (نیم سیر) دیگچوں (۸ تولہ) رال (۳ تولہ)

اول ہمہ ادویہ را کوفتہ باریک نماید بعد ازان در ھاون انداختہ دو پاس ضرب موسل دھد و از آب ستر و شراب ترکند بعد انان دانہ پھول جھڑی نیم پاؤ کارطوس طیار کند و سنگ رائخ و شورہ و نوسادر را یک جا دو پاس بکوبد و گندھک و انگشت بہ نصف و شورہ و رال را یک جا بکوبد۔ بعد آن کارطوس ھا طیار کند اول از بارود پر کنند یک تہ بعد آن درمیان سنگ رائخ دیگچون را آمیز کردہ قدری بارود انداختہ پر کنند ہمین منوال تا بلب رساند۔ بر لب شراب و بارود دھد و خشک کند بعد از دہ روز آتش دھد گلہای رنگ سوسنی برآید۔

آتش بازی نے، اس میں شک نہیں کہ، ایشیا میں بہت کچھ ترقی پائی ہے۔ ایران و عراق وغیرہ ممالک میں اس فن کے اچھے اچھے استاد گزرے ہیں۔ وہ قریب قریب ہر رنگ اور ہر پھول کی آتش بازی تیار کرسکتے تھے۔ مثلاً نرگس، صد برگ، داؤدی، سمن، سوسن، ارغوان، گل امرود، گل بادام، گل نیلوفر، گل بنفشہ، گل شقائق، مروارید، درخت سرو، ناصری، گل مہدی، گل چنار، غبار قمر، غبار گل مروارید، غبار قمر غربی، غبار شمس، غبار گل خرگاھی، غبار گل صد برگ وغیرہ وغیرہ۔ یہی آتش باز جنہیں ہم آج کل شورگر کہتے ہیں، قدیم زمانوں سے باروت ساز بھی ہیں اور صنعت بارود سازی ہندوستان میں ابھی تک اسی فرقے کے ہاتھ میں ہے۔

اس سے بھی یہی یقین ہوتا ہے کہ بارود آتش بازی سے نکلی ہے اور آتش بازی کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اچھے استاد آتش باز کے پاس باروت کے علیحدہ علیحدہ ایک دو نسخے ہوتے تھے۔ اسی لیے کتابوں کے ذریعہ سے ہم کوئی زیادہ مفید اطلاع حاصل نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم "مجموعۃ الصنائع"(۱۵) سے یہ نسخہ باروت کا نقل کرتے ہیں جسے وہ داروی تیر کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے :

"در صنعت داروی تیر بابت مصر و شام جهت قلاع یادگار محمد زرکش است۔
عیار البقر چهارده درم، عقرب سه درم، نجم چهار درم۔
این دارو را از برای سنگ بزرگ و تمار بزرگ و قلعها افگندن نهایت مجرب است۔"

تیر، گولی کے معنوں میں قرون وسطیٰ میں مستعمل ہوتا ہے اور اسی وجہ سے تیر بندوق اکثر تاریخ میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ دارو غالباً" عربی لفظ ہے جو فارسی میں بھی مستعمل ہے۔ وحید بندوق کی تعریف میں کہتا ہے :

نماید حکیمی مسیحا مزاج
ز داروی او دشمنان را علاج

دارو اصل میں علاج اور نسخہ وغیرہ کے معنوں میں تھا۔ آتش بازوں میں یہ اصطلاح ہر قسم کے نسخے کے واسطے استعمال ہونے لگی مثلاً داروی طاسہ لیکن بعد میں دارو صرف باروت کے معنوں میں مخصوص ہوگیا جیسا کہ شعر بالا سے معلوم ہوتا ہے۔

"داروی کمان" ایک اور لفظ ہمیں ملتا ہے۔ یہاں غالباً" کمان کے معنی بندوق کے ہیں۔ اس طرح سے داروئے کمان بھی بارود کا دوسرا نام ہے۔ لغت کی کتابوں میں کمان زنبوری کے معنے بندوق کے ہیں۔ اس کے لیے اسدی کا ایک شعر بھی نقل کیا گیا ہے :

گر فتند گردان ایران زمین
کمانهای زنبوری و چرخ کین

اس لیے کوئی عجب نہیں اگر مجازاً" کمان بندوق کے معنوں میں آیا ہو۔ داروی تیر کا ایک اور نسخہ ہم اسی کتاب سے نقل کرتے ہیں:

"البقر نوزدہ' زغال چہاردہ' نیم سائیدہ در سرکہ کہنہ تر کنند اما کمان را بگیرد از خانہ فتیلہ تا دامان باید کرد و ربود انگاہ دارو دو دانگ پیش رو و دہ دانگ میدان کمان چون عقد کمان معلوم شد چون از دارو تیر کردہ می شود و بہ نشانہ و تپش رود و پرسازد ناکار خوب آید و مثل آن کمان از قاق و تمار گران و این لعبت ھا پیش استاد درست می شود۔"

اس فارسی کو عام فہم معنی دینا ہماری طاقت سے باہر ہے اس لیے کہ اس کی اصطلاحوں سے ہم ناواقف ہیں۔ دوسرے عبارت میں بعض مقامات پر بعض افعال غالباً" چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

اسی قسم کا ایک اور نسخہ ہم اسی کتاب سے نقل کرتے ہیں:

"این را نیز دارو خوانند عبار تیست البقر مثقالان' عقرب مثقال سخت موسندم بسایند کہ کمان را غبار باید کرد دو دانگ و نیم دارو و دو دانگ و نیم از میدان رعد و رھا کند از بہر تیر و یا از بہر سنگ و کمان را باید کشید باید کہ وزن کمان ھم وزن آن سنگ (باشد) و چہار سوراخ باید کرد .بمقدار چہار انگشت و زفت رومی و مشک صافی و علک فالی از مشبق رومی در سرشت کار و بوزن راست است۔ ھمہ را بسایند و ببرند و در دیگی سفالین اینک بینند کہ این داروھا چنداست بوزن صد درم دارو و یک درم روغن نفط سفید بستا نند و در دیگی اندازند و این داروھا درمیان دیگر اندازند و در سوراخ سنگ کنند تا پرشود و چہار سرمہ دان پرکنند و از روغن نفت و . . . را .بفتیلہ استوار کنند و سنگ راگیرند و جامہ در پوشانند از نمد و ھمہ را بروغن نفت چرب کنند و

گرد بر گرد نمد پاره پاره کنند و درمیان دهان کمان استوار کنند و کمان را باید در آن تر خرکی بسازند در آنجا نهند و شاخ های نمدرا آتش بزنند که هرکجا که سنگ برسد بشکند و بسوزد مجرب است و این اعمال استاد محمد زرکش است۔"

مندرجہ بالا پھٹنے والے پتھر کے گولے کا بیان ہے جو کسی کل سے چلایا جاتا ہوگا اور کوئی تعجب نہیں اگر یہ وہی کمان رعد ہو جس کا ذکر ہم خروج چنگیز خان کے زمانے میں پڑھتے ہیں۔ اس کمان سے تیر اور پتھر چلائے جاسکتے ہیں۔

اسی سلسلے میں سہم الطائی کا بھی ذکر کرنا چاہیے جو بلاد مصر و شام میں مستعمل تھا۔ اس کا عیار حسب ذیل ہے:

"البقر بست مثقال' عقرب یک مثقال فحم دو مثقال که تنک بسایند و کندوی پیچیده و پنجاه طاق کاغذ تابد که سوراخ او علیحده باشد و چهار گوشه او بضرب بکوبند و بهر ضربی صد ضرب زنند و بر سر این دارو پنج درم داروی مفرح بریزند و پنجاه ضرب بزنند و قوام نگاه دارند و بیست ضرب دیگر بزنند و سه درم گوگرد بر سر این دارو بریزند و درمیان این دارو یک مثقال خاک سرخ و پنجاه ضرب بزنند و قوام نگه دارد و بیست ضرب دیگر بزنند و این سرشت و باید سوراخ این سهم یک و نیم گندم باشد بدین طریق سوراخ



نیمه برو بود و بهنگام باید که رخت آهنین باشد چوب تیر باید که دوازده فرجه و مشت باشد و بهنگام دو مشت باید که سه برداشته باشد از پوست و سه جای در بند کنند و عدل او باید در پیدا باشد و بر انگشت عدل کنند تا راست آید و تیردان (؟) نیم قد آدمی باشد و زلفین آهنین باید سوراخ درو باید کرد و این سهم درمیان زلفین اندازند و فتیله را آتش دهند که مجرب است۔"

سہم الطائی' ممکن ہے کہ صرف تفریحی آتش بازی ہو لیکن اس کی صورت' رخت آہنیں' سوراخ اور فتیلہ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو توپ سے بہت ملتی جلتی ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر یہی تفریحی اشیاء سب سے پہلے توپ کی ایجاد کا راز کھولتی ہوں

اسی کتاب میں داروئے کمان کے دو اور نسخے دیئے گئے ہیں :

"البقر بیست' نفط شش' حدید چہاردہ' انگشت و کل شست"

دوسرا نسخہ ہے عیار داروئے کمان کا از مبارک شاہ رعد انداز :

"البقر دہ مثقال' زغال مثقال' عقرب دو نیم مثقال"

"مجموعۃ الصنائع" کے جس قدر نسخے ہیں وہ عربی ذرائع سے پہنچے ہیں۔ استادان خوارزم' خطا' عراق و شام و مصر کے منقول ہیں۔ البقر (شورہ)' عقرب (گندھک)' فحم (کوئلہ) بھی عربی اصطلاحیں ہیں۔ ان ملکوں میں آتش بازی' اس میں شک نہیں' مفرداتی کیفیت سے گزر کر مرکباتی حیثیت میں آگئی ہے' جیسا کہ "طو ملک اندر قفس" کے حوالے سے' جو استاد عوض بغدادی کی طرف منسوب ہے' معلوم ہوتا ہے جس میں ایک طوطا پنجرے کے اندر دکھایا جاتا ہے اور پنجرہ چاروں طرف گھومتا رہتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمان رعد' جس کے متعلق سابق میں ذکر ہوچکا ہے' توپ و بندوق کی ایجاد کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مغلوں کے خروج کے وقت سے اس کا استعمال شروع ہوتا ہے اور یہی قوم اس کو ایشیا کے اقصائے مغرب تک پہنچا دیتی ہے۔ شام و مصر میں اس پر کچھ اضافہ کیا جاتا ہے۔ مصر سے افریقہ میں اشاعت پاتی ہوئی ہسپانیہ پہنچ جاتی ہے' جہاں وہ پوری نشو و نما پا کر توپ کی شکل میں نکلتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ بحث کو کچھ دیر کے لیے منقطع کرکے ہمیں ان روایات کا بھی ذکر کردینا چاہئے جو یورپین مورخین باروت کے متعلق بیان کرتے ہیں۔

بعض اسناد کی یہ رائے ہے' جس میں زیادہ تر یورپین مورخ شامل ہیں کہ قدیم

اہل یونان و ہند و روما غالباً" اس مصالحے سے واقف تھے' اس لیے کہ ان کی تصنیفات سے کسی ایسے مصالحے کا پتہ چلتا ہے۔ ورجل کی کتاب "ایلیڈ" کا اقتباس جس میں ایلس کے بادشاہ کو جوپیٹر نے برق اور رعد کی مشابہت کے جرم میں مار ڈالا ہے' اس خیال کی تقویت کے لیے نقل کیا گیا ہے۔ ڈاین کاسیس اپنی تاریخ روما میں کالیگلا کے ذکر میں بیان کرتا ہے کہ اس نے ایسی ایجاد کی تھی جس میں برق اور رعد کی سی خاصیت تھی اور جس سے پتھر پھینکے جاتے تھے۔ فلاسٹریس' دوسری صدی عیسوی کا مصنف' ہندوستان کے دوآبے میں رہنے والی کسی قوم کے ذکر میں گویا ہے کہ اگر سکندر ان کے ملک پر فوج کشی کرتا تو کبھی فتح نہیں پاسکتا اس لیے کہ یہ لوگ میدان جنگ میں آکر اپنے دشمنوں سے لڑنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ شہر کی دیواروں پر سے طوفان اور صاعقہ باری کے ذریعے سے ان کو برباد کردیتے ہیں۔ آئین جنٹو میں' جو حضرت موسیٰ کی ہم عصر ہندوستانی تصنیف مانی گئی ہے' کہا جاتا ہے' آلات محرقہ کے متعلق سب سے قدیم حوالہ ملتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ : "رئیس کو کسی خدع آمیز کل یا زہری اسلحہ یا توپ اور بندوق یا کسی اور قسم کے آتشی حربوں سے جنگ نہیں کرنا چاہیے۔" انگریز مترجم آئین جنٹو کے قول کے مطابق آتشی حربہ' سنسکرت لفظ "اگنی استر" کا لفظی ترجمہ اور توپ "شت اگھنی" کا (ترجمہ) ہے۔ یہ ایسا حربہ تھا جس سے سو آدمی فوراً مارے جاتے ہیں۔

کیٹیسس کا بیان ہے کہ دریائے سندھ کے قرب و جوار کے رہنے والے لوگ ایسا تیل تیار کرتے تھے جو گھڑوں میں بھر کر لکڑی کی عمارات پر پھینکا جاتا تھا' جس سے آگ کے شعلے نکلنے لگتے تھے اور صرف مٹی ہی سے وہ بجھ سکتا تھا۔ وہ صرف بادشاہ کے لیے تیار کیا جاتا تھا' دوسرے آدمیوں کو اس کے رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

ایلین' ایک اور مصنف' اس آتش سیال کے متعلق' کچھ اور معلومات کا اظہار

کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس تیل سے نہ صرف لکڑی جلتی ہے بلکہ جانور اور آدمی بھی جل جاتے ہیں اور ہندوستان کا بادشاہ اس تیل کی مدد سے شہر اور قلعے فتح کرتا ہے۔ مٹکوں میں بھر کر غنیم کی گڑھی کے دروازوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ دروازے جل کر خاک سیاہ ہوجاتے ہیں۔ فلاسٹریس اسی تیل کے متعلق کہتا ہے کہ وہ کسی جانور سے نکالا جاتا ہے اور یہ جانور صرف پادشاہ ہی رکھ سکتا ہے۔

ہم ہندوستان میں ایک آتش بست تیر کے استعمال کا بھی ذکر پڑھتے ہیں کہ جو بانس کی نال سے پھینکا جاتا تھا۔ "مجمل التواریخ" میں' جو کسی سنسکرت کتاب سے عربی میں سنہ ۱۱۲۶ء میں ترجمہ ہوتی ہے' راجہ ہال کے قصے میں لکھا ہے کہ برہمنوں نے راجہ ہال کو' جب کشمیر کے راجہ کی فوجیں چڑھ آئیں' یہ مشورہ دیا کہ مٹی کا ایک ہاتھی بنا کر اپنی فوج کے ہراول رکھے۔ الغرض جب راجہ کشمیر کی فوج آئی' ہاتھی پھٹا اور اس کے شعلوں سے کشمیر والوں کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہوگیا۔ علاوہ ازیں مہا بھارت' ہرے ونس' سری بھاگوت وغیرہ میں بھی ہم کچھ نہ کچھ آلات آتش کے متعلق پڑھتے ہیں۔

ٹائمز انسائیکلوپیڈیا سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کی تصنیف میں کچھ ایسے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے جو قطعی طور پر آتش بازی اور آتشی حقوں سے پیدا ہوسکتے ہیں' اگرچہ شاعر یہ اثرات سحر اور جادو کی طرف تعبیر کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ یہاں قطعی غلط ہے۔ جادو کے اثرات میں فردوسی صرف غیر موسمی برف باری اور تاریکی منسوب کرتا ہے لیکن وہ آلات محرقہ کا خود ذکر کرتا ہے۔ 'نفط' 'نفط سیاہ' قارورہ' عرادہ اور منجنیق وغیرہ (سے) وہ بخوبی واقف ہے اور کئی موقعوں پر ان کا ذکر کرتا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی 'نفط کا عام طور پر استعمال کرتے تھے۔ کیخسرو نے جب گنگ دژ' افراسیاب سے فتح کیا ہے' اشعار ذیل (میں) آتشی آلات کا مذکور ہوا ہے :

دو صد پاره عراده منجنیق   نهاد از برش برسوی جاثلیق
دو صد چرخ بر هر سوی بدگمان   ز دیوار در چون سر بدگمان
پدید آمدی منجنیق از برش   چو ژاله همی کوفتن برسرش
پس منجنیق اندرون رومیان   رها چرخ ها تنگ بسته (میان)
دو صد پیل فرمود پس شهریار   کشیدن ستونها به پیش حصار
یکی کندهٔ زیر باره درون   بکنده نهادند زیرش ستون
پراگنده برچوب نفط سیاه   بر آنگونه فرمود نیرنگ شاه
بر آن چوبها بار ماند بپای   بدان چوبها بر گرفته ز جای
بیک سو پر از منجنیق و ز تیر   رخ سرکشان بود همچو زریر
بزیر اندرون آتش و نفت و چوب   ز بر گرزهای گران کوه کوب
بهر چار سو ساخته کارزار   چنان چون بود ساز جنگ و حصار

اس کے بعد ان چتروں میں آتش زدگی کا اثر یوں دکھایا گیا ہے:

بدان چوب و نفط آتش اندر زدند   ز بر شان همی سنگ برسر زدند
زبانگ کمان های چرخ و ز دود   شده روی خورشید تابان چو دود
زعراده و منجنیق و ز گرد   زمین نیلگون شد هوا لاجورد
خروشیدن پیل و بانگ سران   درخشیدن تیغ و گرز گران
تو گفتی در آویخت با هور ماه   ز باریدن تیر و گرد سیاه
بر آنگونه گشت آسمان ناپدید   کجا چشم روشن جهان را ندید
ز نفط سیه چوبها بر فروخت   بفرمان یزدان چو هیزم بسوخت
نگون باره گفتی که برداشت پای   بکردار کوه اندر آمد ز جای
وزان باره چندی ز ترکان بزیر   نگون اندر آمد بکردار شیر
که آرد بدو شور بختی جهان   بدام اندر* آید سرش ناگهان

یہی ایک منفرد مقام نہیں ہے جہاں شاہ نامے میں ان آلات کا ذکر آتا ہے بلکہ

فور اور سکندر کی جنگ میں، جب کہ یونانی فوجیں غنیم کے حملوں کے دست برد سے بہت بیدل ہوگئی ہیں، سکندر فیلسوفان روم کے مشورے سے لوہے کے سوار مع گھوڑوں کے بناتا ہے۔ راکب اور مرکب کے جوف میں نفط بھردی جاتی ہے اور جب دوبارہ جنگ ہوتی ہے تو یہ آہنی سوار سب سے پہلے میدان جنگ میں لائے جاتے ہیں اور ہاتھیوں پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور نفت میں آگ لگادی جاتی ہے۔ دشمن کے ہاتھی ان مصنوعات آتشی سے ڈر کر اپنی فوجوں کو روندتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں اور فور کو شکست مل جاتی ہے :

باسپ و بنفت اندر آتش زدند — همہ لشکر فور بر سر زدند
از آتش بر افروخت نفط سیاہ — بجنبید ازان کامنین بد سپاہ
چو پیلان بدیدند از ایشان گریز — برفتند با لشکر از جای تیز
ز لشکر برآمد سراسر خروش — بزخم آوریدند پیلان بجوش
چو خرطومہا شان بر آتش گرفت — بماندند ازان پیل بانان شگفت
همہ لشکر ہند گشتند باز — همہ ژندہ پیلان گردن فراز

نوشیروان نے جب قلعہ قالی نیوس، قیصر روم سے فتح کیا ہے، اس موقع پر قارورہ کا بھی ذکر آتا ہے :

بدروازہا جنگ برساختند — همہ تیر و قارورہ انداختند

ہندوستان میں آلات آتش بازی کے متعلق اوپر لکھا جاچکا ہے۔ علیٰ ہذا کہا جاتا ہے (کہ) آتشی حقوں کا بھی استعمال جاری تھا لیکن ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان آلات آتش کو بارود سے کیا تعلق ہے۔ علیٰ ہذا مورخین یورپ کو پورا پورا شبہ ہے کہ ہندوستان میں سکندر اعظم ضرور کسی آتشی اسلحے سے دوچار ہوا ہے کیونکہ کوئٹس کرٹیس مورخ کے ایک فقرے سے اس قسم کا مطلب مفہوم ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قدیم برہمنوں کے پاس گرجنے والی اور چمکنے والی کلیں ضرور تھیں۔ اسی سلسلے میں فردوسی کے بیانات، سکندر کے آہنی سواروں کے متعلق، بھی قابل لحاظ

ہیں۔ ہندوستان میں، ممکن ہے کہ کسی نہ کسی قسم کا کوئی آتشی حربہ ہو لیکن اگر ایسا تھا تو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے وقت ضائع ہوچکا ہوگا، کیونکہ مسلمانی فتوحات کے دوران میں، جس میں ہندو اور مسلمان فوجیں، ہندوستان کے میدان میں اکثر معرکہ آرا ہوئی ہیں، (ہم) کسی آتشی آلے کا ذکر نہیں پڑھتے جس سے مسلمان واقف نہ تھے۔ بلکہ ہم کو اس امر کے تسلیم کرنے میں بھی تامل ہے کہ مسلمانی غلبے کے دوران کے ہندو نفت کے استعمال سے واقف تھے۔ قدیم ہندو اگر کسی قسم کے مصالحے سے واقف تھے تو یہ کیا ضروری ہے کہ وہ بارود ہی ہو۔ ظن اغلب ہے کہ وہ نفت ہو جس کے چشمے ہندوستان کے مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ خان پور اور کوہاٹ کے قریب اس قسم کے چشمے ہیں۔ ہندو، ممکن ہے کہ بارود کے اجزا سے آتش بازی کے سلسلے میں واقف ہوں لیکن بارود کی نفوذی طاقت سے وہ اسی طرح بے خبر معلوم ہوتے ہیں جیسے اور قومیں۔ ہندوستان میں اگر کوئی آتش بازی قدیم سے ہے تو وہ نہایت ابتدائی حالت میں ہوگی۔ اس لیے کہ موجودہ زمانے میں اس فن کی اکثر اصطلاحیں مسلمانی ہیں اور شورگر عموماً مسلمان ہوتے ہیں۔ ہندو، شورگر کو دارو گر اور بارود کو دارو کہتے ہیں، لیکن یہ دونوں لفظ مسلمانی ہیں۔ اہل عراق شورے کو بارود کہتے ہیں اور چونکہ شورہ اس مرکب میں جزواعظم تھا اس لیے اس کا نام بھی بارود ہوگا اگرچہ قدیم نام اس کا دارو تھا۔

بعض مغربی اسناد بارود کی ایجاد راجر بیکن کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ حقیقت میں اس نے مثل البرٹ اعظم ان پرانے نسخوں کی تجدید کی ہے علی الخصوص اس نسخہ کی جسے مارکس گریکس نے اپنی کتاب مصنفہ سنہ ۱۲۳۰ء (میں) درج کیا ہے۔ دشمن پر آگ برسانے کا ایک طریقہ اس نے یوں بیان کیا ہے:

آدھ سیر گندھک، سیر بھر بید کا کوئلہ، تین سیر شورہ، سنگ مرمر کی اوکھلی میں پیس لیا جائے اور پھر ملا دیا جائے۔ کچھ حصہ اس میں سے ایک لمبی، تنگ اور مضبوط جوڑی ہوئی چیز میں رکھ کر پھینک دیا جائے۔

یہ حلیہ ہوائی یا قلم کا ہوسکتا ہے۔ بارود کی اختراع شوارٹز نامی' جرمنی کے ایک راہب کی طرف بھی منسوب کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے' اس نے کولون میں سنہ ۱۳۳۰ء مطابق ۷۳۱ھ (میں) کوئلہ' شورہ اور گندھک کی ترکیب سے ایک نیا آتش گیر مرکب دریافت کیا۔ یہ نسخے' مثل اور نسخہ جات از منہ متوسط' عربوں سے ماخوذ ہیں۔ ریناد اور فاوے اور ان سے پہلے کا سبرے اور آندرے اور دیارود کی تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ گولی کا بارود' جس سے غرض یہ تھی کہ اس کے ذریعے سے آلات حربی فاصلے پر زور سے پھینکے جائیں' عربوں نے ایجاد کیا۔ ان دونوں مسبوق الذکر مصنفین نے اس ایجاد کو اپنی پہلی تصنیف میں چینیوں کی طرف منسوب کیا تھا لیکن اپنی تصنیف مابعد میں' جو ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی' انہوں نے اپنی رائے بدل دی۔ بعض نئی کتابوں کے مل جانے (سے)' ان کو اس امر کا ثبوت مل گیا ہے کہ یہ ایجاد عظیم' جس نے فن حرب میں زبردست انقلاب پیدا کردیا' عربوں کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں : چینیوں نے فقط شورہ نکالا اور آتش بازی میں استعمال کیا لیکن بارود کی قوت نفوذیہ کا استعمال عربوں ہی نے کیا ہے یعنی انہوں نے توپ اور بندوق ایجاد کی۔ باروت سازی (کے) ایک عربی رسالے سے' جو تقریباً" ۱۲۵۰ء میں تصنیف ہوا تھا اور جو کتب خانہ سکوریل میں محفوظ ہے' معلوم ہوتا ہے کہ عرب لوہے کے مجوف غبارے بنا کر' ان کو آتش گیر یا پھٹنے والی اشیا سے بھر کر دشمنوں پر' یا تو ہاتھوں سے جیسے آج کل بم کا گولہ پھینکا جاتا ہے یا جنگی کلوں کے ذریعے سے' جو اس زمانے میں اس غرض کے لیے مستعمل تھیں' پھینک دیتے تھے۔ اس قسم کے پتھر کے گولے کا "مجموعۃ الصنائع" کے حوالے سے ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں۔

عام مورخین توپ کا پہلا استعمال ۱۳۴۶ء میں جنگ کرسی میں بتاتے ہیں لیکن عرب مورخین کے بیانات اور مختلف تصانیف مظہر ہیں کہ توپ اس سے بہت پہلے استعمال ہوچکی ہے۔ منجملہ ان انتخابات کے' جن کو کانڈ نے مختلف عربی تصنیفات سے ترجمہ کیا' ایک حکیم یہ لکھتا ہے کہ کسی امیر یعقوب نامی نے' اپنے ایک باغی

کے شہر میدرا نامی کا، جو افریقہ میں واقع ہے، سنہ ۱۲۰۵ء میں محاصرہ کیا تھا اور دیواروں پر مختلف آلات اور گرجتی ہوئی کلوں کے ذریعے سے، جن کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا، حملہ کیا۔ ان کلوں میں سے سو سو دھاریں نکل رہی تھیں اور شہر میں بڑے بڑے پتھر اور آگ کے گولے برس رہے تھے۔

ابن خلدون کا مندرجہ ذیل بیان جو اس کی تاریخ بربر سے لیا گیا ہے کچھ کم صاف نہیں ہے اور اس سے محاصرے کے وقت توپ کا استعمال ثابت ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"ابو یوسف سلطان مراکش نے ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء میں سجلماسہ کا محاصرہ کیا۔ اس نے آلات محاصرہ کو شہر کے سامنے لگایا۔ ان میں منجنیق، عرادے اور نفط کے متدام، جن سے لوہے کے ریزے برسائے جاتے تھے، (شامل تھے) یہ ریزے متدام کے صندوق میں بھرے جاتے تھے اور ان کے پیچھے بارود تھی جس سے آگ دی جاتی تھی۔ اس کا اثر نہایت عجیب تھا اور اس کے نتائج کو قدرت باری تعالیٰ کہنا چاہئے۔ ایک دن ایک بڑے پتھر کے زور سے، جو منجنیق سے پھینکا گیا تھا، تھوڑی سی دیوار گر گئی اور اس راہ سے شہر پر حملہ کیا گیا۔"

کانڈ کی "تاریخ مسلمانان ہسپانیہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل بن فارض (فرز) بادشاہ غرناطہ نے سنہ ۱۳۳۵ء مطابق ۷۳۶ھ میں جب بازہ (بیضا) کا محاصرہ کیا تو اس کے پاس علاوہ اور مشینوں کے ایک ایسی کل تھی جو لوہے کے گولے پھینکتی تھی۔ جب وہ کل چلائی جاتی تھی تو اس کی روشنی اور گرج سے سخت طوفان کا سا سماں پیدا ہوجاتا تھا۔ گولوں سے شہر کی دیواروں اور برجوں کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ حلیہ صرف توپ کا ہوسکتا ہے۔

اس زمانے کی قلمی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ توپ کا استعمال عربوں میں بہت کثرت سے ہوگیا تھا اور انہوں نے اس کو زیادہ تر ۱۳۴۲ء میں الجسیر کی حفاظت

میں، جس پر الفانس یازدہم نے حملہ کیا تھا، استعمال کیا۔ الفانس یازدہم کی تاریخ میں لکھا ہے :

"شہر کے مسلمان، فوج پر بہت سی گرجنے والی چیزیں اور لوہے کے گولے بہت بڑے سیب کے برابر پھینکتے تھے۔ یہ گولے اس قدر دور جاتے تھے کہ بعض فوج کے اس پار اور بعض فوج میں گرتے تھے۔"

انگریزی کاؤنٹ ڈاربی اور سالسبری نے، جو محاصرے کے وقت موجود تھے، بارود کے اس نئے استعمال کو دیکھا اور اس ایجاد کو اپنے ملک میں لے گئے اور اسی وجہ سے چار سال بعد انگریزوں نے جنگ کریسی[۱۶] میں توپ کا استعمال کیا۔ یہ یاد رہے کہ عربی میں توپ کا نام "مدفع" ہے۔ بارود کا نسخہ اور پھینکنے والی کلوں کا بیان ہمیں عربی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کے متعلق ایک نہایت دلچسپ عبارت نقل کرتے ہیں جو تیرھویں صدی عیسوی کے آخر کی ایک قلمی کتاب سے لی گئی ہے اور اس کا ترجمہ ریناد نے کیا ہے :

"اس سفوف اور اس کی مقدار کا بیان جو مدفع میں بھرا جاتا ہے : شورہ دس درم، کوئلہ دو درم اور گندھک ڈیڑھ درم۔ ان کو نہایت باریک پیس کر مدفع میں ایک تہائی تک بھرنا چاہئے اور اس سے زیادہ نہیں کیونکہ اس کے پھٹ جانے کا خوف ہے۔ بھرنے کے لیے مدفع کے منہ کے برابر ایک لکڑی کا گز بنائیں اور اس سے بارود کو زور سے ٹھوکیں اور پھر اس کے اوپر سے گولہ یا لوہے کا ٹکڑا ڈالیں اور اس کے بعد فلیتے میں آگ دیں۔ مدفع کی لمبائی اس کے سوراخ کے مطابق ہونا چاہئے۔ اگر سوراخ بڑا ہو اور مدفع اس کے مطابق لمبا نہ ہو تو اس میں عیب ہوگا۔"

ہسپانیہ سے آلات آتش بازی کا رواج عیسائی یورپ میں پہنچا۔ یورپ میں توپ کے متعلق سب سے پہلی اور صحیح دستاویز، جو اب تک محفوظ ہے، ۱۱ر فروری سنہ ۱۳۲۶ء کی نوشتہ ہے۔ یہ کاغذ ایک اجازت نامہ، فلورینس کی کونسل کے بارہ

ممبروں اور رہبان سرداروں کے نام' ہے' جس کی رو سے انہیں ریاست جمہوریہ فلورینس کی حفاظت اور مدافعت کے لیے' برنجی توپوں اور آہنی گولوں کی ساخت کی خاطر' آدمی نوکر رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔

سنہ ۱۳۳۸ء مطابق ۷۳۹ھ کی ایک دستاویز سے جو پیرس کے قومی کتب خانے میں موجود ہے' معلوم ہوتا ہے کہ بحری دارالصنع فرانس واقع روئیں میں اسی سال ایک ایسا آہنی آلہ موجود تھا جسے ظرف آتشی کہا جاتا تھا اور جس کے ذریعے سے بان یا تیر پھینکے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی شورہ اور گندھک تھے جن کو پیس کر اس آلے میں چلاتے تھے۔ اس زمانے میں یہ اجزا علیحدہ علیحدہ رکھے جاتے تھے اور ضرورت کے وقت ملا دیئے جاتے تھے۔

انگلستان میں ایڈورڈ سوئم[۱۷] کے زمانہ کی (۱۳۴۵ء مطابق ۷۴۶ھ) ایسی فرد حساب ملتی ہے' جس میں ایسی اشیا کی خرید کے حسابات درج ہیں' جو بارود بنانے کے کام میں آتی ہیں۔ سنہ ۱۳۴۶ء مطابق ۷۴۷ھ میں اسی بادشاہ نے اپنی قلمرو سے شورہ اور گندھک خرید کیے جانے کا حکم دیا لیکن باوجود کوشش یہ اشیا نہایت قلیل مقدار میں دست یاب ہوئیں۔ اسی سال جنگ کریسی ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ اس میں توپیں استعمال ہوئیں۔ یہ کلیں نہایت بدوضع اور بھدی تھیں۔

تیرھویں صدی عیسوی کے قرب و جوار میں عربوں نے ایسی کل ایجاد کی تھی جو نال کی شکل میں تھی' جس کو یا تو وہ اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے یا نیزے کے سرے پر نصب کردیا کرتے تھے۔ اس نال کے ذریعے قریب کے فاصلے سے دشمن پر گولیاں برسائی جاتی تھیں۔ اصل میں یہ بندوق کا حلیہ ہے۔ بندوق ماخوذ ہے عربی لفظ "بندق" سے جو مٹی کے غلے کو کہتے ہیں۔

انگلستان میں ۱۳۷۵ء مطابق ۷۷۷ھ میں بندوق کا رواج ہوگیا تھا۔ اسی سال یارک شائر کے کسی جاگیردار کی گڑھی کے محاصرے کے وقت بندوقچیوں کا ذکر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوار اور پیادے دونوں بندوق رکھتے تھے۔ بندوق کی

شکل یہ ہوتی تھی۔ وہ لوہے یا برنج کی نال ہوتی تھی جس میں کوٹھی کے قریب ایک سوراخ ہوتا تھا۔ یہ نال کسی لکڑی پر جما دی جاتی تھی جو دستے کا کام دیتی تھی۔ چلاتے وقت پیادہ دستے کو اپنے سیدھے ہاتھ کی بغل میں مضبوطی سے داب لیا کرتا تھا اور اسی دستے کو جو لمبا ہوتا تھا' سینے کے مقابل الٹے ہاتھ سے پکڑ لیا جاتا تھا۔ سیدھے ہاتھ میں ایک سلگتا فلیتہ (ہوتا تھا)۔ سوار کی بندوق کا دستہ چھوٹا ہوتا تھا جو سینے کے خلاف رکھا جاتا۔ بندوق کی نال ایک دو شاخے پر' جو زین سے بندھا ہوتا تھا' قائم کردی جاتی تھی۔ رنجک کی پیالی یا سوراخ میں فلیتہ بتانے سے بندوق سر ہوجاتی تھی۔ بندوق کی نال اس زمانے میں دو بالشت سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

ہنری سوئم[۱۸] کے عہد کے آغاز میں بندوق میں یہ ترقی ہوئی کہ گھوڑا لگا دیا گیا جو لبلبی کے ذریعے سے گر کر پیالی پر آجاتا تھا۔ یہ پیالی نال کے پہلو میں ہوتی تھی۔ گھوڑے میں فلیتہ لگا ہوتا تھا جس سے رنجک میں آگ لگ جاتی تھی۔ رنجک کا علاقہ ایک چھوٹے سوراخ کے ذریعے سے کوٹھی (کے ساتھ) ہوا کرتا تھا۔ یہ بندوق ہمارے ہاں توڑے دار کہلاتی تھی۔

بعد کی تبدیلی نے ایک نئی وضع کی بندوق ایجاد کی۔ اس میں ایک چرخی نما گھوڑا ہوتا تھا۔ وہ فولاد کا پہیہ ہوتا تھا جو نال کے پہلو میں ہوتا تھا اور رنجک کی پیالی تک آسکتا تھا۔ گھوڑے میں سنگ چقماق جما ہوتا تھا' جو کمانی کے ذریعے سے رنجک کی پیالی تک آجاتا تھا۔ ایک اور کمانی تھی۔ جب کوک دی جاتی تھی تب اس کا اثر پہیے پر پہنچتا تھا۔ اب پہیہ تیزی کے ساتھ گھومنے لگتا تھا۔ اس حالت میں بار بار سنگ چقماق سے رگڑ کھا کر آگ کے پتنگے پیدا کرتا تھا۔ پتنگوں سے رنجک میں آگ لگ جاتی تھی۔ چرخ نما گھوڑے والی بندوق کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ اس کی ترتیب پیچیدہ تھی۔ علاوہ ازیں اس کی بناوٹ قیمتی تھی۔ دوسرے اس پر پورا اعتبار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ بعض وقت وہ دھوکا بھی دے جاتی تھی اور اس کے کل پرزے جلد خراب ہوجاتا تھے۔

سترھویں صدی عیسوی کے وسط تک میدان توڑے دار بندوقوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس زمانے کے بعد سے بندوق چقماق یا پتھر کلہ رائج ہوگئی۔ سولھویں صدی کے خاتمے پر پتھر کلہ کی قدیم قسم جسے "سنا فانس" کہا جاتا تھا' جرمنی میں وضع ہوئی۔ اس بندوق میں رنجک کی پیالی کے لیے فولاد کا ڈھکن یا سرپوش بھی ہوا کرتا تھا۔ گھوڑے میں سنگ چقماق جڑا ہوتا تھا۔ لبلبی دبانے پر گھوڑا گر کر سرپوش کو رنجک کی پیالی سے اٹھا کر اپنی مقابل سمت میں دھکیل دیتا تھا اور اسی عرصے میں لوہے کے ساتھ تصادم سے شرارہ پیدا کر کے رنجک اڑا دیتا تھا۔ انہی تغیرات اور ترقی کے زمانوں میں بندوق کی نال میں بہت کچھ تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ۱۶۲۱ء میں نال چار فٹ لمبی ہوتی اور ایسی گولی چلائی جاتی تھی جو آدھ سیر وزن میں بارہ بن سکتی تھیں۔

سلاطین عثمانیہ نے توپ و بندوق کا استعمال غالباً" یورپ سے سیکھا ہے۔ ان زمانوں میں فرنگی لوگ اکثر تلاش معاش کی خاطر مختلف ممالک اسلام میں پہنچا کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی لوگ' جن میں اکثر توپچی اور گولہ انداز ہوتے تھے' سب سے پہلے ترکوں میں توپ کو رواج دیتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک قیاس ہے اور تاریخی واقعات سے تصدیق یا تردید کا مستوجب ہے۔ ممکن ہے کہ افریقہ یا مصر سے توپ ان کے پاس براہ راست پہنچی ہو۔ سلاطین عثمانیہ نے' کہا جاسکتا ہے' ان آلات محترقہ کی نشو و نما میں خاص دلچسپی لی ہے کیونکہ تسخیر قسطنطنیہ کے موقع پر سلطان محمد ثانی کے حکم سے دو ایسی عظیم الشان توپیں بنائیں گئی تھیں جو بیس بیس من کا گولہ پھینکتی تھیں۔ محاصرے کے وقت توپوں نے امید کے مطابق کامیابی دکھائی اور قسطنطنیہ' جس کی تاریخ فتح "بلدۃ طیبۃ" ہے' اکاون روز کے محاصرے کے بعد ۱۵۔ ربیع الاول ۸۵۷ھ کو فتح ہوگیا۔ ان قلعہ شکن توپوں کے مقابلے کی توپیں گزشتہ صدیوں میں کہیں نہیں سنی گئیں۔ البتہ وہ توپیں' جو موجودہ جنگ میں جرمنی نے نامور اور انٹورپ کے قلعوں کو مسمار کرنے میں استعمال کی ہیں' سلطان محمد ثانی کی توپوں سے کہیں طاقت ور ہیں' جو سنا جاتا ہے اٹھائیس اٹھائیس من کا گولہ پھینکتی ہیں۔

ایران میں توپ اور بندوق کا استعمال سب سے پہلے شاہ اسمٰعیل صفوی (سنہ ۹۰۷ و ۹۳۰ھ) نے کیا ہے۔ اس زمانے میں توپ خانے کو آتش خانہ اور آتش باز کہا جاتا تھا۔ اسمٰعیل نے توپ خانے کا استعمال غالباً اپنی ہمسایہ سلطنت عثمانیہ سے سیکھا ہے۔ ایرانی تاریخ میں اس کا ذکر قلعہ یزد کی فتح کے وقت آتا ہے۔ "حبیب السیر" میں وہ فقرہ یوں ہے:

"آخر الامر بزخم سنگ و توپ و تفنگ بہادران تیز جنگ رخنہا در بروج و بار · پیدا شد۔"

یہ واقعہ غالباً ۹۱۰ھ کے قریب ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ صاحب "حبیب السیر" توپ کی پہلی اشاعت کے موقع کو بغیر کسی قسم کی تمہید یا تاریخ کا ذکر کئے عبور کر جاتا ہے۔ دیار بکر میں اسمٰعیل صفوی نے قلعہ جز پرت بھی توپ و تفنگ کے ذریعے سے تسخیر کیا تھا۔ سنہ ۹۲۰ھ میں سلطان سلیم اور اسمٰعیل صفوی کے مابین موضع چالدران میں، جو تبریز سے بیس فرسنگ پر واقع ہے، سخت جنگ ہوئی۔ سلطان کے پاس اعلیٰ درجے کا توپ خانہ (تھا)۔ اس فوقیت کا اثر ایرانیوں پر بہت جلد ظاہر ہوگیا۔ اگرچہ ہم عصر مورخ صاحب حبیب السیر اسمٰعیل کی شکست کا ذکر نہیں کرتا لیکن اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل کو واقعی شکست ہوئی تھی۔ ایک ترکی شعر اس جنگ کی تاریخ میں ہے:

هاتف غیبی ودی بو تاریخی

آلدی عجم شاهی سلطان روم

عثمانی ترکوں کا قاعدہ تھا کہ توپ خانے کو اپنے لشکر کے چاروں طرف پھیلا دیتے تھے۔ توپوں کے ارابے زنجیر بند کر دیئے جاتے تھے۔ اس طرح سے فوج گویا محفوظ مقام میں آجاتی تھی۔ اتفاق سے اس جنگ میں اسمٰعیل کے پاس توپ خانہ نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک ایرانی شمشیر کو توپ کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتے تھے۔ صاحب "فوائد صفویہ" لکھتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل نے سلطان کو پیغام بھیجا تھا (کہ):

"شجاع آن کس است کہ باشمشیر در میدان جنگ کند۔ در پس پشت توپ خانہ پناہ بردن و خزیدن طریقہ دلاوری نیست و چون ما بایلغار آمدہ ایم و آتش خانہ ہمراہ نیاوردہ ایم اگر تنہا بمنازعہ و مقابلہ رضا ہستی توپ خانہ را موقوف داشتہ طرفین در میدان .بقلیل سپاہ خود باسپاہ بی کران تو .بمجادلہ شمشیر حاضریم۔"

توپ خانہ، اس میں شک نہیں، ان زمانوں میں فیصلہ کن مدار علیہ بن گیا تھا اور جن قوموں نے اس کے استعمال سے انکار یا سہل انگاری کی وہی اس کے بے پناہ غضب کا بے وقت شکار بنے۔ وہ قوموں اور ملکوں کی تاریخ بدلنے آیا تھا اور اب اپنے انقلابی دور کے مرحلے سرعت کے ساتھ طے کر رہا تھا۔

محمد خاں شیبانی سلاطین ازبک میں زبردست بادشاہ گزرا ہے۔ ترکستان میں مغل شہزادوں کی طاقت توڑ کر اس نے اپنی وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ وہ تجربہ کار سپاہی تھا اور سینکڑوں معرکے اس نے سر کیے تھے لیکن اسمٰعیل صفوی کے توپ خانہ سے اسے کہیں پناہ نہیں ملی۔ نہ اس کی شجاعت اس کے کام آئی نہ وسیع تجربہ۔ یہ بہادر سپاہی جنگ میں مارا گیا۔ کہا جاتا ہے اس کی نعش کے گرد بڑے بڑے آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں جو تعداد میں پانچ سو تھیں۔ ان میں سے اکثر بادشاہ اور شاہزادے تھے جو اسمٰعیل کی آتش بار توپوں کا بے وقت شکار ہوئے تھے۔ اسمٰعیل نے اپنی زبردست فتح کا جشن اس وحشیانہ طریقے سے منایا کہ شیبانی خان کے کاسہ سر کو سونے میں منڈھوا کر اس سے شراب پی اور اپنے امیروں کو پلائی۔ ایک تورانی امیر اس دربار میں حاضر تھا۔ کسی ایرانی نے طنزیہ اس سے کہا: تمہارے بادشاہ کا سر اب تو قدح شراب حریفاں بن گیا ہے۔ اس نے جواب میں اس موقع پر کمی نہیں کی اور بولا: موت میں وہ زندگی سے زیادہ باعظمت ہے۔ زندگی میں اس سر پر تاج رکھا جاتا تھا لیکن موت کے بعد یہ سر بڑے بڑے سلاطین اور جلیل القدر امرا کی بوسہ گاہ بن گیا ہے۔

ظہیرالدین بابر نے غالباً شیبانی خاں کی مثال سے نصیحت حاصل کر کے،

اپنے ہاں توپ خانے کو رواج دیا اور مغلوں میں یہی پہلا بادشاہ ہے جس نے ان آلات کے استعمال سے فائدہ اٹھایا اور توپ خانہ اس پر مبارک بھی ہوا۔ اس لیے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی بادشاہت بغیر زیادہ محنت کئے اس کے ہاتھ لگ گئی۔ لیکن اب وقت ہے کہ ہم ہندوستان میں آتش بازی کی اشاعت کے متعلق کچھ کہیں۔

ایران کے مقابلے میں ہندوستان میں آلات محترقہ کا رواج بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مسلمان سلاطین میں محمد شاہ بن علاء الدین حسن بہمنی (۷۵۹ - ۷۷۶ھ) پہلا بادشاہ ہے جس نے توپ خانے سے کام لیا[۱۹]۔ ۷۶۷ھ میں محمد شاہ نے بیجا نگر کے راجہ پر چڑھائی کی جس کے واقعات مختصراً" حسب ذیل ہیں۔

ایک دن محمد شاہ بہمنی کے دربار میں دہلی کے چند قوال آئے جو امیر خسرو اور حسن دہلوی کے عمل اور صوت سے خوب واقف تھے۔ بادشاہ (نے) ان کی بڑی آؤ بھگت کی، بڑا جشن کر کے ان کا گانا سنا اور بہت محظوظ ہوا۔ اس خوشی کے عالم میں، جب کہ شراب کا اثر بھی اس کے دماغ پر غالب ہو چکا تھا، اس نے اپنے وزیر ملک سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ ان قوالوں کے انعام کی چٹھی بیجا نگر کے راجہ کے خزانے پر لکھ دے۔ وزیر اس خیال سے کہ بادشاہ اس وقت نشے کی حالت میں ہے، جو حکم کہہ کر خاموش ہو رہا۔ دوسرے دن بادشاہ نے ہوش کے عالم میں وزیر سے پوچھا کہ دلی کے قوالوں کی چٹھی راجہ بیجا نگر کے نام لکھ دی یا نہیں؟ مزاج دان وزیر نے کہا: ابھی تک نہیں لکھی گئی لیکن ابھی لکھ دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیجا نگر کا راجہ اس زمانے میں دکن کے تمام راجاؤں سے بلحاظ کثرت فوج و وسعت سلطنت نہایت ممتاز تھا۔ چھ سو کوس کے طول اور ڈیڑھ سو کوس کے عرض میں اس کا راج پھیلا ہوا تھا۔ کئی راجہ اس کے ماتحت اور باج گزار تھے۔ جنگ کے وقت وہ تین ہزار ہاتھی اور نو لاکھ پیدل فوج میدان میں لا سکتا تھا۔ نئی دکنی مسلمان سلطنت کسی حال میں اس

کے معیار یا مقابلے کی نہیں تھی۔ قصہ مختصر سلطان نے وزیر سے کہا کہ قوالوں کے انعام کی بابت جو کچھ میں نے رات کو کہا' مستی کی وجہ سے نہیں کہا تھا بلکہ اس وقت ہوش کی حالت میں بھی وہی بات کہتا ہوں۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ بادشاہ ہو کر میں اپنی زبان سے لغو یا شیخی کے الفاظ نکالوں۔ تم چٹھی لکھ دو اور بیجا نگر کے خزانے سے یہ انعام دلوانے کے لیے میں ہر طرح تیار ہوں۔ ملک سیف الدین سلطان کی طبیعت سے واقف تھا۔ اس نے وہ چٹھی بیجا نگر کے خزانے پر لکھ دی۔ جب قوال بیجا نگر پہنچ کر راجہ کے سامنے لائے گئے' انہوں نے چٹھی پیش کردی۔ مہاراجہ بیجا نگر چٹھی دیکھ کر آگ بگولا ہوگیا۔ گویوں کو گدھے پر بٹھا کر اور شہر میں تشہیر کرکے اس نے اخراج کردیا اور خود اپنی تمام فوج تیار کر کے اپنی رفع توہین کی غرض سے مسلمانی سرحد میں گھس آیا۔ برسات کا موسم تھا اور کرشنا ندی دونوں پاٹ بہہ رہی تھی۔ اس لیے خاطر جمعی سے قلعہ مدگل کو' جو کرشنا ندی سے بیجا نگر کی طرف واقع تھا' محصور کرلیا اور قبل اس کے محصورین کی امداد میں مسلمانی فوجیں آئیں' راجہ نے قلعہ فتح کر کے اس کی کل آبادی کو' جس کی تعداد آٹھ سو تین تھی' قتل کر ڈالا۔ محمد شاہ نے جب خبر سنی تب ہی جیسا بیٹھا تھا ویسا ہی اٹھا' اور اپنے لشکر کی تیاری کا انتظار کیے بغیر' یلغار کرتا ہوا' کرشنا (کے) کنارے جا دھمکا اور اپنے بیٹے مجاہد شاہ کو اپنا جانشین بنا کر نو ہزار سواروں کے ساتھ کرشنا ندی سے گزر گیا۔ راجہ بیجا نگر' محمد شاہ کے اچانک ندی عبور کرنے کی خبر سن کر نہایت بدحواس ہوگیا۔ اسی وقت اس نے اپنا بھاری سامان اور ہاتھی بیجا نگر کی طرف روانہ کردیے اور خود اپنی انتخابی فوج کے ساتھ جنگ کی غرض سے مقیم رہا۔ ہاتھی اور بھیر کیچڑ کی وجہ سے صرف دو کوس راہ طے کرسکے اور پھر تھک کر وہیں ٹھہر گئے۔ محمد شاہ ان کی روانگی کی خبر سن کر اپنے سواروں کے ساتھ غنیم کی طرف بڑھا۔ راتوں رات چل کر علی الصباح وہ دشمن کی فوج تک پہنچ گیا۔ ہندو فوج سلطان کی فوج کو اپنے مقابل

کھڑا دیکھ کر اس قدر حواس باختہ ہوگئی کہ اس میں لڑے بھڑے بغیر بھگدڑ مچ گئی۔ اس نے قلعہ اودنی کا رخ کیا۔ راجہ کا بھاری سامان بغیر کسی دقت کے مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس میں دو ہزار ہاتھی' تین سو توپیں اور ضرب زن وغیرہ تھے۔ محمد شاہ اس غیبی فتح کے بعد برسات بھر قلعہ مدگل میں ٹھہرا رہا۔ اس عرصے میں اس نے اپنے علاقے میں فرامین بھیج کر جگہ جگہ سے توپیں اور ضرب زن منگوائے اور اس کارخانہ آتش بازی کو' جس کا بقول فرشتہ[۲۰] اب تک دکن میں رواج نہیں تھا' مقرب خاں ولد صفدر خان سیستانی کی سپردگی میں دے دیا اور جس قدر رومی اور فرنگی اس سلسلے میں سلطانی ملازم تھے' اس کی ماتحتی میں دے دیئے گئے۔ اس طرح بادشاہ کے پاس بہت بڑا توپ خانہ جمع ہوگیا۔ چوری کے ڈر سے رات کے وقت مقام پر توپوں کے ارابوں کو زنجیروں سے جکڑوادیا جاتا تھا۔ محمد شاہ اس اہتمام سے قلعہ اودنی کی طرف روانہ ہو کر بیجا نگر کے علاقے میں گھس گیا۔ بھوج مل' کشن رائے کے سپہ سالار سے اس کا مقابلہ ہوا۔ ۱۴ ذی قعدہ سنہ مذکور کو جنگ شروع ہوئی۔ موسیٰ خاں اور عیسیٰ خاں افغان' دو بڑے سردار بندوق کے زخم سے اس جنگ میں مارے گئے۔ ہندو اس موقع پر بڑی بہادری سے لڑے اور قریب تھا کہ مسلمان شکست کھا جائیں۔ اتنے میں محمد شاہ اپنے تین ہزار سواروں سے آپہنچا۔ مسلمان فوج کو اس کی موجودگی سے اطمینان ہوگیا اور جم کر لڑنے لگے۔ مقرب خاں نے اپنا توپ خانہ آگے بڑھایا' جس سے معلوم ہوتا ہے' اب تک کوئی کام نہیں لیا گیا تھا۔ توپوں نے آتے ہی جنگ کا رخ بدل دیا اور ہندو فوج پریشان ہوگئی اور مقرب خاں اور خان محمد نے بھوج مل پر عام حملہ کردیا۔ یہ حملہ زبردست تھا اور ہندوؤں کو اپنا توپ خانہ استعمال کرنے کا بھی موقع نصیب نہیں ہوا۔ الغرض ان کے پاؤں اٹھ گئے اور محمد شاہ کو فتح ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی توپوں کی مار بہت کم تھی اور وہ اس وقت کام دے سکتی تھیں جب کہ دشمن

بہت قریب ہو۔ متواتر ضربوں کے بعد کشن رائے جب لڑائی سے عاجز ہوگیا تو اس نے صلح کی غرض سے محمد شاہ کے پاس ایلچی بھیجے۔ سلطان نے اب بھی وہی شرط پیش کی کہ دلی کے قوالوں کی جب تک راجہ چٹھی ادا نہ کردے گا' میں اس سے ہرگز صلح نہیں کروں گا۔ ایلچیوں نے یہ رقم ادا کردی اور صلح ہوگئی۔

اس جنگ سے تین سال پیش تر' جب کہ سلطان محمد شاہ' ناگ دیو والیِ ویلم پٹن کو قتل کر کے' واپس اپنے ملک آرہا تھا' ایک رات اندھیرے میں سلطان کے بندوق کی گولی لگی۔ اس راستے میں اس کے ڈھائی ہزار آدمی راتوں کے وقت ہندوؤں کے تیر اور گولیوں کا نشانہ بنے۔ چونکہ فرشتہ کے بیان سے' جو ملا داؤد بیدری سے یہ واقعات نقل کر رہا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ توپ خانے میں عموماً" رومی اور فرنگی آدمی تھے' قرین قیاس ہے کہ یہی لوگ توپ خانہ ہندوستان میں لائے ہیں۔ ممالک فرنگ کے لوگ ملازمت کی غرض سے بلاد اسلام میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ اس لیے اس زمانے میں فرنگیوں کی ہندوستان میں موجودگی پر کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ پرتگالی اس زمانے کے ایک عرصہ بعد ہندوستان میں آتے ہیں[۲۱]۔ مارکوپولو' تیرھویں صدی عیسوی کا ایک سیاح کبلائی خان کے ہاں ملازم تھا۔

تاریخ گجرات میں آتش بازی کا پتہ سلطان محمود بیگڑہ (۸۶۳ - ۹۱۷ھ) کے زمانے میں لگتا ہے' اگرچہ قلعوں کی تسخیر کے وقت ساباط اگنی کا رواج اس زمانے سے پیش تر گجرات میں موجود تھا۔ سب سے پہلے سنہ ۸۸۷ھ میں ملیباری جہازات سے بحری جنگ کے وقت توپ و تفنگ کا ذکر آتا ہے۔ ملیباری لوگ' پرتگالیوں کی طرح سے' سمندر میں قطاع الطریق کے ارادے سے اترے تھے۔ سلطان محمود نے اپنے جہاز درست کرا کے ان کے مقابلے میں بھیجے۔ ملیباریوں کی کئی کشتیاں گرفتار ہوئیں اور سلطانی بیڑہ بندر کھنبایت میں واپس آگیا۔ اس واقعے کے دوسرے سال' ۸۸۸ھ میں' سلطان نے قلعہ چنپانیر

بھی آلات آتش کی مدد سے فتح کیا۔ اس موقع پر ہم ساباط' مورچل' حقہ بارود اور توپ کا استعمال' قلعہ شکنی کی غرض سے' گجرات میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ بھاری قلعہ شکن توپیں استعمال ہوئی تھیں جن سے قلعہ کی دیوار میں شگاف ہوگیا۔ اسی بادشاہ کے زمانے (۹۱۳ھ) میں سلطان روم نے اپنا بیڑا فرنگیوں کو ہندوستانی سمندروں میں سے نکالنے کے لیے بھیجا۔ یہ بیڑا بسئی و ممبئی اور مہائم کے بندروں پر وارد ہوا۔ محمود بیگڑہ (نے) اپنے سپہ سالار ایاز کو رومی بیڑے کی امداد پر تعین کردیا۔ فرنگیوں کا ایک بڑا جہاز' جس کی قیمت ایک کروڑ روپیہ تھی اور جس میں ان کا امیر البحر موجود تھا' مسلمانی بیڑے کی توپوں سے غرق ہوگیا۔ رومیوں کے چار سو آدمی اور فرنگیوں کے دو تین ہزار آدمی مارے گئے۔

تاریخ مالوہ میں مورچل اور توپ کا ذکر سلطان محمود خلجی (۸۳۹ - ۸۷۳ھ) کے تذکرے میں ملتا ہے۔ قلعہ منڈل گڑھ' علاقہ رانا چتوڑ کو سلطان نے ۸۶۴ھ میں مورچل اور توپ کی مدد سے فتح کیا۔ اس کے بعد ہمیں توپ و تفنگ کا استعمال مالوی واقعات میں برابر ملتا ہے۔ محمود کے جانشین' سلطان غیاث الدین نے عورتوں کا جو شہر آباد کیا تھا' منجملہ ان کے پانچ سو حبشی کنیزوں کو' مردانہ فوجی لباس دے کر' تفنگ بازی اور شمشیر بازی کی بھی تعلیم دی تھی۔

کشمیر میں سلطان زین العابدین (۸۳۶ و ۸۷۷ھ) کے زمانے میں ایک شخص جب نامی نے' جو اقسام فنون آتش بازی میں صاحب کمال تھا' سب سے پہلے بندوق کا رواج اس ملک میں کیا[۲۲]۔ اس نے مختلف اقسام کے بارود بنائے اور فن آتش بازی میں بہت نئی نئی ایجادیں کیں۔ سلطان زین العابدین نے اپنے زمانے میں شکار کھیلنے کی منادی کردی تھی۔

لیکن ہم نہایت تعجب سے دیکھتے ہیں کہ ہندوستان خاص میں آلات آتش بازی کی اشاعت بہت دیر سے ہوئی' جس کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ لودھیوں کے زمانے میں کہیں توپ و تفنگ کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ابراہیم لودھی

(۹۲۳ - ۹۳۲ھ) کے عہد میں جب قلعہ گوالیار فتح ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ کی دیواروں کو نقب لگا کر اور باروت سے پر کرکے آگ لگا کر اڑا دیا گیا تھا۔ دیواروں کے گرنے پر محاصرین قلعے میں گھس گئے اور قلعہ مسخر ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بارود کی اشاعت اس عہد میں ہندوستان میں ہوچکی تھی لیکن توپ اور بندوق کا رواج نہیں ہوا تھا۔ وہ ان اطراف میں سنہ ۹۳۲ھ تک غالباً" رواج یاب نہیں ہوئیں یعنی بابر اور ابراہیم لودھی کی پانی پت میں لڑائی کے وقت تک۔ اس جنگ میں بابر کے ساتھ بھاری توپ خانہ تھا جس کا افسر استاد علی قلی تھا۔ توپ خانے کو رومی دستور کے مطابق نصف دائرے کی شکل میں رکھا تھا تاکہ توپ اندازوں کی حفاظت ہو۔ سلطان ابراہیم کے ساتھ اگرچہ ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھی تھے لیکن غالباً" توپ خانے کی وجہ تھی کہ بابر کو ایسی آسان فتح حاصل ہوگئی حالانکہ بابر کے ساتھ کل بارہ ہزار فوج (تھی)۔ سلطان ابراہیم کی لاش کے گرد پانچ ہزار آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ یہ خوں ریزی صرف توپ خانہ ہی کرسکتا ہے۔ دوران جنگ میں کل سولہ ہزار پٹھان مارے گئے۔

رانا سانگا جب بابر کے مقابلے میں آیا ہے تو یہ بہت بڑا اتفاق تھا جو ہندوستانی نژاد قوموں نے مغلوں کے خلاف کیا تھا۔ اتحادیوں میں بڑے بڑے راجپوت اور پٹھان رؤسا شامل تھے ان کی مجموعی تعداد دو لاکھ لڑنے والی فوج تھی۔ بابر کی فوجی حیثیت اتحادیوں کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہیں تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ توپ خانے کی بدولت بابر نے اس زبردست اجتماع کو فاش شکست دے دی۔ حسن خان میواتی بندوق کی گولی سے مارا گیا۔ علیٰ ہذا اور بڑے بڑے راج پوت مثلاً راول دیو' چندر بھان چوہان' نانک چند چوہان اور کرم سنگھ راجپوت عین جنگ میں مقتول ہوئے۔ اس جنگ میں حسب دستور روم توپ خانہ سب سے آگے تھا اور اسی توپ خانے کی وجہ سے یہ فتح بھی بابر کو

حاصل ہوئی اس لیے کہ اتحادیوں کے پاس کوئی توپ خانہ نہیں معلوم ہوتا۔

بنگالہ میں توپ خانے کا استعمال سلطان محمود والی بنگالہ کے عہد میں جاری تھا۔ شیر شاہ نے بنگالہ اس بادشاہ سے چھینا ہے اور سلطان محمود بھاگ کر ہمایوں کے پاس چلا گیا۔ شیر شاہ سور سنہ ۹۵۲ھ میں کالنجر قلعے کی فتح کے وقت باروت کے بم پھٹنے کی وجہ (سے) جل کر مرا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ بادشاہ قلعے کی دیوار کے نیچے کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی باروت کے گولے رکھے تھے۔ ایک گولا قلعے کی طرف پھینکا گیا۔ اتفاقاً" دیوار سے ٹکرا کر وہ گولا پھٹ کر واپس بادشاہ کے قریب آگرا۔ یہاں اور گولے پڑے تھے' ان میں آگ لگ گئی۔ گولوں کے پھٹنے سے کئی آدمی جلے مثلاً شیر شاہ' شیخ خلیل (شیر شاہ کا مرشد)' ملا نظام دانش مند اور دریا خاں شروانی۔ اس حادثے کے بعد بادشاہ چند ساعت زندہ رہا اور بار بار فوج کو قلعے کی تسخیر کی تاکید کرتا تھا۔ کالنجر کی فتح اس کی زندگی کا آخری کام تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ میں اسے پورا کر کے مروں۔ کچھ دیر میں قلعہ فتح ہوا۔ ادھر یہ خوش خبری اس کے کان میں پہنچی ادھر بادشاہ خود بھی جاں بحق تسلیم ہوگیا۔

ابو الفضل توپ خانے کو قفل و کلید سلطنت کہتا ہے اور سچ بھی یہی ہے۔ اکبر نے آتش خانے کے معاملے میں خاص دلچسپی لی ہے اور جس قدر توپوں کا ذخیرہ اس کے ہاں جمع ہوا تھا' سلطنت عثمانیہ کے سوا اور کہیں نہیں سنا گیا۔ بعض توپیں اکبر کے پاس اس قدر بڑی تھیں کہ ان سے بارہ بارہ من[۲۳] وزن کا گولا پھینکا جاتا تھا۔ ان توپوں کے کھینچنے کے لیے کئی ہزار بیل اور متعدد ہاتھی درکار تھے۔ توپ خانے کا انتظام اکبر کے عہد میں نہایت معقول پیمانے پر تھا۔ سینکڑوں افسر اس کارخانے میں مامور تھے۔ بعض توپیں خود اکبر کی ایجاد تھیں۔ ان میں وصف یہ تھا کہ ان کے پرزے سفر کے وقت علیحدہ علیحدہ کر دیئے جاتے تھے اور ضرورت کے وقت آسانی سے انہیں جوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کی ایک ایجاد

یہ تھی کہ سترہ توپیں صرف ایک فتیلے سے سر ہو سکتی تھیں۔ "گج نال" اکبر کی اختراع ہے جسے ایک ہاتھی آسانی سے لے جاسکتا (تھا)۔ "زنال" بھی اکبری مستحدثات میں سے ہے جسے ایک آدمی لے جاسکتا تھا۔ اس دور اندیش بادشاہ نے توپوں کا بڑا ذخیرہ اپنے ہر ایک صوبے میں جمع کروا دیا تھا۔

بندوق

پرانے زمانے میں بندوق کی نال میں لوہے کے چار قطعے درکار تھے۔ بعض اوقات لوہے کی لمبی چادر کو لے کر گول کر کے اس کے دونوں لبوں کو ایک دوسرے سے پیوست کردیا جاتا تھا۔ لیکن ایسی بندوقیں خوف ناک تھیں۔ چلاتے وقت اکثر پھٹ جاتی تھیں۔ اکبر نے اس خامی کو یوں رفع کیا کہ لوہے کی چادر لے کر اس کے لبوں کو کاغذ کی طرح ایک دوسرے پر چسپاں کرادیا یا پھر ٹھوس لوہے کے پارچے لے کر ان میں برموں کے ذریعہ سے سوراخ کرادیا اور پھر انہیں آپس میں جوڑ لیا۔ بندوق کی نال بالشت سے لے کر دو گز تک لمبی ہوتی تھی۔ سوا گز لمبی نال والی بندوق "دمانک" کہلاتی تھی۔ اس کی کوٹھی کی وضع بھی اور بندوقوں سے مختلف تھی۔ بعض بندوقیں ایسی بھی تھیں جو صرف گھوڑے کی حرکت سے بغیر فتیلہ آگ لیتی تھیں۔ بعض بندوقوں کی گولیاں تیر نما ہوتی تھیں۔ استاد حسین بندوق ساز اپنے فن میں' اکبر کے ہاں کامل مانا گیا ہے۔ نال کے لیے لوہا تیار ہونے پر اپنے اصلی وزن کا نصف رہ جاتا تھا۔ اس پر اصلی وزن اور نقصان زدہ وزن کی اصلی تعداد علیحدہ علیحدہ لکھ دی جاتی تھی۔ ایسے لوہے کے پارچے کو اصلاح میں "ڈول" کہا جاتا تھا۔ بادشاہ کے ملاحظے کے لیے "ڈول" محل سرا میں بھیج دیا جاتا تھا۔ پھر حسب الحکم اس میں بڑا یا چھوٹا سوراخ' گولی کے وزن کے لحاظ سے بنایا جاتا تھا۔ بڑی گولی کا وزن پچیس ٹانک اور چھوٹی گولی کا پندرہ ٹانک ہوتا تھا۔ پچیس ٹانک کی گولی چلانے کے عام لوگ

عادی نہیں تھے، صرف بادشاہ اسے چلا سکتا تھا۔ جب نالی میں سوراخ ہو چکا، شاہی (ملاحظے کے) لیے وہ دوبارہ حرم سرا میں لائی گئی۔ اس کے بعد اسے کندے پر چڑھایا اور نال کے تہائی حصہ تک بارود بھر کر کئی فیر اس سے چلائے۔ اگر (بندوق) قابل اطمینان نکلی بادشاہ کے معائنے کے لیے پھر جائے گی۔ واپسی پر اس کا دہانہ تیار کیا جائے گا۔ اس کے بعد پھر امتحان کیا جائے گا کہ گولی (سیدھی گئی) یا نہیں۔ اگر گولی نشانے پر نہیں لگتی تو گرم کر کے، نال کو خاص لکڑی میں رکھ کر، اسے راست کیا جائے گا۔ عیب نکلنے کے بعد نقش و نگار (کے لیے) سوہان گر کے پاس جائے گی۔ بعد میں شاہی ملاحظہ میں جا کر واپس آئے گی۔ کندے کی لکڑی بادشاہ خود پسند فرماتے تھے۔ اس موقع پر نال کے (سابق) وزن کے ہندسے محو کر دیے جاتے تھے۔ ان کی بجائے کاریگر کا نام، مقام، تاریخ، مہینہ اور سال کندہ کر دیے جاتے۔ اب گز اور گھوڑے کی تیاری (کی جاتی) اور جب بندوق یوں تیار ہو گئی تو "سادہ" کہلاتی تھی۔ پادشاہی امتحان سے فراغت پا کر نال اور کندے کے رنگ کی باری آتی تھی۔ (جب رنگ ہو چکا) تب رنگین بندوق کہلائے گی۔ اب بادشاہ کے پاس پھر بھیجی جائے گی، جہاں اس کا پھر امتحان کیا جائے گا۔ بادشاہ اس سے چار گولیاں لگا کر بندوق (ساز کو واپس) بھیج دیتا۔ جب دس رنگین بندوقیں مندرجہ بالا مراتب طے کر کے تیار ہو جاتیں تب ان پر طلائی کوفت کا کام (کرنے کی غرض سے) شاہی چیلے کے سپرد کر دی جاتیں۔

اکبری دور سے پیش تر بندوق کے صیقل کے لیے کئی کئی اوزاروں اور آدمیوں کی ضرورت تھی لیکن بادشاہ نے ایک ایسا (آلہ ایجاد) کیا تھا جسے "دولاب خانہ" کہتے تھے اور جو ایک بیل سے پھرتا تھا۔ اس چرخ کے ذریعے سے سولہ بندوقیں، بہت ہی کم وقفے میں نہایت (آسانی) کے ساتھ صیقل ہو سکتی تھیں۔ اکبر نے مہینوں، ہفتوں اور دنوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بندوقیں رکھ چھوڑی تھیں۔ ان کی پوری تفصیل (دیکھی جا سکتی ہے)۔ علاوہ ازیں جس

جس بندوق سے جو شکار اکبر نے مارا تھا اس کی تفصیل مع تاریخ میر شکار لکھ لیا کرتے تھے' چنانچہ ایک (بندوق) "سنگرام" نامی سے' جو فروردین یا مارچ سے منسوب تھی' اکبر نے گیارہ سو جانور شکار کئے تھے۔

اکبری عہد کے بعد "گج نال" اور "نرنال" کے اتباع میں "گھڑ نال" اور "شترنال" وضع ہوئیں اور جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے' گھوڑے اور اونٹ (کے اٹھانے) کے قابل تھیں۔ "شترنال" کو "زنبور" بھی کہا جاتا تھا۔ "جزائل" بھی اسی زمانے کی ایجاد ہے۔ " رہکلہ" چھوٹی توپ ہوتی تھی۔ بم کے گولوں کی (فہرست میں) "فیتارہ" وغیرہ کا شمار کرنا چاہئے' جس کے واسطے حقہ آتش' عام اصطلاح تھی۔ "بان" ایک لوہے کی نال ہوتی تھی۔ طول میں کسی جانب . . . (سے) زیادہ نہیں ہوتی۔ اس میں تین پاؤ سے لے کر سیر بھر (تک) بارود ڈالی جاتی تھی۔ بارود خوب ٹھوک ٹھوک کر بھری جاتی۔ یہ کام (ہر شخص) نہیں کرسکتا تھا۔ پیندے میں ایک طرف سوراخ ہوتا۔ اس میں شتابہ رکھا جاتا تھا۔ نال کے منہ کو لوہے سے بند کر کے جھال دیا (جاتا تھا)۔ بعد میں ایک تھیلی میں بند کر کے' تھیلی کا منہ (سی) دیا جاتا ہے۔ اصلی شتابہ اس سے نمودار رہتا (ہے)۔ تھیلی میں سے گز سوا گز کی ڈور لٹکتی رہتی ہے۔ چلاتے وقت فتیلے کو آگ دے دی جاتی ہے اور پھر ڈور کو زور سے پھرا کر غنیم کی طرف پھینک دیا جاتا ہے۔

رومی بندوقیں ہندوستان میں ہر زمانے میں مشہور رہی ہیں۔ ان کی نال ہشت پہلو اور سوا گز تک لانبی ہوا کرتی تھی۔ مارپلہ (؟) بہت تھا۔ ہندوستان میں سندھ اور کوہاٹ کی بندوقیں اول درجے (کی) مانی گئی ہیں۔ مار میں رومی بندوقوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتیں۔ سندھی کی نال ایک گز چھ گرہ سے پونے دو گز تک لمبی ہوتی ہے۔ اس کا تیر اکثر بیس نمبر کا ہوتا ہے۔ کوہاٹی اور رومی کا تیر سندھی سے بڑا ہوتا ہے۔ سندھی بندوق کی موری زیادہ تر مگر یا شیر

کی صورت میں ہوتی ہے۔ نال پر اعلیٰ درجے کا جوہر ہوتا ہے۔ جوہر کے لحاظ سے کوئی بندوق سندھی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ کوہانی بھی جوہردار ہوتی ہے اور ہاتھ پھیرنے (سے) اس کا جوہر سطح سے ابھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان کے اور مقامات میں لاہور' بوندی اور آمیر کی بندوقیں بھی مشہور ہیں۔ نرور کی بندوق بلحاظ صنعت کاری زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ اس پر اسی قسم کے جوہر نمودار ہوتے ہیں جیسے تلواروں پر۔ جوہر مختلف قسم کے ہوتے ہیں مثلاً جوڑی دار' لہریا' جلیبی اور میخی۔ اعلیٰ لاہوری بندوقوں میں میخی جوہر ہوتے ہیں۔ آمیری بندوق کی نال پر کوٹھی سے موری تک مکھی کے محاذ میں ایک خط مستقیم پڑا ہوتا ہے۔

حواشی

(۱) طبری نے اس کا نام عمرو بن حوط سدوسی لکھا ہے۔ (مرتب)۔

(۱) طبری کے ہاں اختلافی روایات نقل کی گئی ہیں۔ چنانچہ وہ اس آگ کا سبب یہ بھی بتاتا ہے کہ محصورین حرم کعبہ میں ضروریات کے پیش نظر آگ جلایا کرتے تھے۔ ہوا سے ایک چنگاری اڑ کر غلاف کعبہ پر جا پڑی۔ غلاف اور چوبینہ جل گیا (مرتب)۔

(۳) انتقال کی تاریخ ۱۴ - ربیع الاول بتائی جاتی ہے۔ غرہ ربیع الاخر کو یہ خبر ملنے پر حصین بن نمیر نے مکے کا محاصرہ اٹھا لیا۔ (مرتب)

(۴) ڈاکٹر یحییٰ قریب نے یہ شعر یوں نقل کیا ہے:

چنان گلندی از منجنیق سنگ عدوی

کزو شدی دل خور از نہیب او بغمام

حاشیے میں پہلے مصرعے کی ایک قرات "زد سنگ منجنیق عدو" بھی درج کی ہے۔ دوسرے مصرعے پر حاشیے میں بجائے "کزو شدی" "کہ برشدی" ہے لیکن "خور" اور "نور" کا اختلاف نہیں بتایا۔ حالانکہ "خور" زیادہ موزوں ہوتا۔ سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے صرف انہیں نسخوں سے

کام کیا ہے جو ایران میں موجود ہیں۔ ("دیوان عنصری" مرتبہ یحییٰ قریب' تہران' ۱۳۴۱ ش)۔ مرتب

(۵) دیوان مسعود سعد سلمان مرتبہ آقای رشید یاسمی طبع تہران' ۱۳۱۸ ہجری شمسی میں صفحہ ۲۶۳ پر "حمی" بجائے "حصین" (مرتب)

(۶) مرتبہ رشید یاسمی میں "بسان چرخ برو" بجائے "زھر چہار طرف"۔ (مرتب)

(۷) مرتبہ رشید یاسمی میں دوسرا مصرع یوں ہے:

چنان کجا بسری چرخ دعوت ابرار (مرتب)

(۸) رشید یاسمی کے ہاں "وگرچہ بود" (مرتب)

(۹) رشید یاسمی کے ہاں:

برون شد او چو براهیم آزر از آزر (مرتب)

(۱۰) رشید یاسمی نے "ی شدی زنہار" کے بجائے "گشت چون گلزار" درج کیا ہے۔ (مرتب)

(۱۱) "پرتھی راج راسا" کی بابت شیرانی صاحب کی یہ رائے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ آگے چل کر جب انہوں نے اس تالیف کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک جعلی تصنیف ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "تنقید پر تھی راج راسا" مشمولہ "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ہفتم۔ (مرتب)

(۱۲) ملاحظہ ہو خواند میرکی "حبیب السیر" جلد سوم' صفحہ ۵۷' بمبئی' ۱۸۵۷ء (مرتب)

(۱۳) ملاحظہ ہو ظفر نامہ شرف الدین یزدی' جلد دوم' صفحہ ۷۸' بہ تصحیح محمد عباسی' تہران' ۱۳۳۶ شمسی (مرتب)۔

(۱۴) شرف الدین یزدی: "ظفر نامہ" جلد دوم صفحہ ۳۴۰ (مرتب)۔

(۱۵) یہ کتاب غالباً دسویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہے۔ مصنف کے نام میں اختلاف ہے۔ اس پر شیرانی صاحب کا حاشیہ مشمولہ "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ہفتم' صفحہ ۲۶۵ ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

(۱۶) جنگ کریسی فرانس اور انگلستان کے مابین سنہ ۱۳۴۶ میں لڑی گئی تھی (مرتب)

(۱۷) دور حکومت: سنہ ۱۳۲۷ء تا ۱۳۷۷ء (مرتب)

(۱۸) یہ ہنری سوئم شاہ انگلستان (۱۲۱۶ء-۱۲۷۲ء) نہیں ہے بلکہ فرانس کا بادشاہ جس نے سنہ ۱۵۷۴ء سے ۱۵۸۹ء تک حکومت کی (مرتب)۔

(۱۹) شیرانی صاحب نے یہ بیان "تاریخ فرشتہ" کی سند پر دیا تھا۔ آگے چل کر انہیں اس کے مبنی بر حقیقت ہونے پر شبہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا:

"ہم سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر فرشتہ کو سہو ہوگیا ہے۔ بہمنیوں میں اسی محمد شاہ کے جانشینوں میں ایک اور محمد شاہ (سنہ ۸۶۸-۸۸۷ء / سنہ ۱۴۶۴-۱۴۸۲ء) ہے۔ بہ ظاہر حالات یہ زمانہ ہندوستان میں توپ و بندوق کے رواج کے واسطے موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ فرشتہ کو ان دونوں سلاطین میں التباس پیدا ہوگیا ہو . . . . اگر دکن میں توپ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں آچکی ہے تو کیا وجہ ہے کہ دہلی، مالوہ اور گجرات وغیرہ کی تاریخوں میں اس کا مذکور نہیں آتا اور نہ جنگوں اور نہ قلعوں کے محاصروں میں مورخین اس سے کام لیے جانے کا ذکر کرتے ہیں۔" ("مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ہفتم، صفحہ ۲۹۷) (مرتب)۔

(۲۰) فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:

"سلطان محمد شاہ . . . فرامین مطاعہ بجمیع قلاع و ممالک محروسہ مرسول داشتہ توپ و ضرب زن بسیار طلب کرد و کارخانہ آتش بازی را کہ پیش ازان در دکن میان مسلمانان شائع نبود، محل اعتماد ساختہ سرکاری آن را بہ مقرب خان ولد صفدر خان سیستانی، کہ از امرای معتمد بود، رجوع فرمود و جمیع رومیان و فرنگیان، کہ ملازم آن موکب منصور بودند، تابع مقرب خان شدہ، توپ خانہ بزرگ ترتیب یافت" (تاریخ فرشتہ، جلد اول صفحہ ۵۵۲، مرتبہ برگز، بمبئی، ۱۸۳۱ء) مرتب۔

(۲۱) بعد میں شیرانی صاحب نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا اور لکھا:

"ہمارے نزدیک آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں رومیوں اور فرنگیوں کی ہندوستان میں آمد ناقابل قبول ہے۔ فرنگیوں میں سب سے پہلی قوم، جو ہندوستان میں آتی ہے، پرتگالی ہیں، جو دسویں صدی ہجری کے آغاز میں آتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر فرشتہ کو سہو ہوگیا ہے۔" (مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد ہفتم صفحہ ۲۹۷)۔ (مرتب)

(۲۲) فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:

"و در عہد سلطان جسب نام آتش بازی پیدا شد کہ چشم روزگار پیش ازان ندیدہ بود و در فن آتش بازی اختراعات کردہ کہ مردم حیران ماندند و در کشمیر تفنگ او پیدا کرد و در حضور سلطان داروھا

ساخت و حوضہا نمود و مردم را تعلیم داد۔" (تاریخ فرشتہ' جلد دوم' صفحہ ۶۵۹-۶۶۰' مرتبہ برگز' بمبئی' ۱۸۳۱ء) (مرتب)۔

(۲۳) یہ ہندوستانی "من" نہیں ہے بلکہ ایرانی' جو اول الذکر سے بہت چھوٹا ہوتا تھا (مرتب)

❑❑❑

ولی کے سنہ وفات کی تحقیق

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت اگست سنہ ۱۹۳۴ء)

سردار عبدالحمید (نکئی) صاحب شیرانی صاحب کے عزیز شاگرد ہیں۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں اورینٹل کالج سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا تھا۔ گریجویشن ۱۹۳۴ء میں کی۔ موصوف نے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام' جائزہ زبان اردو کے سلسلے میں' پنجاب میں اردو کی ارتقائی تاریخ (از ۱۸۳۶ء تا ۱۹۰۰ء) کے موضوع پر' شیرانی صاحب کی نگرانی میں' دو سو صفحات سے زیادہ طویل مقالہ لکھا تھا جسے جائزہ کمیٹی نے بہت پسند کیا تھا۔ یہ غالباً" ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ زیر نظر مضمون "ولی کے سن وفات کی تحقیق" سردار عبدالحمید صاحب کے نام پر اگست ۱۹۳۴ء کے "اورینٹل کالج میگزین" میں شائع ہوا۔

کالج کی طالب علمی کے زمانے میں میں نے یہ مضمون پہلی بار پڑھا۔ اس وقت مجھے اس بات پر تعجب تھا کہ سردار صاحب موصوف کا اس مضمون کے علاوہ کبھی کوئی اور مضمون "اورینٹل کالج میگزین" میں کیوں نہیں چھپا؟ حال ہی میں' جب میں شیرانی صاحب کے مختلف مطبوعات پر تبصروں کی جستجو میں "اورینٹل کالج میگزین" کے پرانے پرچے کھنگال رہا تھا' اتفاق سے یہ مضمون سامنے آگیا۔ میں نے اسے غور

سے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ مضمون ہذا' الفاظ کے انتخاب' محاوروں کی نشست' گفتگو کے انداز' دلائل کی پیشکش' غرض اسلوب بیان کے اعتبار سے حیرت انگیز طور پر شیرانی صاحب کی تحریروں سے مماثلت رکھتا ہے۔ جب میں مضمون کے اختتام کے قریب ان فقرات پر پہنچا کہ "اس کی تائید میں ہم ایک اور قلمی نسخہ دیوان ولی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کی نمائش میں رکھا گیا تھا۔ اور سنہ جلوس محمد شاہی (م ۱۱۳۸ء) کا نوشتہ ہے۔ . . ." تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ یہ مضمون خود شیرانی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محولہ بالا نسخہ دیوان ولی خود شیرانی صاحب کے مجموعہ کتب کے نوادرات میں شامل تھا۔ اگر سردار عبدالحمید صاحب اس کا تعارف کراتے تو براہ راست کتب خانہ شیرانی کے حوالے سے کراتے جس کے اہم مخطوطات اس نمائش میں رکھے گئے تھے۔

خوش قسمتی سے سردار صاحب موصوف گلبرگ (لاہور) میں قیام پذیر ہیں چنانچہ میں نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ایک عریضہ کے ذریعہ یہ استفسار ان کی خدمت میں روانہ کردیا۔ ضعف علالت کے باعث تحریری جواب کی بجائے ۲۶ اکتوبر کی شام ان کا فون موصول ہوا کہ "مضمون ہذا سے میرا کوئی تعلق نہیں یہ استاذ مکرم کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ مجھے تو انہوں نے مضمون دینے کے بعد بتایا تھا کہ میں نے تمہارے نام سے میگزین میں مضمون دیا ہے۔" اس کا سبب بقول سردار صاحب یہ تھا کہ "شیرانی صاحب مجھے تحقیق و تنقید کے میدان میں لانا چاہتے تھے اس لیے تشویق کے طور پر ایسا کیا گیا تھا۔"

اندریں حالات یہ مضمون یہاں شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔

(مرتب)

رسالہ "اردو" بابت جنوری سنہ ۱۹۳۴ء میں فاضل اڈیٹر مولانا عبدالحق صاحب نے ایک نوٹ اوپر کے عنوان سے سپرد قلم کیا ہے، جس میں ولی اورنگ آبادی کی تاریخ وفات سے بحث کی ہے۔ اس وقت تک ولی کا سال وفات غیر متحقق تھا لیکن اب مولانا نے اس امر کو پایہ تحقیق تک پہنچا دیا ہے کہ اس کی وفات سنہ ۱۱۱۹ھ میں واقع ہوئی۔ ہم موصوف کے بیان کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں:

عام تذکرے اس مسئلہ کے متعلق خاموش تھے۔ صرف مولوی عبدالجبار خاں مرحوم مولف "تذکرہ شعرائے دکن" نے اس کا سن وفات ۱۱۵۵ھ لکھا ہے لیکن اس کے لیے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ چنانچہ اب تک یہی سن درست سمجھا گیا۔ غالباً" اس غلط فہمی کی وجہ یہ شعر تھا:

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین

جاکہو کوئی محمد شاہ سوں

اسی طرح ولی کا دوبارہ دلی جانا، جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے، کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ وہ صرف ایک دفعہ دلی گیا ہے اور سوائے قائم کے کسی نے اس کا صحیح سن نہیں لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ولی عالم گیر کے ۴۴ سن جلوس (سنہ ۱۱۱۲ھ) میں دلی گیا۔

مولانا عبدالحق صاحب نے مدت کی تلاش کے بعد ایک قلمی نسخہ دیوان ولی (نشان ۴۲۷۹) کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں دریافت کیا جس کے خاتمہ پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے:

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل

والی ملک سخن صاحب عرفان ولی

سال وفاتش خرد از سر الہام گفت

باد پناہ ولی ساقی کوثر علی

مولانا عبدالحق فرماتے ہیں کہ یہ دیوان ۲۱ سنہ جلوس محمد شاہی (م سنہ ۱۱۵۲ھ) میں لکھا گیا ہے اور اس کے کاتب کا نام شہسوار بیگ ہے۔ اس کے بعد اضافہ کرتے ہیں

کہ اس کی مزید تصدیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانہ سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قطعہ کے مصنف مولوی حسن مفتی ہیں۔ چنانچہ اس قطعہ تاریخ سے یہ امر کلی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ ولی کا سن وفات ۱۱۱۹ھ ہے۔

ہم مولانا کے دلائل کی ضروری تلخیص یہاں پھر دہراتے ہیں :

(۱) مولف "تذکرہ شعرائے دکن" نے اس کا سن وفات ۱۱۵۵ھ لکھا ہے اور اس کے لیے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔

(۲) مضمون کے مندرجہ بالا شعر کو ولی کا شعر سمجھ لیا گیا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ولی محمد شاہ کے عہد میں ہوا حالانکہ وہ شعر ولی کا نہیں۔

(۳) ولی کا محمد شاہ کے عہد میں دوبارہ دلی آنا کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ وہ صرف ایک دفعہ دلی گیا اور قائم نے اس کا دلی جانا ۴۴ سنہ جلوس عالم گیری میں (سنہ ۱۱۱۲ھ) لکھا ہے۔

(۴) دیوان ولی کے ایک قلمی نسخے کے خاتمے سے، جس کی کتابت ۲۱ سنہ جلوس محمد شاہی کی ہے اور جس کی مزید تصدیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانے سے ہوتی ہے، صریحاً ثابت ہے کہ ولی کا سال انتقال ۱۱۱۹ھ ہے۔

رسالہ "زمانہ" بابت اپریل سنہ ۱۹۳۴ء میں جناب محمد یحیٰی صاحب تنہا غازی پوری مصنف "سیر المصنفین" نے مولانا کے نظریہ کی تردید میں اس عقیدے کو پیش کیا ہے کہ ولی کا سن وفات ۱۱۵۵ھ زیادہ صحیح ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

"ظاہر ہے کہ یہ قطعہ تاریخ ناقل دیوان ولی نے یا کسی اور شخص نے، جس کا نام مولوی حسن مفتی ہے، نظم کرکے دیوان ولی کے خاتمے پر درج کردیا ہے۔ اب امر یہ غور طلب ہے کہ ناقل دیوان ولی یا مولوی حسن مفتی کو ولی کی صحیح تاریخ معلوم تھی یا مولف تذکرہ شعرائے دکن' کو اس کا صحیح علم تھا۔ بظاہر مولف تذکرہ نے ولی کی صحیح تاریخ وفات معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی اور کاتب دیوان ولی یا کسی حسن مفتی کو اس قدر جدوجہد کرنے کی ضرورت پیش نہ

آئی ہوگی بلکہ سرسری طور پر جو تاریخ اسے معلوم ہوئی ہوگی اس کو نظم کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی ہوگی۔ مجھے فی الواقع یہ شبہ ہے کہ تاریخ وفات ولی، جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، کہیں ولی رام ولی شاعر کی تاریخ وفات نہ ہو جو ہمارے ولی سے دس بیس برس پہلے مرچکا ہے اور "ناقل نا عاقل" نے اس ولی کی تاریخ وفات کو ولی اللہ کی تاریخ وفات سمجھ کر قطعہ تاریخ نظم کردیا ہو۔"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"بہرحال لایق اڈیٹر صاحب (مولانا عبدالحق بالقابہ) اس امر کی طرف توجہ فرمائیں کہ ولی نے یہ اشعار جو اس نے "وہ مجلس" کی تاریخ تالیف کے متعلق لکھے ہیں:

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال
تھا گیارہ سو پہ اکتالیسوں سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول
ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

کیسے لکھ دیئے جب کہ وہ سنہ ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوگیا تھا۔ ان اشعار سے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ کم از کم سنہ ۱۱۴۱ھ تک زندہ تھا اور اگر موصوف کی رائے میں اس نے یہ اشعار نہیں لکھے تو قابل اڈیٹر کے پاس وہ کیا شہادت قابل یقین موجود ہے جس کی بنا پر "وہ مجلس" کی تاریخ تالیف کو غلط کہا جاسکتا ہے۔"

گویا تنہا صاحب مندرجہ ذیل تین امور کی بنا پر ولی کا سن وفات ۱۱۵۵ھ صحیح سمجھتے ہیں:

(۱) مولف "تذکرہ شعرائے دکن" نے ولی کی صحیح تاریخ وفات معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی اور کاتب دیوان ولی یا کسی مولوی حسن مفتی کو اس قدر جدوجہد کی ضرورت پیش نہ آئی ہوگی بلکہ سرسری طور پر جو تاریخ اسے معلوم ہوئی ہوگی اسی کو نظم کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی ہوگی۔

(۲) ولی کا سن وفات ۱۱۱۹ھ جو کاتب دیوان ولی نے لکھا ہے' ولی رام کا سن وفات معلوم ہوتا ہے۔

(۳) "دہ مجلس" کی تاریخ تالیف سے ثابت ہوتا ہے کہ ولی کم از کم سنہ ۱۱۴۱ھ تک زندہ تھا۔ اس لیے اس کا سن وفات ۱۱۵۵ھ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا دلائل کی بنا پر تنہ صاحب ولی کا سن وفات ۱۱۵۵ھ صحیح قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک سنہ ۱۱۱۹ھ غلط ہے جو غالباً" ولی رام کا سن وفات ہے۔

تنہا صاحب بے شک ایک قابل وکیل اور مشہور مصنف ہیں' وہ ہمیں معاف کریں گے اگر ہم یہ کہیں کہ ان کا استدلال نہایت انوکھا اور غیر منطقیانہ ہے۔

جب ہمارے پاس ایک ایسے قلمی دیوان کی سند موجود ہے جس کی کتابت سنہ ۲۱ جلوس محمد شاہی میں ہوئی۔ اور اس کی مزید صحت و توثیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانے سے ہوجاتی ہے تو یہ تشکیک بے معنی ہے کہ آیا "مولف تذکرہ شعرائے دکن" کو ولی کی صحیح تاریخ وفات معلوم تھی یا ناقل دیوان ولی کو؟ تاریخ اور ادبی تنقید میں کاغذی شہادت جس قدر زیادہ قدیم ہو اتنی ہی زیادہ معتبر اور مستند مانی جاتی ہے۔ مولوی عبدالجبار خان کا تذکرہ شعرائے دکن بالکل حال کی چیز ہے اور سنہ ۱۳۲۹ھ کی تالیف ہے۔ اور قلمی نسخہ دیوان ولی ۲۱ جلوس محمد شاہی (مطابق سنہ ۱۱۵۲ھ) کا ہے۔ تنہا صاحب کا یہ دعویٰ بالکل بے محل ہے کہ کاتب دیوان ولی کو اس قدر جدوجہد کی ضرورت پیش نہ آئی ہوگی۔ یہاں کاتب زیر بحث نہیں ہے جس قدر مولوی حسن مفتی مولف قطعہ بالا ہے۔ جب اس نے قطعہ وفات لکھا ہے تو ظاہر ہے کہ یا تو وہ ولی کا معاصر ہے اور جاننے والا ہے یا اگر ذاتی طور پر جاننے والا نہیں ہے تو اُس نے ولی کے کسی جاننے والے کی فرمائش پر یہ قطعہ لکھا ہے۔ قطعہ مذکور بہرحال سنہ ۱۱۵۲ھ سے قبل کا نوشتہ ہے۔ اس لیے یقیناً قابل اعتبار اور مستند ہے۔ نیز یہ شہادت ہمیں ایک ایسے مخطوطے سے ملتی ہے جو ولی کی وفات سے تھوڑے عرصے بعد لکھا گیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی عبدالجبار مصنف "تذکرہ شعرائے دکن" نے اپنی بیان

کردہ تاریخ وفات سنہ ۱۱۵۵ھ کے متعلق کوئی سند یا حوالہ پیش نہیں کیا ہے۔ وہ ولی کے سال وفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کہتے ہیں سنہ ۱۱۵۵ھ کے قریب احمد آباد گجرات میں فوت ہوا" (صفحہ ۱۳۳، محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن، مطبع رحمانی، سنہ ۱۳۲۹ھ)

اب ظاہر ہے کہ عبدالجبار خاں نے سنی سنائی بات لکھ دی ہے جس کی صحت میں خود مصنف کو بھی شبہ ہے کیونکہ ان کا بیان "کہتے ہیں" سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے موجودہ زمانے کے مصنف کے غیر موثقہ بیان کو پرانی شہادت پر ترجیح دینا کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں۔

غور کرنے سے ایک اور نکتہ ذہن میں آتا ہے کہ جب شہسوار بیگ سنہ ۲۱ جلوس محمد شاہی مطابق سنہ ۱۱۵۲ھ میں حسن مفتی کا قطعہ مذکورہ نقل کر رہا ہے جس سے ولی کی تاریخ وفات سنہ ۱۱۱۹ھ برآمد ہوتی ہے تو تنہا صاحب کس بنا پر سنہ ۱۱۵۵ھ ولی کا سال وفات تسلیم کرتے ہیں۔ کیا ایک شخص کی وفات سے تین سال قبل اس کی تاریخ وفات اس کی تصنیف میں درج ہونا ممکن ہے۔

(۲) محقق مقالہ نگار اپنی تحقیق کے جواز میں ایک اور ثبوت بہم پہنچاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ تاریخ وفات ولی رام ولی کی معلوم ہوتی ہے نہ کہ ولی اورنگ آبادی کی اور "ناقل نا عاقل" نے ولی کی تاریخ وفات سمجھ کر قطعہ تاریخ نظم کردیا ہے۔

ہم ان کے اس بیان کے متعلق یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی یہ تاویل جس قدر غیر موجہ ہے اسی قدر غیر عالمانہ بھی ہے۔ تنہا صاحب نے 'معلوم ہوتا ہے' اس قطعہ کی عبارت پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا ورنہ ان جیسا لائق وکیل ایسے بے حقیقت استدلال کا آسانی کے ساتھ شکار نہ ہوسکتا جس میں ایک مسلمان' ولی کی تاریخ وفات کو ایک ہندو' ولی رام ولی کی تاریخ وفات فرض کرلیا جائے۔ ہم ان کی توجہ اس قطعہ کے چوتھے مصرعے:

باد پناہ ولی ساقی کوثر علی

کی طرف مبذول کر کے مستفسر ہیں کہ کیا ایک ہندو کے لیے یہ قطعہ اور یہ مصرع ایک موزوں تاریخ مانا جاسکتا ہے۔ یہ مصرع بالکل مسلمانی جذبات کا مظہر ہے اور مسلمان کے لیے لکھا گیا ہے نہ کہ ہندو کے واسطے۔ یہاں ولی رام کے متعلق بھی چند کلمے لکھنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

ولی رام ولی پنجاب کا باشندہ ہے اور شاہ جہاں کے عہد میں گزرا ہے۔ اس کا کلام فارسی میں ہے۔ تصوف میں وہ کئی مثنویوں کا مالک ہے جن میں سے بعض مختلف مطابع میں چھپ چکی ہیں۔ ایک مثنوی، مقلب بہ شش وزن، مطبع نادر العلوم میں چھپی تھی۔ اس کی ایک اور مثنوی "بحر عرفان" گیان پریس گوجرانوالہ میں بہ اہتمام منشی برج لعل شائع ہوئی ہے۔ اس کے خاتمہ میں مندرجہ ذیل عبارت، جس سے ولی رام کا سال وفات بر آمد ہوتا ہے، درج ہے:

"تاریخ وصال ولی رام صاحب: ع

از جام یقیں ولی شدہ مست

اس مصرع سے ولی رام کا سن وفات ۱۰۷۷ھ نکلتا ہے۔ ان تمام باتوں سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ "عاقل ناعاقل" کا اس میں کوئی قصور نہیں بلکہ خود جناب تنہا صاحب اس غلط فہمی کے تمام و کمال ذمہ دار ہیں۔ ولی رام کا سن وفات ۱۰۷۷ھ ہے اور سنہ ۱۱۱۹ھ کسی صورت میں نہیں ہوسکتا۔ اس لیے مولانا عبدالحق کا بیان، کہ سنہ ۱۱۱۹ھ ولی اورنگ آبادی کی تاریخ وفات ہے، زیادہ صحیح اور قرین عقل و قیاس معلوم ہوتا ہے۔

(۳) تیسری دلیل تنہا صاحب کی ولی کے وہ اشعار ہیں جو اس نے "دہ مجلس" کی تاریخ تالیف کے متعلق لکھے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ان سے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ کم از کم سنہ ۱۱۴۱ھ تک زندہ تھا۔"

اس کے جواب میں ہم تنہا صاحب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ "دہ مجلس" جسے "روضۃ الشہدا" بھی کہا جاتا ہے، ولی اورنگ آبادی کی تصنیف نہیں۔ اسی نام کا ایک اور ولی گزرا ہے جسے ولی ویلوری کہا جاتا ہے۔ وہ ویلور کا باشندہ تھا اور اس کا

نام محمد فیاض ہے۔ "دہ مجلس" یا "روضۃ الشہداء" اس ولی ویلوری کی تصنیف ہے اور ولی اورنگ آبادی کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ تنہا صاحب کا کہنا بجا ہے کہ انجمن ترقی اردو کے مطبوعہ کلیات میں "دہ مجلس" کے یہ اشعار ولی اورنگ آبادی سے منسوب کئے گئے ہیں۔ لیکن اس میں مولانا عبدالحق کا کیا قصور ہے؟ مطبوعہ کلیات کے اڈیٹر احسن مارہروی ہیں نہ کہ مولانا عبدالحق۔ احسن صاحب بھی، معلوم ہوتا ہے، اسی غلط فہمی کا شکار ہوگئے جس میں خود تنہا صاحب مبتلا ہیں۔ ہم اپنے اس بیان کی تائید میں ولی ویلوری اور اس کی تصنیف "دہ مجلس" یا "روضۃ الشہداء" کے متعلق مندرجہ ذیل عبارت حکیم شمس اللہ صاحب قادری کی مشہور کتاب "اردوے قدیم" سے نقل کرتے ہیں:

"سید محمد فیاض ان کا نام ہے۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مراۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ویلور ان کا وطن تھا۔ عالم گیر کے زمانے میں گزرے ہیں۔ دکن میں سات گڑھ ایک تاریخی مقام ہے۔ وہاں حراست خاں نام ایک امیر رہا کرتا تھا۔ ولی عرصہ تک اس کی رفاقت میں رہے۔ پھر وہاں سے نکل کر کڑپہ میں چلے آئے۔ یہاں کے صوبہ دار نواب عبدالحمید خاں تھے۔ انہوں نے ولی کی قدر دانی کی اور ملازمت دے کر سدہوٹ میں تعینات کردیا۔ یہ واقعات ولی نے رتن پدم کے دیباچے میں بیان کئے ہیں... ولی کی تصنیفات سے اس وقت دو کتابیں ملتی ہیں:

(۱) رتن پدم...

(۲) روضۃ الشہدا۔ اس میں ولی نے واقعات کربلا منظوم کئے ہیں۔ ضخیم کتاب ہے اور سنہ ۱۱۱۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے:

کیا ہوں جب ختم یو درد کا حال
اگیارہ سو پو تھا انیسواں سال

(اردوے قدیم، صفحہ ۸۹-۹۰)

حکیم شمس اللہ قادری کے بیان کے مطابق "روضۃ الشہداء" کا سن تصنیف ۱۱۱۹ھ ہے لیکن جناب نصیرالدین ہاشمی اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں رقم طراز ہیں:

"مولف اردوے قدیم نے تاریخ تصنیف کا شعر حسب ذیل درج کیا ہے جو مطبوعہ نسخے سے ماخوذ ہے:

کیا ہوں جب ختم یو درد کا حال
گیارہ سو پو تھا انیسواں سال

مگر یورپ کے تین نسخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی بلکہ وہاں کے نسخوں سے سنہ ۱۱۳۰ھ ظاہر ہوتا ہے:

کیا ہوں ختم جب یو درد کا حال
گیارہ سو اوپر تھا تیسواں سال

میرے پاس جو نسخہ ہے اس سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ اگرچہ وزن کے لحاظ سے یہ شعر موزوں نہیں ہوتا مگر ایک سے زاید نسخوں میں اسی سن کا لکھا جانا خالی از تعجب نہیں۔ مولف اردو شہ پارے' نے سن تصنیف کے متعلق کوئی رائے نہیں دی ہے۔" (یورپ میں دکھنی مخطوطات' صفحہ ۳۵۳)

ہم "روضۃ الشہداء" کے سن تصنیف کے متعلق زیادہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ یہاں صرف یہی دکھلانا مقصود ہے کہ "روضۃ الشہداء" یا "دہ مجلس" ولی ویلوری کی تصنیف ہے اور اسے ولی اورنگ آبادی سے کوئی تعلق نہیں۔ مذکورہ بالا بیان کی تصدیق میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری کی کتاب "اردو شہ پارے" کی یہ عبارت بھی قابل ملاحظہ ہے:

"اس میں شک نہیں کہ دکھن میں ایک ہی زمانے میں دو شاعر ایسے گزرے ہیں جن کا تخلص ولی تھا لیکن ایک شاعر شمال مغربی حصہ یعنی اورنگ آباد کا باشندہ تھا اور دوسرا جنوب مشرق میں بمقام ویلور رہتا تھا جو اب علاقہ

نہیں بلکہ ۱۱۱۹ھ ہے۔

آخر میں ہم قبلہ مولانا عبدالحق صاحب کے انکشاف کی اہمیت اور اس کی صحت کا اعتراف کرتے ہوئے تنہا صاحب کی خدمت میں ان کی طرف سے عرض کرتے ہیں:

مرا خواندی و خود بدام آمدی
نظر پختہ تر کن کہ خام آمدی

ان سطور کو ختم کرنے سے پیش تر ایک مودبانہ درخواست مولانا کی خدمت میں بھی کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ حسن مفتی کے قطعہ بالا سے بحساب جمل ولی کا سن وفات ۱۱۱۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ سنہ ۱۱۱۹ھ غالباً" سہو کتابت ہو۔[۲]

حواشی

(۱) اندراج نمبر ۴۵۵۵/۱۵۰۵، ذخیرہ شیرانی مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (مرتب)

(۲) یہاں یہ بات ایک لحہ کے لیے بھی تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ حسن مفتی کے قطعہ کے تیسرے مصرع میں "از سر الہام گفت" سے عمیہ کی جو صورت پیدا ہوتی ہے، وہ شیرانی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ اس بہانے سے وہ مولوی عبدالحق صاحب کو کسی بحث میں کھینچنا چاہتے تھے۔ اپنے نام سے یہ مضمون نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ شیرانی صاحب کی نظر میں کوئی ایسا ماخذ ہو جس سے ولی کی تاریخ وفات سنہ ۱۱۱۸ھ ہونے کی شہادت ملتی ہو۔ چنانچہ ایک عرصہ بعد قاضی احمد میاں اختر مرحوم نے "اعراس نامہ" کے مخطوطے کے حوالے سے ولی کے برادر نسبتی شیخ فرید صدیقی کے بیٹے شیخ جمیل اللہ کی لکھی ہوئی ولی کی تاریخ وفات "من ایمن بدر خفی" بتائی ہے۔ اس مادہ سے بھی سال ۱۱۱۸ھ (خفی کی یا اور الف دونوں شامل کرکے) برآمد ہوتا ہے۔ یہ شہادت ایک قریبی عزیز کی ہے اور اہمیت کی حامل بھی۔ (دیکھیے رسالہ "اردو" کراچی بابت جنوری سنہ ۱۹۵۱ء)۔ مرتب۔

مدراس میں شامل ہوگیا ہے۔ اگرچہ دونوں کو ایک ہی زمانہ میں عروج ہوا لیکن خود وہ ایک دوسرے کے وجود سے ناواقف تھے ..... ویلور کے ولی کا نام سید محمد فیاض ہے ..... وہ پر نویس شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے موجودہ تین نسخوں میں سے دو بہت ضخیم ہیں:

(۱) رتن پدم (یہ ہمارے موجودہ مبحث سے خارج ہے اس لیے اس کا ذکر بخوف طوالت چھوڑ دیا جاتا ہے)۔

(۲) روضتہ الشہداء' اس کی دوسری نظم ہے۔ یہ کئی وقت طبع ہوچکی ہے۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کا ایک عمدہ مخطوطہ ہے......

ولی کی "روضتہ الشہداء" کا تعلق ملا حسین واعظ کاشفی کی اسی نام کی کتاب سے ہے جس کو "دہ مجلس" بھی کہا جاتا ہے۔ بوڈلین لائبریری کے مخطوطے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ ترجمہ میں ہر باب کا عنوان "مجلس" قرار دیا گیا ہے اور چونکہ اس میں دس ابواب ہیں اسی لیے اس کا نام "دہ مجلس" بالکل درست ہے۔ اس کو ولی اورنگ آبادی کی تصنیف خیال کیا جاتا ہے لیکن راقم کی رائے میں "دہ مجلس" اس مشہور و معروف ولی کی تصنیف نہیں بلکہ یہی "روضتہ الشہداء" ہے جس کا نام "دہ مجلس" بھی ہے۔ اورنگ آباد کے ولی نے اس نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ حال ہی میں ولی کا جو کلیات طبع ہوا ہے اس میں "دہ مجلس" کے جو چند اشعار درج ہیں وہ فی الحقیقت ویلور کے ولی کے ہیں نہ کہ اسی مشہور و معروف ولی کے"

(اردو شہ پارے' صفحہ ۱۴۳-۱۴۵)

بہرصورت اب یہ امر پایہ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ درحقیقت ولی ویلوری نے ایک مثنوی بنام "روضتہ الشہداء" لکھی تھی جس کا تعلق ملا حسین کاشفی کی "دہ مجلس" سے ہے اور ولی اورنگ آبادی نے کوئی ایسی مثنوی بنام "دہ مجلس" نہیں لکھی۔ نصیرالدین صاحب ہاشمی اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں لکھتے ہیں:

"یورپ کے کسی نسخے میں "دہ مجلس" کا قطعہ تاریخ درج نہیں ہے۔ خصوصاً سب سے قدیم دیوان جو سنہ ۱۱۴۴ھ کا لکھا ہے اور ابوالمعالی کے فرزند کے جمع کردہ دیوان میں اس کا نہ ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ولی نے وہ تاریخ نہیں کہی۔"

(یورپ میں دکھنی مخطوطات' صفحہ ۴۹۵)

مندرجہ بالا امور سے امید ہے تنہا صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ ہوجائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ غلط فہمی زیادہ تر "دہ مجلس" کے اشعار سے ہوئی۔ اس کے متعلق ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ "دہ مجلس" ولی اورنگ آبادی کی تصنیف نہیں بلکہ ولی ویلوری کی ہے۔ نیز ولی کے دیوان کے قلمی نسخے نے' جس کا مولانا عبدالحق نے انکشاف کیا ہے' اس امر کا حتمی طور پر فیصلہ کردیا ہے کہ ولی کا سن وفات ۱۱۱۹ھ ہے۔

اس کی تائید میں ہم ایک اور قلمی نسخہ دیوان ولی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کی نمائش میں رکھا گیا تھا اور سنہ ۸ جلوس محمد شاہی (م سنہ ۱۱۳۸ھ) کا نوشتہ ہے اور ثناء اللہ فانی کے ہاتھ کا لکھا ہے[1] اور کام کی بات یہ ہے کہ ثناء اللہ ولی کو مرحوم کے لفظ سے یاد کر رہا ہے۔ خاتمے کی اصل عبارت یہ ہے:

"دیوان اشعار ولی مسمی سید ولی محمد مرحوم بتاریخ چہار دہم شہر محرم الحرام سنہ ۸ از جلوس میمنت مانوس محمد شاہ پادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ' روز چہار شنبہ وقت چاشت در بلدہ خیر البلاد احمد آباد حمیت عن الفساد بخط فقیر حقیر اضعف العباد کلب محبوب سبحانی نمود بے بود ثناء اللہ فانی سمت انجام و صورت اتمام پذیرفت۔"

اس نسخے میں ولی کو "مرحوم" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ ولی ان سنوں سے قبل وفات پاچکا ہے اور جب حسن مفتی کے قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوا تو ہمیں اس بیان کی تصدیق میں تامل و تذبذب نہیں کرنا چاہیے اور بلا حیل و حجت مان لینا چاہیے کہ ولی کا سن وفات ۱۱۵۵ھ

حصّۂ چہارم

تنقید و تبصرہ

تنقید

مطلع الانوار حضرت امیر خسرو دہلویؒ

(از اورینٹل کالج میگزین" بابت فروری سنہ ۱۹۲۸ء)

اورینٹل کالج میگزین کا یہ پہلا شمارہ ہے جس میں شیرانی صاحب بطور مبصر (مطبوعات) سامنے آتے ہیں۔ ان کا پہلا تبصرہ "مثنوی مطلع الانوار" پر ہے جو یہاں درج کیا جارہا ہے۔ دوسرا تبصرہ حکیم شمس اللہ قادری کے مرتبہ "دیباچہ قدیم شاہنامہ" پر تھا جو مقالات کی چوتھی جلد (راجع بہ فردوسی) میں شامل ہوچکا ہے۔

ان کے بعد مولانا نورالحق کا ایک اور پروفیسر محمد اقبال کے دو تبصرے ملتے ہیں۔ شاید پہلی بار بزم تبصرہ میں شامل ہونے کی بنا پر شیرانی صاحب کے دونوں تبصروں کے آخر میں باقاعدہ ان کا نام "(حافظ) محمود شیرانی" درج ہے (مرتب)۔

بہ تنقید و نگرانی جناب مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی' مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سنہ ۱۹۲۶ء میں طبع ہوئی۔

انتساب و فہرست ۵ صفحے' مقدمہ ٦٦ صفحے' متن کتاب ۲۳۸ صفحے۔ کل ۳۰۹ صفحات۔ قیمت قسم اول ۸ روپیہ' قسم دوم ٦ روپیہ' قسم سوم (غیر مجلد) ۳ روپیہ۔

یہ مثنوی سلسلہ کلیات خسرو میں شائع ہوئی ہے۔ سلسلہ مذکور ملک میں اس قدر مشہور ہوچکا ہے کہ تعریف سے مستغنی ہے۔ لہٰذا اس قدر کہنا کافی ہے کہ اس سلسلے کی جملہ خوبیاں اس مثنوی میں بھی موجود ہیں۔ کاغذ اعلیٰ' خط جمیل' طباعت حسین' یہ وہ اوصاف ہیں کہ مطبوعات مطبع مسلم یونیورسٹی میں موجود پانے کے ہم خوگر ہیں۔ اس سلسلے کی اور کتابوں کی طرح ایک عالمانہ مقدمہ شروع میں موجود ہے' جس میں جناب

مولوی محمد مقتدی خان صاحب نے اس مثنوی کے محاسن پر ایک غائر نظر ڈالی ہے۔ موصوف کی سخن دانی مقدمہ پڑھنے والوں سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہ رہے گی۔ حواشی کتاب میں سربسر اختلافی نسخے درج ہیں اور کہیں کہیں مفردات و تراکیبِ مشکلہ و اشعارِ مغلقہ کا حل مختصر مگر واضح الفاظ میں دیا ہے۔ متن پڑھنے میں خاصہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور طباعت نے صحت متن کو بہت کم ضرر پہنچایا ہے۔

ہم نے دیباچے سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ متن کون سے نسخے پر مبنی ہے اور اختلافی نسخے کسی ایک نسخے سے لیے گئے' جیسا بادی النظر میں متبادر ہوتا ہے یا متعدد نسخوں سے' جیسا کہ اغلب ہے۔ لیکن ہم کو بہت حیرت ہوئی جب اس قسم کی کوئی اطلاع ہم کو دیباچے (یا کتاب کے کسی اور حصے) سے نہ ملی۔ جناب ایڈیٹر نے تصحیح و تنقید کے عنوان میں (دیباچہ صفحہ ۲ پر) صرف اتنا لکھا ہے کہ "یہ مثنوی تصحیح و تنقید کے لیے متعدد نظروں اور مختلف ہاتھوں سے گزری ہے.... جہاں تک مختلف نسخوں کے ساتھ مقابلے اور تصحیح کا تعلق ہے میں اس سے بری الذمہ ہوں۔"

یہ مسلم ہے کہ ہر ایڈیٹر کا مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیے کہ تاحدامکان مصنف کا اصلی متن قارئین کے سامنے پیش کرے۔ لہٰذا یہ ضروری ٹھہرا کہ متن حتی الوسع قدیم ترین نسخوں پر یا ان کی ثابت شدہ نقلوں پر مبنی کیا جائے۔ اس اعتبار سے ہم حق بجانب ہیں اگر جناب ایڈیٹر سے دریافت کریں کہ وہ مطبوعہ متن کی تاریخ ہم کو بتائیں۔ اس تاریخ کی تلاش میں بہ ناچار ہم نے "تبصرہ متعلق کارروائی ترتیب کلیات حضرت امیر خسرو" کی ورق گردانی کی۔ اس میں صفحہ ۳۶ بعد پر مطلع الانوار کے پانچ نسخے (جناب مہتمم کے پاس) موجود بتائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مطبع نول کشور کا چھپا ہوا اور چار قلمی ہیں۔ ان چار میں سے ایک مدرستہ العلوم علی گڑھ کی لائبریری سے آیا' ایک نواب عماد الملک (مرحوم) سے مستعار ملا۔ ایک نواب سالار جنگ بہادر اور ایک منشی مبارک سنگھ صاحب نے عطا کیا۔ بدبختی سے' تبصرے میں ان میں سے کسی نسخے کا حال خصوصاً" سن کتابت درج نہیں ہوا۔ تاہم ان نسخوں کی بابت بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ

متن کو قائم کرنے میں یہ سب استعمال میں آئے یا نہیں اور متن ان تمام نسخوں سے مرکب ہوا یا کسی ایک پر مبنی کیا گیا اور حاشیے کے نسخے ان میں سے کس کس سے حاصل ہوئے۔ تبصرہ مذکور کے صفحہ ۴۲ پر یہ بھی درج ہے کہ برٹش میوزیم سے کلیات خسرو وغیرہ کے فوٹو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا' اس کی اطلاع ہم کو نہیں ملی۔

غالباً" مطلع الانوار کے قدیم ترین نسخے یورپ میں ہیں اور اس لیے ہماری رائے میں کوئی ایڈیشن' جو تنقیدی ہونے کا دعویٰ کرے' قدرتی طور پر ان نسخوں سے جو یورپ میں ہیں' مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لیے ہم بلا استقصا انگلستان کے کتاب خانوں کے چند قدیم نسخوں کا سن کتابت درج ذیل کرتے ہیں۔ (یاد رہے کہ خسرو کا سن وفات ۷۲۵ھ ہے):

(۱) برٹش میوزیم: خمسہ خسرو[1] تحریر سنہ ۸۲۱ھ' ایضاً" تحریر ۸۹۶ھ

(۲) کتاب خانہ بادلی: خمسہ خسرو تحریر ۸۴۰ھ[2]۔

(۳) کتاب خانہ انڈیا آفس: مطلع الانوار[3] تحریر ۸۶۶ھ۔

ان کے مقابلے میں ہندوستان کے چند قدیم[4] نسخوں کی تاریخ کتابت ملاحظہ ہو:

(۱) کتاب خانہ بانکی پور[5]: مطلع الانوار تحریر ۹۴۷ھ' خمسہ تحریر ۹۷۳ھ۔

(۲) کتاب خانہ ریاست رام پور[6]: خمسہ تحریر ۹۷۷ھ' کلیات خسرو (ناقص الاخر) قیاساً" دسویں صدی کی تحریر۔

(۳) کتاب خانہ ایشیاٹک[7] سوسائٹی بنگال: خمسہ' بظاہر دسویں صدی میں لکھا گیا۔ مطلع الانوار و خمسہ' گیارھویں صدی کی تحریر۔

(۴) کتاب خانہ آصفیہ' حیدر آباد: کسی نسخے پر تاریخ کتابت درج نہیں۔

مختصر یہ کہ مطبوعہ نسخہ خوب چیز ہے مگر ہم کو بتایا نہیں گیا کہ متن کو مرتب کرنے میں روایت صحیح کا لحاظ رکھا گیا یا نہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ نسخے جو استعمال کئے گئے وہ کافی قدیم نہیں ہیں حالانکہ قدیم نسخے نسبتاً" قلیل صرف سے اور قلیل مدت میں حاصل کئے

جاسکتے تھے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ کتابت کی غلطیاں "نسبتاً" بہت کم نظر آئیں۔ دو چار جو نظر سے گزریں درج ذیل ہیں:

دیباچہ' صفحہ ۲۰: تکلو کا نام نسف آقا ہے نہ افاشف۔

دیباچہ' صفحہ ۲۰: غزالی مشہدی کی مثنوی کا صحیح نام "قدرت آثار" معلوم ہوتا ہے...(۸)

حواشی' صفحہ ۲۲۵ پر متعدد الفاظ غلط چھپے ہیں۔

صفحہ ۲۲۶' سطر ۱۲: مقنعہ (بجائے مقنہ) چاہیے تھا۔

حواشی صفحہ ۲۲۹' سطر ۶: یہ شعر غالباً" درست نہیں چھپا۔

حواشی صفحہ ۲۲۹' سطر ۱۵: یابد (بجائے باید)۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ساری کتاب میں تلفظ ہندوستان کی رعایت سے نون غنہ لکھا گیا ہے مگر ہم کو اس کے درست ہونے میں تامل ہے۔ قدیم نسخوں میں ہم نے نون کو نقطہ دار ہی پایا ہے۔

دیباچے کے صفحہ ۱۹ پر ایک نامکمل جدول ان مثنویوں کا دیا گیا ہے جو مطلع الانوار کے مقابلے میں لکھی گئی ہیں۔ اس جدول میں ۲۶ مثنویاں مذکور ہیں۔ اس کے بعد ایک اور جدول میں بسم اللہ کی تضمینیں درج ہیں۔ ان دونوں جدولوں کا قریباً" تمام مواد غالباً" "ہفت آسمان" (مولفہ آغا احمد علی مرحوم) سے ماخوذ ہے۔ شاید کثرت شہرت کی وجہ سے حوالہ اس کتاب کا نہیں دیا گیا مگر ہماری رائے میں دینا چاہیے تھا۔

دلیل ان کے "ہفت آسمان" سے ماخوذ ہونے کی یہ ہے کہ ان میں سے ۲۵ مثنویوں کا حال "ہفت آسمان" میں موجود ہے اور جہاں سن وفات کسی کا "ہفت آسمان" میں دیا ہے صرف وہیں اس جدول میں بھی دیا ہے حالانکہ بعض استادوں کے وفیات تتبع سے معلوم ہوسکتے تھے۔ اس سے قوی تر دلیل یہ کہ حکیم شفائی' صاحب مثنوی دیدہ بیدار کا سن وفات ۱۰۲۷ھ دیا ہے مگر "ہفت آسمان" میں صفحہ ۱۳۵ پر یہ سن غلطی طباعت سے درج ہوا ہے۔ اصل کی عبارت یہ ہے:

"در سنہ (۱۰۲۷) فوت شد۔ ملا شاہ عرشی تاریخ فوت او گفتہ:

بشاہ دین شفائی داد جان را"

اس مادے سے سنہ ۱۰۳۷ھ برآمد ہوتا ہے نہ کہ ۱۰۲۷ھ اور صحیح تاریخ وفات ۱۰۳۷ھ ہی ہے (دیکھو عالم آرای عباسی، صفحہ ۱۱۷)۔

بعض مثنویاں جو مخزن اسرار کے مقابلے میں لکھی گئیں اور "ہفت آسمان" میں مذکور ہیں، جدول مذکور میں درج نہیں ہوئیں مثلاً نویدی شیرازی کی دو مثنویاں، خلد برین وحشی وغیرہا۔

ہم کو یقین ہے کہ شائقین زبان فارسی ان جواہر ریزوں کو دست بدست لیں گے۔

حواشی

(۱) فہرست ریو صفحہ ۸۶۷ و ضمیمہ فہرست ریو صفحہ ۱۶۷۔ برٹش میوزیم میں ان کے علاوہ دسویں صدی ہجری کے مطلع الانوار کے نسخے (بعض خمسوں میں اور بعض الگ) سات ہیں۔ (حاشیہ مؤلف)۔

(۲) یہ سن مشتبہ ہے مگر صدی کا ہندسہ یقینی ہے۔ فہرست بانکی پور صفحہ ۲۶ تا ۲۸۔ (مؤلف)۔

(۳) فہرست ممود، ۶۹۲ (مؤلف)۔

(۴) ظاہر ہے کہ یہاں انہی نسخوں کا ذکر ہے جو مطبوعہ فہرستوں میں مذکور ہیں۔ جن کتب خانوں کی فہرستیں شائع نہیں ہوئیں۔ ان کی نسبت پتہ نہیں لگایا جا سکتا (مؤلف)۔

(۵) فہرست ...، صفحہ ۱۹۲ (مؤلف)۔

(۶) دیکھو اورینٹل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۲۶ء، صفحہ ۱۴-۱۵

(۷) فہرست ایوانف، صفحہ ۲۰۱ (مؤلف)۔

(۸) دیکھو "ہفت آسمان" صفحہ ۱۰۴، فہرست کتب خانہ بانکی پور، نمبر ۶۵۶ (مؤلف)۔

تنقید و تبصرہ

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت مئی سنہ ۱۹۲۸ء)

اس شمارے میں تبصرہ نگار کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ پہلا تبصرہ رسالہ ''تاج'' کے ''اردوئے قدیم نمبر'' پر تھا جو یقیناً شیرانی صاحب کا تحریر کردہ تھا۔ لہٰذا اسے ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' کی پہلی جلد میں شامل کرلیا گیا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ باقی ماندہ تین مختصر سے تبصرے بھی موصوف ہی نے کئے ہوں گے چنانچہ انہیں یہاں درج کیا جاتا ہے (مرتب)۔

''ابنِ یمین''

رشید یاسمی نے دو باب اور چند فصلوں میں ایک فارسی رسالہ ابن یمین کے حالات میں لکھا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس رسالے کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پنڈی (کذا۔ منڈی؟) بہاء الدین نے اس اردو ترجمے کو شائع کیا ہے۔ ابن یمین کے حالات پر اس کتاب سے بہتر کتاب غالباً وجود میں نہیں آئی اور دوست داران ادب فارسی کمپنی مذکور کے مشکور ہوں گے کہ انہوں نے اردو خواں پبلک کے لیے اس مفید کتاب کو شائع کیا۔ کتاب کے پروف احتیاط سے پڑھے نہیں گئے اور اعلام کو بعض جگہ ممسوخ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ٹائٹل پر ''مولفہ عبدالسلام'' بجائے ''مترجمہ الخ'' چھپ گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ کمپنی مذکور سے طلب کی جائے۔

رسائل

(ا) ''نیرنگ'' (رام پور) کا خاص نمبر (بابت جنوری و فروری سنہ ۱۹۲۸ء) ریویو کے لیے ہم کو موصول ہوا ہے۔ یہ نمبر ۱۸۰ صفحے پر شائع ہوا ہے۔ اس میں نظم نثر کے ۹۰

مضامین درج ہیں۔ ان کے علاوہ سات تصاویر اور تیرہ عکس تحریرات مشاہیر بھی شامل ہیں۔ غرض یہ نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا ہے۔ مضامین عموماً دلچسپ ہیں اور بعض بہت بلند پایہ۔ مضامین متنوعہ کا یہ دل فریب مجموعہ یقیناً بہت محنت سے مرتب ہوا ہے اور جناب مدیر اس کے لیے مستحق مبارک باد ہیں۔

(۲) "رہنمائے تعلیم": یہ ماہوار تعلیمی رسالہ زیر ادارت جناب چھجی چند ودیارتھی بی۔اے، بی۔ٹی، چار دیگر اصحاب کی اعانت سے شائع ہوتا ہے۔ جنوری سنہ ۱۹۲۸ء کا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ اس نمبر میں ۳۸ تعلیمی مضامین ۱۱۴ صفحوں پر دیئے ہیں۔ پھر مختلف نوٹ اور کارروائیاں ۱۶ اور ریویو ۴ صفحوں پر۔ آخر میں "گلدستہ اطفال" کے نام سے ۲۴ صفحے کا رسالہ بچوں کے لیے شامل ہوا ہے۔ ہم نے بعض مضامین کو پڑھا۔ ہماری رائے میں یہ رسالہ معلمین اور دیگر اصحاب ذوق کے لیے بہت مفید ہے۔ مضامین تجربہ کار اور لائق اساتذہ کے قلم سے نکلے ہیں اور اس لحاظ سے تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینے والے اصحاب کو اس رسالے کی قدر کرنی چاہیے۔ سالانہ چندہ چار روپے منیجر رسالہ "رہنمائے تعلیم" رام گلی۔ لاہور سے طلب کیا جائے۔

تبصرہ و تنقید

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت فروری سنہ ۱۹۲۹ء)

اس شمارے میں تبصرہ نگاروں کے اسماء کی جگہ "اڈیٹر و دیگر صاحبان" درج ہے۔ چنانچہ پہلا تبصرہ "فہرست کتب عربیہ' کتب خانہ ریاست رام پور" پر ہے جو مولوی محمد شفیع کی کاوش طبع کا نتیجہ ہے۔ موصوف ہی میگزین کے اڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ باقی ماندہ تبصرے شیرانی صاحب کے معلوم ہوتے ہیں۔ (مرتب)

(۲) "اربابِ نثرِ اردو"

عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد) کے قیام سے جن مفید علمی نتائج کی توقع کی جاتی تھی' ہمیں مسرت ہے کہ وہ بہترین شکل میں بروئے کار آرہے ہیں بالخصوص اردو علم و ادب کے سلسلے میں یہ یونیورسٹی اب تک جو شاندار اور سنہری خدمات انجام دے چکی ہے وہ نہایت امید افزا اور حیرت انگیز ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ میں جس خالص علمی ذوق کی پرورش ہو رہی ہے اور اس کے جو خوش گوار اثرات ظاہر ہو رہے ہیں وہ اس یونیورسٹی کو تمام دوسری ہندوستانی یونیورسٹیوں سے ممیز کرتے ہیں چنانچہ اکثر ایسی تالیفات جنہوں نے اردو ادب میں معقول اضافہ کیا ہے' ملک کی اسی تنہا اردو یونیورسٹی کے طلبہ کی کاوش دماغی اور ذوق علمی کا نتیجہ ہیں۔ اسی سلسلے میں سید محمد صاحب قادری متعلم ایم ۔ اے' کلیہ جامعہ عثمانیہ نے "ارباب نثر اردو" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جو فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے اردو نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے۔

کتاب کے شروع میں "پیش نامہ" کے عنوان سے ڈاکٹر سید عبداللطیف بی ۔ اے' پی ایچ ۔ ڈی' پروفیسر ادبیات انگریزی (کلیہ عثمانیہ) نے ایک مختصر تقریب لکھی ہے۔

اس کے بعد مولف کا دیباچہ ہے جس میں فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی اردو نثر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے تذکرے سے اصلی کتاب شروع ہوتی ہے اور کالج کے بانیوں اور مولفین کے حالات بہت محنت و کاوش سے جمع کرکے پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب کے اخیر میں "ایک نظر بازگشت" کے عنوان سے بحیثیت مجموعی کالج مذکور کی "اردو نوازی اور اردو نثر نویسی کی اساسی تحریک کا سرسری" طور پر ذکر کیا گیا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں۔ مولفین کالج کی تالیفات کی فہرست اور اشاریہ (انڈکس) پر کتاب ختم ہوتی ہے۔

ہمیں جہاں تک معلوم ہے اردو نثر کے سلسلے میں یہ پہلی تالیف ہے جو اس درجہ تکمیل و عمدگی کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ ہم اس کی تایف پر مولف کو مبارک باد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اردو ادب کے سلسلے میں خدا ان کو مزید علمی کوششوں کی توفیق دے اور کامیاب کرے۔

کتاب مجلد ہے اور کتابت و طباعت کے اعتبار سے بھی خوب ہے۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ' امداد باہمی' اسٹیشن روڈ۔ حیدر آباد (دکن)

---

(۳) "انشائے جدید"

(مولفہ مولوی محمد علی خاں صاحب اثر رام پوری)

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ جدید فارسی میں انشا یعنی فن خطوط نویسی کی تعلیم کے لیے لکھا گیا ہے' جس میں ہر قسم کے سرکاری' پرائیویٹ' تجارتی اور عدالتی خطوط نیز عرضیاں' پروانے' قبض الوصول وغیرہ کے لکھنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ جدید فارسی سیکھنے والوں کے لیے یہ رسالہ مفید ہوسکتا ہے۔ ملنے کا پتہ: محمد علی خاں اثر' خسرو باغ ،،، ' رام پور۔ یا منیجر مسلم یونیورسٹی بک ڈپو' علی گڑھ۔

---

(۴) "مرقعِ انشاء" (حصہ اول)

(مؤلفہ سید محسن ترمذی)

مدارس ثانوی کے بچوں کے لیے اردو مضمون نویسی کی تعلیم کے لیے یہ رسالہ لکھا گیا ہے۔ چند مضامین بطور نمونے کے درج کئے گئے ہیں۔ بظاہر مفید معلوم ہوتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: منیجر ایجوکیشنل گزٹ، ریلوے روڈ، جالندھر شہر (پنجاب)

---

(۵) "ظل السلطان"

ایک زنانہ ماہوار رسالہ زیر ادارت محمود الحسن صاحب صدیقی و محترمہ قمر النسا بیگم و محترمہ تہذیب فاطمہ عباسی، بھوپال سے شائع ہوتا ہے۔ نمونے کا جو پرچہ ہمارے پیش نظر ہے وہ بابت ماہ جولائی و اگست ۱۹۲۸ء (نمبر ۷ و ۸، جلد ۱۲) ہے جس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرچے میں کوئی امتیازی خصوصیات ملحوظ نہیں ہیں۔ مضامین معمولی ہیں اور ان کا روئے سخن (جیسا کہ ظاہر ہے) عورتوں کی طرف ہے۔ لکھائی چھپائی درمیانی درجے کی ہے۔ با ایں ہمہ اس قسم کی زنانہ ادبی کوششیں ضرور قابل تحسین ہیں۔ سالانہ چندہ تین روپے۔

تبصرہ و تنقید

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت مئی سنہ ۱۹۲۹ء)

"سروش"

ایک ماہوار رسالہ زیر ادارت جناب محمد عنایت خاں صاحب حیرت' لاہور سے نکلا ہے۔ مضمونوں اور نظموں کی وہی نوعیت ہے جو عموماً" ہمارے اردو کے ادبی رسالوں میں ہوا کرتی ہے' کوئی خاص امتیازی خصوصیت نہیں۔ لکھائی چھپائی معمولی' حجم ۶۴ صفحے' سالانہ چندہ تین روپے۔ ملنے کا پتہ : مینجر رسالہ "سروش" ۔ کسان بلڈنگ' بیرون اکبری دروازہ' لاہور۔

تبصرہ و تنقید

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت اگست سنہ ۱۹۲۹ء)

اس شمارے کی فہرست میں تبصرہ نگار کی جگہ ''ایڈیٹر و دیگر صاحبان'' درج ہے لیکن اندر تبصروں کے ساتھ کوئی نام نہیں دیا گیا۔ بہرحال یہ دونوں تبصرے شیرانی صاحب کے تحریر کردہ ہیں (مرتب)۔

(۱) رسالہ تاریخ

حکیم سید شمس اللہ قادری ان باکمال بزرگوں میں سے ہیں جن کو اسلامی تاریخ و آثار قدیمہ سے قدرتی شغف ہے۔ آپ کی علمی خدمات اور تصنیفات اس کے شاہد عادل ہیں۔ اب تک ہم آپ سے بحیثیت مورخ ادبیات فارسی و اردو واقف تھے مگر اب ہم ان سے بحیثیت مدیر رسالہ ''تاریخ'' معرف ہوتے ہیں۔ رسالہ ''تاریخ'' ایک سہ ماہی رسالہ ہے اور مقصد کے لحاظ سے اسم بامسمیٰ یعنی اس میں تاریخ و آثار قدیمہ کے متعلق مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ یہ پرچہ جنوری ۱۹۲۹ء سے جاری ہوا ہے۔ پہلا نمبر بابت جنوری ہمارے پیش نظر ہے اس کے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) مملکت آصفیہ سنہ ۱۱۶۰ - ۱۱۴۷ھ میں — از ایڈیٹر
(۲) کتب خانہ اسکندریہ — مترجمہ مولوی سید معین الدین ایم۔ اے
(۳) سید معصوم نامی — از ایڈیٹر
(۴) سلاطین بہمنیہ — ماخوذ از ہفت اقلیم
(۵) قنوج — مترجمہ سید ضامن کنتوری
(۶) تبصرے

ترجموں کے سوا باقی تمام حصہ غالباً'' حضرت مدیر کے اپنے زور قلم کا نتیجہ ہے اور ہمیں تعجب ہے کہ اہل حیدر آباد ایسے مفید اور ضروری رسالے کی قلمی اعانت سے

غافل نظر آتے ہیں۔

ہمیں رسالے میں سید معصوم نامی پر ایڈیٹر صاحب کا مضمون پسند آیا۔ حکیم صاحب نے اس کو اپنے انداز خاص میں لکھا ہے۔ ہم ان کی اطلاع کے لیے اس قدر عرض کرتے ہیں کہ ابھی اور ایسے مقامات باقی ہیں جہاں معصوم کے کتبات موجود ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ملک کے علمی حلقوں میں حکیم صاحب کے اس اہم رسالے کی کماحقہ قدر کی جائے گی اور رسالے کو حسب دل خواہ کامیابی نصیب ہوگی کیونکہ جہاں تک ہمیں علم ہے مخصوص طور پر تاریخ اور آثار قدیمہ پر یہ پہلا رسالہ ہے جو اردو زبان میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ رسالے کا حجم کم از کم سو صفحات ہوا کرے گا۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ : منیجر رسالہ "تاریخ" ۔ کوٹلہ اکبر جاہ' حیدر آباد (دکن)۔

---

(۲)

(پروفیسر محفوظ الحق کا ایک مضمون)

اکتوبر' دسمبر ۱۹۲۷ء کے سہ ماہی رسالہ "مسلم ریویو" کلکتہ میں' جو بزبان انگریزی شائع ہوتا ہے' پروفیسر محفوظ الحق صاحب ایم ۔ اے (پرشین) پروفیسر پریذیڈنسی کالج' کلکتہ نے جناب اجیت گھوش' بیرسٹر کلکتہ کے ذخیرہ نوادرات اسلامی مخطوطات و تصاویر و قطعات پر ایک عالمانہ مضمون لکھا ہے جو خطاط اور خطاطین کے متعلق ہماری اطلاعات میں اضافہ کرتا ہے۔ پروفیسر صاحب نے مضمون کے ساتھ حواشی اضافہ کرکے اس کو اور بھی کار آمد اور مستند بنادیا ہے۔ خصوصاً" ان مغربی تصانیف کے حوالوں سے جن میں خطاطوں کی وصلیاں وغیرہ پہلے چھپ چکی ہیں۔ اگر وہ مضمون کے آخر میں ان مآخذ اور خطاطوں کی فہرست بھی دے دیتے تو بہت مناسب ہوتا۔ ہم پروفیسر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مسٹر گھوش کے نوادرات پر ایک مفصل بیان شائع کریں یا

اقساط اس پر لکھتے رہیں کیونکہ یہ ایک علمی خدمت ہوگی۔

مولانا سلطان علی مشہدی کی وصلی بہ خیال پروفیسر صاحب مولانا عبدالرحمن جامی کے لیے لکھی گئی ہے لیکن "مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی" سے مراد از تصنیف مولانا عبدالرحمن جامی ہے اور ابیات مذکورہ دیوان جامی میں موجود بھی ہیں۔

مضمون کے ساتھ خطاطی کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں جو بلاک میں تیار ہوئے ہیں ان میں ایک بلاک رنگین ہے۔

غرض یہ مضمون قابل قدر ہے اور ارباب ذوق کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تنقید و تبصرہ

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت مئی سنہ ۱۹۳۰ء)

اس شمارے میں شیرانی صاحب نے چار مطبوعات پر تبصرہ کیا ہے۔ ان میں پہلا تبصرہ ڈاکٹر زور کی تالیف ''اردو شہ پارے'' پر تھا جو میگزین کے ۲۳ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' کی پہلی جلد میں شامل کر لیا گیا تھا۔ باقی نمبر ۲ تا نمبر ۴ یعنی تین مختصر تبصرے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ نمبر ۴ کے بعد اسی پرچے میں بغیر نمبر دیئے دو اور تبصرے بھی نظر آتے ہیں لیکن وہ غالباً'' ایڈیٹر یعنی مولوی محمد شفیع صاحب کے تحریر کردہ ہیں (مرتب)۔

(۲) ''کردار افسانہ''

(از جناب عبدالقادر سروری ایم - اے' ایل - ایل - بی) یہ کتاب ''دنیائے افسانہ'' کا دوسرا حصہ ہے جس میں افسانے کے کردار پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں اشخاص قصہ یا افراد قصہ کا بیان ہے۔ دوسرے میں کردار نگاری پر نظر ڈالی گئی ہے۔ تیسرے میں مشہور افسانوں کے کردار مثلاً سحر البیان کی نجم النساء' انیس کے مراثی میں عون و محمد اور ڈاکٹر نذیر احمد کے قصوں میں سے اکثر کرداروں اور آخر میں عمرو عیار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اردو ادب میں افسانے کا موضوع بالکل نیا اور جدید ہے اور سروری صاحب مستحق تحسین ہیں جنھوں نے اس نئے میدان کی طرف توجہ کی اور تحقیق و تنقید افسانہ پر نہایت کاوش و انہماک سے کام کر رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ جس سنجیدگی کے ساتھ علمی عنوانات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں دوسری یونیورسٹیوں کے لیے باعث رشک ہے اور بلاشبہ جامعہ عثمانیہ سے ملک کو اور خصوصاً'' جہان اردو کو جو

امیدیں تھیں وہ کامیاب ہو رہی ہیں۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس موضوع پر سروری صاحب کے قلم سے بعض اور کتابیں بھی نکلنے والی ہیں۔ امید ہے کہ افسانے کا ذوق رکھنے والے لوگ ان کی حوصلہ افزائی کریں گے۔

کتاب کی کتابت و طباعت بہت اچھی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ : مکتبہ ابراہیمیہ' اسٹیشن روڈ' حیدر آباد (دکن)۔

---

(۳) "قاعدۂ فارسی"

(برائے افادۂ طلبہ طبقہ تحتانیہ) بسلسلہ انتشارات درسیہ 'مکتبہ ابراہیمیہ' حیدر آباد (دکن)۔

یہ قاعدہ جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین' مدرس فارسی و سلطانیہ دارالشفاء سرکار عالی کی تالیف ہے۔ متین صاحب نے اس کو "طریق راست" (ڈائرکٹ میتھڈ) کے اصول پر لکھا ہے۔ ہر درس میں الفاظ کی تشریح کے لیے تصاویر سے کام لیا ہے اور فارسی جدید کے محاورے پر زیادہ نظر رکھی ہے۔ کتاب میں کل اکیس درس ہیں اور آخر میں نو مشقیں دی ہیں جو دو دو تین تین سبقوں سے متعلق ہیں۔ موجودہ ایرانی رسم الخط کا تتبع کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں استعمال شدہ الفاظ کی ایک فرہنگ دے دی گئی ہے۔ جو لوگ طریق راست کی خوبیوں کے دل دادہ ہیں ہم ان سے اس کتاب کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے اور قیمت چھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ : مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود)' اسٹیشن روڈ' حیدر آباد (دکن)۔

اس سلسلے کے دوسرے حصے زیر طبع ہیں اور عن قریب شائع ہو جائیں گے۔

---

(۴) ”چار یار“

(از مطبوعات مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

بچوں کے لیے سلسلہ تاریخ اسلامی کی دوسری کتاب مرتبہ احمد الیاس مجیبی، طبع اول : جولائی ۱۹۲۹ء، صفحات ۱۶۰۔ ایک نقشہ بھی اسلامی دنیا کا دیا ہے۔ قیمت درج نہیں۔

جناب احمد الیاس مجیبی نے اس کتاب میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے وہ سبق آموز حالات جمع کر دیئے ہیں جن سے مسلمان بچوں میں صحیح اسلامی روح پیدا ہو۔ کتاب کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے مولف نے لطیف پیرائے میں خلافت راشدہ کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔

اس کتاب میں قابلیت اور عمر کے مدارج کا بھی کافی خیال رکھا گیا ہے۔ چھپائی بہت صاف اور دل کش تاہم بعض جگہ طباعت کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے : ”تو اس بات سے ان کو بڑا ڈھارس بندھا“ ڈھارس کو مذکر لکھا ہے حالانکہ ڈھارس مونث ہے (فرہنگ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۳۲۷ و رسالہ تذکیر و تانیث مشہور بہ مفید الشعراء صفحہ ۳۶)۔ اسی طرح صفحہ ۶۳ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام ختمہ لکھا ہے حالانکہ ان کا نام حنتمہ ہے (اصابہ، جلد دوم، صفحہ ۱۲۳۲ و طبقات ابن سعد، جلد سوم، جزو اول، صفحہ ۱۹۰)۔

مولف نے احتیاط سے کام لیا ہے تاہم صفحہ ۱۱۹ پر حضرت عثمان کی خلافت کی کل مدت دس سال لکھی گئی ہے حالانکہ سنہ ۲۳ ہجری سے ۳۵ ہجری تک بارہ سال بنتے ہیں۔

تنقید و تبصرہ

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت اگست سنہ ۱۹۳۰ء)

شمارہ ہذا کی فہرست میں تنقید و تبصرہ کے سامنے ''ادارۂ تنقید'' درج ہے تاہم یہ چند مختصر تبصرے شیرانی صاحب کے بندھے ٹکے انداز میں ہیں (مرتب)۔

''تاریخ الامت'' (حصہ ہفتم)

اس کے مصنف مولانا محمد اسلم خاں جے راج پوری، مشہور اسلامی مورخ ہیں۔ زبان اردو آپ کی بہت سی اعلیٰ تصانیف کی مرہون منت ہے۔ تاریخ الامت کے اس حصے میں سلاطین عثمانیہ کے ابتدا سے لے کر آج تک کے حالات لکھے گئے ہیں اور آخیر میں ''تاریخ عثمانیہ پر ایک نظر'' کے عنوان سے ترکوں کی مختصر تاریخ کا خاکہ دیا گیا ہے اور ان کی عادات و خصائل پر نہایت مبصرانہ بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ ''یہ کتاب تعلیمی ہے علمی نہیں اس لیے مصنف نے تمام واقعات کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے اور تفصیلات کو نظرانداز کردیا ہے''۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب جامع ہے اور جناب مصنف اپنے مقصد میں بہ وجہ احسن کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتاب اسلامی تواریخ کے طلبہ کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ زبان نہایت صاف اور شستہ ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، قرول باغ، دہلی۔

''ہمارے رسول''

مصنفہ خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی، اسی صفحوں کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اور رسول اللہ صلعم کی سوانح حیات اور ان کی سیرت پر

مشتمل ہے۔ واقعات آسان اور سلیس عبارت میں لکھے گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت فقرے کتاب کی زینت ہیں۔ عبارت میں کہیں کہیں گنجلک پیدا ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں مصنف نے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ بہرحال یہ کتاب دس گیارہ سال کے بچوں کے لیے مفید اور اخلاق آموز ہو سکتی ہے۔ قیمت چھ آنے' کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ' دہلی سے مل سکتی ہے۔

"سکھ سیلا"

مصنفہ شاہ برہان الدین جانم' مرتبہ سید محمد حفیظ صاحب بی ۔ اے' ال ۔ ٹی لیکچرر الہ آباد یونیورسٹی۔

اس رسالے میں اردو زبان کی ایک قدیم نظم "سکھ سیلا" کو معہ اس کے انگریزی ترجمے کے شائع کیا گیا ہے۔ شروع میں سید صاحب نے مصنف کے حالات اور اس کی تالیفات سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد اصل نظم اور پھر اس کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔ متن تین مختلف قلمی نسخوں سے تیار ہوا ہے۔ جن حضرات کو اردو ادب کے قدیم آثار سے دلچسپی ہے ان کے لیے اس رسالے کا مطالعہ ضروری ہے۔ رسالہ انڈین پریس' الہ آباد سے الہ آباد یونیورسٹی کے سلسلہ تالیفات ادبی کے ماتحت شائع ہوا ہے۔

"بانگ درا"

اس نام کا امرتسر سے ایک ماہانہ رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ سالک صہبائی صاحب ایڈیٹر ہیں۔ رسالہ اردو کے عام ادبی رسالوں کے لب و لہجے کا حامل اور ہر قسم کے رطب و یابس سے لبریز ہے۔ سالانہ چندہ دو روپے آٹھ آنے' فی پرچہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ: منیجر "بانگ درا" امرتسر۔

تبصرہ

"حیات فریاد"

(از "خیالستان" لاہور بابت جنوری سنہ ۱۹۳۱ء)

خان بہادر مولانا شاد عظیم آبادی مرحوم ہندوستان کے مشہور اور بلند پایہ شعرا میں سے تھے۔ زیر نظر کتاب میں آپ نے اپنے استاد سید الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ فریاد مرحوم ایک جامع کمالات بزرگ تھے اور ان کی سوانح عمری بغایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ کتاب کے پیش لفظ نگار نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

"کہنے کو تو مرحوم شاد نے یہ صرف ایک باکمال یعنی اپنے استاد حضرت فریاد عظیم آبادی کی سوانح عمری لکھی ہے مگر درحقیقت یہ اس عہد کی علمی و تمدنی تاریخ ہے۔ آزاد نے جس طرح آب حیات میں اردو کے پہلے (دہلی) اور دوسرے مرکز (لکھنو) کے باکمالوں کی تصویر اتاری ہے، شاد نے حیات فریاد میں اردو کے تیسرے مرکز (عظیم آباد) کے باکمالوں کی مرقع کشی کی ہے۔۔۔۔۔۔۔"

عرض حال کے تحت میں مولانا شاد مرحوم کے فرزند مولوی سید حسین خاں نے لکھا ہے کہ:

"یہ تالیف والد مرحوم نے انتقال کے کچھ دنوں پیشتر ختم کی اور ایسے وقت میں شروع کی تھی جب کہ بہ وجہ کبر سنی بہت مضحل ہوگئے تھے۔"

گویا یہ مرحوم کی آخری تصنیف ہے اور باوجود نظرثانی نہ ہونے کے مولانا شاد کی دلآویز نثر نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔

کتاب کے مطالب کی فہرست کا اگر ناشرین اضافہ کردیتے تو اچھا تھا۔ کتابت و طباعت اعلیٰ درجے کی ہے۔ ضخامت ۳۵۷ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ کتاب غالباً" سید ہمایوں میرزا، بیرسٹر ایٹ لاء، دفتر رسالہ "النساء" حیدر آباد (دکن) سے مل سکتی ہے۔

تبصرہ و تنقید

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت فروری سنہ ۱۹۳۱ء)

فہرست میں تبصرہ نگار کے نام کی جگہ ''ادارہ'' درج ہے لیکن تبصرے
شیرانی صاحب کے ہیں (مرتب)۔

''نورس'' (عبدالحق نمبر)

رسالہ نورس (جلد ۴ نمبر۱) اورنگ آباد انٹر کالج کا عبدالحق نمبر (آذر و دے سنہ ۱۳۴۰ ف) بہ غرض ریویو وصول ہوا۔ اس نمبر کے مضامین تمام تر مولوی عبدالحق صاحب، بی۔ اے۔ علیگ، پرنسپل، انٹر کالج، اورنگ آباد کے الوداعی جلسے، ان کے مقاصد زندگی اور حالت انتظامی سے متعلق ہیں اور موصوف کے حالات کے متعلق مفید، دلچسپ اور کارآمد اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔

ایک نظم جناب مولوی عبدالحق صاحب موصوف کی تشریف آوری جامعہ عثمانیہ کے موقع پر تہنیت میں مصنفہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی ہے جس میں پانچ بند بطور ترجیع بند ہیں۔ وزن اس نظم کا ''مفعول مفاعلن فعولن'' بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف ہے اور پہلا شعر یہ ہے:

مژدہ اہل عزت و زوایا ہنگامہ فروز بزم آیا

پہلے مصرع کا وزن مفعول مفاعلن فعولن ہے حالانکہ جب اس بحر میں زحاف تسکین اوسط سے کام لیا جاتا ہے تو وزن مفعولن فاعلن فعولن ہوجاتا ہے جیسا کہ ترجیع کا ہلا مصرع ہے۔ یہی خرابی پانچویں بند کے ان دو مصرعوں:

(۱) بے دردوں کو درد مند کردے اور

(۲) گاہک بن کے چند چند کردے

میں بھی ہے مگر دوسرے مصرع میں بظاہر کمپوزر کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ بجائے ''دوچند'' کے اس نے چند چند کمپوز کردیا ہے۔ معنے بھی ''دوچند'' ہی سے بنتے ہیں۔

پہلے بند میں ایک شعر ہے:

یا طائر دیر و دور رفتہ پھر شاخ پہ گر کے چہچہانا

"گرے" کی جگہ پر "آ کے" مناسب معلوم ہوتا ہے: "پھر شاخ پر آ کے چہچہانا"

دوسرے بند کے یہ اشعار ہیں:

اے پردہ در حجاب معنیٰ اے فاش نگار سر و اخفیٰ

اے جلوہ نمائے حسن پنہاں اے چشم کشائے ذوق خفتہ

تیرے سر آگہی کے آگے شایاں کہ جھکے کلاہ فضلا

(۱) "سر و اخفیٰ" کے درمیاں "واو" کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(۲) ہائے مختفی کا قافیہ الف کے ساتھ اردو میں جائز ہے (تاہم) ذوق خفتہ بہ ترکیب اضافی فارسی' قافیہ درست نہیں یعنی اس مرکب اضافی کے فارسی ہونے کی وجہ سے الف کے ساتھ اس ہائے مختفی کا قافیہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اہل فارس ہائے مختفی کا قافیہ الف کے ساتھ درست قرار نہیں دیتے۔

(۳) لفظ "فضلا" بہ سکون "ضاد" اس مصرع میں موزوں ہوا ہے جو خلاف صحت ہے' بہ فتح "ضاد" چاہئے۔ پھر کسی کے آگے سر جھکنا تو سنا مگر کلاہ جھکنا' دیکھنے میں نہیں آیا۔

"مثنویات میر"

آنریبل جسٹس سر محمد سلیمان' جج ہائی کورٹ الہ آباد نے میر تقی میر کی ۳۲ مثنویوں کا انتخاب کیا ہے۔ اشعار کی کل تعداد ڈھائی ہزار کے قریب ہے اور شروع میں ۳۶ صفحے کا ایک مقدمہ ہے جس میں میر کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ انتخاب میں جو اصول مدنظر رکھا گیا ہے اس کو تمہید میں یوں بیان کیا ہے:

"اصول انتخاب یہ رکھا گیا ہے کہ صرف ان اشعار کو نقل کیا ہے جو فن شاعری کے نقطہ نظر سے قابل قدر ہیں۔ جو محض بھرتی کے اور پھیکے اشعار تھے انہیں نکال دیا

گیا ہے۔ فحش اشعار بھی ترک کردیئے گئے ہیں۔"

کتاب کی طباعت عمدہ ہوئی ہے۔ ہر صفحے کے نیچے مشکل الفاظ کی تشریح دی گئی ہے۔ مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں، سنہ ۱۹۳۰ء، قیمت: ایک روپیہ آٹھ آنے۔

"سوانح چاند بی بی" (ملکہ احمد نگر)

دکن کی تاریخی شہرت و عظمت رکھنے والی ملکہ چاند بی بی کی سوانح حیات ادارہ حیدر آباد کی مجلس تاریخی کے سلسلے میں چھپی ہے۔ مرتبہ سید احمد اللہ صاحب قادری۔

بائیس مختلف ابواب کے تحت میں چاند بی بی کی سیرت کے مختلف عنوانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں ایک انڈکس (اشاریہ) بھی شامل ہے جس نے کتاب کے حسن میں اضافہ کردیا ہے۔ سید صاحب اپنے ذوق تاریخ کی رعایت سے کچھ نہ کچھ تاریخی سرمایہ وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں۔ کتاب کی کتابت و طباعت قابل داد ہے اور لیڈی سر اکبر حیدری کے نام پر اس کا انتساب کیا گیا ہے جن کے خاندان کی خواتین اپنے علمی و تعلیمی مشاغل کے لیے خاص شہرت رکھتی ہیں۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ: سید احمد اللہ قادری، پوسٹ بکس نمبر ۱۳۶۱، مدراس۔

تنقید و تبصرہ

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت مئی سنہ ۱۹۳۱ء)

"اورینٹل کالج میگزین کے اس شمارے میں شیرانی صاحب نے چار کتب و رسائل پر تبصرہ کیا تھا۔ ان میں پہلا تبصرہ رسالہ ہندوستانی (الہ آباد) کے جنوری ۱۹۳۱ء کے پرچے پر تھا۔ اس کے موضوع اور اہمیت کے پیش نظر اسے مقالات حافظ محمود شیرانی کی پہلی جلد میں بذیل "تنقید و تبصرہ" شامل کرلیا گیا تھا۔ باقی تین تبصرے یہاں درج کئے جارہے ہیں۔

"ہندوستانی فونیٹکس" یعنی ہندوستانی فن تجوید

مصنفہ ڈاکٹر محی الدین قادری، ایم۔اے،
پی ایچ۔ ڈی، پیرس، ۱۹۳۰ء، ۱۶ صفحات

یہ کتاب دکنی اردو کے صحیح تلفظ کے بیان پر شامل ہے، جس کا جنوبی ہند میں رواج ہے۔ موجودہ دور میں تجوید کا مطالعہ ایک نیا فن ہے جس کی بنیاد یورپ میں گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے پڑی ہے۔ سرزمین ہندوستان میں یہ علم بہت قدیم ہے۔ اس کے متعلق دو ہزار سال سے زیادہ کی پرانی تصنیفات موجود ہیں۔ قدمائے ہند کو اس علم کا موجد کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اہل یورپ نے اس فن کے مطالعے میں دیگر علوم اور مشینری سے بھی کام لیا ہے اور دن رات وہاں اس کا مطالعہ ترقی پر ہے۔ پچھلے چند سال میں ہندوستان کی بعض زبانوں کی تجوید پر کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً بنگالی پر پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کی کتاب، پنجابی پر ڈاکٹر گراہم بیلی کی (اور ڈاکٹر بنارسی داس کی جدید تالیف جو عن قریب طبع ہونے والی ہے)، بنگال کی نواکھالی بولی پر پروفیسر ہلدر کی کتاب اور دکنی ہندوستانی پر ڈاکٹر قادری کی زیر تبصرہ کتاب۔

ڈاکٹر قادری کی کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیف میں علمی

ذرائع سے بھی کام لیا ہے اور اپنے نتائج شائع کردیے ہیں مثلاً پلیٹوگرام یعنی وہ تصاویر جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ایک خاص صوت کے تلفظ میں زبان کا کونسا اور کتنا حصہ تالو سے مس ہوتا ہے۔ ان کے تیار کرنے کا خاص طریقہ ہے۔ اسی طرح خاص خاص آوازوں کے تلفظ میں گھومتے ہوئے ڈھول کے چسپاں کاغذ پر جو خم دار لکیریں پیدا ہوتی ہیں ان سے آوازوں کی لمبائی' سروغیرہ اور اور باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ ڈاکٹر قادری نے بعض آوازوں کے لیے ان خم دار خطوط کے نقشے بھی دیئے ہیں۔

فونیٹکس (تجوید) کی اہمیت اور ضرورت میں کسی کو کلام نہیں۔ زبانوں کی علمی اور عملی دونوں قسم کی تعلیم میں اس فن کی مدد اور ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ علاوہ بریں ہندوستانی زبان کا مطالعہ اور رواج نہ صرف ہندوستان تک ہی محدود ہے بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا کتاب کی اہمیت اور ضرورت میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے اور اس کے شروع میں پیرس یونیورسٹی کے سنسکرت زبان کے پروفیسر ڈاکٹر ژول بلاک نے دیباچہ لکھا ہے' جس میں انہوں نے فن تجوید کے فوائد بیان کرکے کتاب ہذا کی اشد ضرورت ظاہر کی ہے اور اس کے لکھنے پر ڈاکٹر قادری کی قابلیت و استعداد کا اعتراف کیا ہے۔

کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں اردو زبان کی پیدائش اور نشوونما کا بیان ہے نیز شمالی اور جنوبی اردو میں جو فرق ہے اس کی تشریح کی ہے۔ مصنف کی رائے میں اردو کا ماخذ وہ پرانی زبان ہے جو گیارہویں بارہویں صدی میں پنجاب نیز دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب اردو دکن میں پہنچی تو اس میں بہت سی پنجابی خصوصیتیں قائم رہ گئیں لیکن شمالی اردو سے یہ خصوصیات دور مابعد میں خارج ہوگئیں۔ (صفحہ ۲۱۔ ۲۲)

صفحہ ۳۰ پر ایسے الفاظ کی فہرست دی ہے جن میں دکنی میں "ت" یا "د" ہے اور شمالی ہندوستانی یا اردو میں "ٹ" یا "ڈ"۔

یہ فہرست زبان کی پرانی تاریخ پر خاص طور پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں سے چند

الفاظ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

دکنی	شمالی اردو	معنی
تاٹ	ٹاٹ	بوریا
توٹنا	ٹوٹنا	
تکڑا	ٹکڑا	
تھٹرنا	ٹھٹھرنا	سردی سے کانپنا
تھڈی	ٹھڈی (ٹھوڑی)	
دیڑ	ڈیڑھ	
دھاٹا	ڈھاٹا	ڈاڑھی پر باندھنے کا کپڑا

کتاب کا یہ حصہ بہت دلچسپ ہے۔ تلفظ کے علاوہ صرف و نحو کا فرق بھی بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں دکنی ہندوستانی کی آواز ہائے علت کا بیان ہے۔ تیسرے حصے میں آواز ہائے صحیح کا بیان ہے اور چوتھے حصے میں آوازوں کے اوصاف کا بیان ہے یعنی آواز کی لمبائی، آواز کا سر اور آواز کی شدت یا جس قدر زور کے ساتھ آواز پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اس وقت ہندوستان میں فن تجوید کا مطالعہ نہایت محدود ہے اس لیے یہ کتاب ایک خاص کمی کو پورا کرتی ہے۔ ہندوستانی زبان سے ہر تعلیم یافتہ شخص واقف ہے اور اس میں ہندوستانی ہی کا تلفظ بیان کیا گیا ہے لہٰذا اس کتاب کے ذریعہ ہر شخص نہ صرف ہندوستانی تلفظ کا مطالعہ بلکہ فن تجوید کے ابتدائی اصولوں کا مطالعہ بھی کر سکتا ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ اس کتاب کو علم دوست اصحاب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ بھی اس سے لطف اٹھائیں۔

"دست کاری"

یہ ماہانہ رسالہ کئی سال سے ڈاکٹر شفیع احمد پی ایچ - ڈی کی ادارت میں دہلی سے

نکلتا ہے۔ اس کا کام نام سے ظاہر ہے یعنی دست کاری کے متعلق مضامین اور مختلف دست کاریوں کی ترکیبیں شائع کرنا وغیرہ۔ ٹائٹل پیج پر درج ہے کہ قلم رو دکن کے لیے محکمہ تعلیمات کا منظور شدہ بھی ہے۔ دست کاری کے متعلق، جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کوئی اور اردو رسالہ موجود نہیں۔ اس صورت میں اس پرچے کی ضرورت و اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ جو لوگ فرصت کے اوقات میں یا بے کاری سے بچنے کے لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنے کے امکانات موجود ہیں۔ سالانہ قیمت پانچ روپے مگر آج کل چند روز کے واسطے تین روپے ہے۔ ملنے کا پتہ: منیجر رسالہ "دست کاری" محلہ بلی ماراں، دہلی۔

"اتالیق"

"کم سن طالب علموں کی علمی ترقی اور اخلاقی نشوونما میں مدد دینا" اس ماہانہ رسالہ کا مقصد ہے۔ مولوی فاضل محمد عبدالرب کوکب کی ادارت میں حیدر آباد سے شائع ہوتا ہے۔ بچوں کے متعلق اکثر سائنٹفک اور تاریخی مضامین و معلومات بھی شائع کرتا ہے مگر انعامی مقابلوں اور لطیفوں کا عنصر غالب ہے۔ قیمت رسالے میں درج نہیں۔ دفتر رسالہ "اتالیق" حیدر آباد (دکن) سے خط و کتابت کرنا چاہیے۔

تبصرہ و تنقید

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت فروری سنہ ۱۹۳۲ء)

اس شمارے میں پانچ کتب و رسائل پر تبصرے کے بعد اردو اکادمی' جامعہ ملیہ دہلی کا مختصر تعارف بھی شامل ہے یہ تمام تبصرے اور تعارف شیرانی صاحب کے مخصوص انداز میں لکھے گئے ہیں اگرچہ ان کے ساتھ یا فہرست میں کسی کا نام نہیں دیا گیا (مرتب)۔

(۱) ''انڈین لنگوسٹکس''

یہ لنگوسٹک سوسائٹی آف انڈیا (انجمن لسانیات ہند) کا رسالہ ہے جس کی پہلی جلد کا پہلا نمبر ابھی شائع ہوا ہے۔ یہ سوسائٹی پرنس آف ویلز کالج جموں کے پروفیسر ڈاکٹر سد میشور ورما کی حسن سعی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں یہ اپنی قسم کی پہلی سوسائٹی ہے اور اس کی ضرورت مدتوں سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس سوسائٹی کا مقصد ہندوستان کی زبانوں کے متعلق تحقیقات کرنا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت چھوٹی بڑی آٹھ سو کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ ان کی گرامر وغیرہ ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔ موجودہ زمانے میں کسی قسم کی علمی تحقیق کے لیے ایک سوسائٹی اور رسالے کا ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس سوسائٹی اور رسالے کا ظہور ہوا۔ اس سوسائٹی کے حامیوں میں سر جارج گریرسن کا نام بھی شامل ہے۔ جن کا مرتبہ ہندوستانی زبانوں کے مسلم فضلا میں سب سے بلند ہے۔ ان کی تصنیف ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا'' ہندی لسانیات کے متعلق نہایت مستند کتاب ہے۔

رسالے کے موجودہ نمبر میں تین مضامین شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر تاراپور والا نے موجودہ ہندوستانی زبانوں کی گرامر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ یا تو پرانی زبانوں سنسکرت

فارسی وغیرہ کے ڈھانچے پر لکھی گئی ہیں یا انگریزی، لاطینی وغیرہ کی طرز پر لیکن اس طریق کو علمی طریق نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی زبان کی گرامر لکھتے وقت اس زبان کی مکمل اور مستقل تحقیق ہونی چاہیے۔ ایک زبان کی گرامر کسی دوسری زبان کی گرامر کی طرز پر نہیں لکھی جاسکتی۔ لہٰذا پروفیسر تارا پور والا نے اس امر کی سفارش کی ہے کہ لنگوسٹک سوسائٹی ہندوستان کی مشہور زبانوں مثلاً ہندی، اردو، بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ کی گرامریں علمی طریق پر تیار کرے۔

دوسرا مضمون ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے قلم سے ہے۔ انہوں نے ہندوستانی زبانوں کی چند مخصوص آوازوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ آوازیں سندھی اور ملتانی زبان میں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے بولتے وقت حلق میں اسی قسم کا عمل ہوتا ہے جو ہمزہ (ء) کے بولتے وقت ہوتا ہے۔

تیسرا مضمون دراوڑی زبانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تینوں مضامین اعلیٰ پائے کے ہیں اور سوسائٹی کے اراکین کے نام دیکھ کر یہ امید ہوسکتی ہے کہ آئندہ بھی ایسے ہی عالمانہ مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔ سوسائٹی اس بات کی امید کرتی ہے کہ جو اصحاب زبانوں کی تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ممبر بن کر یا مضمون بھیج کر سوسائٹی کی حوصلہ افزائی کریں گے۔

---

(۲) ''منتخباتِ ہندی کلام''

مرتبہ ڈاکٹر جعفر حسن، مطبوعہ اعظم سٹیم پریس۔ حیدر آباد، سنہ ۱۹۳۰ء، حجم ۸x۱۸x۲۲، صفحات ۲۲۵، قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے۔

ہندی کی شیرینی اور لطافت نے مرتب کو ہندی ادب کے مطالعے کی طرف راغب کیا ہے اور اردو ادب اور ہندی ادب میں موازنہ کرنے کے شوق نے اور زیادہ مستعدی سے ہندی ادب کی طرف متوجہ کیا۔ موجودہ کتاب مرتب کے اس مطالعے اور

موازنے کا نتیجہ ہے۔

تمہید میں مرتب نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اردو رسم الخط میں چھپی ہوئی ہندی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ تلاش کرنے پر بھی صرف آٹھ سات ہی ایسی کتابیں دستیاب ہو سکیں جن کا مرتب نے مختصر بیان کیا ہے۔ ہندی کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد مسلمانان سلف کی ہندی زبان اور ادب سے دلچسپی کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں اور کئی ایک ہندی شاعروں کے نام گنائے ہیں جو مسلمان بادشاہ اور امیروں کے درباری شاعر تھے۔ اس کے بعد ایک سو ہندی دو ہے، جن میں سے اکثر کبیر، تلسی داس، سورداس، بہاری لال، برند وغیرہ کی تصنیف ہیں، ہندی اور اردو رسم الخط میں دیئے گئے ہیں۔ ان کے مشکل الفاظ کے معانی دے کر اردو ترجمہ مع تشریح دیا گیا ہے۔ انتخاب کے دوہے دلچسپ، سبق آموز اور صنعت سے پر ہیں۔ میری رائے میں اردو خواں اصحاب اس کے مطالعہ سے ہندی ادب کا خاصا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں مرتب کا مشکور ہونا چاہیے۔

اخیر میں مرتب کو دو باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اگر اگلے ایڈیشن میں ان کا خیال رکھا جائے تو کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا۔

(۱) چونکہ اس کتاب میں صرف دو چار شعروں کو چھوڑ کر باقی سب مثالیں دوہوں کی ہیں اور کتاب کا نام "منتخبات ہندی کلام" ہے۔ اس سے ناظرین کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ہندی کلام میں اکثر دوہے ہی ہیں اور دوسرے بحر تقریباً منفی کے برابر ہیں۔ اس مغالطے کو دور کرنے کے لیے یا تو انتخاب میں دوسری بحریں مثلاً کبت، سویا، چھپے وغیرہ بھی شامل کر لیے جائیں یا اس کتاب کا نام: "منتخبات ہندی دوہا جات" ہونا چاہیے۔

(۲) ہندی رسم الخط میں اکثر غلطیاں رہ گئی ہیں۔ بہتر ہوتا کہ اسے ہندی ٹائپ میں کمپوز کرایا جاتا۔ اردو رسم الخط میں اعراب کا استعمال مکمل اور صحیح ہونا چاہیے تھا۔

---

(۳) ”گلشن گفتار“

مرتبہ سید محمد ایم ۔ اے، قیمت : ۱۲ آنے، ملنے کا پتہ : مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، دکن۔

یہ شعرائے اردو کے قدیم ترین تذکروں میں سے ہے اور خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کی تصنیف ہے۔ سنہ ۱۱۶۵ھ میں یعنی جس سال نکات الشعراء میر تقی و تذکرۂ فتح علی گردیزی لکھے جاتے ہیں گلشن گفتار بھی وجود میں آتا ہے۔ اردو کے تمام قدیم تذکرے فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے چنانچہ یہ تذکرہ بھی اسی زبان میں ہے۔

اصل متن غالباً پچاس صفحات سے زیادہ نہ ہوگا اور اس میں صرف ۳۲ شعرا کا تذکرہ درج ہے۔ جہاں تک قدیم شعرائے دکن کا تعلق ہے یہ تذکرہ بعض مفید اور خاص اطلاعات کی بنا پر اصل ماخذ کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ ان ۳۲ شعرا میں سترہ اٹھارہ خاص دکن کے شاعر ہیں اور چونکہ مصنف خود دکن کا باشندہ ہے اور اپنے معاصرین سے ذاتی واقفیت رکھتا ہے اس لیے اس کے بیانات دوسرے تذکروں کے مقابلے میں زیادہ مستند اور معتبر مانے جاسکتے ہیں۔ علاوہ بریں اس تالیف میں ایسے شاعر بھی درج ہیں جن کا نام تک دیگر تذکروں میں نہیں ملتا۔ جناب مرتب نے دیباچہ، علیحیات و اشاریہ (انڈکس) کے علاوہ ایک مفید کام یہ کیا ہے کہ بعض قدیم شعرا کے حالات نکات الشعرا، تذکرہ فتح علی گردیزی، مخزن نکات، چمنستان شعرا، گلزار ابراہیمی اور تحفۃ الشعرا سے بغرض مقابلہ حاشیے میں درج کردیئے ہیں تاکہ پڑھنے والے کو سہولت رہے۔

سید محمد صاحب کا یہ دوسرا علمی کارنامہ ہے۔ اس سے پیش تر وہ اپنی مفید اور مشہور تصنیف ”نثر نگاران اردو“ علمی دنیا کے سامنے پیش کرچکے ہیں۔

---

(۴) "محمود گاواں"

مولفہ محمد ظہیر الدین صاحب متعلم بی۔ اے' سینیئر' کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ قیمت آٹھ آنے' ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ' اسٹیشن روڈ' حیدر آباد (دکن)۔

خواجہ محمود گاواں کا نام ان مسلمان مدبرین اور وزرا کی فہرست میں شامل ہے جو اپنے حیرت انگیز دماغی اور ذاتی اوصاف کی بدولت مشرق کی تاریخ میں نمایاں عظمت نشین پر فائز ہیں۔ علی الخصوص اس عہد کے ہندوستان میں تنہا ان کی ہستی ہے جو اپنے تدبر اور قابلیت کے لحاظ سے مورخ کی نگاہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

زیر نظر رسالے میں مولف نے دکن کی اس شہرہ آفاق اور تاریخی شخصیت کے حالات و سوانح پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور یقیناً تاریخی مآخذ کی تشنگی اور اختصار پسندی کے باوجود ان کو ایک ممکن کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ خواجہ کے ممتاز اوصاف' سیاسی کارناموں' فوجی خدمتوں' علمی و دماغی قابلیت اور ذاتی خوبیوں کو خوش اسلوبی سے ایک جگہ جمع کردیا ہے۔

یہ رسالہ چھوٹے سائز کے ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے۔ اس کے بعد مضمون کے مآخذ کی فہرست درج ہے جس میں خود خواجہ محمود گاواں کی ایک سے زیادہ مولفات کے نام دلچسپی سے دیکھے جاتے ہیں۔ خواجہ کی قبر اور مدرسے کی تصویروں نے رسالے کی دلچسپی کو چار چاند لگادیے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مولف کی یہ پہلی قلمی کوشش' ملک کے علمی حلقوں میں مقبول ثابت ہوگی۔

---

(۵) باغبانی پراجیکٹ اور بچوں کی چند کہانیاں

یہ کتاب محمد عبدالغفار صاحب مدہولی' نگران تعلیمی مرکز نمبرا' جامعہ (دہلی) کی تالیف اور سلسلہ اشاعت تعلیم' تعلیمی مرکز نمبرا' جامعہ (دہلی) کی ایک کڑی ہے۔ اس

میں مولف نے باغبانی کی تعلیم کے سلسلے میں، طلبہ کے عملی تجربات اور اپنی نگرانی سے ضروری معاملات و مواقع کا مفصل تذکرہ کرنے کے بعد طلبہ کے نفسیات اور باغبانی سے متعلق ضروری معلومات کا اظہار کیا ہے۔ مولف مذکور جامعہ کے تعلیمی مرکز نمبر ا کے نگراں ہیں۔ جماعت ابتدائی سوم آپ کے سپرد ہے۔ چنانچہ آپ نے اس کتاب میں اپنی ہی جماعت کے چند بچوں کی کہانیاں درج کی ہیں۔ علاوہ بریں طلبہ کے مختصر حالات اور ان کی ذہنی و تعلیمی کیفیات بھی مع ان کی تصاویر کے شائع کی گئی ہیں۔

ایک علیحدہ باب کے ماتحت طلبہ کے امتحانات اور سوالات کی تفصیل دی گئی ہے۔ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھوتی اور معلومات کے لحاظ سے مفید ہے۔ قیمت آٹھ آنے، ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرول باغ، دہلی۔

اردو اکادمی (جامعہ ملّیہ) دہلی

ملک کی مشہور درس گاہ "جامعہ ملیہ" کے باہمت کارکنوں نے علوم و فنون کی صحیح اور ٹھوس خدمت کے سلسلے میں جو مفید اور قابل داد کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں شاید سب سے زیادہ قابل ذکر اور قابل قدر کارنامہ "اردو اکادمی" کا قیام ہے جو اب تک متعدد مفید اور اہم کتابیں شائع کرچکی ہے۔

اکادمی، اب تک اپنے علمی شغف میں بقدر ظرف و حیثیت حصہ لے رہی تھی اور اس نے بڑے پیمانے پر اپنا کام شروع نہیں کیا تھا۔ اب ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس کے کام میں خاطر خواہ ترقی ہو رہی ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ اپنی خدمات کے حلقے کو زیادہ وسیع کردے۔

ہم اپنے ناظرین کو پرزور الفاظ میں اکادمی کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ حسب امکان و استطاعت اکادمی کی علمی خدمات کی عملی قدر کریں اور اس کی ترقی و ہمدردی میں امکانی حصہ لینے سے دریغ نہ فرمائیں۔ مزید تفصیل کے لیے ذیل کے قواعد کا مطالعہ کافی ہوگا۔

مختصر قواعد:

(۱) جامعہ ملیہ کا شعبہ تصنیف و تالیف "اردو اکادمی" کہلاتا ہے۔
(۲) اردو اکادمی کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر مستند کتابیں لکھوا کے یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کرا کے شائع کرے۔
(۳) اکادمی' ہندوستان کی ان علمی انجمنوں اور ناشروں کے ساتھ اتحاد عمل رکھتی ہے جو اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں اور ان کی قابل قدر کتابوں کی اشاعت میں حسب مقدور مدد کرتی ہے۔
(۴) اکادمی کی طرف سے ایک علمی رسالہ "جامعہ" اور ایک تعلیمی رسالہ "پیام تعلیم" شائع ہوتا ہے۔
(۵) اکادمی کے رکن وہ حضرات ہوسکتے ہیں جو چوبیس روپے سال پیشگی ادا کریں یا اگر کسی وجہ سے یک مشت ۲۴ روپے ادا کرنا ممکن نہ ہو تو ارکان کی سہولت کے لیے یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ یہ رقم کم از کم چھ چھ روپیوں کی چار قسطوں میں ہر سہ ماہی کے شروع میں ادا کردی جائے۔
(۶) ارکان کی خدمت میں ہر سال چوبیس روپے کی کتابیں پیش کی جائیں گی اور "جامعہ" اور "پیام تعلیم" جن کا مجموعی چندہ ساڑھے سات روپے سالانہ ہے' بلا قیمت نذر کیے جائیں گے۔
(۷) ارکان کو سال کے شروع میں اکادمی کی مجوزہ مطبوعات کی فہرست بھیج دی جایا کرے گی اور جب کوئی کتاب چھپ کر تیار ہوگی تو فوراً ان کی خدمت میں روانہ کردی جائے گی۔
(۸) اس کے علاوہ ان کتابوں کی فہرست بھی بھیجی جائے گی جو دوسری علمی انجمنوں اور مختلف ناشروں کی طرف سے شائع ہونے والی ہیں اور ارکان سے درخواست کی جائے گی کہ ان میں سے اتنی کتابیں منتخب فرمالیں جو اردو اکادمی کی کتابوں کے ساتھ مل کر چوبیس روپے سے زیادہ کی نہ ہوں۔ یہ کتابیں بھی جس وقت وصول ہوں گی' فوراً ارکان کی خدمت میں روانہ کی جائیں گی۔

جو صاحب ان شرائط پر اکادمی کے رکن بننا پسند فرمائیں وہ ناظم اکادمی کو اپنے نام اور پورے پتے سے مطلع فرمائیں۔

تنقید و تبصرہ

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت نومبر سنہ ۱۹۳۳ء)

اس شمارے کی فہرست میں ''تنقید و تبصرہ'' کے سامنے حسب دستور ''ایڈیٹر'' درج ہے لیکن یہ دونوں تبصرے شیرانی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں (مرتب)۔

''جدید اردو شاعری''

مولوی عبدالقادر سروری ایم۔ اے' ایل۔ ایل۔ بی' مددگار پروفیسر اردو' کلیہ جامعہ عثمانیہ و ایڈیٹر مجلہ ''مکتبہ'' کی تازہ اور دلچسپ تالیف ہے جو اردو کی جدید رنگ کی شاعری سے بحث کرتی ہے۔ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شعر کی معنوی نوعیتوں اور اصناف کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصے میں جدید شاعری کی پیدائش اور اس کے زمانے سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ جسے اس تالیف کی جان سمجھنا چاہیے عصر اصلاح' درمیانی زمانہ' عصر حاضر اور شعرائے مستقبل کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ کتاب کا متین اور سنجیدہ انتقادی لب و لہجہ مستحق داد ہے اور مولف کی رائیں بڑی حد تک ان کے گہرے مطالعے اور تنقید کی فنی قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔

جو بات ہم کو نہایت پسندیدہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جناب مصنف نے تنقید کے لیے ایسی زبان استعمال کی ہے جو مغربی اسالیب بیان پر مبنی ہونے کے باوجود اردو میں غیر مانوس معلوم نہیں ہوتی۔ عقبی زمین' عالمی شہرت' مخصوص انفرادیت' غیر شعوری طور وغیرہ ترکیبیں بے تکلف اس خوبصورتی سے کھپائی گئی ہیں کہ پڑھنے والا ان کو اردو زبان کا جزو سمجھتا ہے۔ کم سے کم راقم سطور اردو میں انتقادی مصلحات (ٹکنیک) کی اس فراوانی اور سہولت استعمال کو دیکھ کر اپنے دل کو جذبات مسرت سے لبریز پاتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک ان مصلحات کی فراوانی اور ان کے استعمال کی

سہولت ارتقائے زبان کی ایک اہم منزل کے طے ہونے کی علامت ہے۔

شعرائے حال و مستقبل کے تذکرے میں ہمیں بعض نام ایسے نظر آتے ہیں جنہیں مولف نے غیر ضروری اہمیت دی ہے۔ اسی طرح بعض ایسے شاعروں کا تذکرہ نہیں کیا گیا جو جدید شاعری میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ کتاب میں اردو کے قدیم و جدید شعرا کی تصاویر بھی دی گئی ہیں جنہوں نے کتاب کی دلچسپی میں کافی اضافہ کردیا ہے۔ صفحہ ۳۰۵ پر آیت کلام اللہ میں "عرضنا" چاہیے بجائے "ارضنا"۔ تعداد صفحات ۳۷۴۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں اہم تاریخیں دی ہیں اور اشاریہ (انڈکس) بھی ہے۔ قیمت تین روپے۔ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ، حیدر آباد (دکن)۔

"ترکوں کی اسلامی خدمات
اور
ان کی زبان و ادبیات"

اس موضوع پر یہ تین لیکچر ہیں جو ڈاکٹر جولیس جرمانس، پروفیسر بڈاپسٹ یونیورسٹی نے، جن کی خدمات تین سال کے لیے شانتی نکیتن میں اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے مستعار لی گئی تھیں، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد (دکن) میں دیئے۔ ڈاکٹر جرمانس کو اسلامیات سے خاص شغف ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن اور مذہب سے ان کی دلچسپی مشہور ہے بلکہ بقول مولوی عبدالحق "یوں کہنا چاہیے کہ وہ اچھے خاصے مسلمان ہیں۔" وہ ترکی اور عربی زبانوں کے عالم ہیں اور اس لیے ان زبانوں کے ادبیات کے متعلق، جو اسلامی دنیا کے اہم ترین حصوں کی زبانیں ہیں، ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔

پہلا لیکچر ترکوں کی نسلی ابتدا، تاریخی عظمت، خصائل جنگ جوئی اور قومی ترقیات کی کیفیت پر مشتمل ہے۔ باقی دو لیکچروں میں ترکی زبان کے ادبیات کی بتدریج ترقی، اس

کے شاعروں اور ادیبوں کے باب میں انتقادی خیالات اور عہد بعہد کی علمی و ادبی مساعی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ دل کشی اور دل آویزی جو ڈاکٹر صاحب کے شگفتہ قلم نے ان لکچروں میں پیدا کی ہے، قابل تحسین ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس قدر دلچسپی اور وسعت کے ساتھ ترکی ادبیات کے متعلق کہیں نہیں لکھا گیا۔ اصلی لکچر انگریزی زبان میں تھے جن کا مولوی سید وہاج الدین بی ۔ اے، بی ۔ ٹی، پروفیسر اورنگ آباد کالج نے انجمن ترقی اردو کے لیے اردو میں ترجمہ کیا اور انجمن کے سلسلہ مطبوعات کے نمبر ۶۹ کی حیثیت سے انہیں شائع کیا گیا۔ قیمت فی جلد ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو۔

تبصرہ و تنقید

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت فروری سنہ ۱۹۳۴ء)

اس شمارے میں نو مطبوعات پر تبصرے شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر کے آخر میں تبصرہ نگار کے نام کے ابتدائی حروف درج ہیں۔ مثلاً پروفیسر محمد اقبال کے لیے "الف" اور مولوی نور الحق کے لیے "نو" وغیرہ۔ صرف دو تبصروں پر کوئی نام نہیں۔ ان میں سے ایک جو یہاں درج کیا جارہا ہے' شیرانی صاحب کا ہے اور دوسرا امیر خسرو کی مثنوی "تغلق نامہ" پر مولوی محمد شفیع صاحب کا (مرتب)۔

داستانِ رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

(سلسلہ انجمن ترقی اردو' نمبر ۷۰)

سید انشاءاللہ خاں انشا کی شخصیت اپنی ذہانت و استعداد علمی اور شعر و سخن کی مہارت کی وجہ سے اردو دنیا میں ایک حیرت انگیز شخصیت مشہور ہے۔ ان کی مشہور تالیف "دریائے لطافت" جہاں ان کی لسانی نکتہ دانی کی شاہد ہے وہاں ان کی شوخ نگاری اور بذلہ سنجی کا بھی دلچسپ ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ۵۱ صفحات کی ایک کہانی ہے جسے انشا کی جدت طبع نے اس التزام کے ساتھ تحریر کیا تھا کہ تمام کتاب میں عربی فارسی کا ایک لفظ تک نہ آنے پائے' چنانچہ سبب تالیف کے سلسلے میں جسے وہ "ڈول ڈال ایک انوکھی بات کا" کہنا پسند کرتے ہیں' لکھتے ہیں:

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بول سے نپٹ نہ ملے۔"

مولوی عبدالحق صاحب' آنریری سیکرٹری' انجمن ترقی اردو اپنے دیباچے میں لکھتے

ہیں:

"اس داستان کا ذکر مدت سے سنتے آئے تھے لیکن ملتی کہیں نہ تھی۔ آخر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی پرانی جلدوں میں اس کا پتہ لگا۔ مسٹر کلنٹ' پرنسپل لا مارٹن کالج' لکھنؤ کو اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا جسے انہوں نے سوسائٹی کے رسالے میں طبع کرادیا۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں اس کا ایک حصہ طبع ہوا اور دوسرا حصہ سنہ ۱۸۵۵ء میں۔"

پنڈت منوہر لال زتشی ایم ۔ اے' نے مولانا کو اسی داستان کا ایک نسخہ' جو کبھی لکھنؤ میں ناگری حروف میں چھپا تھا' عنایت فرمایا' جس سے "مقابلہ کرکے مزید تصحیح کی گئی" اور اس طرح یہ عجیب و غریب اور دلچسپ کہانی ہم تک پہنچی جس کے لیے انجمن ترقی اردو مبارک باد کی مستحق ہے۔

انشا کی یہ کہانی ان ہزاروں کہانیوں میں سے ایک ہے جو مشرقی طبائع کی دلچسپی کی خاطر مافوق الفطرت امور سے بحث کرتی ہیں۔ سادھوؤں کی ساحرانہ طاقت کا اس داستان میں ایسا ہی مظاہرہ نظر آتا ہے جیسا ہم طلسم ہوش ربا کے واقعات میں بار بار مطالعہ کرتے ہیں۔ کہانی کا پلاٹ اردو کی ابتدائی کہانیوں کی طرح شہزادے کے "شکار" سے شروع ہوتا ہے اور ایک ہرنی کے پیچھے گھوڑا دوڑانے' رات ہوجانے اور ایک راج کماری (کیتکی) سے اتفاقیہ دوچار ہونے پر مشتمل ہے۔

کہانی کی زبان' عربی فارسی الفاظ نہ ہونے کی وجہ سے ہندی بن گئی ہے لیکن بقول مولوی عبدالحق "آج کل سی ایسی ہندی نہیں کہ نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا' اردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی' زبان اور بیان دونوں صاف ہیں۔ اسی کا نام ہندوستانی ہے۔"

اسی کے ساتھ موصوف نے بجا طور پر یہ بھی لکھا ہے کہ "قصہ کہانی میں تو ایسی زبان نبھ جاتی ہے (اگرچہ وہ بھی آسان نہیں) لیکن ادبی اور علمی مضامین ادا کرنے کی اس میں سکت نہیں۔"

طباعت کے لحاظ سے اس کہانی کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ دکن کے اس نسخ

ٹائپ میں چھپی ہے جو ہنوز اردو مطبوعات کے لیے بالکل نیا اور بے گانہ ہے۔ ان خصوصیات کے باوجود قیمت صرف چار آنے ہے جو حیرت انگیز طور پر کم معلوم ہوتی ہے۔ کہانی انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) سے طلب کی جائے۔

"مغل اور اردو"

(دو تاریک پہلو)

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت مئی سنہ ۱۹۳۴ء)

یہ دلچسپ مضمون جو نواب نصیر حسین خیال کی تالیف "مغل اور اردو" پر ناقدانہ تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے' یقیناً شیرانی صاحب کے قلم سے نکلا ہے' اگرچہ اورینٹل کالج میگزین کے متعلقہ شمارے کی فہرست میں مضمون نگار کے نام کا اختصار د۔ ش۔ لکھا ہے اور اصل مضمون کے اختتام (صفحہ ۹۸) پر محض حرف (الف) درج ہے۔ میرے خیال میں د۔ ش۔ سے مراد "داؤد شیرانی" ہے اور الف سے "اختر"۔

دراصل مضمون میں زیر تبصرہ کتاب کے جن دو تاریک پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے ان میں دوسرا پہلو مآخذ کا حوالہ نہ دینا ہے۔ اس ضمن میں مثالیں دیتے ہوے "پنجاب میں اردو" کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اس سے خود ستائی کا جو پہلو نکلتا تھا اس نے شیرانی صاحب کو اپنا نام دینے سے باز رکھا اور احتیاطاً" بیٹے کے نام کے ابتدائی حروف دینے پر اکتفا کی۔ مضمون کے آخر میں "الف" کا اضافہ غالباً" میگزین کے مدیر کا کام ہے (مرتب)۔

نواب سید نصیر حسین خیال عظیم آبادی' اردو زبان کے بلند مرتبہ انشا پرداز ہیں۔ اکثر نقاد ان کو اردو کا بہترین' فصیح البیان اور سلاست نگار صاحب طرز تسلیم کرتے ہیں۔ بلاشبہ جو روانی اور آمد ان کی انشا میں پائی جاتی ہے' اردو کی دنیائے ادب میں مفقود ہے۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں "آل انڈیا اردو کانفرنس" قائم ہوئی۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ کے قیصر باغ کی مشہور بارہ دری میں اس کانفرنس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا اور حضرت خیال اس

کے صدر بنائے گئے۔ اس موقع پر صدر کی حیثیت سے جو طویل خطبہ آپ نے ابلاغ کیا وہ اپنی ادبی لطافت اور انشائی حلاوت کے لحاظ سے بہت مقبول ہوا اور شائع ہونے پر ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس کی یہ ہر دلعزیزی اور قبولیت دیکھ کر خیال صاحب نے اس کی بنیادوں پر ایک طویل تالیف "داستان اردو" کی طرح ڈالی' جس کا ایک باب "مغل اور اردو" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

"مغل اور اردو" ۱۶۸ صفحات کو محیط ہے۔ اس کا مقصد تالیف ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے ان احسانات کو اجاگر کرنا ہے' جو انہوں نے اردو زبان و ادب پر کیے۔ کتاب کا نام' مقدمہ نگار کا بیان اور خیال صاحب کے مختلف مگر متعدد اشارات' کتاب کے اسی مقصد اساسی کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں --- چنانچہ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کوئی مغل بادشاہ ایسا نہیں جن کا نام اور تذکرہ اس کتاب میں اردو کے محسن کی حیثیت سے نہ آیا ہو۔

(۱)

اس مقصد میں خیال صاحب کو کس حد تک کامیابی ہوئی؟ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کتاب کا موجودہ سرمایہ معلومات و اطلاعات اس کی انتہائی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے۔ آخری دور کے چند مغل بادشاہوں اور شہزادوں مثلاً شاہ عالم' جہاندار شاہ' بہادر شاہ اور میرزا سلیمان شکوہ کے ذوق شعر و سخن (اردو) سے قطع نظر کیجئے تو اردو زبان سے مغل فرماں رواؤں کی وابستگی ایک افسوس ناک لاتعلقی بن جاتی ہے۔

اردو کا وہ سرمایہ شعر و ادب جو مغل حکمرانوں کے عہد کی پیداوار ہے' ان حکمرانوں کی تحریک' دلچسپی یا احسان کا مرہون نہیں بلکہ قدرتی نتیجہ ہے ان سیاسی' لسانی اور ذہنی و فکری انقلابات کا جو ہندوستان کی سرزمینوں میں پرورش پا رہے تھے اور پنجاب سے لے کر دکن تک کی فضاؤں کو محیط تھے۔ "مغل اور اردو" میں زیادہ تر اسی غیر مغلی سرمایہ ادب و شعر سے بحث کی گئی ہے اور ہم نہیں سمجھ سکے کہ اس قسم کے ادبیات کی پیداوار سے مغلوں کا کیا تعلق ہے؟

اس اجمال کی تفصیل کے لیے ہمیں بابر سے لے کر آخری مغل بادشاہ تک کتاب کا اسی ترتیب کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے جو مولف ممدوح نے قائم کی ہے۔

بابر کے ذکر میں فرماتے ہیں:-

"ایک دفعہ اس نے اپنے تخیلات و جذبات کے پتلے کو ترکی خرقہ اور ہندی جامہ ساتھ پہنایا اور شوخیوں کے ساتھ محفل میں اسے یوں جلوہ دیا:

مجکا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی

فقرا ہلیغہ بس بولغو سید ور پانی وروتی

(صفحہ ۵)

یہ ہے ہندوستان کے پہلے مغل فرماں روا کا وہ عظیم الشان احسان جو اس نے اردو زبان و ادب پر صرف فرمایا اور بقول خیال صاحب "اپنی پیاری رعایا کی پیاری زبان کو اس طرح منہ لگایا اور خلعت نظم تک بخشا۔"

اگر کسی غیر ملک میں رہ کر اس کی زبان سے ابتدائی واقفیت حاصل کرلینا اس زبان پر احسان کرنے کے مترادف ہے تو معلوم نہیں خیال صاحب ان انگریز افسروں کو اردو زبان کا کتنا بڑا محسن سمجھیں گے جو چند سال ہی کے قیام میں اپنے بیروں سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات چیت کرنے لگتے ہیں؟ ان تازہ وارد افغانوں کو کیا کہیں گے جو پہلے ہی سفر میں دہلی پہنچتے پہنچتے اردو میں اظہار مطلب کرنا سیکھ جاتے ہیں؟ یقیناً ان کا احسان مغل بادشاہوں کے احسان سے کہیں زیادہ مستحق توصیف و تحسین ہے۔ لیکن بعض اور امور' جو بابر کے ہندوستانی زبان سے اعتنا کے سلسلے میں کہے جاسکتے تھے' ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت خیال نے ان کو محروم التفات چھوڑا ہے۔ مثلاً واقعات بابری میں وہ ہندوستان کے حیوانات' اشجار' ہفتہ اور ماہ' اعداد و اوزان کے ہندی نام دے رہا ہے اور تقریباً" ایک سو سے زیادہ ایسے الفاظ اس کی تصنیف میں ملتے ہیں بلکہ بعض ہندی خصوصیات لسانی تک کا وہ ذکر کرتا ہے مثلاً ملک ہست کے ذکر میں کہتا ہے:

"نام اصلی اسد بود۔ ہندوستانیان این چنین حرکت را گاہی ساکن می خوانند چنانچہ خبر (بہ

فتحہ با) را خبر (بہ سکون با) می گویند۔ اسد (بہ فتحہ سین) را اسد (بہ سکون سین) گفتہ اند۔ رفتہ رفتہ ھیبت شد۔"

(صفحہ ۱۴۱)

آم کے بیان میں کہتا ہے:

"یکی انبہ است۔ اکثر مردم ھندوستان بے را بے حرکت تلفظ می کنند۔"

یہ تلفظ پنجاب میں آج بھی رائج ہے۔ ایک موقع پر کہتا ہے کہ ہندوستانی شین کو سین بولتے ہیں: "اہل ہندوستان شین را سین تلفظ می کنند۔"

کالے ہرن کے متعلق لکھتا ہے:

"ہندوستانیان کلرا می گویند۔ دراصل کالا ہرن بود یعنی آھوی سیاہ۔ تخفیف کردہ کلرا گفتہ اند۔"

ہتیہ پول کی تشریح اس طرح کی ہے:

"پیل را ہاتھی گویند، دروازہ را پول۔ ازین جہت ہتیہ پول می گویند۔"

(صفحہ ۲۴۴)

یہاں اس قدر اور اضافہ کیا جاتا ہے کہ مخصوص ہندی اصوات تک بابر کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ ایک تازہ وارد مغل کے لہجے میں انہیں لکھتا ہے مثلاً گھڑیال کو گریال، سدا پھل کو سدا فل، امرت پھل کو امرو فل، گھڑی کو گری، بڈھل (بڑھل) کو بدل، چمگادڑ کو چمکدر، کھرنی کو کرنی اور گڑھل کو گرل کی شکل میں بولتا ہے۔

ہمایوں کا ذکر خیال صاحب نے اس لیے نہیں کیا کہ وہ "برگشتہ تقدیر" رہا لیکن ان کا خیال ہے کہ "اس کے سے سخن رس کو موقع ملتا تو اسی وقت یہ زبان شہد و شیر سے دھوئی بلکہ نہلادی جاتی" اور وہ "اپنے باپ کی اس منہ بولی (اردو) پر سمرقند و بخارا تک نثار کر دیتا)۔۔۔۔ اردو کو ہمایوں شہد و شیر سے نہلادیتا یا نہیں؟ ہم اس کا فیصلہ خیال صاحب کی خوش فہمی پر چھوڑتے ہیں، گو تنقید کی دراز دستیاں کسی کی خوش فہمی پر رحم کرنے کی عادی نہیں۔ بہرحال چونکہ بقول خیال صاحب "یہ شرف بھی اکبر ہی کے

لیے اٹھا رکھا گیا تھا" اور "جب وہ نچنت ہو کر بیٹھا تو ادھر بھی متوجہ ہوا" اس لیے ہم بھی ہمایوں کو چھوڑ کر اکبر کے اس "شرف" کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اکبر کا یہ شرف، جو اس نے اردو زبان کو بخشا یا اردو کی وجہ سے خود حاصل کیا، خیال صاحب کے نزدیک دو باتوں پر مبنی ہے۔ اول تو یہ کہ اس نے "کرنگ" کو "سرنگ" اور "الہ آباد" کو "الہ باس" کے نام سے بدل دیا۔ دوسرے یہ کہ اس نے ایک مرتبہ جہانگیر کی کسی عرضی پر یہ رباعی دستخط کی:

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت

تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت

ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت

ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

(صفحہ ۸)

سرنگ اور الہ باس سے ہمیں یاد آیا کہ خاکروب کا نام حلال خور، کنجری کا کنچنی اور ہاتھی کی اندھیاری کا نام اجیالی اکبر ہی کا رکھا ہوا ہے۔ مگر یہ الفاظ اس کی طبیعت کی ایجاد اور اپج کی دلیل مانے جاسکتے ہیں نہ اس کی اردو نوازی کی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر نے اور ایسے نام ایجاد کئے ہیں جو یقیناً اردو کے محاورے اور اس کی روح کے مخالف ہیں مثلاً فارسی مہینہ مرداد کو اکبر امرداد کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ہاتھی کے ایک خاص شامیانے کا نام میگھ ڈنبر رکھتا ہے۔ ایک نو ایجاد شکار کا نام (جس میں کئی کئی چیتے بیک وقت ہرنوں کی ڈار پر چھوڑے جاتے تھے) چتر منڈل، ایک نئے کھیل کا (جسے سولہ آدمی کھیلتے تھے) چند منڈل اور اپنی چہیتی بندوق کا نام سنگرام رکھتا ہے۔ اسی طرح سو تولے کی اشرفی کا نام سنسہ، اس کے نصف کا رہس، چہارم کا آتمہ اور پانچویں حصے کا نام بنست رکھا تھا۔ علی ہذا روپے کے نصف کا درب، چوتھی کا چرن، پانچویں حصے کا پانڈو، آٹھویں کا اشٹ، دسویں کا دسا، سولہویں کا کلا اور بیسویں حصے کا نام سوکی رکھا تھا۔

یہی نہیں بلکہ عام لباس کے رائج الوقت اور عام فہم نام بدل دیتا ہے یعنی جامے کا نام سرب گاتی' پاجامے کا یار پیراہن' نیم تنے کا تن زیب' لنگی کا پت گت' برقع کا چتر گپت' کلاہ کا سیس سوبھا' عورتوں کے موباف کا کیس گہن' کمر (پٹکا) کا کٹ زیب' دوشالے کا پرم نرم اور پاپوش کا نام چرن دھرن بنادیتا ہے۔

یہ الفاظ اردو کے مقابلے میں برج کے ذخیرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے مہابلی کو اردو کے محسنوں میں شمار کرنا حضرت خیال کا حسن ظن ہے۔

رہا رباعی کا دستخط کرنا' جس کے لیے خیال صاحب "جلوۂ خضر" کا حوالہ دیتے ہیں' اس کے لیے اس کے سوا کیا کہا جائے کہ محض جلوۂ خضر کا حوالہ ان کی تنقیدی اور تاریخی ذمہ داری کو ہلکا نہیں کرسکتا۔ وہ زبان جو اس رباعی میں برتی گئی ہے' اکبر کے اخلاف کے عہد میں بھی مفقود تھی' اکبر کے زمانے میں کہاں سے آئی؟ ہم تو اسے حضرت خیال کی حد سے گزری ہوئی خوش اعتقادی خیال کرتے ہیں۔

جہانگیر کی کلاہ افتخار میں خیال صاحب کی مشاطہ قلم نے جو طرہ ٹانکا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے شراب کو "رام رنگی" کا خطاب بخشا تھا اور ایک مرتبہ "سفر کشمیر میں پچ ہزارا ایک پرفضا مقام پر پہنچ کر ادھر کی ایک کہاوت کو یاد کرکے اور جھوم کر کہا تھا:

پچ ہزارا کنکا (ں) بھلیاں دھنی کھوب گائیں

سور سکیرتی گھوڑ بھلے اور ہشت نگر کے دھائیں"

(صفحہ ۱۲)

جہانگیر کی اس "اردو نوازی" کو اگر ہندی نوازی کہا جائے تو ہمارے خیال میں بے جا نہ ہوگا۔

نور جہاں کے تذکرے میں خیال صاحب فرماتے ہیں:

"خدا کی قدرت ایرانی حور زادی ہندی رانیوں کو بھی مات کرے اور ان کی زبان میں بھی جو کچھ کہہ دے وہ اردو دانوں کی دستار کا طرہ بنے۔ وہ اس طرف آتی تو اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتی ہے:

دیں جگہ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بے باک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم"
(صفحہ ۱۷)

کون صاحب ہوش ان اشعار کو نورجہاں کا کلام مان سکتا ہے؟ یہ منجھی ہوئی زبان' اس کی روانی' فصاحت اور بیان کی صفائی جو ان شعروں میں نظر آتی ہے خود صفیر بلگرامی کے کلام میں بھی نہ ہوگی' جس کے تذکرہ "جلوۂ خضر" سے حضرت خیال نے یہ اشعار نقل فرمائے ہیں' نورجہاں کے زمانے میں کہاں سے آئی؟ یہ حضرت خیال کا خیالی فیضان ہو تو ہو۔ اس موقع پر تذکرہ مرآت خیالی کی عبارت ذیل دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے:

"نور جہاں حرم محترم جہانگیر ابن اکبر شاہ بادشاہ ہند کا نام نامی ہے۔ اس کے بیان میں تذکرہ نویسوں نے خوب خوب گل کھلائے ہیں' عجیب عجیب طرح کے فقرے اڑائے ہیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہ لطیفہ ہے کہ دو چار شعر اردو کے اس کی طرف منسوب کئے گئے۔"

(صفحہ ۳۷' مرآت خیالی' حصہ اول' سنہ ۱۸۸۳ء' طبع اکمل المطابع' دہلی)۔

"مرآت خیالی" جس عہد میں تصنیف ہوتا ہے اس وقت ہندی اہل قلم تحقیق و تنقید کے عادی نہ تھے اور ہر رطب و یابس پر یقین لانے کے لیے تیار تھے لیکن نورجہاں کی اردو شعر گوئی کا قصہ اس وقت بھی ناقابل اعتبار مانا گیا۔ حضرت خیال پر ہمیں تعجب آتا ہے کہ اس تحقیق و تنقید کے دور میں اس افسانے کو ایک تاریخی واقعے کے طور پر منظر عام پر لا رہے ہیں۔

بابر' اکبر' جہانگیر اور نورجہاں کے بعد اب آیئے ذرا شاہجہاں کے اس عظیم احسان کی طرف توجہ کریں جو اس نے اردو کے حال زار پر کیا ہے۔

خیال صاحب کی زبان میں :

"شاہ (شاہ جہاں) جب قلعہ آگرہ میں زچ ہوا تو گوشہ تنہائی میں اپنے اسی طفل (اردو) سے کھیلا اور جی بہلایا کرتا تھا۔" (صفحہ ۲۰)

اس تمام کھیل اور جی بہلاؤ کا ثبوت وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ "اس کا ایک شقہ شاہی اورنگ زیب کے ہاتھ لگ گیا تھا" جس کا اردو زبان میں ہونا اورنگ زیب کے اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے : "آن فرمان عالی کہ در زبان اہل ہند از دستخط خاص رقم فرمودہ. . . ." (صفحہ ۲۱)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"یہ زبان ہندی وہی زبان ہے جو ان دونوں قوموں (ہند و مسلمان) کے صدیوں کے ارتباط و اختلاط کا ایک خوش گوار نتیجہ اور زمین ہند کا وہ عام میوہ تھی جو بزار میں لایا اور مزے لے لے کر کھایا گیا۔ اب شاہی دسترخوان پر بھی اس نے زینت پائی۔" (صفحہ ۲۱)

لیکن اس سے زیادہ عجیب و غریب بیان یہ ہے :

"شاہجہاں کو اردو پر وہی حق و دعویٰ ہے جو کسی صناع کو اپنی کاریگری پر ہوتا ہے اور جب تک یہ یہاں کی دو بڑی قومیں (ہندو و مسلمان) زندہ ہیں اپنے اس ہندی شہنشاہ کی اس بے مثل صناعی اور اپنی قومیت کی اس زبردست نشانی کو یاد کرتی رہیں گی۔ تاج' جما (جامع) مسجد اور قلعہ معلی کی سی شان دار عمارتوں کے ساتھ اردوئے معلی کی یادگار عمارت بھی اسی فیاض و سیر چشم بادشاہ کے مبارک نام سے قائم رہے گی۔" (صفحہ ۱۸)

شاہجہاں کو اردو پر یہ مفروضہ "حق و دعویٰ" کیونکر حاصل ہوا؟ اور اس نے اردوئے معلی کی یہ یادگار عمارت کس طرح قائم کی؟ خیال صاحب اور ان کے پیش رو تذکرہ نویس اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کرتے۔ خیال صاحب نے بہت سعی کی تو اورنگ زیب کے خطوط سے ایک فقرہ ایسا نقل کردیا جس سے نظر بندی کی حالت میں شاہ جہاں کا "زبان اہل ہند" میں ایک شقہ لکھنا ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ یہ ثابت نہ کرسکے

کہ اورنگ زیب کا سا "فارسی پسند" مغل جس زبان کو "زبان اہل ہند" کہتا ہے وہ اردو ہے یا ہندی---؟

داراشکوہ کے تذکرے میں مولف "مغل اور اردو" کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے:

> "بھاشا اور سنسکرت سے اس کا اخلاص پوشیدہ نہیں..... کاشی (بنارس) میں بیٹھ کر اس نے پنڈتوں کے آگے زانوے ادب و شاگردی تہ کیا۔ گیتا کا وہ وظیفہ خواں رہا اور "اپانی شادش" کو اس نے "سرالاسرار" بنا دیا۔ جس نے "جوگ وششٹا" کو فارسی جامہ بخش کر اپنی ددھیالی زبان کو سجایا۔ وہ اپنے گرو بابا لال داس اور اپنے برہمن مشیر و دیوان چندر بھان کے سے شاعر و ادیب کی مدد سے اپنی مادری اور باپ کی پیاری زبان کو کہاں تک نہ سنوارتا مگر مشیت اس کے خلاف تھی.. ... "سارسنگرہ" کی سی دوہوں کی بیاض اسی کے حکم سے ترتیب پائی اور اپنی انگوٹھی پر "پرابھو" کی سی نشانی اس نے کھدوائی۔" (صفحہ ۲۴)۔

دیکھا آپ نے؟ داراشکوہ کو اردو سے کیسا زبردست تعلق تھا! غریب اردو سیکھنے کے لیے کاشی جاتا اور پنڈتوں کے آگے زانوے ادب تہ کرتا ہے!! گیتا اس لیے پڑھتا ہے کہ وہ اردو ادب کی بہترین کتاب تھی۔ "اپانی شادش" اور "جوگ وششٹا" کو وہ "اردو" سے فارسی میں منتقل کرتا اور اس لیے فارسی پر نہیں "اردو" پر احسان کرتا ہے۔ "سارسنگرہ" کی سی دوہوں کی بیاض مرتب کروا کر وہ "اردو زبان" کو زندہ جاوید بناتا ہے اور اپنی انگوٹھی پر "پرابھو" کی نشانی کھدوا کر "اردو" کے خاتم پر اپنی سرپرستی کا نگینہ جڑ دیتا ہے۔

یوں تو "مغل اور اردو" شروع سے آخر تک "دلچسپیوں" کا مجموعہ ہے لیکن داراشکوہ اور اردو کے تعلقات کے سلسلے میں خیال صاحب کا مذکورہ بالا بیان حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ پنڈت، دوہے، جوگ وششٹا، اپانی شادش، ہندی، بھاشا، سنسکرت، پرابھو، کوئی نام بھی تو ایسا نہیں جس کی تفصیل یا تذکرے کو اردو سے دور کا بھی تعلق ہو! پھر

اس لمبی چوڑی تفصیل کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ "مغل اور اردو" لکھ رہے ہیں، مغلوں کے عام حالات یا علم نوازی کا تذکرہ نہیں!

اورنگ زیب (عالم گیر) کے ذکر میں تحریر فرماتے ہیں:

"جب بنگالے سے ایک شخص اس (بادشاہ) کا مرید ہونے آتا اور صلابت خاں میر توزک اسے حضور میں پیش کرتا ہے تو وہ (عالم گیر) مسکراتا اور عربی فارسی مثل کے عوض بے اختیار یہ ہندی کہاوت:

ٹولی پسندی بلورہ دینری کواڑے پیچ

چوہا مگدن باولے، تو گل باندھے چیچ

کہتا ہے" (صفحہ ۲۵ و ۲۶)۔

خیال صاحب اسے خود ہی "ہندی کہاوت" کہتے ہیں! پھر کیا کسی ہندی کہاوت کا عالمگیر کی زبان سے ادا ہونا اس کا "اردو" پر احسان ہے؟

آگے چل کر وہ عالم گیر کی سرپرستی علوم و فنون اور سعی نشر و تعلیم پر بحث کرنے کے بعد کہتے ہیں:

"جو بادشاہ علم و تعلیم کا اتنا حامی ہو ..... وہ اپنے بزرگوں کی یادگار اردوئے معلی کا کہاں تک خیال نہ رکھتا ہوگا" (صفحہ ۲۸)۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ "رکھتا ہوگا" سے جناب خیال کا کیا مقصد ہے؟ اگر محض اپنے حسن ظن اور قیاس کا اظہار ہے تو وہ خود ہی انصاف فرمائیں کہ یہ کس حد تک ان کے موضوع تالیف کی متانت کے مناسب اور شایان شان ہوگا؟

خیال صاحب نے اورنگ زیب کے رقعات کا ذکر کیا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ فارسی میں ہیں اور ان کا عالم گیر اور اردو کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اس کا ایک شعر نقل کرتے ہیں:

"غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چسان در شیشہ ساعت کنم ریگ بیابان را"

یہ بھی فارسی میں ہے۔ اس کے فرامین بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ پھر وہ کون سی چیز ہے جو اردو سے اس کے تعلقات کا اظہار کرسکے؟ دلی والیاں اگر اپنے شوہر کے فراق میں گاتی تھی کہ :

"دلی سہر سہاونا اور کنچن برسے نیر
سب کے کنت ہنور کے لے گئے عالم گیر"

(صفحہ ۳۰)

تو اسے دلی والیوں کا "اردو" پر احسان کہا جاسکتا ہے عالم گیر کا نہیں۔

خیال صاحب پورے سات صفحے رنگنے کے باوجود عالم گیر اور اردو کا کوئی تعلق ثابت نہ کرسکے۔

زیب النسا کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"اردو میں بھی اس نے جو کچھ کہا وہ اس زبان کا سرمایہ ناز سمجھا جاتا ہے ..... اس کا اردو کلام اب نایاب ہے .... مشہور فرنچ تذکرہ نویس میسیوتاسی خبر دیتے ہیں کہ "زیب النسا" کی اردو نظمیں میں نے دیکھی اور پڑھی ہیں' .... صاحب جلوۂ خضر فرماتے ہیں کہ ایک پرانی بیاض میں شہزادی کے اردو شعر ہماری نظر سے گزرے ہیں .. ... ان مرحوم نے اپنے تذکرے میں یہ تین شعر بھی نقل کردیے ہیں :

جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

دیکھو کتنا صاف کہتی اور اردو زبان کا انداز قائم رکھتی ہے' سنو :

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

شہزادی غضب کا شعر کہتی اور آج کل کے شعرا سے داد طلب ہے :

آکر ہماری لاش پر کیا یار کر چلے
خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

(صفحہ ۳۲)

اردو کے ساتھ زیب النسا کے اس شغف کو، جو ان اشعار سے واضح ہوتا ہے، بلاشبہ ہم اکبر و بابر، جہانگیر و داراشکوہ اور نورجہاں کے احسانات سے زیادہ وزنی اور قابل داد سمجھتے، اگر یہ اشعار واقعی زیب النسا کے ہوتے! تاسی اور صاحب جلوۂ خضر کی رہنمائی میں خیال صاحب "کعبہ" کی بجائے "ترکستان" پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کرکے ایک غیر اہل زبان پروفیسر اور ایک ناوقف تنقید "داستان گو" کی روایتوں پر اعتماد کرلیا ہے اور ذاتی درایت سے کام نہیں لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ "کتنا صاف کہتی اور زبان کا انداز قائم رکھتی ہے" در حالے کہ اہل نظر کے نزدیک یہ صاف کہنا اور زبان کا انداز قائم رکھنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اشعار اورنگ زیب کی دختر کے نہیں ہوسکتے۔

آخری شعر کے متعلق اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ تذکرہ بہارستان ناز (از حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی، طبع سنہ ۱۲۸۱ھ) میں اس شعر کو گنا بیگم اور ان کے شوہر نواب عمادالملک غازی الدین خان کی طرف بدیں حکایت منسوب کیا گیا ہے :

"نواب ایک روز باغ میں تشریف لائے۔ بیگم باغ کی سیر میں مشغول تھیں۔ بولے چلو بارہ دری میں بیٹھ کر نظارہ چمن کریں گے۔ بیگم نے کہا حضور تشریف لے چلیں، لونڈی بھی حاضر ہوتی ہے۔ نواب بارہ دری میں جاکر پلنگ پر لیٹے اور آنکھ لگ گئی۔ جب بیگم آئیں دیکھا نواب سو رہے ہیں۔ پاؤں کی آہٹ سے نواب کی آنکھ کھل گئی۔ نواب نے بیگم کو دیکھتے ہی یہ مصرع پڑھا:

آکر ہماری نعش پر کیا یار کر چلے

بیگم نے فی الفور جواب میں کہا:

خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے

لیکن بہ سند "گلشن بے خار" صاحب "مرآت خیالی" منشی درگا پرشاد نادر کا بیان ہے کہ "یہ شعر مرزا عظیم بیگ شاگرد حاتم کا ہے" (صفحہ ۱۰۸)

ہم اپنے ناظرین کی سہولت کے لیے اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ یہ میرزا

عظیم بیگ وہی بزرگ ہیں جن کے سید انشاءاللہ خاں انشا سے معرکے رہے ہیں۔ ان کا مخمس بہ جواب انشا بے حد مشہور ہے۔

منشی کریم الدین نے اپنی "تاریخ شعرائے اردو" میں اس شعر کو مرزا عظیم بیگ ہی کے نام پر درج کیا ہے۔ چنانچہ:

آکر ہماری نعش پر کیا یار کر چلے
خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے
بالیں پہ میری آکے دم نزع کل عظیم
رو کر لگا وہ کہنے یہ کیا یار کر چلے

(تذکرہ کریم الدین، صفحہ ۳۴۴)

زیب النسا کے بعد عالم گیر کے تین فرزندوں کا ذکر آتا ہے محمد سلطان، معظم اور اعظم۔ محمد سلطان کا ایک سطری تذکرہ (یک سطری اس لیے کہ خیال صاحب کو بھی اس کی "سرپرستی اردو" کا دعوی نہیں) ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ اعظم کے لیے لکھتے ہیں:

"سانسکرت و بھاشا سے الفت رکھتا اور ہندی شعرا کا سرپرست تھا۔ نواز شاعر نے اسی شہزادے کی فرمائش پر "سکنتلا" کو فارسی کا جامہ پہنایا اور بعد کو اسے بھاشا کے روپ میں پیش کیا۔ "ست سئے" کی سی سنسکرت تصنیف بھی اسی کے حکم سے تدوین پاکر اشاعت اعظم کے نام سے مشہور ہوئی" (صفحہ ۳۷)۔

ان الفاظ کو غور سے دیکھیے اور بتائیے اعظم کا اردو سے کوئی تعلق ظاہر ہوا؟ بہتر ہو کہ خیال صاحب "مغل اور گوالیاری" کے نام سے کوئی کتاب مرتب فرمائیں۔ ان کے ان ممدوح مغل فرماں رواؤں کے تذکرے وہاں زیادہ موزوں ثابت ہوں گے۔

معظم کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

"معظم کو خدا نے دو بڑے اتالیق دیئے۔ ایک مرزا عبدالقادر بیدل اور نواب خان صادق۔"

بیدل کو معظم کا اتالیق بنا کر معلوم نہیں خیال صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ بیدل کے دو اردو شعر مشہور ہیں اور وہ معظم کا وابستۂ دولت تھا اس لیے معظم اردو کا سرپرست بن گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ اس مقصد میں ناکام رہے ہیں۔

اسی سلسلے میں وہ معظم کے متعلق مآثر عالم گیری اور سیر المتاخرین کا قول نقل کرتے ہیں:

"....عربی ایسی بولتا تھا کہ فصحائے عرب پسند کرتے تھے۔ ترکی اور فارسی تو اس کے گھر کی زبانیں تھیں۔ سانسکرت اور بھاشا کا علم رکھتا اور ہندی کویوں کو بے حد مانتا تھا...." (صفحہ ۳۸ صفحہ)

فرمایئے! عربی، ترکی، فارسی، سانسکرت اور بھاشا کے ساتھ کہیں اردو کا ذکر آیا؟ یا اس زبان کا جو اس زمانے میں رائج تھی اور جس پر ہمیں اردو کا شبہ ہو سکتا ہے؟ خواہ اس عہد میں اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو؟

یہاں یہ کہنا بھی خالی از لطف نہ ہوگا کہ خیال صاحب نے مآثر عالمگیری اور سیر المتاخرین کا جو قول نقل کیا ہے اس سے کسی طرح بھی معظم کی اردو سے دلچسپی کا اظہار نہیں ہوتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مآثر عالمگیری اور سیر المتاخرین کے بیان کے مقابلے میں خیال صاحب کے خیال کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔

ع: یہ اگر سچ ہے تو ظالم! اسے کیا کہتے ہیں؟

پھر فرماتے ہیں:

"معظم کا علمی دربار مشہور ہے۔ خافی خان (مشہور مورخ) کا سا خوش صاحب قلم اگر حضوری میں ہے تو نعمت علی خان کا سا بلبل ہزار داستان بھی صحبت میں چہک رہا ہے اور میر جعفر (زٹلی) کے سے زبان آور کا طوطی بھی بول رہا ہے۔ دیوانہ شاعر اگر اپنا فارسی ہندی کلام سناتا تو عالم برہمن کوی بھی اپنی عالم کیلی (تصنیف) کھول کر رادھا کرشنا کی داستان لے بیٹھتا ہے۔ رسک پریا (ہندی تالیف) پڑھی جاتی اور خوش مذاق بادشاہ

مزے لیتا اور اس کی شرح لکھنے کا حکم دیتا ہے" (صفحہ ۳۹)۔

کیا اس بیان سے کسی طرح بھی (ثابت ہونا درکنار) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معظم کو اردو سے کچھ تعلق تھا؟ اور یہ کہ اس نے اردو زبان کی کوئی خدمت انجام دی؟ میر جعفر (زٹلی) کی اردو دانی مسلم! لیکن اس کی زٹلیات کو معظم کی "اردو شناسی" سے کیا تعلق؟ بالخصوص اس حالت میں جب کہ زٹل کا معظم سے وابستہ ہونا کسی تذکرہ و تاریخ سے ثابت نہیں! زٹل نے معظم کی ہجو ضرور لکھی ہے لیکن یہ ہجو معظم کی سرپرستی اردو کی دلیل نہیں!

ان تمام "سخنہائے گفتنی" کے بعد بھی خیال صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں:

"افسوس ہے کہ معظم کی حیات نے وفا نہ کی مگر اپنی چند سالہ حکومت میں علم و ادب کی شان اور پھر اردو کا نشان جس طرح اس نے بلند کردیا وہ قابل تعریف ہے" (صفحہ ۳۹)

اردو کا نشان بلند کرنا اسی کو کہتے ہیں تو

ع: بیا کہ ماسپر انداختیم اگر جنگ است!

اب اس کا ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ نعمت خان عالی اور خافی خان کی فارسی دانی اور عالم کوی کی عالم کیلی اور رسک پریا کی بھاشا اردو زبان سے کیا تعلق رکھتی ہے؟ پھر اردو کا نشان کس طرح بلند ہوا اور کس نے بلند کیا؟

ع: این سخن راچہ جواب است توهم می دانی!

اب فرخ سیر کا زمانہ آتا ہے۔ ہم دردان اردو کو توقع ہوگی (اور توقع ہونی چاہیے کہ اگر اس کے آبا و اجداد نے اردو کے لیے کچھ نہیں کیا تو ان کے "نعم البدل" کے طور پر وہ ضرور اردو کی کوئی نہ کوئی خدمت انجام دے گا لیکن آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی جب آپ دیکھیں گے کہ

ع: بحر ہزج میں ڈال کر بحر رمل چلے!

کے مصداق، خیال صاحب نے فرخ سیر کے تذکرے کو بیدل اور جعفر زٹلی کے اذکار پر

ختم کردیا ہے' جن کا اس کی اردو سرپرستی سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔

محمد شاہ کا تذکرہ خیال صاحب نے طب اور نجوم کی ترقی اور ہندی کے شعرا کی قدر شناسی کے حالات پر ختم کردیا ہے۔ اس دفتر پریشان میں اگر کوئی مناسب موقع بات ہے تو وہ محمد شاہ کا ایک اردو شعر ہے:

"پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی

دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشہ گذری کا"

(صفحہ ۴۷)

پورے اٹھارہ صفحات میں صرف یہ ایک شعر ہے جو محمد شاہ کا اردو سے کسی قسم کا تعلق ظاہر کرتا ہے۔ ناظرین اسے اردو پر محمد شاہ کا احسان سمجھ لیں یا اس عہد کے لسانی رجحان کا اثر اور عوام کے ذوق اردو کی "صدائے بازگشت" کہہ لیں۔

"احمد شاہ اور اردوئے معلیٰ" کا دلچسپ عنوان دیکھ کر ناظر کو توقع ہوتی ہے کہ غالباً" یہاں ناکامی نہ ہوگی اور احمد شاہ نے اردو زبان و ادب پر احسان نہیں تو کم از کم اس سے تعلق ضرور پیدا کیا ہوگا! لیکن پورے بارہ صفحات پڑھ جانے پر بھی "احمد شاہ اور اردوئے معلیٰ" کی وابستگی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ میر ضاحک کا شہر آشوب' نواب اکرام اللہ خاں درد' فدوی لاہوری اور اشرف علی خان فغان کا ذکر اور نمونہ کلام ضرور دیا ہے لیکن کسی پادشاہ کے ہم عصر و ہم عہد شعرا کا اردو کلام اس پادشاہ کا "اردوئے معلیٰ" سے کوئی تعلق ظاہر نہیں کرتا۔

(۲)

"مغل اور اردو" کا ایک اور نقطہ نظر سے بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

جس حد تک' اس دلچسپ کتاب کے بیانات کے مآخذ کا تعلق ہے' مولف نے حوالہ دینے سے افسوس ناک حد تک بے پروائی برتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر دو چار حوالے دیئے بھی گئے ہیں تو انہیں بیانات کے سلسلے میں جو ہر لحاظ سے ناقابل تسلیم اور غیر معتبر ہیں۔ مثلاً "نور جہاں کا اردو کلام" بحوالہ تذکرہ جلوۂ خضر مولفہ صفیر

بلگرامی۔ "زیب النسا کا اردو کلام" بحوالہ تاسی و صفیر بلگرامی اور اکبر کا جہانگیر کی عرضی پر ایک اردو رباعی دستخط کرنا بحوالہ صفیر بلگرامی۔

حوالوں سے اس بے نیازی اور بے پروائی نے مغل اور اردو کی علمی حیثیت اور اس کی وقعت کو مجروح کردیا ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں مآخذ کے حوالے ایک ضروری اور اہم عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور علمی و تاریخی کام کرنے والوں کو اس ضروری کام سے غفلت نہیں برتنا چاہیے۔

"مغل اور اردو" کا ایک سرسری مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کے اجزائے تعمیر میں متعدد تاریخوں، تذکروں اور لسانی تالیفات کے بیانات کا خمیر صرف ہوا ہے۔ تمام "سرمایہ ماخوذ" پر نظر ڈالنا وقت اور فرصت کا طلب گار ہے اس لیے ہم یہاں محض ان بیانات سے بحث کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو صرف ایک کتاب "پنجاب میں اردو" سے تعلق رکھتے ہیں۔

"مغل اور اردو" کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ جب ہم ایک نظر "پنجاب میں اردو" پر ڈالتے ہیں تو شک پیدا ہوتا ہے کہ "پنجاب میں اردو" کے بعض بیانات صاحب "مغل اور اردو" کے ضرور پیش نظر ہیں، گو ان کا حوالہ نہیں دیا گیا:

مؔ: اینک بشہادت طلبم لوح و قلم را

خیال صاحب نے "اردو اپنے گھر میں" کے عنوان سے جو باب لکھا ہے اس میں "پنجاب کی ایک مخلوط زبان، شمالی ہند کی ایک نئی زبان، دلی کا پنجاب کی ایک نو آباد چھاؤنی بننا" ایسے بیانات ہیں جن سے "پنجاب میں اردو" کا پرتو صاف طور پر نمایاں ہے۔ "پنجاب میں اردو" پہلی تالیف ہے جس نے ان معاملات سے تفصیلی بحث کی ہے اور اس لحاظ سے کم از کم اس بارۂ خاص میں اس کا حوالہ نہ دینا حیرت انگیز ہے۔

میر جعفر زٹلی کے تذکرے میں اس کے یہ اشعار جو اس نے محمد معظم کی ہجو میں کہے ہیں:

نخستیں کلاں ترکہ برکھنڈ کرد
همہ کاروبار پدر بھنڈ کرد
چناں لوٹ شد بستی بھگ نگر
نہ غذ ما صفا ماند نہ ماکدر
جہاں ہووے ایسا کلچھن کپوت
لگے خلق کے منہ کو کالک بھبھوت
(صفحہ ۴۴، ۴۵)

اور یہ اشعار جو محمد اعظم شاہ کی ہجو میں ہیں:
دگر شاہ اعظم همہ کندور
برسوائی انداخت کار پدر
بہ خوش دامن و خسپورہ ساختہ
بہ للو پتو کار درباختہ
(صفحہ ۴۵)

بجنسہٖ "پنجاب میں اردو" میں درج ہیں۔ اسی طرح اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کی یاد میں میر جعفر زٹلی نے جو اشعار لکھے ہیں:
کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ
مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
رکت کے انجھواں دل روتا ہے
نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے
دوادو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے
بچہ در گود سر کھٹیا دھری ہے
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم
زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم

بیا جعفر زباں کو مختصر کر
ز دور مختلف دل میں حذر کر
(صفحہ ۴۵)

چار شعروں کے اضافے کے ساتھ یہ اشعار "پنجاب میں اردو" میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔ ایک فرق ضرور ہے کہ دو مصرعوں میں تبدیلی نظر آتی ہے۔ "مغل اور اردو" کا مصرعہ :

رکت کے آنجھواں دل روو تا ہے

"پنجاب میں اردو" میں اس صورت میں ملتا ہے :

ع : رکت کے آنسووں جگ روو تا ہے

اور مصرع : زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم کی جگہ "پنجاب میں اردو" میں ہے :

ع : جھڑا جھڑو دھڑا دھڑ ہر دو پایم

معلوم نہیں یہ تبدیلی خیال صاحب نے کی ہے یا یہ اشعار انہوں نے کسی اور جگہ سے نقل کیے ہیں۔ بہرحال حوالہ ضرور دینا چاہیے تھا۔

علاوہ برایں میر کا شہر آشوب :

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
بھلا دی بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے
(صفحہ ۴۶)

دونوں کتابوں میں مشترک ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ "مغل اور اردو" میں مندرجہ ذیل شعر نقل نہیں کیا گیا:

نفر کی جب طلب ہووے نفر باہر کھڑا رووے
میاں گھر میں پڑا سووے عجب یہ دور آیا ہے

فرخ سیر کا سکہ:

"سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر"

اور اس پر میر جعفر کی چوٹ:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ پشہ کش فرخ سیر"
(صفحہ ۴۸)

بھی بظاہر "پنجاب میں اردو" سے منقول ہے۔

"پنجاب میں اردو" میں زٹل کا "اردو الفاظ کو عربی بندش دینا" "مغل اور اردو" میں "اردو الفاظ کو عربی ترکیب دینا" بن جاتا ہے اور جعفر کی نثر: "چوں گھڑگھڑاہٹ الرعد فی الغمام و کڑکڑاہٹ البرق فی الہرام بر سرست . . . . الخ" کا اندراج دونوں کتابوں میں مشترک نظر آتا ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ "پنجاب میں اردو" سے خیال صاحب نے استفادہ کیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ جعفر کی چھ مختلف چیزیں "پنجاب میں اردو" میں موجود ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان چھ چیزوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں جسے خیال صاحب "مغل اور اردو" میں نقل کرنا ضروری نہ سمجھیں۔

"مغل اور اردو" میں اٹل نارنولی کا کلام بھی درج کیا گیا ہے:

"رخسار پر بہار سجن رونق چمن
یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن
یا حقہ جواہر و یا درج در کہوں
یا غنچہ گلاب کہوں یا کہوں دہن

یہ شعر بھی "پنجاب میں اردو" سے ماخوذ ہے' جہاں دل محمد دلشاد پسروری کے نام سے درج ہے لیکن "مغل اور اردو" میں نہ "پنجاب میں اردو" کا حوالہ نظر آتا ہے نہ غریب شاعر کا نام درج کیا جاتا ہے در حالے کہ یہ شاعر پہلی مرتبہ "پنجاب میں اردو" اور صرف "پنجاب میں اردو" کے ذریعہ سے روشناس ہوتا ہے۔

فدوی لاہوری کے ذکر میں خیال صاحب نے اس کے تین شعر درج کئے ہیں۔

"نہ پوچھو رنگ مہندی کا کف قاتل پہ اے یارو
کسی کے خوں میں اس کے ہاتھ کو تلوار لے ڈوبی

(صفحہ ۸۵)

خیال صاحب نے اس شعر کے ساتھ جلی قلم سے "مطلع" لکھ دیا ہے۔ ہم خیال صاحب کو اصطلاحات شعر سے اتنا نابلد نہیں سمجھتے کہ ان کو مطلع اور مقطع وغیرہ کا فرق نہ معلوم ہو۔ غالباً" یہ "مطلع" حضرت کاتب کے مطلع فکر سے طلوع ہوا ہے۔

دوسری غزل کے دو شعر یہ ہیں:

"آنسو نہیں ہیں دیدۂ تر میں بھرے ہوئے
موتی ہیں آبدار صدف میں بھرے ہوئے
فدوی ہمارے دیدۂ گریاں کے فیض سے
اشجار کوہ و دشت کے یکسر ہرے ہوئے"

(صفحہ ۸۶)

مطلع میں دونوں مصرعوں کا قافیہ مشترک ہے در حالے کہ یہ ناجائز ہے۔ حقیقتاً" دوسرے مصرعے میں دھرے چاہیے۔ چنانچہ "پنجاب میں اردو" میں اسی طرح درج ہے۔ بہرحال فدوی کے یہ تینوں شعر "پنجاب میں اردو" سے لیے گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً خیال صاحب کسی تیسری زمین میں بھی اس کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور ارقام فرماتے۔

گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہیں بھونگ
یا زلف مشک رنگ ہے یا نافہ ختن
با قد خوش خرام چلے جب لٹک لٹک
شمشاد اور صنوبر خم کھاویں در چمن

. . . .

. . . .

بر توسن کرشمہ سوار است نازنین
سید اٹل ز بادۂ دیدار او مگن
(صفحہ ۴۷)

خیال صاحب نے دو شعر خارج کردیئے ہیں اور یہ نظم بھی "پنجاب میں اردو" سے نقل کی ہے۔ "پنجاب میں اردو" میں ان اشعار کے نیچے حسب ذیل حوالہ ملتا ہے:

"از بیاض پرتاب سنگھ ساکن موضع آدر عملہ پرگنہ راہوں' دو آبہ بست جالندھر بست و نہم شہر جمادی الاول سنہ ۹ جلوس والاے محمد شاہ بادشاہ غازی" (پنجاب میں اردو' صفحہ ۲۰۴)

لیکن خیال صاحب نہ اس بیاض کا حوالہ دیتے ہیں نہ "پنجاب میں اردو" کا اور نہ کسی دوسرے تذکرے یا کتاب کا۔ ع:

ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی!

محمد شاہ کے تذکرے میں ارشاد ہوتا ہے:

"اردو کے اکثر لفظوں کی نادری واقعات سے نسبت ہے اور وہ ہمارا محاورہ ہو کر ایک مزیدار تاریخ بن گئے ہیں۔ نادری' نادرشاہی' نادری حکم اور نادر گردی اور پھر غمزۂ نادر جیسے:

قتل عام است در جہان آباد
آخر این غمزۂ تو نادر نیست
(صفحہ ۶۹)

تنقید و تبصرہ

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت نومبر سنہ ۱۹۳۵ء)

اس شمارے میں چھ مطبوعات پر تبصرے شامل ہیں جن میں سے دو، جو یہاں درج کیے جارہے ہیں، شیرانی صاحب کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے آخر میں حرف (ش) بھی دیا ہوا ہے جو "شیرانی" کا پہلا حرف ہے۔ مولوی محمد شفیع صاحب ایسے مواقع پر "ایڈیٹر" لکھا کرتے تھے (مرتب)۔

"فلسفہ جمال"

یہ ۸۶ صفحات کا ایک رسالہ ہے جس میں جناب ریاض الحسن ایم۔ اے نے فلسفہ حسن اور اس کے جزئیات سے بحث کی ہے۔ مضمون چھ حصوں پر منقسم ہے جن کے عنوانات یہ ہیں:

(۱) فلسفہ جمال (۲) حسن اور آرٹ

(۳) ہم آہنگی اور وحدت (۴) حسین اور بدصورت کا تعلق

(۵) صاحب فن کی بزرگی و عظمت (۶) آرٹ اور اخلاق

آخر الذکر عنوان فلسفہ و ادب کی دنیا میں ایک معرکۃ الارا مسئلہ بنا رہا ہے۔ مولف نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بہت کچھ اضافہ ممکن ہے۔ ع:

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

رسالے کے موضوع کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مولف کی نگارش کا لب و لہجہ ایک قابل قدر کوشش ہے اور چونکہ اس نوع کے عنوانوں پر اردو زبان کا سرمایہ نقد و نظر بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے زیر نظر رسالے کا مطالعہ ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔ اگرچہ کسی کسی جگہ مطالب کی تشنگی دامن گیر فکر و تامل ہوتی ہے اور کہیں کہیں مثالوں کے طور پر پیش کردہ اشعار مولف کے دعاوی اور متعلقہ بحث کے شواہد کا قرار واقعی

مناسب ثبوت بہم نہیں پہنچاتے تاہم موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ رسالہ "ہندوستانی اکیڈمی" (یو۔ پی' الہ آباد) نے شائع کیا ہے اور منیجر کتابستان' ۱۷۔ الف سٹی روڈ' الہ آباد سے ایک روپے میں طلب کیا جاسکتا ہے۔

"باپ کے خط بیٹی کے نام"

پنڈت جواہرلال نہرو جدید ہندوستان کی ایک مشہور اور نمایاں شخصیت ہیں۔ وہ صرف ایک بڑے باپ کے بیٹے ہی نہیں بلکہ ذاتی طور پر بھی جوہر قابل ہیں۔ زیر نظر کتاب پنڈت جی کے ان دلچسپ اور قابل قدر خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو وہ سنہ ۱۹۲۸ء میں اپنی دہ سالہ صاحبزادی اندرا کو لکھتے رہے تھے۔ اصل خطوط انگریزی زبان میں لکھے گئے تھے۔ اب اردو داں دنیا کے لیے ان کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے' جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

یہ خطوط بتلاتے ہیں کہ ایک قابل اور وسیع معلومات رکھنے والا باپ خطوں ہی خطوں میں اپنی بچی کی تعلیمی ترقی اور عام اطلاعات میں کس حد تک مفید اضافہ کرسکتا ہے۔

خطوط میں زمین اور کائنات زمین' دنیا اور دنیا کے مکینوں کے بننے' جانوروں اور آدمیوں کے پیدا ہونے اور پھلنے پھولنے کا حال بتلایا گیا ہے۔ ہر خط ایک دلچسپ سبق کی حیثیت رکھتا ہے' جس میں نہایت شیریں لہجے' دلچسپ انداز اور انتہائی سلاست و سادگی کے رنگ میں' بچوں کے لیے انہی کی زبان میں تاریخی اور سائنٹفک معلومات کا سرمایہ جمع کردیا گیا ہے۔

کتاب بچوں کے لیے بہت مفید ہے اور ادب الصبیان میں قابل ذکر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مذہب کے متعلق ایک دو جگہ پنڈت جی کا اظہار خیال شاید مذہبی حلقوں میں اچھی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ "مذہب ڈر کا نتیجہ ہے" بچوں کی کتاب میں قطعی غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

انگریزی خطوط ہماری نظر سے نہیں گزرے لیکن اردو ترجمے کے مطالعے کے بعد ہم

کہہ سکتے ہیں کہ باوجود اپنی سادگی اور عام فہم زبان کے اس سے اچھا اردو ترجمہ ممکن تھا۔
کتاب ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے اور دو روپے میں منیجر "کتابستان" الہ آباد سے طلب کی جاسکتی ہے۔

"مرقع داراشکوہ اور اس کا مقدمہ"

از محمد عبداللہ چغتائی

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت مئی سنہ ۱۹۳۷ء)

اس شمارے میں عبداللہ چغتائی صاحب کے مضمون پر میگزین کے ایڈیٹر مولوی محمد شفیع صاحب نے جو تعارفی نوٹ دیا ہے اس میں شیرانی صاحب کے اس ضمن میں اظہار خیال پر مبنی چند سطور بھی شامل ہیں۔ یہ نوٹ من و عن یہاں درج کیا جاتا ہے (مرتب)۔

ذیل کا مضمون ہمارے عنایت فرما مسٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی نے پیرس سے بھیجا ہے۔ مضمون ان کے خاص "جناتی" خط میں لکھا ہوا ہے اور وہ مصر ہیں کہ اس کو ضرور شائع کیا جائے۔ مکرمی حافظ محمود شیرانی صاحب نے توجہ فرما کر اس کی تصحیح میں کوشش کی ہے مگر نتیجہ انہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"قدم قدم پر صاحب مضمون کی بدحواسی عیاں ہے۔ کتبوں اور تصاویر کی فہرست ہی اول تو نامکمل دی ہے اور بیان بہت کچھ تشنہ ہے۔ دوسرے داراشکوہ کا دیباچہ اس سے بھی بدتر حالت میں ہے۔ چغتائی صاحب کے جنی خط کے پڑھنے میں خاصہ کاوش سے کام لیا گیا ہے مگر پھر بھی میں عہدہ برآ نہ ہوسکا۔ آپ خود دیکھ لیں، مجھے جگہ جگہ استفہامیہ سے کام لینا پڑا ہے۔ آخری اشعار کو بصورت نثر لکھا ہے۔ دیباچے کی عبارت کئی جگہ سے غیر مربوط ہے، جس میں ربط پیدا کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ چغتائی صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اسے نگارستان منیر کے خاتمے سے نقل کیا ہے لیکن مجھے منیر کی کوئی تصنیف، جو نگارستان کہلاتی ہے، معلوم نہیں۔ "کارستان منیر" میرے پاس ہے مگر اس میں یہ دیباچہ موجود نہیں اور نہ وہاں کوئی اس کا موقعہ ہے۔ ممکن ہے کہ منیر کی انشا میں ہو۔ میں نے تو "نگار نامہ" بھی اٹھا کر دیکھ لیا۔ اس میں صرف خطوط ہیں اور کچھ نہیں۔"

ان حالات میں مضمون سے پورا فائدہ اٹھایا نہیں جاسکتا۔ تاہم چغتائی صاحب کی محنت

کو سرتاسر ضائع کر دینا بھی مناسب معلوم نہیں ہوا اس لیے اس کو ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ "ایڈیٹر"

تنقید و تبصرہ

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت نومبر سنہ ۱۹۳۷ء)

اس شمارے میں سات مطبوعات پر تبصرے شامل ہیں۔ خصوصیت یہ ہے کہ ہر تبصرے کے بعد مبصر کا نام دیا گیا ہے (اگرچہ فہرست میں صرف "ادارہ" درج ہے) یہ آخری تبصرہ (نمبر ۷) شیرانی صاحب کے قلم سے ہے چنانچہ خلاف معمول اس کے اختتام پر یہ الفاظ ملتے ہیں:

"(حافظ) محمود شیرانی، پروفیسر اورینٹل کالج، لاہور" (مرتب)۔

"الموسیٰ" (یادگار ولی)

بابت خورداد سنہ ۱۳۴۶ فصلی۔ "الموسیٰ" طلبہ یونیورسٹی کالج حیدر آباد (دکن) کا علمی و ادبی رسالہ ہے۔ یہ خاص نمبر یادگار ولی ہے جو بہ تقریب جشن دو صد سالہ، آدم ریختہ سید محمد ولی اورنگ آبادی المتخلص بہ ولی شائع ہوا ہے۔ یادگار ولی منانے کی تحریک ابتدا میں سٹی کالج کی بزم ادب کی طرف سے شروع ہوئی اور ایک مجلس منتظمہ بنادی گئی جو جامعہ عثمانیہ و سٹی کالج کے بعض اساتذہ پر مشتمل تھی۔ اس مجلس نے حیدر آباد و بیرون حیدر آباد کے سربر آوردہ اہل قلم کو اس موقع پر علمی اعانت و تعاون کی دعوت دی اور مختلف جامعات کے میلسانی و غیر میلسانی طلبہ سے "اردو شاعری میں ولی کا رتبہ" کے موضوع پر مسابقتی مضامین لکھنے کی درخواست کی۔ اس کے علاوہ دکنی اردو کے مخطوطات اور قدیم تصاویر کی نمائش کا اہتمام کیا۔ یوم ولی کا پہلا اجلاس بہ صدارت نواب سالار جنگ بہادر ۴ فروری یوم چہار شنبہ کو ساڑھے چار بجے شام منعقد ہوا۔ سب سے پہلے نمائش کا افتتاح کیا گیا۔ اس کے بعد اجلاس میں اطراف ہند سے مختلف ارباب علم کے پیامات پڑھے گئے پھر نظمیں اور مقالے سنائے گئے۔

دوسرے دن کا اجلاس ساڑھے آٹھ بجے صبح سے بارہ بجے تک رہا۔ اس کی صدارت

نواب مہدی یار جنگ نے فرمائی۔ یہ ولی کی کرامت سے کم نہیں کہ وفات سے دو سو سال بعد اپنے ابنائے وطن سے خراج تحسین وصول کیا۔

یہ خاص نمبراس دو روزہ کاروائی کی روئداد ہے جو چونتیس مقالات و نظموں اور ۲۷۲ صفحات پر شامل ہے۔ اکثر مقالے دکن کے بلند پایہ و معروف ارباب قلم کے نوشتہ ہیں اور ولی کے حالات و سوانح حیات' اس کی وطنیت و شاعری اور تلامذہ' نیز اس کی سیرت کے دیگر پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ نظموں میں سید سکندر علی صاحب وجد اور غلام طیب صاحب پیام اور مولوی مخدوم محی الدین صاحب کی نظمیں اپنے حسن تخیل' نزاکت ادا و اسلوب بیان کے لحاظ سے ارباب ذوق سے خراج تحسین وصول کریں گی۔

نمائش میں تقریباً" پانچ سو مخطوطات' جو تمام تر دکنی زبان سے تعلق رکھتے تھے' منظر عام پر لائے گئے تھے۔ ان میں سے ۳۲۵ ایسے نسخوں کی ایک فہرست جو نمائش سے دو روز قبل تک وصول ہوچکے تھے' شامل روئیداد ہذا ہے۔ باقی کتابیں جو بعد میں آئیں بدقسمتی سے درج فہرست نہ ہوسکیں۔ قدامت کے لحاظ سے مثنوی خوب ترنگ نوشتہ سنہ ۱۰۱۰ھ ' سیف الملوک و بدیع الجمال از ملا غواصی نوشتہ ۱۰۶۷ھ ' سب رس از ملا وجہی نوشتہ ۱۰۷۳ھ اور پھول بن از ابن نشاطی نوشتہ ۱۰۷۶ھ قابل ذکر ہیں۔ نمائش میں ایک سو قلمی تصاویر قدیم و جدید بھی شامل تھیں جن میں سلاطین قطب شاہیہ و عادل شاہیہ اور ان کی بیگمات' صوفیہ و اولیاء' خانوادۂ آصفیہ' اور ان کے درباری عمائدین اور شہزادگان کی تصاویر شامل تھیں۔ ہندوستان میں شاید یہ پہلا موقع ہے۔ جو اتنے بڑے پیمانے پر نمائش دکنی قلمیات کی کی گئی ہے۔

طبقہ صوفیہ اپنے بزرگوں کے عرس قدیم سے مناتا چلا آرہا ہے۔ قدیم اساتذہ کی یادگار منانے کی رسم گو جدید ہے مگر نہایت مبارک ہے۔ اس سے ہم میں صحیح وجدان ترقی پاتا ہے اور بیداری کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ صحیح وطن پرستی اسی کا نام ہے۔ اس مغرب زدگی کے دور میں ایسی تقریبات کا بروئے کار آنا نہایت مبارک فال ہے۔

رسالہ ہذا نہایت اعلیٰ کاغذ پر چھپا ہے۔ جابجا بلاک کی تصاویر سے' جو تعداد میں چوبیس

ہیں' اس کی دل کشی میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس۔ قیمت فی پرچہ دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: دفتر "المو سی" سٹی کالج' حیدر آباد (دکن)

تنقید و تبصرہ

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت مئی سنہ ۱۹۳۸ء)

اس شمارے میں شیرانی صاحب کے تحریر کردہ دو تبصرے شامل تھے۔ پہلا "ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء" از ڈاکٹر اقبال حسین پر جامع تبصرہ جو "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم کا پہلا مضمون ہے۔ دوسرا مختصر تبصرہ یہاں درج کیا جارہا ہے۔ ان دونوں تبصروں کے آخر میں "شیرانی" کا پہلا حرف "ش" دیا ہوا ہے۔ ان دونوں کے بعد "مکاتیب غالب" پر مولانا غلام رسول مہر کا اور "فہرس کتب خانہ سٹی کالج" پر سید محمد عبداللہ کا تبصرہ چھپا ہوا ہے۔ (مرتب)

"فارسی ادب کی تلمیحات و اشارات"

برائے امیدواران امتحانات یونیورسٹی از میٹرک تا ایم اے' بزبان انگریزی از جناب زال شہریار رستم ایرانی' بی۔ اے' بی۔ ایس۔ ٹی۔ سی' مدرس فارسی سینٹ میریز ہائی سکول بمبئی نمبر ۱۰

اس رسالے میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فارسی ادب کی مستعملہ تلمیحات مذہبی' تاریخی و افسانوی مع ضروری تشریح درج ہیں جن کا جاننا ہر فارسی آموز کے لیے لازمی ہے۔ جو لوگ انگریزی کے ذریعے فارسی سیکھتے ہیں' ان کے لیے رسالہ ہذا بڑی حد تک مفید ثابت ہوگا۔ اس کے ترپن صفحات ہیں' جن میں تین سو چودہ تلمیحات کی شرح دی گئی ہے ان میں ایک چوتھائی ایسی ہیں جو مکرر آئی ہیں۔ اصطلاحات پہلے فارسی خط میں بعدہ' انگریزی خط میں دی ہیں۔ انگریزی تلفظ میں ہمارے خیال میں بہت کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۹ پر "مہر گیاہ" کو "meher-e-giyah" ' "ناقہ صالح" کو "Naqa-ye-salah" اور "نامہ سیاہ" کو "Nameh-ye-siyeh" اور "نخشب"

کو "Nakh-shab" قلم بند کیا ہے۔ بعض اوقات اسی لفظ کے ایک سے زیادہ تلفظ دیئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۷ میں سبکتگین کو سبکتگین Sabaktagin اور صفحہ ۱۳۹ میں سبکتگین Sabuktegin تحریر کیا ہے۔ اگر کوئی بدگمان اعتراض کرے تو زال شہریار رستم صاحب ایرانی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے دو تلفظ دیئے اور تم دونوں سے مطمئن نہیں۔ اور سچ بھی تو ہے آخر آٹھ آنے میں' جو اس رسالے کی قیمت ہے' اور کتنے تلفظ دیئے جاتے۔ بابل کے متعلق بھی جناب مولف نے تسامح سے کام لیا ہے یعنی صفحہ ۳۱ میں بابل (Babol) اور صفحہ ۳۰۱ میں بابل (Babul) اور صفحہ ۳۰۱ میں "بابلی" کو "Baboli" رقم کیا۔ تلفظ میں ایسا تصرف انگریزی خواں ہندوستانی کیا کم کیا کرتے ہیں' پھر ہم کس منہ سے مولف کی' جو ایرانی ہیں' شکایت کریں۔

چغل خوری اخلاقی لحاظ سے ایک بدنما عیب ہے مگر تبصرہ نگار میں ہنر' اس لیے ہم مبصر کے اس مبارک وصف یعنی غمازی سے کام لے کر عرض کرتے ہیں کہ صاحب رسالہ کے نزدیک صفحہ ۱۴۰ میں "دم عیسیٰ" اور "مسیحادم" ایک دوسرے کے مرادف ہیں صفحہ ۱۱۴ میں "رستم دستان" کو بلا اضافت لکھا ہے۔ مصنف کی رائے میں جو سفید ہاتھی رستم نے ہلاک کیا تھا وہ پادشاہ کا تھا اگرچہ فردوسی کی روایت سے خود سپہدار زال یعنی رستم کے باپ کا تھا:

که پیل سپید سپہبد زبند رہا گشت و آمد بمردم گزند

اسی طرح اسفندیار مولف کے نزدیک ایران کا بادشاہ ہے۔ حالانکہ تخت ایران کے ارمان میں وہ رستم سے جنگ کرکے مارا جاتا ہے۔ صفحہ ۲۹ میں ایاز کو محمود کا حبشی غلام بتایا ہے اگرچہ ہمیں ایسی کوئی روایت معلوم نہیں۔ اس کے نام ایاز اویماق سے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ ترکی الاصل ہے۔ فرخی:

امیر جنگجو ایاز اویماق دل و بازوی خسرو روز پیکار

صفحہ ۱۳۹ میں سبکتگین کو غزنوی خاندان کا بانی بتایا ہے اگرچہ مورخ الپتگین کو یہ عزت دیتے ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ اور اسی قسم کی دیگر اغلاط کی، جو سرزد ہوئی ہیں صاحب رسالہ اشاعت ثانی میں تصحیح کردیں گے۔ ہم نے یہاں رسالے کی انگریزی خامیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھا ہے۔ ٹائپ اور چھپائی اعلیٰ اور آٹھ آنے میں، جو اس کی قیمت ہے، طالب علموں کے لیے یہ سودا برا نہیں۔

ملنے کا پتہ: حاجی آغا شیرازی و فرزندان کتاب فروشان، عمر کھاڑی، بمبئی نمبر ۹

تبصرہ و تنقید

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت اگست سنہ ۱۹۴۰ء)

اس شمارے میں آٹھ کتب و رسائل پر تبصرہ شامل اشاعت ہے جن میں سے پانچ انجمن ترقی اردو کی مطبوعات ہیں۔ ابتدا میں "ترانہ عشق" اور "سلطان محمود غزنوی" پر شیرانی صاحب کے تبصرے ہیں۔ اس کے بعد "حیات جاوید" پر ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کا تبصرہ ملتا ہے۔ بعد ازاں انجمن ترقی اردو کی پانچ مطبوعات پر تبصرے آتے ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

(الف) تقویم ہجری و عیسوی

(ب) تاریخ ادبیات ایران در عہد جدید

(ج) فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں

(د) انجمن ترقی اردو کی کہانی

(ہ) خمسہ کیفی

ان میں سے (ب) اور (د) پر شیرانی صاحب کے تبصرے یہاں نقل کردیئے گئے ہیں۔ باقی تینوں یعنی (الف)، (ج) اور ہ) سید صاحب کے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ سید عبداللہ صاحب کے تبصروں کے اختتام پر س - م - ع کے حروف ثبت ہیں لیکن شیرانی صاحب کا نام کہیں نظر نہیں آتا (مرتب)۔

"ترانہ عشق"

حکیم الممالک حکیم عبدالباسط المتخلص بہ عشق کا دیوان ہے، جس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں فارسی غزلیات و رباعیات ہیں اور حصہ دوم میں ان کا اردو کلام

ہے کہ وہ بھی غزلیات و رباعیات پر مشتمل ہے۔

حکیم عبدالباسط صاحب عشق ارکاٹ (مدراس) کے رہنے والے تھے اور ایک ممتاز اور ذی علم خاندان کے فرد تھے۔ شاعری ان کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد مولوی مہدی واصف اور دادا مولوی عارف الدین رونق فارسی کے ذی رتبہ شاعروں میں سے تھے اور دربار والا جاہی میں خاص عزت و منزلت رکھتے تھے۔ عشق کی پیدائش سنہ ۱۲۳۸ھ میں مدراس میں ہوئی اور سنہ ۱۳۰۲ھ میں حیدر آباد میں فوت ہوئے۔ علاوہ عربی اور فارسی ادب کے، جس کی تحصیل گزشتہ صدی تک ہر طالب فضیلت کے لیے لازمی تھی، عشق نے زبان انگریزی میں بھی کمال پیدا کیا بلکہ میڈیکل کالج مدراس میں انگریزی طب کا علم حاصل کیا اور جراحی (سرجری) میں خاص طور پر مہارت پیدا کی لیکن چونکہ طبیعت کا میلان شاعری اور ادب کی طرف تھا لہٰذا ڈاکٹری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔

عشق کے فارسی اور اردو کلام میں خاصی پختگی ہے جس کو دیکھ کر ہمیں دہلی کے آخری زمانے کے شعرا کا کلام یاد آتا ہے لیکن انگریزی دانی کے باوجود فارسی اور اردو پر ایسی قدرت کا ہونا ایک نادر مثال ہے۔ پچھلی نسل کے بزرگوں کو عربی اور فارسی کی تعلیم کچھ ایسے صحیح طریقے پر ملتی تھی کہ انگریزی ان کے خیالات پر غالب نہیں ہونے پاتی تھی۔ اب حالت بالکل برعکس ہے۔

حضرت عشق کا دیوان ان کے پوتے محمد عبدالباسط صاحب نے مرتب کیا ہے اور شروع میں ستائیس صفحے کا مقدمہ بھی لکھا ہے۔ تعداد صفحات ۱۴۳ جن میں سے ۱۰۶ صفحے حصہ اول اور ۳۷ صفحے حصہ دوم کے ہیں۔

مقام اشاعت حیدر آباد، ۱۳۵۹ھ۔

"سلطان محمود غزنوی"

از مولوی محمد حبیب صاحب بی۔ اے (آکسن)، مترجمہ سید جمیل حسین ایم۔

اے (علیگ)، حیدر آباد سول سروس۔

یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی جس کے مصنف محمد حبیب صاحب، پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہیں۔ سید جمیل حسین صاحب اب اس کا ترجمہ اردو میں کرکے پبلک کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ایک کٹھن اور دشوار مہم مانی جاتی ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں ہوا کرتا مگر قابل مترجم نے اپنا فرض نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ زبان نہایت صاف و رواں اور سہل و سادہ ہے اور سید جمیل حسین اس اعلیٰ ترجمے کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ الہ آباد اکیڈمی نے اس کتاب کی نشر و اشاعت کی ہے۔ مصنف نے اس کتاب کے دوران میں جا و بے جا موقع و بے موقع یہ رٹ لگائی ہے کہ محمود لٹیرا اور ڈاکو تھا۔ وہ ہندوستان کے مندروں کی دولت لوٹ کر لے گیا۔ علاوہ ازیں اس کے اخلاق اور چال چلن پر بھی چھینٹے اڑائے ہیں۔

محمود پر ڈاکٹر محمد ناظم کے فاضلانہ مقالے کے موجود ہونے کے باوجود حبیب صاحب کی اس کتاب کو ترجمے اور اشاعت کے لیے منتخب کرنا ہم کو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اکیڈمی نے ہیرے اور کنکر اور موتی اور پوتھ میں مطلق تمیز نہیں کی بلکہ مسلمانوں کی دل آزاری کا بیج بویا ہے۔ اکیڈمی کو معلوم رہے کہ یہ کتاب بہ حیثیت کتاب تاریخ مستند نہیں مانی جاسکتی۔ محمود پر قدیم مآخذ عربی اور فارسی زبانوں میں محفوظ ہیں اور پروفیسر حبیب ان دونوں زبانوں سے نابلد مطلق ہیں۔ ان کا دارومدار زیادہ تر ایلیٹ اور ڈوسن کے ان تراجم پر ہے جو ان مورخین کی تاریخ ہندوستان میں درج ہیں۔ ان تراجم کے متعلق پروفیسر ہودیوالا کی قابل قدر تالیف "ہندوستانی تاریخ کی تنقید" پڑھنے کے بعد ہمارا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

حبیب صاحب کا ایک اور ادبی کارنامہ حضرت امیر خسرو دہلوی کی "خزائن الفتوح" کا انگریزی ترجمہ ہے جس پر اسی میگزین میں تبصرہ ہوچکا ہے۔ بشرط فرصت ہم ارادہ کر

رہے ہیں کہ حبیب صاحب کے "سلطان محمود غزنوی" پر بھی آئندہ کسی وقت مفصل تبصرہ کیا جائے۔

ہم اپنے میگزین کے ناظرین کی خدمت میں یہ ناخوشگوار اطلاع دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے حبیب صاحب کی اس فسادی کتاب کو حوالے کی کتاب کے طور پر اپنی فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔ ع:

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است

مطبوعات انجمن ترقی اردو

"تاریخ ادبیات ایران در عہد جدید"

(سلسلہ نمبر ۱۲۵، ص ص الف تا ن + ۶۷۷)

پروفیسر براؤن کی مشہور کتاب "پرشین لٹریچر ان موڈرن ٹائمز" کا یہ اردو ترجمہ ہے جو سید وہاج الدین احمد کنتوری (جامعہ عثمانیہ) نے کیا ہے اور جس کو انجمن ترقی اردو نے گزشتہ سال میں شائع کیا ہے۔ انجمن نے پروفیسر موصوف کی تصنیف "تاریخ ادبیات ایران" کا مکمل ترجمہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے جس کی یہ چوتھی اور آخری جلد ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اب صرف دوسری جلد کا ترجمہ ہونا باقی رہا ہے۔ علمی دنیا انجمن کی اس خدمت کی بے حد ممنون ہے۔

کتاب زیر تبصرہ کو ہم نے جستہ جستہ اصل انگریزی سے مقابلہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مترجم نے اس بات کا التزام نہیں کیا کہ ترجمہ بالکل "وفاداری" کے ساتھ کیا جائے بلکہ صرف اس بات پر قناعت کی ہے کہ مصنف جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کو بطریق احسن ادا کردیا جائے، اگرچہ الفاظ کی پابندی نہ ہو۔ ہم اس بات کو کچھ ایسا قابل اعتراض نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ ایک علمی کتاب کے ترجمے کا مقصد بھی یہی

ہوتا ہے کہ مصنف کے مفہوم کی ترجمانی کردی جائے۔ ترجمے کی زبان پختہ اور صاف ہے اور کتاب کی طباعت خاصی اچھی ہوئی ہے۔

افسوس ہے کہ ترجمے میں اصل کتاب کی تصاویر کو حذف کردیا گیا ہے اور تصویریں تو خیر لیکن ان میں بعض شعراء اور مصنفین کے خطوں کے نمونے تھے جن کے فوٹو دیئے گئے تھے اور وہ قارئین کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہیں مثلاً مرزا صائب کے خط کا نمونہ۔ اور اس کے علاوہ وصال' یغما' ملا محمد باقر مجلسی' ملا صدرا' بہاالدین عاملی' ملا محسن فیض کے خطوں کے نمونے ہیں۔ ان کے فوٹو کا ترجمہ میں دیا جانا ضروری تھا۔

ایک اور بڑی فروگزاشت انڈیکس کی ہے جس کے بغیر ایک علمی کتاب اپنے فائدے اور اہمیت میں آدھی رہ جاتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اشاعت آئندہ میں ان دو خامیوں کی تلافی کردی جائے گی۔

"انجمن ترقی اردو کی کہانی"

(سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند' نمبر ۱۲۹) مرتبہ مولوی غلام ربانی (سر رشتہ آثار قدیمہ سرکار عالی)' سنہ ۱۹۳۹ء۔

انجمن ترقی اردو ملک کا نہایت مشہور علمی و ادبی ادارہ ہے جس کی سرپرستی میں اردو کی بہترین تصنیفات قدیم و جدید شائع ہوئی ہیں۔ رسالہ ہذا میں جناب مولوی غلام ربانی اس انجمن کی تاسیس اور بعد کی سرگزشت کی کہانی سناتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۳ء کے دربار دہلی کے موقع پر جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا' یہ انجمن وجود میں آئی۔ اس کے پہلے سیکرٹری مولانا شبلی نعمانی مرحوم مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کا تقرر عمل میں آیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں مولوی عزیز مرزا کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ ان کے انتقال پر قرعہ انتخاب جناب

مولوی عبدالحق صاحب موجودہ سیکرٹری انجمن کے نام پر نکلا جن کا زمانہ انجمن کی زندگی کا سنہرا زمانہ کہا جاسکتا ہے' جب انجمن ترقی اردو حقیقی معنوں میں ترقی اردو بنتی ہے اور اب تو مولانا عبدالحق اور انجمن ترقی اردو دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے ہیں اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۳ء تک انجمن صرف چھ کتابیں شائع کرسکی تھی لیکن آج اس کی مطبوعات کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے' جن میں متعدد کتابیں کئی کئی بار چھپ چکی ہیں۔ اردو زبان کے دو بہترین رسالے انجمن کے زیرِ اہتمام شائع ہوتے ہیں۔ پہلا رسالہ "اردو" ہے جس نے گزشتہ بیس سال سے اردو کی لسانی و ادبی خدمت میں حصہ لیا ہے۔ اس کے مضامین نہایت محققانہ اور انقلابی ہوتے ہیں۔ دوسرا رسالہ "سائنس" ہے جو محض علمی ہے اور اپنے دائرہ عمل میں کامیاب خدمت انجام دے رہا ہے۔

نواب عماد الملک مرحوم کی تحریک پر ابتدا میں حضور نظام نے بارہ سو روپے سالانہ کی امداد انجمن کے لیے منظور فرمائی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں سر اکبر حیدری کی کوشش سے یہ امداد پانچ ہزار روپے سالانہ کردی گئی۔ علیا حضرت مرحومہ فرماں روائے بھوپال پچاس روپے ماہوار کی مستقل اعانت کرتی رہیں۔ اس کے علاوہ اخراجات طبع کے سلسلے میں بھی یک مشت امداد فرمائی۔ گزشتہ سال کے آغاز میں سالانہ بیس نئی کتابیں شائع کرنے کی شرط پر حضور سلطان العلوم نے چھ سال کے واسطے انجمن کو پینتالیس ہزار روپے سالانہ کی بیش قیمت امداد دینی منظور فرمائی۔ جس کے ذریعے سے' ہم امید کرتے ہیں' اردو ادبیات کو بہت کچھ سرسبز اور بارور ہونے کا موقع مل جائے گا۔

آخر میں ہم انجمن کے دیرینہ سال کارواں سالار ڈاکٹر عبدالحق کی درازی عمر کے لیے دعا کرتے ہیں تاکہ انجمن کا قافلہ بخیر و عافیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔

رسالے کی قیمت چار آنے ہے اور انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے ملتا ہے۔

تبصرہ و تنقید

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت فروری نومبر ۱۹۴۰ء)

اس شمارے میں تین مطبوعات پر تبصرے کیے گئے ہیں۔ ان پر کسی کا نام نہیں دیا گیا حتیٰ کہ فہرست میں بھی نام کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ معمول کے مطابق "ادارہ" یا "ایڈیٹر" وغیرہ کچھ نہیں لکھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں مختصر تبصرے شیرانی صاحب نے لکھے ہیں (مرتب)۔

"تذکرہ بے نظیر"

تالیف سید عبدالوہاب افتخار دولت آبادی بہ ترتیب و تصحیح سید منظور علی ایم۔ اے (سلسلہ انتشارات جامعہ الہ آباد' بسلسلہ عربی و فارسی جلد اول)' سینٹ ہاؤس الہ آباد سنہ ۱۹۴۰ء' تعداد صفحات مطبوعہ ۱۶۶' طبع بحروف سربی' ملنے کا پتہ : کتابستان۔ الہ آباد' قیمت : دو روپے۔

یہ تذکرہ نہایت کم یاب تھا۔ اب الہ آباد یونیورسٹی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے۔ سید منظور علی ایم۔ اے نے سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں بہ حیثیت ریسرچ سکالر اس کو ڈاکٹر زبید احمد صاحب کی نگرانی میں مرتب کیا تھا۔ اب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کی نظر ثانی سے شائع ہوا ہے۔

تذکرۂ بے نظیر' ان شعرائے ایران و ہندوستان کا تذکرہ ہے جو بارہویں صدی ہجری کے پہلے ۷۲ سال میں ہو گزرے ہیں۔ مولف نے اس کو سنہ ۱۱۷۲ھ میں مکمل کیا۔ (مولف نے اپنا حال اور اپنے کلام کا انتخاب صفحہ ۳۳ تا صفحہ ۳۸ پر دیا ہے) اس کے اہم مآخذ حسب ذیل ہیں :

(۱) سرو آزاد۔

(۲) تذکرۃ الشعراء علی حزیں۔
(۳) حیات الشعراء محمد علی خاں متین۔

اشعار کا انتخاب مولف نے خود کیا ہے۔ تراجم نسبتاً مفصل ہیں۔ خزانہ عامرہ (تالیف آزاد بلگرامی' سنہ ۱۱۷۶ھ) اور گل رعنا تالیف لچھمی نرائن شفیق (سنہ ۱۱۸۱ھ) کے ماٰخذ میں اس کتاب کا شمار ہے (فہرست ریو' صفحہ ۹۷۷ و ۳۷۳' فہرست بانکی پور ج ۸ صفحہ ۱۲۹)۔ کتاب خانہ انڈیا آفس میں ایک ضخیم تذکرہ ۹۳۶ ورق کا موجود ہے۔ (دیکھو فہرست نمبر ۶۹۲) جس پر مولف کا نام درج نہیں ہے۔ مولف فہرست کتاب خانہ مذکور نے اس کو تذکرہ بے نظیر سمجھا مگر یہ گمان اس کا موجودہ تذکرہ سے غلط ثابت ہوتا ہے۔

یہ ایڈیشن ایک ہی نسخے پر مبنی ہے جس کی کتابت سنہ ۱۱۹۵ھ میں تکمیل ہوئی۔ اصل نسخہ خاصہ اچھا ہوگا اس لیے کہ صحت کے اعتبار سے متن اچھا ہے۔ البتہ کہیں کہیں غلطیاں نظر آتی ہیں مثلاً ص ۵ س ۱۵ پر عجالہ چاہیے (بجائے عجالہ)' ص ۶ س ۱۵ پر پیش بردہ چاہیے (بجائے بیش بردہ)' ص ۱۴ س ۹ پر "وما ھذا السیف الا لیقتلا" درست نہیں۔ کوئی لفظ رہ گیا ہے۔ شاید "وما حز ھذا السیف الخ" ہو۔ اسی صفحے کی سطر ۲۱ میں "مثل المفرو" کی بجائے "مثل المطوق" چاہیے۔ صفحہ ۷۷ سطر ۱۱ پر پرتیر چاہیے (بجائے پرتیز)' ص ۸۹ س ۸ پر دوست چاہیے (بجائے دولت)۔

"آسان اردو"

انجمن ترقی اردو' جوبلی ہل' بنجارہ روڈ' حیدر آباد دکن نے آسان اردو میں تصنیفات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس میں رسالہ ہذا کا پہلا نمبر ہے۔ یہ رسالہ خاص طور پر بالغوں کے واسطے لکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد نو آموزوں کی لیاقت اور استعداد بڑھانا اور مفید معلومات سے انہیں آگاہ کرنا ہے۔ اس نقطہ نظر سے یہ تالیف پوری کامیاب ہے۔ اس کی زبان نہایت سادہ اور سہل ہے اور تمام مطالب آسان پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔

رسالہ "آسان اردو" کے تین چار حصے ہیں۔ پہلا تاریخی جس میں مختلف مشاہیر کے حالات ہیں۔ دوسرا سماجی جس میں تین کہانیاں ہیں۔ "علمی تحریریں" تیسرے حصے کا عنوان ہے جو بجلی، ریل گاڑی، لاسلکی اور حفظان صحت پر کار آمد اور صحیح اطلاع کا حامل ہے۔ حصہ نظم میں انیس، حالی، اکبر، اقبال، غالب اور ظفروغیرہم کی نظمیں اور رباعیاں ہیں۔

مشاہیر کے حالات میں، جس کا عنوان "حالات زندگی" ہے، بعض غیر تاریخی روایتوں نے جگہ پالی ہے۔ مثلاً یہ قصہ کہ علاء الدین حسن شاہ بانی خاندان بہمنیہ نے اپنے آقا گانگو برہمن کی یاد میں اپنے آپ کو "گانگو بہمنی" کہنا شروع کیا بالکل غیر تاریخی معلوم ہوتا ہے۔ قدیم مآخذ میں اس کا کہیں مذکور نہیں۔ بہمن اور برہمن میں سوائے اس کے کہ لفظی رعایت ہو اور کوئی مناسبت نہیں۔ بہمن حسن کا نام ہے اور "بہمن شاہ" نام اس کے بعض سکوں پر بھی پایا جاتا ہے۔ عصامی کی "فتوح السلاطین" میں، جسے ڈاکٹر آغا مہدی حسین (آگرہ کالج) نے مرتب کیا ہے، حسن کے حالات میں شعر ذیل آتا ہے:

بہ سیرت فریدون و بہمن بنام
شدہ کنیتش بوالمظفر مدام

یہی نہیں بلکہ یہ خاندان اپنے آپ کو بہمن بن اسفندیار کی یادگار بتاتا ہے چنانچہ عصامی لکھتا ہے:

بہرکار چون نام خود احسن است
چراغ خوش از دودۂ بہمن است

ایک اور موقعہ پر کہا ہے:

دو صد لشکر از قوت یک تن است
کہ ہم بہمنی ہست و ہم بہمن است

فرشتہ ایک رسالے کا بھی ذکر کرتا ہے جو احمد نگر کے شاہی کتب خانے میں اس کی

نظر سے گزرا تھا۔ اس رسالے کا موضوع خاندان بہمنیہ کی اصل و نسب کی تحقیقات تھی اور لکھا تھا کہ وہ بہرام گور کی اولاد ہیں جو ساسان بن بہمن کی نسل میں تھا۔ "فتوح اسلاطین" میں، جو بہمنی خاندان کی سب سے قدیم تاریخ ہے، گانگو یا گنگو برہمن کا جو علاء الدین کا آقا کہا جاتا ہے کہیں مذکور نہیں آتا۔ "آسان اردو" میں خواجہ غریب نواز (شیخ معین الدین چشتی) کا مولد خراسان بتایا ہے حالانکہ وہ سجستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی بنا پر "سجزی" ان کی نسبت ٹھہری جسے جہلا نے "سنجری" مشہور کردیا۔ ان کا سال وفات ۶۰۶ھ لکھا ہے جو یقیناً غلط ہے۔ فرشتہ نے سنہ ۶۳۳ھ دیا ہے۔

ابوالحسن تاناشاہ کے حالات میں تاریخ عہد سے قطع نظر کرکے نعمت خان عالی کے بعض بیانات پر زیادہ اعتبار کیا گیا ہے۔ "آسان اردو" کی لکھائی چھپائی بہت دل خوش کن اور نظر افروز ہے۔ کاغذ اعلیٰ، چھوٹی تقطیع، ۸۱ صفحات اور قیمت آٹھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ۔

"ایثار"

ایک چھوٹا سا ناول نورالحسن صاحب کی تصنیف ہے جسے انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔ سلسلہ اشاعت میں اس کا نمبر ۴ ہے۔ دو دوست واجد اور محمود کثرت ازدواج پر بحث کرتے ہیں کیونکہ محمود کے چچا ابا مشتاق کو بڑھاپے میں نئی شادی کا شوق سوجھا ہے۔ واجد کے دلائل سے قائل ہوکر محمود چچا ابا کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر الٹا اثر ہوتا ہے۔ بڑے میاں اپنی ضد پر اڑ جاتے ہیں اور نئی شادی رچاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ رشتہ داروں سے قطع تعلق ہوتا ہے جن میں ان کی بڑی بیوی بدرالنسا اور بیٹی فخرالنسا بھی شامل ہیں۔ مشتاق صاحب کی نئی دلہن "ماہ لقا" ایک نہایت مغرور، خودغرض اور بے عقل عورت معلوم ہوتی ہے جو اپنی سوت اور سوت کی لڑکی کو مشتاق سے حکماً" بلواتی ہے۔ وہ نئے گھر میں آتی ہیں۔ مشتاق ڈبل نمونہ کا شکار ہوکر اس عالم فانی سے رخصت ہوتے ہیں۔ دلہن اپنے میکے واپس پہنچتی ہے۔ ادھر یک نشد دو شد،

مشتاق کے بھائی اشتیاق یعنی محمود کے والد ہیضہ کرکے راہی ملک بقا ہوتے ہیں۔ اب محمود تمام خاندان کا کفیل و مختار رہ جاتا ہے۔ واجد فخر النسا کے ساتھ اپنی شادی کے لیے محمود سے درخواست کرتا ہے۔ محمود اس رشتے کو بہت پسند کرتا ہے۔ ادھر محمود کی ماں مہر النسا' فخر النسا کو محمود کی دلہن بنانا چاہتی ہے اور محمود کو اس رشتے پر رضامندی کرنا چاہتی ہے مگر محمود واجد کے لیے کوشش کرتا ہے۔ فخر النسا محمود سے محبت کرتی ہے اور خود محمود کو بھی فخر النسا سے دلی عشق ہے لیکن محمود کو اپنے آپ اس جذبہ کی اس وقت اطلاع ہوتی ہے جب وہ واجد کا رشتہ فخر النسا سے کرچکتا ہے۔ دولہا دلہن کو ایک شادکام ازدواجی زندگی کا موقعہ دینے کے لیے محمود ایک رات گھر سے غائب ہوجاتا ہے اور ایسا غائب ہوتا ہے کہ آج تک پتہ نہیں چلا:

ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

محمود کی اس قربانی کی بنا پر افسانے کا نام "ایثار" رکھا گیا ہے لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ایسے ایثار کو انتہائی حماقت کے نام سے یاد کریں گے جس کی پاداش میں دو جانیں تادم مرگ ناشاد و نامراد زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں۔

چھوٹی تقطیع' ۷۶ صفحات' قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: معتمد انجمن ترقی اردو' بجارہ روڈ' حیدر آباد۔ دکن۔

پنجاب میں اردو

(ایک تبصرے پر تبصرہ)

(از مجلّہ "فنون" لاہور' سالنامہ ۸۱۔۱۹۸۰ء)

پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی معرکہ آرا کتاب "پنجاب میں اردو" پہلی بار سنہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب پر مولوی عبدالحق مرحوم کا مخالفانہ تبصرہ رسالہ "اردو" کے شمارہ جولائی سنہ ۱۹۲۸ء میں چھپا۔ اس جانب دارانہ تبصرے سے شیرانی صاحب کو افسوس ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر محی الدین زور قادری کے نام اپنے ۲۔ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"پنجاب میں اردو' کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے لیے آپ میرا شکریہ قبول کیجئے۔ عبدالحق صاحب کے تبصرے نے تو مجھ کو سخت مایوس کیا ہے بلکہ میں اس کو بیداد سمجھتا ہوں۔"

شیرانی صاحب کے کاغذات کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے ایک نامکمل مضمون کا مسودہ ہاتھ لگا۔ اسے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ مولوی صاحب کے "پنجاب میں اردو" پر محولہ بالا تبصرے کے جواب کا خاکہ ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ جواب کبھی تکمیل پاکر شائع نہیں ہوا (مرتب)۔

قولہ: "یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جو شخص پنجاب سے ہو یا وہاں رہ کر دہلی آئے تو وہ اپنی زبان دہلی میں رائج کردے گا۔ وغیرہ"

مولانا غزنوی دور میں مسلمانوں کے قیام پنجاب کو جو پانچویں صدی ہجری کی ابتدا سے چھٹی صدی ہجری کے خاتمہ تک رہا ہے بالکل فراموش کردیتے ہیں اور مسلمانوں

کے وہاں قیام و بود و باش وغیرہ کے قصہ کو نسیا" منسیا" قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں مسلمان ہندوستان میں آباد ہوکر ہندوستانی بن جاتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اختیار کرتے ہیں اور ہندی زبان میں وہ ترمیم شروع کردیتے ہیں جس کے اصول پر اردو زبان بعد میں نشوونما پاتی ہے مثلاً کوٹوال کا کوتوال' پانٹری کا پانی بنالیا گیا۔ مولانا کا یہ خیال محض دور از کار ہے کہ "پنجاب کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہاں کوئی زبان مستقل طور سے بن سکتی۔ وہ اس زمانہ میں اس قدر پامال رہا اور اس کی حالت ایسی ناقابل اطمینان تھی کہ وہاں اسکی توقع ہی نہیں ہوسکتی تھی۔" خدا جانے مولانا نے اس سے کیا مراد لی ہے۔

غزنوی دور میں پنجاب کو امن و سکون میسر تھا۔ مسلمان مختلف شہروں میں آباد تھے۔ لوگ کثرت کے ساتھ مسلمان ہوئے اور ہو رہے تھے حتی کہ البیرونی بھی اس ملک میں اسلام کی اشاعت کا ایسے ابتدائی زمانہ (سنہ ۴۲۳ھ) میں ذکر کرتا ہے۔ دیکھو "کتاب الہند (صفحہ ۹۱) : "وقد فسخنا الاسلام کما فتح اکثرما فی الارض الھند التی اسلو اھلھا والحمدللہ۔" یہ جملہ ہندوؤں کی بعض رسوم قبیحہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

جب بیرونی کے دور میں اسلام پنجاب میں شائع ہو رہا ہے تو اس عہد سے دو صدی بعد تو پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد بذریعہ مہاجرت از ممالک غیرو تبلیغ بہت کچھ اضافہ ہوگئی ہوگی۔ ملتان محمود کے عہد سے پیش تر ملاحدہ کے تحت حکومت تھا۔ اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ قطب الدین کے ساتھ جو لوگ دہلی جاکر آباد ہوئے وہ کون تھے۔ مولانا یہ فرض کر رہے ہیں کہ وہ سب بیرونی تھے اور ہندوستان کے نہیں تھے۔ اگر تاریخ کو بہ نظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا کا یہ خیال کہ مسلمان جو غزنی' ترکستان اور ایران سے آئے تھے اور کہ وہ پنجاب سے گزر کر دہلی میں آباد ہوگئے' واقعات کے بالکل مخالف ہے۔ اول تو ترکستان سے مسلمانوں کی آمد بہت کچھ قیاس اور مفروضہ ہے۔ یہی حالت ایران کی ہے۔ شہاب الدین کی فوجوں میں ہم بڑا عنصر خلجیوں اور افغانوں کا دیکھتے ہیں۔ لیکن جب پنجاب میں غزنوی حکومت محدود ہوچکی ہے اور

قطب الدین لاہور فتح کرلیتا ہے تو کیا یہ مان لیا جائے کہ اس کی فوجوں میں قسم کھانے کو بھی اہل پنجاب کو نہیں داخل کیا گیا تھا۔ اور آخر یہ کیوں؟ اس وقت مسلمان پنجاب کے مختلف شہروں میں لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں بیرونی اقوام کے افراد بھی تھے جو غزنوی دور میں یہاں آکر آباد ہوئے۔ اس کے علاوہ ایسے مسلمان بھی تھے جو غزنوی دور سے پیش تر ملتان وغیرہ علاقوں میں آباد تھے اور وہ بھی شامل تھے جو اسلام لے آئے تھے۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ شہاب الدین اور اس کا سپہ سالار قطب الدین اس عنصر سے جو پنجاب میں کثیر تعداد میں موجود تھا اور جو تمام بیرونیوں' ترکستانیوں' ایرانیوں اور غزنویوں کے مقابلے میں زیادہ مفید بھی تھا کیونکہ یہ لوگ اس ملک کی آب و ہوا کے عادی تھے' زبان سے اور رسوم سے واقف تھے' یہاں کے مالیات و ملکی معاملات کا تجربہ رکھتے تھے' میں دریافت کرتا ہوں کہ آخر قطب الدین ان لوگوں سے کیوں نہ کام لیتا۔ مولانا کے مفروضہ ترکستانی و ایرانی' جو اس ملک کی آب و ہوا کے عادی نہ تھے' زبان و رسوم سے اجنبی تھے' دہلی پہنچ کر اس کو کیا مفید ہوتے۔ دوسرے مولانا کو یہ بھی ثابت کرنا چاہیے تھا کہ ان ایام میں ترکستان و ایران سے لوگ بڑی تعداد میں اٹھ کر قطب الدین کے ساتھ دہلی گئے ہیں۔ ہمیں جہاں تک معلوم ہے ایسی کسی بڑی مہاجرت کا ذکر ترکستان و ایران کی تاریخ میں نہیں آتا۔ مولانا نے غریب ایرانیوں کو ناحق بدنام کیا ہے۔ وہ فوجی امور کے بالکل ناقابل تھے اور نہ فوجی خدمات ان کے سپرد ہوئیں۔ ملکی یا سول سروس سے ان کا تعلق رہا ہے۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ ترکستان و ایران سے ان ایام میں کوئی بڑی مہاجرت نہیں ہوئی (پھر) یہ لاکھوں نفوس' جو قطب الدین کے ساتھ دہلی جاتے ہیں' کہاں سے ابل پڑے۔ صرف غزنین یہ تعداد نہیں دے سکتا تھا۔ ممالک غور سے یہ لوگ نہیں آسکتے تھے۔ غور کا اور غزنین کا علاقہ نہایت مختصر ہے۔ آخر یہ تعداد کہاں سے آگئی؟ جس نے دہلی پہنچ کر ہندوستان کے اس وسیع علاقے پر جو ایک طرف گجرات سے ملحق ہے' دوسری طرف ہمالیہ کے دامن سے لگ گیا ہے' تیسری طرف خلیج بنگال تک پہنچ گیا ہے اور جس میں صوبہ دہلی' آگرہ'

اودھ' مالوا' بہار' بنگال' راجپوتانہ شامل ہیں اور جو طاقت ور ہندو راجاؤں کے ہمسایہ میں واقع تھا' کس طرح فتح کیا؟ اور کس طرح اس (پر) قابض ہوگئے؟ اور کس طرح اس کا انتظام کیا؟ میں عرض کرتا ہوں کہ ہمیں بغیر پنجاب کی امداد کے مفر نہیں۔ پنجابی' زبان سے واقف' ملک کی آب و ہوا کے لیے موزوں تھے۔ یہاں کے انتظامات' طریق جنگ کا ان کو تجربہ تھا۔ اس لیے شہاب الدین اور اس کے جنرل قطب الدین نے ان لوگوں سے یقیناً کام لیا۔ ایک سوال یہ باقی رہتا ہے کہ آیا پنجابی فوجی خدمات کے لیے موزوں تھے؟ اس کے لیے عرض ہے کہ یہ قوم جنگ جوئی کے لیے ہمیشہ نامور رہی ہے۔ پنجاب کے جاٹ اور جنجوئے اور کھوکھر جنگی کارناموں کے لیے مشہور ہیں۔ محمود نے پنجابیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ غزنین میں ان کی ایک فوج مقیم تھی۔ اس کے فرزند نے انہیں کرمان بھیجااور نیا تگین کی سرکوبی کے لیے یہ لوگ تلک کی ماتحتی میں ہندوستان بھیجے گئے۔ جب خود سلطان محمود پنجابیوں کی جنگی استعداد کو مانتا ہے اور ان کو اپنی ترک و افغان و عرب افواج کے ساتھ شامل کرتا ہے تو ہم یقین کرسکتے ہیں کہ اس کے اخلاف و اعقاب نے کیا ان لوگوں سے کام نہیں لیا ہوگا؟ پھر شہاب الدین اور قطب الدین کیا ان سے کام نہ لیتے؟ ہمارے اپنے زمانے میں افواج ہند کا غالب عنصر پنجابی ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں: "مسلمان جو ترکستان و ایران و غزنین سے اٹھ کر آئے تھے ان کی زبان فارسی تھی اور آپس میں یہی زبان بولتے تھے۔ نوکر چاکروں سے جو مقامی زبان میں ایک آدھ فقرہ بول لیا جاتا ہے اس کی حالت جیسی کچھ ہوتی وہ ظاہر ہے۔ جسے اس کی شان دیکھنی ہو وہ کسی انگریز کو اردو بولتے ہوئے دیکھ لے۔"

مولانا کا یہ استدلال نہایت عجیب و غریب ہے۔ اول تو میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ دہلی کے آباد کاروں میں غالب عنصر ایرانیوں اور ترکستانیوں کا تھا۔ ایرانیوں اور ترکستانیوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ لوگ اپنے ممالک سے اٹھ کر یہاں آتے۔ ایران پر خوارزم شاہیوں کا قبضہ تھا اور خود ان کو فوجی خدمات کے لیے آدمیوں کی

ضرورت تھی۔ اب ترکستانی اور ایرانی، جو سرد ملک کی آب و ہوا کے عادی ہیں، یہاں کیوں آتے جب کہ خود ان کے ملک میں ان کے لیے ان خدمات کی ضرورت تھی۔ ویسے جو لوگ ہمیشہ نقل مکانی کرتے رہتے تھے ان کو کسی شمار میں نہیں آنا چاہیے اور نہ وہ آبادی کا نمایاں عنصر بن سکتے۔

انگریزوں کی مثال بالکل بے محل ہے اس لیے کہ اکثر مالی و ملکی ملازمتیں خود ہندوستانیوں کے پاس ہیں۔ دوسرے جب ہندوستانیوں نے انگریزی سیکھنی شروع کر دی ہے تو ان کو کیا ضرورت ہے کہ ہندوستانی زبان سیکھیں لیکن غزنویوں اور غوریوں کا زمانہ بالکل مختلف تھا۔ ہندوؤں کی آبادی، اس عہد کے ہندوؤں کے برخلاف، مفتوح ہونے کی حالت میں بھی بالکل قدامت پرست تھی۔ انہوں نے تبدیلی حکومت کے باوجود اپنی معاشی و داخلی زندگی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ آج جب کہ چند لاکھ صاحب بہادروں کی خاطر تمام ہندوستان انگریزی سیکھنے پر آمادہ ہے اور اپنی داخلی و خارجی زندگی میں ہر قسم کے انقلاب کو ترتیب دے رہا ہے، اس عہد کا ہندو اپنی روایات قدیمہ کا پابند تھا۔ اس نے ایک اجنبی سلطنت کا جوا اپنے سر پر لے لیا لیکن اور امور میں اس نے سلطنت کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔ اس نے اجنبی سلطنت کی زبان سیکھنے یا سلطنت کے عہدے مانگنے کی مطلق خواہش ظاہر نہیں کی۔ اس کا جہاں تک بس چل سکا عدم تعاونی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فاتحین کو باوجود طاقت کے مختلف امور میں مفتوحین کے قواعد و ضوابط کو اختیار کرنا پڑا۔ سکہ میں بھی انہوں نے تین صدیوں تک مفتوحین کے جذبات کا احترام کیا۔ محمود کے جانشینوں نے ہندوستان میں جو سکہ جاری کیا تھا اس میں ایک طرف سوار اور دوسری طرف نندی بیل ہوتا تھا اور دونوں طرف یا ایک طرف سنسکرت الفاظ منقوش ہوتے تھے۔

زبان کی بھی یہی حالت تھی۔ فاتح گروہ مفتوحین کی زبان سیکھنے پر مجبور تھا۔ یہی نہیں بلکہ خود فاتحین میں ایسی جماعتیں تھیں جو مختلف زبانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ مثلاً ترک، افغان، خلج، ایرانی، عرب، ہندی مسلمان اور ہندو اپنی اپنی مختلف بولیاں بولتے

تھے۔ ایرانیوں کے سوا باقی جماعتیں فارسی سے ناواقف تھیں۔ یہی حالت عربی کی تھی۔ یہی حالت ترکی کی تھی۔ اب ایک ایسے مجموعہ اضداد کے لیے ایک ایسی زبان درکار تھی جس میں وہ خود گفتگو کرسکیں اور ان کی رعایا بھی جانتی ہو۔ اس لیے اس ملک میں آکر فاتحین کو شروع ہی سے یہاں کی کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرلینی پڑی ہے۔

پگ، مٹھ، انب، گڈی، تل وغیرہ الفاظ کے متعلق جو اب اردو میں پاگ، ماٹھ، آنب، گاڑی اور تال بن گئے ہیں، مولانا کا یہ خیال کہ دونوں صورتوں میں بولے جاتے تھے اور اب بھی بولے جاتے ہیں، فرق یہ ہوا ہے کہ ایک صورت ادبی زبان میں ترک ہوگئی اور دوسری قائم رہی، میں تسلیم نہیں کرسکتا۔ اول تو ہمیں جہاں تک علم ہے کسی ایک شہر یا قصبہ یا گاؤں میں ان دونوں لہجوں کا بولا جانا کہ پگ بھی کہتے ہوں اور پاگ بھی، مٹھ بھی کہتے ہوں اور ماٹھ بھی، انب بھی کہتے ہوں اور آنب بھی وغیرہ وغیرہ نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے ہندوستان بڑا ملک ہے۔ مولانا کچھ متعین فرمادیتے کہ کونسے علاقے میں دونوں لہجے جاری ہیں تو اور بھی اچھا معلوم ہوتا۔

لیکن یہ مان کر کہ ان ایام میں دہلی میں دونوں قسم کے لہجے رائج ہیں، ہم قدرتاً" یہ توقع کریں گے (کہ) اس دور کے مصنف، جب کہ ابھی زبان فصیح کا معیار قائم نہیں ہوچکا تھا، ان الفاظ کو دونوں طرح ہی سے تحریر میں لاتے مثلاً کھاٹ بھی لکھتے اور کھٹ بھی، پاگ لکھتے اور پگ بھی، بھانڈ لکھتے اور بھنڈ بھی، مگر امیر خسرو، ضیا برنی، محمد کرمانی کے ہاں جو آٹھویں صدی کے مصنفین ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ الفاظ لک، پگ اور کھٹ بار بار ملتے ہیں لیکن یہ بزرگ ہر بار اسی شکل میں لکھتے ہیں اور کبھی بھول کر بھی لاکھ، پاگ اور کھاٹ نہیں لکھتے۔ حالانکہ یہ لہجہ بھی دہلی کے ہندو آبادی سے رات دن سننے میں آتا ہوگا۔

حضرت مولانا نے اپنی سنسکرت شناسی کا بے جا استعمال کیا ہے۔ ہمیں آم اور مونگ کی اصل سے کوئی تعلق نہیں، نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان کی زندہ زبانوں سے تعلق میں آئے

سنسکرت سے براہ راست ان کو کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس لیے جو ہندی الفاظ انہوں نے اپنے لیے لیے ہیں ہندوستان کی زندہ زبانوں سے لیے ہیں۔ مثلاً میں بھی یہی دو لفظ "انبہ" اور "منگ" لیتا ہوں جس کو ساتویں صدی کے مصنفین اسی شکل میں لکھتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ آم کو سنسکرت میں انبہ کہتے ہیں' اسی سے انب ہوا اور اسی سے آم۔ مونگ سنسکرت میں مدگ ہے اور اسی سے مونگ اور منگ بن گیا۔ جامن کو سنسکرت میں جمبو کہتے ہیں' اسی سے جامن اور جمو ہوگیا۔ یہ استدلال ایک فرہنگ نگار کے لیے موزوں ہے نہ اردو کے مورخ کے لیے۔ مانا کہ یہ الفاظ بالواسطہ سنسکرت سے لیے گئے ہیں لیکن بحیثیت اردو زبان کے مورخ کے ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ یہ بھی دکھائیں کہ مسلمانوں نے یہ الفاظ کہاں سے لیے ہیں؟

اب سنسکرت میں بھی انبہ ہے اور پنجابی میں بھی انبہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فارسی والوں نے یہ لفظ براہ راست سنسکرت سے نہیں لیا ہے بلکہ پنجاب سے۔ یہی حالت مونگ کی ہے۔ پرانے فارسی خواں اس کو منگ لکھتے ہیں لیکن یہ لہجہ پنجاب کا ہے اس لیے یہ کیوں نہ مان لیا جائے کہ یہ لفظ پنجاب سے لیا گیا ہے۔ میں ایک اور لفظ مثال میں پیش کرتا ہوں یعنی "دند" جو ابوالفرج رونی کے شعر ذیل میں آتا ہے:

بشکل فیل یک دندش نگہ کن
نعم چون فیل یک دندش مرار است

اس بیت میں لفظ "دند" تشریح طلب ہے۔ صاحب فرہنگ رشیدی نے کہا ہے کہ یہ ہندی ہے۔ فرہنگ آنند راج میں مرقوم ہے: "گویا این مفرس دنت باشد کہ لغت ہندی است" مولانا عبدالحق پھر اپنی سنسکرت کا "دنتک" پیش کریں گے لیکن ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ ابوالفرج لاہوری ہیں اور "دند" بمعنی دانت لاہوری لہجے میں لکھ دیا ہے۔ "پیل یک دند" سے شاعر کی مراد "اک دنتا ہاتھی" ہے۔ اب مولانا پھر یہی فرمائیں گے کہ ان الفاظ کو پنجابی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

مگر ایک ایسے بزرگ کو کیا کہا جائے جو یہ کہہ دے کہ: "آٹھویں اور نویں صدی

کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں اور فارسی لغات بھی اس معاملے میں مستند نہیں ہو سکتیں۔" آخر کیا صرف مولانا کو اس بارہ میں سند مان لیا جائے؟ حالانکہ فارسی کتابیں و لغات ان ایام میں اردو کے وجود کے لیے (ایسے زمانے کے واسطے جب کہ اس زبان کی تحریری دستاویزیں موجود نہیں) سب سے بہتر شہادت پیش کرتی ہیں، لیکن مولانا ان کو بھی نہیں مانتے۔

اردو اور پنجابی صرف و نحو کی مشابہت اور تعلقات کا سب سے بہتر مطالعہ یہی ہے کہ ہم ان میں جو کچھ جزو مشترک ہے اس کو معلوم کرلیں۔ مولانا نے اس کے مختلف فیہ عنصر کو لے کر فرمایا ہے کہ ان میں یہ اختلاف موجود ہے۔ یہ تو کسی کا بھی دعویٰ نہیں ہے کہ دونوں زبانیں ایک ہیں۔ آخر جب دو زبانیں ہیں تو اختلاف لازمی ہے اور اگر ہر امر میں ایک دوسرے کے موافق ہوتیں تو پھر یہ سوال ہی کاہے کو اٹھتا۔ مولانا اگر صحیح دلیل پیش کرنی چاہتے تھے تو چاہیے تھا کہ ہندوستان کی کوئی ایک زبان لے کر اردو کا مقابلہ کرکے فیصلہ کرتے کہ اردو فلاں زبان سے نکلی ہے یا اس کے قریب ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اردو سے زیادہ پنجابی سے قریب تر کوئی اور زبان نہیں ہے ورنہ یوں تو ہندوستان کی زبانیں خاصی ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ جو تھوڑی بہت مشابہت اردو اور پنجابی میں پائی جاتی ہے وہ اردو کا اثر ہے نہ پنجابی کا۔ میں اس کے ماننے کے لیے تیار ہوں۔ اردو کا اثر آخری زمانے میں گویا مغلیہ عہد میں، میں کہتا ہوں نہ صرف پنجابی پر رہا ہے بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں پر بھی رہا ہے۔ اور کیا وجہ ہے کہ دارالسلطنت کی زبان دوسری زبانوں پر اپنا اثر نہ ڈالتی۔ لیکن اس سے اردو اور پنجابی کی مماثلت کا (مسئلہ) پورا حل نہیں ہوتا۔ ان زبانوں کی مماثلت ماہرین لسانیات کے لیے بہت کچھ تعجب خیز ہے۔ مولانا تو صرف تھوڑی بہت مشابہت کے قائل ہیں لیکن پیمائش لسانیات کے ماہر سر جارج گریرسن دونوں زبانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر ان کی بڑی مماثلت کے قائل ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ صرف اسی بنا پر انہوں نے پنجابی زبان کو ہندوستانی زبانوں کی مرکزی تقسیم میں شامل کرلیا ہے اور لہندا کو خارجی دائرہ میں رکھا ہے۔ اگر ان کے پاس

پنجابی اور اردو کا قدیم ذخیرہ موجود ہوتا' جیسا کہ ہمارے پاس ہے' تو وہ قطعاً" ان دونوں زبانوں کو ایک ہی اصل ثابت کرتے۔ پنجابی اور اردو کی مماثلت صرف اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ سنسکرت سے متخرج ہیں۔ مولانا اس مماثلت کو اردو کے اثر سے یاد کرتے ہیں لیکن یہاں پھر ایک سوال ہوتا ہے کہ اردو آخر کوئی قدیمی زبان تو ہے نہیں جو مسلمانوں کی آمد سے پیش تر ہندوستان میں موجود تھی بلکہ یہ نتیجہ ہے ہندوستان میں اس انقلاب کا جس کو ہم ہندوستان میں مسلمانوں کے توطن سے تعبیر کرتے ہیں۔ پنجابی' اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل موجود تھی یا دوسرے لفظوں میں اردو کی آمد سے پہلے سے رائج تھی۔ (اب) بظاہر حالات تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرانی زبان ایک نئی زبان پر اثر ڈالے اور اس کی شہادت بھی ہمیں بعض محاوروں میں ملتی ہے۔ مثلاً ان اردو کے محاورات کو لیجیے : مانگنا تانگنا' دن دہاڑے' چپ چپاتے اور ہلنا جلنا' جن کے آخری حصوں کو اہل اردو تابع مہمل مانتے ہیں لیکن جب ہم پنجابی زبان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ مہمل نہیں ہیں بلکہ بامعنی' چنانچہ تانگنا کے وہی معنی ہیں جو مانگنا کے ہیں۔ دہاڑا دن کے معنوں میں اور چپاتا چپ کے اور جلنا چلنے کے معنوں میں آتا ہے۔ اب اگر یہ اردو کا اثر پنجابی پر ہوتا تو اردو ان الفاظ کی تشریح کر سکتی تھی لیکن جب اردو ان کے معنوں ہی سے ناواقف ہے اور پنجابی تشریح کر رہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ پنجابی کا اردو زبان پر اثر ہے۔ (اور) محاورے کیا' افعال میں بھی یہی صورت موجود ہے۔ "کھڑنا" پنجابی میں مصدر ہے جس سے اسم مفعول "کھڑا" بنا۔ اردو میں صرف کھڑا مستعمل ہے اور مصدر ہونے یا کرنے کے ساتھ یہ ترکیب بنایا جاتا ہے مثلاً کھڑا ہونا یا کھڑا رہنا وغیرہ۔ اس صورت میں کیا وجہ ہے کہ پنجابی کا اردو پر اثر نہ مانا جائے۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ : "جس طرح اردو مسلمانوں کی ایک عام زبان بن گئی تھی ..... اسی طرح ہندوؤں میں ہندی عام زبان تھی۔" یہاں مولانا نے بہت کچھ قیاس سے کام لیا ہے۔ آخر ہندوؤں میں یہ کونسی ہندی زبان تھی؟ راقم کو اس کی مطلق اطلاع نہیں۔ مولانا کو یہ امر واضح (ہو) کہ یہ ہندی' جو آج کل اردو کے مقابلے

میں لاکھڑی کی گئی ہے' صرف ڈاکٹر گل کرائیسٹ کے دماغ کا نتیجہ ہے ورنہ ان کے عہد سے پیش تر اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

"سی" علامت مستقبل کے سلسلے میں مولانا نے کافی تحقیقات کی ہیں۔ وہ سنسکرت تک پہنچے ہیں۔ اس کے بعد اس کو مختلف زبانوں مثلاً گجراتی' مشرقی راجستھانی' رجوائی' بھوج پوری اور سوراسینی اور اپ بھرنش وغیرہ میں (تلاش کرکے) اس کی مختلف شکلوں سے بحث کی ہے اور پھر مولانا نے اسی امر پر زور دیا ہے کہ یہ علامت پنجاب سے نہیں آئی بلکہ اس کی اصل سنسکرت ہے۔ لیکن آخر اردو میں یہ علامت کونسی زبان سے آئی؟ یہ سوال بدستور باقی رہتا ہے۔ یہ امر تو بدیہی ہے کہ مسلمان ایران و ترکستان سے تو اسے لے کر نہیں آئے۔ اسی طرح یہ امر بھی صاف ہے کہ سنسکرت سے انہوں نے (اسے) براہ راست نہیں لیا۔ اور مولانا میرے ساتھ اس امر میں بھی (غالباً) متفق ہوں گے کہ (اس کو) رجوائی اور بھوج پوری یا گجراتی سے بھی انہوں نے نہیں لیا۔ اور جب پنجابی سے بھی مولانا کو انکار ہے تو آخر یہ علامت آئی کہاں سے؟ مشرقی راجستھانی میں یہ علامت زیادہ تر شی' شو' شاں ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ اردو سے یہ علامت پنجابی میں گئی ہے؟

اسی طرح متروک امر کی علامت کھائیں' جائیں ہے جو پھر اردو اور پنجابی میں عام ہے۔ مولانا پھر وہی سنسکرت کو آگے دھریں گے اور تمام زبانوں کی گردان شروع کردیں گے۔

میرے نزدیک ان سب (باتوں کا) کا ایک ہی حل ہے کہ اردو نے جہاں سے سی اور گا مستقبل' الف آخر اسم میں' نے علامت فاعلیت' ان جمع کے لیے لیا ہے وہیں سے "ایں" امر بھی لیا ہے اور اگر یہ امور پنجابی اور اردو میں عام ہیں تو یقیناً اردو پنجاب سے ہے اور اگر بھوج پوری اور اردو میں عام ہیں تو یقیناً بھوج پوری سے اردو نکلی ہے اور باقی بحث بالکل فضول ہے۔

اردو شہ پارے

(ایک ناتمام تبصرہ)

یہ مسودہ جو شیرانی صاحب کے اپنے قلم کا نوشتہ ہے ان کے کاغذات میں ملا ہے۔ جگہ جگہ قطع و برید کی گئی ہے اور جابجا خلا چھوڑ دیئے گئے ہیں جن کا اظہار نقطوں اور خطوں سے ہوتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ تبصرہ کے خیال سے کچھ نکات مختصراً تحریر کیے ہیں جو کسی قسم کی تمہید اور ضروری تفصیل سے عاری ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین زور قادری کی تالیف "اردو شہ پارے" (جلد اول) پر شیرانی صاحب نے اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۳۰ء) میں تبصرہ کیا تھا جو مقالات حافظ محمود شیرانی کی پہلی جلد میں شامل ہے۔ زیر نظر غیر مطبوعہ تبصرہ بھی اسی تالیف پر لیکن پہلے سے بالکل مختلف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زور معاصرین کی تصنیفات سے خوشہ چینی کا اعتراف کرنے میں بڑا بخل کرتے تھے۔ شیرانی صاحب اور مولوی عبدالحق دونوں کو ان سے یہ بڑی شکایت تھی۔ چنانچہ شیرانی صاحب "اردو شہ پارے" پر اپنے مطبوعہ تبصرے میں لکھتے ہیں:

"دوسرے لوگوں کی محنت اور کاوش دماغی سے فائدہ اٹھانا اور شکریہ درکنار استفادہ کے اظہار تک سے گریز کرنا ایک عجیب طریقہ ہے جو نہ مغربی کہا جاسکتا ہے اور نہ مشرقی۔ شہ پارے کا مصنف سب سے زیادہ مولوی عبدالحق کے مضامین سے خوشہ چینی کر رہا ہے اور اس کے بعد اردوے قدیم سے لیکن اس نے اپنی زلہ ربائی کا اقرار قسم کھانے کو بھی نہیں کیا البتہ اس نے اپنے پیش رووں کی لغزش اور فروگزاشت کا ذکر ضرور کیا ہے مثلاً....." (مقالات، جلد اول، صفحہ ۳۰۱)۔ ڈاکٹر زور

صاحب نے "پنجاب میں اردو" سے بھی پورا پورا استفادہ کیا تھا لیکن شیرانی صاحب اپنی فطری حیا اور وضع داری کی بنا پر اس کا کھل کر اظہار نہ کرسکے۔ لہٰذا اس دوسرے تبصرے میں، جو مکمل نہ ہوسکا، اپنی جھونجھل اتارنا چاہتے تھے۔ تبصرے کے ایک فقرے میں "مخزن کے ناظرین" کے الفاظ آتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے رسالہ مخزن میں شائع ہونا تھا۔ لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ تبصرے میں خود شیرانی صاحب نے اپنے لیے صیغہ غائب استعمال کیا ہے یعنی تکمیل کے بعد یہ تبصرہ کسی اور شخص کے نام پر شائع ہوتا (مرتب)۔

صفحہ ۹: "شاہ ارسلان بن مسعود حاکم لاہور اور سلطان ابراہیم سنہ ۴۵۱ھ کے زمانہ کا شاعر تھا"..... "مسعود لاہور کا باشندہ تھا اور جس وقت مسلمانوں نے دہلی فتح کی اس وقت بقید حیات تھا".... "امیر خسرو البتہ اس عہد میں تھا۔"

یہ طرز بیان کہ خواجہ مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کو بہ صیغہ واحد غائب لکھنا ہندوستانی آداب صحبت کے خلاف ہے۔ اس قدر صاحبیت ابھی تک اردو خواں پبلک میں سرایت نہیں ہوئی ہے۔

صفحہ ۱۰، بہ ذکر امیر خسرو: "چنانچہ خسرو نے بھی ان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور پنجاب میں اور دہلی کے اطراف و اکناف جو بولیاں اس وقت مروج تھیں ان کے نام گنائے ہیں۔"

یہ فقرہ عجیب گول مول ہے۔ آخر خسرو نے کہاں ان بولیوں کے نام گنائے ہیں جو پنجاب اور دہلی کے اطراف میں مروج ہیں؟

مصنف نے سنین کے متعلق کوئی التزام نہیں کیا ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ انگریزی سنین دیئے جائیں لیکن اول تو اردو خوانوں کو جو زیادہ تر سنین ہجری کے عادی ہیں، اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ دوسرے خود ان کتابوں اور تاریخوں میں، جو اس اردوئے قدیم سے تعلق رکھتی ہیں، ہمیشہ سنین ہجری استعمال کیے گئے ہیں۔

ان کی دوسری کوشش یہ ہے کہ اردو خواں پبلک کو یہ جتایا جائے کہ یہ تمام مواد جو اس کتاب میں دیا گیا ہے صرف یورپ میں بیٹھ کر حاصل کیا گیا ہے۔ اس لیے جناب ڈاکٹر نے کوشش کرکے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے مخطوطات کے غیر ضروری طور پر حوالے دیئے ہیں جس سے اردو خواں پبلک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مثلاً سکندر بن منجھو کی مرآت سکندری کو لیجئے جو بمبئی میں چھپ چکی ہے اور عام طور پر بازاروں میں ملتی ہے۔ اس کے حوالے کے لیے وہ اپنے قارئین کو ارشاد کرتے ہیں: "ملاحظہ ہو مرآت سکندری، ورق ۱۵۲۔ الف، انڈیا آفس فارسی مخطوطات"

اسی طرح مرآت احمدی کے متعلق، جو علی محمد خاں کی تصنیف ہے اور بمبئی میں چھپ چکی ہے نیز بڑودہ ہسٹاریکل سیریز میں پروفیسر نواب علی چھاپ چکے ہیں، ہمارے محترم انڈیا آفس کا حوالہ دیتے ہیں اور ناظرین سے فرماتے ہیں:

"ملاحظہ ہو مرآت احمدی، ورق ۶۶۸/ ب۔" آخر جناب مصنف نے ان حوالوں سے ہم غریبوں کے لیے جو ہندوستان میں بیٹھے ہیں، کیا فائدہ سوچا ہے۔ اس پر لطف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان مخطوطات سے جو حظ یا معلومات حاصل کی اس سے اپنے ناظرین کو محروم ہی رکھا، یعنی وہ اردو جملے جو ان تاریخوں میں ملے کہاں ہیں؟ کچھ نہیں کہا۔ ہم ڈاکٹر صاحب سے مودبانہ کہیں گے کہ یہ تنہا خوری مناسب نہیں۔ اگر آئندہ کبھی اس ادبی شہ پارے کی دوبارہ اشاعت کی نوبت آئے تو اس کی تلافی کردیں اور بالفعل ہم اردو شہ پارے کے ناظرین سے درخواست کریں گے کہ یہ اطلاع، جس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے بخل سے کام لیا ہے، وہ مولوی عبدالحیٔ صاحب کی "گل رعنا" کے ابتدائی باب میں اور شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" میں اور پروفیسر شیرانی کی "پنجاب میں اردو" سے حاصل کرسکتے ہیں۔

صفحہ ۱۲، حاشیہ ۱: یہ گجرات کے قدیم شاعروں کا تذکرہ نہیں بلکہ گزشتہ صدی کے شعرا کا۔[1]

صفحہ ۱۳: "بہاء الدین باجن"۔ اس سرخی کے ذیل میں جو اطلاع دی ہے سراسر

"پنجاب میں اردو" سے ماخوذ ہے" لیکن ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر شیرانی کی تصنیف سے ممنونیت کا اظہار مطلق نہیں کیا بلکہ اور الٹا اعتراض جڑ دیا ہے کہ "پنجاب میں اردو" میں ان کے کلام کے جو نمونے دیئے گئے ہیں وہ نہ تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہیں نہ معتبر و موثق۔ باجن ایک زاہد مرتاض شخص تھے اور غالباً" انہوں نے کوئی ادبی کارنامہ اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔"

غالباً" یہ اشارہ ہے پروفیسر شیرانی کے اس بیان کی طرف : "شیخ باجن ہندی اور فارسی میں اشعار لکھتے تھے اور باجن تخلص کرتے تھے۔ باجن کے معنی ہندی میں ساز کے ہیں۔ انہوں نے فارسی زبان میں ایک تصنیف اپنے پیر کے حالات اور مریدوں کی ہدایت میں لکھی ہے اور اس میں اپنے اشعار کثرت سے لائے ہیں"۔ (پنجاب میں اردو' صفحہ ۱۵۵)۔

اس صریح بیان کے باوجود یہ کہنا کہ "غالباً" انہوں نے کوئی ادبی کارنامہ اپنی یادگار نہیں چھوڑا" ایک مہمل سی بات ہوجاتی ہے۔ کیا زاہدوں اور مرتاضوں کے لیے تصنیف و تالیف ممنوع ہے۔ نمونہ کلام جو پروفیسر شیرانی نے دیا ہے اس کو غیر موثق و معتبر بتایا گیا ہے۔ آخر ڈاکٹر صاحب کے پاس اس امر کی کیا دلیل ہے۔ یہ خیال کہ وہ ادبی لحاظ سے قابل قدر نہیں' نکتہ ناشناسی کی دلیل ہے۔ باجن ایک ایسے عہد کے بزرگ ہیں جب اردو زبان اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے اور ان کی شعر گوئی' خواہ کیسی ہی اکھڑی اور ابتدائی کیوں نہ ہو' اردو کے مورخ کے لیے ہر حال میں ایک مقدس سرمایہ ہے۔ یہ عہد داغ و امیر کا عہد تو ہے نہیں جو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہو۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر اس ادبی ذوق کے دل دادہ ڈاکٹر نے شیخ بہاء الدین کو اپنے ادبی شہ پارے میں کیوں جگہ دی؟ اور لطف یہ کہ اس کو سب سے اول نشست دی ہے۔

صفحہ ۱۴ : شاہ علی محمد جیو گام دھنی ۔ معلوم نہیں کہ جناب ڈاکٹر کے پاس اس بزرگ کے حالات کے لیے کونسا ماخذ ہے۔ اب یہ وہ بزرگ ہیں کو جن کو سب سے

پہلے "پنجاب میں اردو" میں معرف کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر نے اس کا حوالہ دینا گوارا نہیں کیا۔ بعد میں مولوی عبدالحق نے ان پر اپنے رسالے میں مضمون لکھا ہے لیکن جناب ڈاکٹر یہ تمام اطلاع حذف کرگئے۔ ڈاکٹر نے اپنی طرف سے جو کچھ اضافہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ: "اس کی زبان بالکل سادہ ہے اور اکثر معنی بالکل صاف ہیں۔"

یہ رائے وہی شخص دے سکتا ہے جس نے شاہ علی (محمد) کی تصنیف کو بالکل آنکھ سے نہیں دیکھا ہو اور کرسی پر بیٹھ کر محض خیال آرائیاں کررہا ہو۔

صفحہ ۱۵: شیخ خوب محمد "پنجاب میں اردو" میں سب سے اول روشناس کیے گئے ہیں۔ بعد میں مولوی عبدالحق ان پر لکھتے ہیں اور ڈاکٹر نے اس اطلاع پر' جو ان مآخذ میں دی گئی ہے' نہ تو ایک حرف اضافہ کیا ہے اور نہ ان مآخذ کا ذکر کیا ہے۔ ان کا اضافہ غالباً" اسی قدر ہے کہ شیخ کی مشہور تصنیف "خوب ترنگ" کا نام "خوش ترنگ" بتایا ہے۔

صفحہ ۱۸: عین الدین گنج العلم (سنہ ۷۰۶ھ و ۷۹۵ھ) کو اردو کا مصنف تسلیم کرنا محض ظنی ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔

صفحہ ۱۹: خواجہ بندہ نواز حضرت سید محمد حسینی کے متعلق فرمایا ہے کہ آپ کے والد ماجد نے خلد آباد میں انتقال فرمایا۔ ہم ڈاکٹر صاحب (سے) استفسار کرتے ہیں کہ کیا ان ایام میں خلد آباد دنیا کے پردہ پر کہیں موجود تھا؟

پھر فرمایا ہے: "چند مختصر اردو رسالے بھی آپ سے منسوب ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے معتمد کے ہاں بعض قدیم مخطوطے ہیں جو آپ کے بتائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک "معراج العاشقین" جو زیادہ موثق طور پر آپ کا سمجھا جاتا ہے' شائع بھی ہوگیا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ زور صاحب نے اس تصنیف کو کبھی دیکھا نہیں ورنہ وہ اس قدر وثوق کے ساتھ اس کو حضرت گیسو دراز کا ماننے کے لیے تیار نہ ہوجاتے۔ ہم ان کی اطلاع کے لیے عرض کرتے ہیں کہ گیسو دراز نے اردو میں کچھ نہیں لکھا۔[۲] ان کی تمام تر

تالیفات فارسی میں ہیں اور "معراج العاشقین" اگر ان کے قلم سے نکلی ہے تو فارسی میں نکلی ہے اور موجودہ رسالہ کسی ایسے شخص کا ترجمہ ہے جو نہ فارسی سے واقف معلوم ہوتا ہے اور عربی سے تو مطلق بے خبر ہے۔ اس کی عربی دانی اور فارسی دانی کے ذیل میں بعض مثالیں پروفیسر شیرانی کے ایک لکچر سے میں یہاں درج کرتا ہوں:

. . . .

اسمٰعیل عادل شاہ (سنہ ۹۱۶-۹۴۱ھ)، ابراہیم عادل شاہ (سنہ ۹۴۱-۹۶۵ھ) اور علی عادل شاہ (سنہ ۹۶۵-۹۸۸ھ) کے دوروں میں ہمارے ڈاکٹر کو صرف ایک بیجاپوری مصنف ملتا ہے اور وہ شاہ برہان الدین جانم متوفی سنہ ۹۹۰ھ ہیں۔ اول تو یہ امر ہی بجائے خود تعجب خیز ہے کہ ایک مصنف اتنے لمبے عرصے تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے لیکن یہ مان کر کہ شیخ جانم کی عمر شیخ رتن یا کافر لال پوش کی طرح تھی، ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ آخر دکنیوں کے پاس شیخ جانم کو دکنی مصنف ماننے کے ایسے کیا وجوہ ہیں؟ حالانکہ خود شیخ جانم اپنی زبان کو گوجری یا گجری کہتے ہیں جس سے بغیر کسی گنجائش گمان صاف و صریح واضح ہے کہ وہ گجراتی ہیں۔ چنانچہ اس امر کی طرف ان کی کئی تصنیفات میں اشارات ملتے ہیں۔ دیکھو اردو . . . . . اور جب برہان الدین جانم گجراتی ہیں تو ان کے والد شاہ میراں جی (متوفی سنہ ۹۰۲ھ) بدرجہ اولیٰ گجراتی ثابت ہوئے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ اہل دکن کا اپنی ادبیات کی قدامت کا سنگ بنیاد چودھویں صدی (عیسوی) میں رکھنااور اس کا وجود پندرھویں (صدی) میں' برنائے بعض مصنفین گجرات' ثابت کرنا محض ایک ادعائے احتمالی ہے جس کے لیے ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دکن کی ادبی تاریخ کا ورق دسویں صدی ہجری (مطابق سولہویں صدی عیسوی) کے اختتام سے کچھ عرصہ پیش تر کھلتا ہے۔

صفحہ ۸۶ و ۸۷ پر بعض اشعار (اگر غوطے لک برس غواص کھائے الخ اور یو موتی نہیں دو جو غواص پائیں الخ) وجہی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں

شاعر اپنے ایک ہم عصر شاعر غواصی کی طرف ایما کر رہا ہے (جو) خلاف قیاس و تحقیق ہے۔

یہ اشعار مثنوی قطب مشتری میں آتے ہیں جو سنہ ۱۰۱۸ھ کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ اور اگر اس مثنوی کے ان اشعار پر غور کیا جائے جو ابراہیم قطب شاہ کے ذکر میں صفحہ ۲۲ پر درج ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ مثنوی کی بنیاد ابراہیم قطب شاہ (سنہ ۹۵۷۔۹۸۸ھ) کے آخری دور میں پڑچکی ہے اور خاتمہ سنہ ۱۰۱۸ھ میں محمد قلی قطب شاہ (سنہ ۹۸۸۔۱۰۲۰ھ) کے دور میں لکھا گیا ہے۔ اب یہ خیال کرنا کہ وجہی اپنی اس مثنوی میں' جو غالباً" اس کی ابتدائی تصنیف ہے' ایک ایسے شاعر کا' جو بظاہر حالات عبداللہ قطب شاہ (سنہ ۱۰۳۵۔۱۰۸۳ھ) کے دور کا شاعر ہے اور جس کو ہمارا ڈاکٹر اس زمانہ میں یعنی عبداللہ کے عہد میں "کم عمر مدمقابل وجہی" (صفحہ ۹۴) تسلیم کر رہا ہے (ذکر کرتا ہے' ممکن نہیں۔ یعنی) بوڑھا وجہی اپنے جواں سال معاصر کا ایسے قدیم عہد میں کیونکر ذکر کرسکتا ہے۔

صفحہ ۱۲۶ : افضل۔ اس کو شمالی ہند کا مصنف ماننے میں ڈاکٹر کو بہت کچھ تذبذب ہے۔ اس لیے کہ مصنف "پنجاب میں اردو" نے صرف علی قلی خاں والہ داغستانی کے واحد بیان پر اس بات کو تسلیم کرلیا ہے۔ اگر ایک بیان سے زیادہ کی ضرورت ہے تو میر حسن کا تذکرہ دیکھ لیا جاتا جس میں اسے صاف طور پر قدیم شعرا میں مانا گیا ہے۔ قاسم بھی انھی کا ہم زبان ہے۔ رہا یہ امر کہ والہ ان کے ہندی اشعار نقل نہیں کرتا' سو وہ فارسی شعرا کا تذکرہ لکھ رہا ہے نہ ہندی شعرا کا۔ اس نے تذکرۃ" کہہ دیا کہ وہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا۔ ڈاکٹر' قاسم اور میر حسن کے بیانات کے باوجود اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں کہ "یہ بہت ممکن ہے کہ افضل دیگر مسلم شعرا کی طرح جن کا ذکر آزاد بلگرامی نے کیا ہے خالص برج بھاشہ کا شاعر ہوگا" سبحان اللہ۔

صفحہ ۱۲۸ : شیخ جیون۔ ڈاکٹر اس امر پر مصنف "پنجاب میں اردو' سے ناراض ہیں کہ

محبوب عالم کو پروفیسر شیرانی نے شمالی ہند کے مصنفین میں کیوں داخل کرلیا۔ ڈاکٹر کے نزدیک سب سے پہلے مصنف "پنجاب میں اردو" کو یہ ثابت کرنا تھا کہ محبوب عالم یا اسپرینگر کا شیخ جیون دکن کا باشندہ نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ آخر ڈاکٹر نے اس کو دکنی کیوں نہیں ثابت کیا' اگر وہ دکنی ہے۔ ڈاکٹر نے اس بارہ میں پروفیسر شیرانی کے بیانات کو نہ مان کر اسپرینگر پر بھروسہ کیا ہے اور اسی لیے اس کو بار بار شیخ جیون لکھا ہے حالانکہ اس کا اصل نام محبوب عالم ہے اور یہاں ہم اس مغالطے کو بھی عیاں کردیتے ہیں جس میں ڈاکٹر مبتلا ہیں۔ اسپرینگر نے محشرنامہ کے ذکر میں دو مختلف اشخاص یعنی محبوب عالم اور ان کے دوست شیخ جیون کو ایک شخص تصور کرلیا ہے۔ حالانکہ امرواقعہ یہ ہے کہ یہ دو مختلف شخص ہیں۔ محشرنامہ' دردنامہ' دہیزنامہ و خواب نامہ کے مصنف محبوب عالم (۳) ہیں نہ شیخ جیون۔ محشرنامہ البتہ شیخ جیون کی درخواست پر لکھا جاتا ہے۔ اس سے اسپرینگر یہ سمجھا کہ اصل مصنف شیخ جیون ہے جس کا عرف محبوب عالم ہے۔ پروفیسر شیرانی نے جب اسپرینگر کے بیان کو دیکھا تو یہ تاثر لیا کہ محبوب عالم اصل نام ہے اور شیخ جیون عرف چنانچہ "پنجاب میں اردو" میں انہوں نے محبوب عالم عرف شیخ جیون لکھا۔ ان میں سے ڈاکٹر کو صرف شیخ جیون ہی یاد رہ گیا اور اس لیے بار بار اس کو شیخ جیون لکھا ہے۔ لیکن ہمارے ڈاکٹر کا یہ بیان نہایت مزیدار ہے:

"اگر یہ دونوں حوالے ایک ہی شخص سے متعلق ہیں تو وہ شخص دکنی ہوسکتا ہے' جب تک کہ یہ ثابت نہ ہوجائے کہ دردنامہ کا مصنف حقیقت میں شاہ میراں بھیک کا مرید تھا اور شاہ میراں بھیک شمالی ہند کے بزرگ ہیں' شیخ جیون کو دکنی نہ کہنا کچھ ٹھیک بات نہیں معلوم ہوتی" (صفحہ ۱۲۹)۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کو اس بات کا رنج ہے کہ محبوب عالم کو دکنی کیوں نہیں کہا گیا اور اب تا وقتے کہ اس مصنف کو غیردکنی نہ ثابت کیا جائے وہ اس کو اپنے ذہن میں دکنی مانتے رہیں گے۔ اس لیے ان کی اطلاع کے لیے لکھا جاتا ہے کہ شاہ میراں بھیک چشتی کا اصل نام سید محمد سعید ہے۔ وہ شمالی ہند کے رہنے والے ہیں

اور قصبہ کھڑام[۴] میں مدفون ہیں۔ سال پیدائش ۱۰۴۶ھ اور وفات سنہ ۱۱۳۱ھ[۵] ہے۔ ان کے والد کا نام شاہ ابوالمعالی چشتی ہے اور دادا سید محمد اشرف ساکن ایٹھ[۵] متصل سہارن پور ہیں۔ سید میراں بھیک خود ہندی کے اچھے شاعر تھے اور قوال لوگ اب تک ان کے اشعار گاتے ہیں۔[۷] ان کے حالات کے لیے دیکھو "خزینۃ الاصفیا" صفحہ ۴۸۹، جلد اول۔ ان کے خلفا میں شیخ جیون موجود ہیں۔ ان کا نمبر چالیسواں ہے (خزینۃ الاصفیا، صفحہ ۴۹۴)۔

صفحہ ۱۲۹ : ڈاکٹر کا یہ بیان کہ : "پروفیسر شیرانی نے شیخ جیون کے لیے محبوب عالم کا نام استعمال کیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ محبوب عالم اور شیخ جیون ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔" یہ عجیب بیان ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا ہے۔ اسپرینگر نے اپنی فہرست میں (صفحہ ۶۱۷) محبوب عالم کے لیے لکھا تھا۔

"Mohammad Jywan of Jhajher who was familiarly Called Mahbube Alam"

پروفیسر شیرانی نے یہ سوچ کر کہ جیون عرف ہے اور نام محبوب عالم ہے، اس ترتیب کو بدل دیا اور اپنی تصنیف میں محبوب عالم عرف شیخ جیون لکھا (صفحہ ۱۹۰ "پنجاب میں اردو" اور مقدمہ، صفحہ و) اب جو شخص جھجر کا رہنے والا مان لیا گیا ہے، اس کو دکنی کیوں مانا جائے۔ علاوہ ازیں پروفیسر شیرانی نے محبوب عالم کی خصوصیات لسانی پر کافی روشنی ڈالی ہے جس سے ایک سمجھ دار انسان بہ آسانی تمام اس زبان کو دکنی سے ممیز کرسکتا ہے۔ دیکھو صفحہ ۱۹۱۔ ساتھ ہی کافی نمونہ کلام دیا جو صفحات ۱۹۲-۱۹۴ پر درج ہے۔ ڈاکٹر نے ان امور پر مطلق غور نہیں کیا اور محبوب عالم کو دکنی بنانے کی ناکام کوشش میں دو ورق سیاہ کردیئے ہیں۔ ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ : "شیرانی نے درد نامہ کے متعلق کوئی معلومات تحریر نہیں کی ہیں کہ انہوں نے اسے کہاں دیکھا اور اس کا کیسے پتہ چلایا" . . . . ظاہر ہے کہ پروفیسر صاحب انگلستان میں تو ہیں نہیں جو ڈاکٹر کی طرح برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کا حوالہ دے دیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ کتاب خود ان

کے پاس موجود ہے۔

صفحہ ۱۳۰: میر جعفر زٹلی کے حالات میں "پنجاب میں اردو" کا پرتو موجود ہے جس کی طرف مولف نے بھول کر بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔

صفحہ ۱۳۶: امین۔ اس کو گولکنڈہ کا شاعر بتایا گیا ہے۔ اس کی کتاب یوسف زلیخا کو خسرو کی یوسف زلیخا کا ترجمہ بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ نہایت عجیب اطلاع دی گئی ہے کہ "جب شاعر اپنے آپ کو ایک بہت بڑا صوفی بتلانے کی کوشش کرتا ہے تو انداز بیان پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ دیباچہ اور اختتام سے کسی قسم کی مفید اطلاع حاصل نہیں ہوتی۔ ان سے صرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شاعر 'شاعر نہیں بلکہ ایک مذہبی آدمی تھا۔"

آخر ڈاکٹر نے ایک گجراتی شاعر کو گولکنڈہ کا کیسے فرض کر لیا؟

صفحہ ۱۴۹: ولی اورنگ آبادی۔ اس کے متعلق یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ پروفیسر شیرانی کے ہاں ایک دیوان ولی ہے جو سنہ ۸ جلوس محمد شاہی (مطابق ۱۱۳۸ھ) میں احمد آباد (گجرات) میں نقل کیا (گیا) ہے۔ اس میں شاعر کا نام سید ولی محمد مرحوم درج ہے۔

ولی کے متعلق ڈاکٹر کا یہ فقرہ "مخزن" کے ناظرین کے لیے لکھا جاتا ہے: "یہ اورنگ آبادی ولی مذہبی آدمی نہیں تھا . . . . نیز اس نے انتہائی عاشقانہ زندگی گزاری ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص جس نے خاص طور پر خوبصورت لڑکوں اور شراب خواری کی آرزو کے متعلق غزلیں لکھی ہوں کس طرح مذہب کا پرستار تصور کیا جاسکتا ہے۔"

اس پر ہمیں کسی بڑے بوڑھے کا ایک مصرع یاد آیا: ولی پر حرف جو لائے اسے شیطان کہتے ہیں[۸] کیا یہ ایسے ہی موقع کے لیے لکھا گیا تھا؟ یہاں آکر ہمیں خیال ہوتا ہے کہ جناب ڈاکٹر نے یہ کتاب بزبان انگریزی اپنے تھیسس کے طور پر لندن میں پیش کی ہے اور اپنے انگریز ممتحنین کو خوش کرنے کے لیے ایسی نکتہ آفرینیاں پیش کی ہیں۔ بہرحال انگلستان میں ان کے ان خیالات کو پسند کیا گیا ہو لیکن یہاں ہندوستان کے لوگ،

جو ولی اور حافظ و غالب کو ڈاکٹر اور ان کے ممتحنین سے بہتر جانتے ہیں' اس خرافات کو سننے کے لیے تیار نہیں۔

حواشی

(۱) "اردو شہ پارے" کا وہ حاشیہ جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے:

"چند روز ہوئے گجرات کے ایک اردو رسالے کے ایڈیٹر نے راقم الحروف کو اطلاع دی تھی کہ انہیں گجرات کے قدیم اردو شاعروں کے کلام کا ایک گلدستہ دستیاب ہوا ہے اور اور وہ اس کو شائع کرنے والے ہیں مگر اس کے بعد سے اب تک کوئی خبر اس کی نسبت موصول نہیں ہوئی۔"

شیرانی صاحب کے خیال میں ڈاکٹر زور کی مراد قاضی نورالدین فائق شیرازی کے تذکرہ مخزن شعرا سے ہے جس میں اس کے سنہ تالیف (۱۲۶۸ھ) سے عموماً" ایک صدی پہلے تک کے شعرا کا ذکر ہے۔ چنانچہ قادری صاحب کے اس حاشیہ سے کوئی تین برس بعد یعنی ۱۹۳۳ء میں جب مولوی عبدالحق نے "مخزن شعرا" ترتیب دے کر شائع کیا تو اس کے مقدمہ میں لکھا: "تذکرے میں بارہویں اور زیادہ تر تیرھویں صدی کے شعرا کا ذکر ہے" (مرتب)۔

(۲) اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ "معراج العاشقین" حضرت گیسو دراز کی نہیں بلکہ شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف ہے۔ ملاحظہ ہو "معراج العاشقین کا مصنف" از ڈاکٹر حفیظ قتیل' حیدر آباد (دکن)' سنہ ۱۹۶۸ء (مرتب)

(۳) آگے چل کر اس موضوع پر شیرانی صاحب نے مزید معلومات بہم پہنچائیں۔ ان کی رو سے دہیز نامہ اور خواب نامہ' محبوب عالم کی نہیں بلکہ شاہ عبدالحکیم ممی کی تصانیف ہیں۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد دوم' صفحہ ۳۷۰ - ۳۸۳ (مرتب)۔

(۴) یہ قصبہ جس کو فارسی زبان کی تاریخی کتابوں میں "کہرام" لکھا جاتا ہے مقامی طور پر کھڑام یا گھڑام کہلاتا ہے۔ سلطان معزالدین غوری نے اسے فتح کیا تھا اور سلاطین کے زمانے میں نہایت اہم مقام شمار ہوتا تھا۔ قاضی منہاج سراج نے "طبقات ناصری" میں اس کا بار بار ذکر کیا ہے۔ ابوالفضل اسے سرکار سرہند کے محالات میں شمار کرتا ہے۔ مرہٹوں کے عروج اور پھر سکھ گردی میں تباہی کے باعث اس کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی (مرتب)۔

(۵) "شاہ ۔ بھیکھ مقبول خدا" سے آپ کی تاریخ وفات کا سال ۱۱۳۱ھ بر آمد ہوتا ہے۔ لیکن اس میں ۔ بھیکھ کی دونوں "ہا" شامل ہیں۔ (مرتب)

(۶) امیٹھہ سے مراد ضلع سہارن پور کا معروف اور مردم خیز قصبہ انیسٹھہ ہے۔ مولوی احمد علی "قصر عارفان" میں شاہ ابوالمعالی کے نام کے ساتھ نسبت "انبہٹوی" لکھتے ہیں۔
(قصر عارفاں، صفحہ ۴۷۷، اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۶۵ء) مرتب۔

(۷) صاحب خزینۃ الاصفیا کے الفاظ یہ ہیں: "و دی اشعار ہندی و دوھرہ ھا ۔ مضامین توحید بسیار گفتی کہ اکثر ازان قوالان در محافل صوفیان می گویند و موجب ازدیاد ذوق و شوق می گردد" (جلد اول، صفحہ ۴۸۹، مطبع نول کشور، کان پور، سنہ ندارد)

قصرعارفاں میں میراں شاہ بھیک کھڑامی کے نام پر ایک دوہڑا دیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے والد اور مرشد شاہ ابوالمعالی کی شان میں کہا تھا وہو ہذا:

بھیک مالی پر واریاں اور پل میں لک لک بار
کاگا سے ہنسا کئی اور کرت نہ لائی بار

("قصر عارفاں" صفحہ ۴۷۷)

مشہور محمد شاہی امیر، نواب روشن الدولہ ظفر خاں بھی شاہ بھیک کا مرید صادق الاعتقاد تھا اور اسی نے کھڑام میں آپ کا روضہ تعمیر کرایا۔ (مرتب)

(۸) یہ مصرع پیر خاں کمترین کا ہے۔ شیرانی صاحب نے یہ سطور لکھتے وقت (غالباً سنہ ۱۹۳۰ء) میں اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھ دیا ہوگا۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے میر قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ مجموعہ نغز، مرتب کیا جو پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس میں جلد دوم کے صفحہ ۲۹۷ پر ولی کے ذکر میں یہ مصرع بدیں الفاظ درج ہوا ہے:

ولی پر جو سخن لاوے اوسے شیطان کہتے ہیں

(مرتب)

مجلس ترقی ادب لاہور